
SEPTEMBER 2011
شعاع
WWW.PAKSOCIETY.COM
www.Paksociety.com



مستقل سلسلے

ستمبر 2011
جلد 26 شمارہ 1
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: 91، بی بلاک نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaamonthly@yahoo.com, info@khawateendigest.com

سالانہ خریداری بذریعہ رجسٹری
پاکستان .... 800 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ .... 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا .... 6000 روپے

شعاع کا ستمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

رحمتوں اور برکتوں کا مہینہ رمضان المبارک اختتام پذیر ہے۔ آخری عشرہ میں عبادتوں کے ساتھ ساتھ عید کی تیاریاں عروج پر ہوتی ہیں۔ لیکن وطن عزیز میں اس وقت جو دل فگار حالات ہیں، ان میں خوشی کا تصور بھی محال لگتا ہے۔ اندرون سندھ بارشوں نے تباہی پھیلا رکھی ہے۔ فصلیں تباہ ہو چکی ہیں۔ لاکھوں افراد بے گھر، بے سروسامان کھلے آسمان تلے امداد کے منتظر ہیں۔ دوسری طرف کراچی لہو لہو ہے۔ پچھلے دو ڈھائی عشروں سے جاری قتل و غارت اور دہشت گردی کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔

بدترین حالات میں بھی امید کی کرن چھپی ہوتی ہے۔ سوچیے خود دیکھیے۔ ان حالات کو کیسے بدلا جا سکتا ہے۔ اور آپ کیا کر سکتی ہیں۔

عید مسلمانوں کا اجتماعی مذہبی تہوار ہے۔ خوشیاں اور محبتیں بانٹنے سے بڑھتی ہیں۔ اپنی خوشیوں میں ان لوگوں کا حصہ ضرور رکھیے گا جو حالات کے ستائے ہوئے ہیں۔

خوش خبری،

مزاح لکھنا آسان کام نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں بے شمار شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار تو نظر آتے ہیں لیکن مزاح نگار اتنے کم ہیں کہ انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ فائزہ افتخار کی خوبی یہ ہے کہ وہ سنجیدہ تحریروں کے ساتھ مزاح بھی اتنی ہی خوبصورتی سے لکھتی ہیں۔ کافی وقفے کے بعد فائزہ افتخار نے شعاع کی قارئین کے لیے ناول لکھا ہے جو اکتوبر کے شمارے میں شامل ہوگا۔

اس شمارے میں،

- زندگی خوبصورت ہے۔ راشدہ رفعت کا مکمل ناول،
- قافلے راہ بھول جاتے ہیں۔ سندس جبیں کا مکمل ناول،
- دل کے رستے دشوار بہت تھے۔ سلویٰ علی بٹ کے ناول کا آخری حصہ،
- ثمرہ بخاری اور سائرہ عارف کے ناولٹ،
- آسیہ مقصود، نبیلہ ابر راجا اور راحت نذیر کے افسانے،
- عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کے ناول،
- رنگ عید کے۔ قارئین سے عید کا خصوصی سروے،
- بندھن۔ عامر قریشی اور مہوش حیات سے ملاقات،
- دستک۔ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا عید نمبر آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔

حمد باری تعالیٰ

دل رفتہ جمال ہے اس ذوالجلال کا
مستجمع جمیع صفات و کمال کا

ادراک کو ہے ذات مقدس میں دخل کیا
اودھر نہیں گزر گمان و خیال کا

حیرت ہے عارفوں کو نہیں راہ معرفت
حال کچھ عجب ہے یاں انہوں کے حال و قال کا

ہے قسمت زمین و فلک سے غرض نمود
جلوہ وگرنہ سب میں ہے اس کے جمال کا

مرنے کا بھی خیال ہے میرؔ اگر تجھے
ہے اشتیاق جان جہاں کے وصال کا

میر تقی میرؔ

نئے امکان کے در کھول دیتا ہے کلام اس کا
حیات تازہ کا مژدہ سناتا ہے پیام اس کا

زمانہ آج تک اس کی طرف حیرت سے تکتا ہے
کہ بالا ہے بہت ہر ایک بلندی سے مقام اس کا

یہ دنیا لا نہیں سکتی کبھی کوئی مثال اس کی
ہر اک کار نمایاں سے نمایاں تر ہے کام اس کا

تمیز بندہ و آقا نہیں ہے اس کی محفل میں
ہے سارے تشنہ کاموں کے لیے گردش میں جام اس کا

اسی کے فیض سے انسان نے انساں کو پہچانا
ہر اک نظم حکومت سے ہے بہتر انتظام اس کا

بھلا اس کا مقام و مرتبہ کیا کوئی پہچانے
شہنشاہوں کو خاطر میں نہیں لاتا غلام اس کا

جمیلؔ اب تو یہاں بس دو گھڑی کو آن بیٹھے ہیں
یہ بزم اس کی ہے، باتیں اس کی، مے اس کی، جام اس کا

جمیل یوسف

ادارہ

پیاری پیاری باتیں

شب قدر کی فضیلت کا بیان

(سورۃ قدر میں) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ۔

"ہم نے اس (قرآن مجید) کو شب قدر میں اتارا اور تونے کیا سمجھا کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ اس میں فرشتے 'روح القدس (جبرئیل علیہ السلام) کے ساتھ اپنے رب کے حکم سے ہربات کا انتظام کرنے کو اترتے ہیں۔ اور صبح تک یہ سلامتی کی رات قائم رہتی ہے۔"

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص رمضان کے روزے ایمان اور احتساب (حصول اجر و ثواب کی نیت) کے ساتھ رکھے 'اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔ اور جو لیلۃ القدر میں ایمان و احتساب کے ساتھ نماز میں کھڑا رہے 'اس کے بھی پچھلے تمام گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔"

شب قدر کو رمضان کی آخری طاق راتوں میں تلاش کرنا

ہم سے عبداللہ ابن یوسف نے بیان کیا' کہا کہ ہم کو امام مالک نے خبردی' انھیں نافع نے اور انھیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند اصحاب کو شب قدر خواب میں (رمضان کی) سات آخری تاریخوں میں دکھائی گئی تھی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے سب کے خواب سات آخری تاریخوں پر متفق ہوگئے ہیں۔ اس لیے جسے اس کی تلاش ہو وہ اسی ہفتہ کی آخری (طاق) راتوں میں تلاش کرے۔"

یہ مبارک رات رمضان شریف کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں ہوتی ہے اور یہ ہر سال مستقل ہوتی رہتی ہے۔ شافعیہ نے اکیسویں رات کو ترجیح دی ہے اور جمہور نے ستائیسویں رات کو۔ مگر صحیح تر یہی ہے کہ اسے ہر سال کے لیے کسی خاص تاریخ کے ساتھ متعین نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ہر سال منتقل ہوتی رہتی ہے اور یہ ایک پوشیدہ رات ہے۔

علماء نے کہا کہ اس رات کے مخفی ہونے میں یہ حکمت ہے کہ اس کی تلاش کے لیے کوشش کی جائے۔ اگر اسے معین کردیا جاتا تو پھر اس رات پر اکتفا کرلیا جاتا۔

مختلف آثار میں اس رات کی کچھ نشانیاں بھی بتائی گئی ہیں۔ مگر وہ آثار بطور امکان ہیں' بطور شرط نہیں ہیں۔ جیسا کہ بعض روایات میں اس کی ایک علامت بارش ہونا بھی بتلایا گیا ہے۔ مگر کتنے ہی رمضان ایسے گزر جاتے ہیں کہ ان میں بارش نہیں ہوتی حالانکہ ان میں لیلۃ القدر کا ہونا بھی برحق ہے۔ پس بہت دفعہ ایسا ہونا ممکن ہے کہ ایک شخص نے عشرہ آخیر کی طاق راتوں میں قیام کیا اور اسے لیلۃ القدر حاصل بھی ہو گئی مگر اس نے اس رات میں کوئی امر بطور خوارق عادت نہیں دیکھا۔ اس لیے حافظ صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں یعنی ہم یہ اعتقاد نہیں رکھتے کہ لیلۃ القدر کو وہی پہنچ سکتا ہے جو کوئی امر خارق دیکھے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اللہ کا فضل بہت فراخ ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا "یا رسول اللہ! میں لیلۃ القدر میں کیا دعا پڑھوں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ یہ دعا بکثرت پڑھا کرو۔

"یا اللہ! تو معاف کرنے والا ہے اور معافی کو پسند کرتا ہے پس تو میری خطائیں معاف کردے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔

"میں نے کہا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ رات پہلے انبیا کے ساتھ بھی ہوا کرتی تھی کہ جب وہ انتقال کرجاتے تو وہ رات اٹھادی جاتی؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں بلکہ وہ رات باقی ہے۔"

اور امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے جو انھوں نے موطا میں نقل کیا ہے کہ مجھے پہنچا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کی عمریں کم ہونے کا احساس ہوا کہ پہلی امتوں کی عمریں بہت طویل ہوا کرتی تھیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو لیلۃ القدر عطا فرمائی 'جس سے آپ کی امت کو تسلی دینا مقصود تھا جن کی عمریں بہت چھوٹی ہیں اور یہ رات ایک ہزار مہینے سے بہتر ان کو دی گئی۔" (ملخص)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل میں سے ایک شخص کا ذکر فرمایا جس نے ایک ہزار مہینے تک اللہ کی راہ میں جہاد کیا تھا۔ اس کو سن کر مسلمانوں کو بے حد تعجب ہوا' اس پر یہ سورۃ مبارکہ نازل ہوئی۔ مفسرین نے کہا ہے کہ پہلے زمانے میں ایک شمسون نامی نبی تھے جو ایک ہزار ماہ تک اللہ کے دین کے لیے جہاد فرماتے رہے اور اس تمام مدت میں انھوں نے اپنے ہتھیار جسم سے نہیں اتارے' یہ سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے بھی اس طویل عمر کے لیے تمنا ظاہر کی تاکہ وہ بھی اس طرح خدمت اسلام کریں۔ اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی اور بتلایا گیا کہ تم کو صرف ایک ایسی رات دی گئی جو عبادت کے لیے ایک ہزار ماہ سے بہتر و افضل ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "شب قدر کو تلاش کرو۔"

تشریح: جس کی صورت یہ کہ آخری عشرہ کی طاق راتوں میں جاگو اور عبادت کرو۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرتے اور فرماتے۔

"رمضان کے آخری عشرہ میں شب قدر کو تلاش کرو۔"

تشریح: آخری عشرہ کی طاق راتوں میں جاگو اور عبادت کرو۔

لوگوں کا جھگڑا

عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں شب قدر کی خبر دینے کے لیے تشریف لارہے تھے کہ دو مسلمان آپس میں کچھ جھگڑا کرنے لگے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں آیا تھا کہ تمہیں شب قدر بتادوں لیکن فلاں اور فلاں نے آپس میں جھگڑا کرلیا۔ پس اس کا علم اٹھا لیا گیا۔ اور امید یہی ہے کہ تمہارے حق میں یہی بہتر ہو گا۔ پس اب تم اس کی تلاش (آخری عشرہ کی) نویا سات یا پانچ (ی راتوں) میں کیا کرو۔"

آخری عشرہ کی عبادت

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ "جب (رمضان کا) آخری عشرہ آتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا تہبند مضبوط باندھتے (یعنی اپنی کمر پوری طرح کس لیتے) اور ان راتوں میں آپ خود بھی جاگتے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگایا کرتے تھے۔"

تشریح: کمر کس لینے کا مطلب یہ کہ آپ اس عشرہ میں عبادت الٰہی کے لیے خاص محنت کرتے۔ خود جاگتے 'گھر والوں کو جگاتے اور رات بھر عبادت الٰہی میں مشغول رہتے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سارا عمل تعلیم امت کے لیے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا۔ اے ایمان والو! اللہ کے رسول

تمہارے لیے بہترین نمونہ ہیں۔ ان کی اقتدا کرنا تمہاری سعادت مندی ہے یوں تو ہمیشہ ہی عبادت الٰہی کرنا بڑا کار ثواب ہے لیکن رمضان کے آخری عشرہ میں عبادت الٰہی کرنا بہت ہی بڑا کار ثواب ہے۔ لہٰذا ان ایام میں جس قدر بھی عبادت ہو سکے غنیمت ہے۔

رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرنا، اور اعتکاف ہر ایک مسجد میں درست ہے

یعنی اعتکاف کے لغوی معنی کسی چیز کو اپنے لیے لازم کر لینا اور اپنے نفس کو اس پر مقید کر دینا اور شرعی معنی میں کسی بھی مسجد میں کسی مقرر آدمی کی طرف سے کسی مخصوص طریقہ کے ساتھ کسی جگہ کو لازم کر لینا اور یہ اعتکاف اجماعی طور پر واجب نہیں ہے۔ ہاں کوئی اگر نذر مانے یا کوئی شروع کرے مگر درمیان میں قصداً "چھوڑ دے تو ان پر ادائیگی واجب ہے۔

اعتکاف کے لیے مسجد کا ہونا شرط ہے جو آیت قرآنی (2/البقرۃ:187) سے ثابت ہے۔ یعنی حنفیہ نے عورتوں کے لیے اعتکاف جائز رکھا ہے اس صورت میں کہ وہ اپنے گھروں کی ان جگہوں میں اعتکاف کریں جو جگہ نماز کے لیے مخصوص کی ہوئی ہوتی ہیں۔ امام زہری اور سلف کی ایک جماعت نے اعتکاف کو جامع مسجد کے ساتھ خاص کیا ہے۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا بھی تقریباً" ایسا ہی اشارہ ہے اور یہ مناسب بھی ہے تاکہ معتکف با آسانی ادائیگی جمعہ بھی کر سکے۔ رمضان شریف کے پورے آخری عشرہ میں اعتکاف میں بیٹھنا مسنون ہے۔ یوں ایک دن ایک رات یا اور بھی کوئی کم مدت کے لیے بیٹھنے کی نیت کرے تو اسے بھی بقدر عمل ثواب ملے گا۔

سنن ابو داؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ "یعنی معتکف کے لیے سنت ہے کہ وہ کسی مریض کی عیادت کے لیے نہ جائے اور نہ کسی جنازہ پر حاضر ہو اور نہ اپنی عورت کے قریب جائے اور کسی حاجت کے لیے اپنی جگہ سے باہر نہ نکلے مگر جس کے لیے نکلنا بے حد ضروری ہو۔ جیسا کہ کھانا پینا یا قضائے حاجات کے لیے جانا۔ اگر معتکف ایسے کاموں کے لیے نکلا اور مسجد سے خارج ہی وضو کر کے واپس آ گیا تو اس کے اعتکاف میں کوئی خلل نہ ہو گا۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات تک برابر رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کرتے رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی ازواج مطہرات اعتکاف کرتی رہیں۔

صرف ایک رات کے لیے اعتکاف کرنا

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

"میں نے جاہلیت میں یہ نذر مانی تھی کہ مسجد حرام میں ایک رات کا اعتکاف کروں گا۔"

آپ نے فرمایا "اپنی نذر پوری کر۔"

تشریح: نذر و نیاز جو خالصاً "اللہ کے لیے ہو اور امر جائز کے لیے جائز طور پر مانی گئی ہو اس کا پورا کرنا واجب ہے۔ اعتکاف بھی ایسے ہی امور میں داخل ہے اگر کوئی غلط نذر مانے جیسا کہ ایک شخص نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے باطل قرار دیا۔ اسی طرح دیگر غلط نذر و منت بھی توڑنی لازمی ضروری ہیں۔ غیر اللہ کے لیے کوئی نذر و منت ماننا شرک میں داخل ہے۔

عورتوں کا اعتکاف کرنا

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ میں آپ کے لیے (مسجد میں) ایک خیمہ لگا دیتی اور آپ صبح کی نماز پڑھ کے اس میں چلے جاتے تھے۔ پھر حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی عائشہ رضی اللہ عنہا سے خیمہ کھڑا کرنے کی (اپنے اعتکاف کے لیے) اجازت چاہی۔ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اجازت دے دی اور انہوں نے ایک خیمہ کھڑا کر لیا۔ جب زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے دیکھا تو انہوں نے بھی (اپنے لیے) ایک خیمہ کھڑا کر لیا۔

صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی خیمے دیکھے تو فرمایا "یہ کیا ہے؟"

آپ کو ان کی حقیقت کی خبر دی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا تم سمجھتے ہو یہ خیمے ثواب کی نیت سے کھڑے کیے گئے ہیں؟"

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مہینہ (رمضان) کا اعتکاف چھوڑ دیا اور شوال کے عشرہ کا اعتکاف کیا۔

یعنی عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر اعتکاف نہ کرے اور بغیر اجازت اعتکاف کی صورت میں خاوند کو حق ہے کہ وہ عورت کا اعتکاف ختم کرا دے اور اعتکاف کے لیے مساجد میں خیمہ لگانا درست ہے اور عورتوں کے لیے افضل یہی ہے کہ وہ مساجد میں اعتکاف نہ کریں اور معتکف کے لیے اپنی جگہ میں داخل ہونے کا وقت نماز فجر کے بعد کا وقت ہے۔ یہ اوزاعی کا قول ہے لیکن ائمہ اربعہ اور ایک جماعت علما کا قول یہ ہے کہ سورج غروب ہونے سے قبل اپنے مقام میں داخل ہو۔

معتکف کا مسجد کے دروازے تک جانا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک بیوی حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے خبر دی کہ وہ رمضان کے آخری عشرہ میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف میں بیٹھے ہوئے تھے "آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے مسجد میں آئیں تھوڑی دیر تک باتیں کیں پھر واپس ہونے کے لیے کھڑی ہوئیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی انہیں پہنچانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ جب وہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے دروازے سے قریب والے مسجد کے دروازے پر پہنچیں تو دو انصاری آدمی ادھر سے گزرے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کسی سوچ کی ضرورت نہیں، یہ تو (میری بیوی) صفیہ بنت حیی ہیں۔"

ان دونوں صحابیوں نے عرض کیا "سبحان اللہ! یا رسول اللہ!"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"شیطان خون کی طرح انسان کے بدن میں دوڑتا رہتا ہے۔ مجھے خطرہ ہوا کہ کہیں تمہارے دلوں میں وہ کوئی بدگمانی نہ ڈال دے۔"

تشریح: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ معتکف ضروری کام کے لیے مقام اعتکاف سے باہر نکل سکتا ہے۔ آپ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اس لیے نکلے کہ وہ اکیلی رہ گئی تھیں۔ کہتے ہیں ان کا مکان بھی مسجد سے دور تھا بعض روایتوں میں ان کو دیکھنے والوں کے متعلق ذکر ہے کہ انہوں نے "آگے بڑھ جانا چاہا تھا" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حقیقت حال سے آگاہ فرمانے کے لیے ان کو بلایا۔ معلوم ہوا کہ کسی ممکن شک کو دور کر دینا بہر حال اچھا ہے۔

عیدین میں اذان اور اقامت

سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دونوں عیدوں کی نماز کئی بار بغیر اذان کے اور بغیر اقامت کے پڑھی۔ (مسلم)

عید الفطر میں صدقہ

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نماز فطر کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور سیدنا ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم سب کے

ساتھ گیا تو ان سب بزرگوں کا قاعدہ تھا کہ نماز' خطبہ سے پہلے پڑھتے تھے اور اس کے بعد خطبہ پڑھتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اترے یعنی خطبہ پڑھ کر گویا میں ان کی طرف دیکھ رہا ہوں جب انہوں نے لوگوں کو ہاتھ سے اشارہ کرکے بٹھانا شروع کیا پھر ان کی چیرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ بھی تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے فارغ ہوئے اور پھر فرمایا کہ "تم نے ان سب کا اقرار کیا کہ اس میں سے ایک عورت نے کہا کہ "ہاں اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!" راوی نے کہا کہ معلوم نہیں وہ کون تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "صدقہ کرو۔" پھر انہوں نے صدقہ دینا شروع کیا اور سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے اپنا کپڑا پھیلایا اور کہا کہ "لاؤ میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں۔" اور وہ سب چھلے اور انگوٹھیاں اتار اتار کر سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کے کپڑے میں ڈالنے لگیں۔ (مسلم)

عورتوں کی نماز عید

سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کیا کہ ہم عیدالفطر میں اور عیدالاضحیٰ میں اپنی کنواری' جوان لڑکیوں کو اور حیض والیوں کو اور پردہ والیوں کو لے جائیں۔ بس حیض والیاں نماز کی جگہ سے الگ رہیں اور اس کار نیک اور مسلمانوں کی دعا میں حاضر ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے کسی کے پاس چادر نہیں ہوتی۔" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اس کی بہن اسے اپنی چادر اوڑھا دے۔" (مسلم)

صدقہ فطر کھانے' پنیر اور انگور سے ادا کرنے کا بیان

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں صدقہ فطر ہر چھوٹے بڑے' آزاد' غلام کی طرف سے ایک صاع گندم یا ایک صاع پنیر یا جو کھجور یا انگور نکالتے تھے پھر جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ حج کو یا عمرہ کو آئے تو لوگوں میں منبر پر وعظ کیا اور اس میں کہا کہ۔

"میں جانتا ہوں کہ دو مد (یعنی نصف صاع) شام کی گندم کا ایک صاع کھجور کے برابر ہوتا ہے۔" (یعنی قیمت میں) سو لوگوں نے اس کو لے لیا اور سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ

"میں تو وہی نکالتا رہوں گا جو نکالتا تھا (یعنی ایک صاع) جب تک جیوں گا۔" (سبحان اللہ یہ اتباع تھا حدیث کا اور نفرت تھی رائے اور قیاس سے) (مسلم)

جمعہ کے دن غسل

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ایک دن جمعہ کا خطبہ لوگوں میں پڑھ رہے تھے کہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ آئے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "کیا حال ہو گا ان لوگوں کا جو اذان کے بعد دیر لگاتے ہیں۔"

تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا "اے امیرالمومنین! جب میں نے اذان سنی تو اور کچھ نہیں کیا۔ سوائے وضو کے' وضو کیا اور آیا۔"

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا "صرف وضو ہی کیا ہم نے نہیں سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے "جب کوئی جمعہ کو آئے تو ضرور نہائے۔"" (مسلم)

رنگ عید کے

ادارہ

تیرہ شبوں کو پھر سے جگمگائے ہلال عید
سندیسہ بہار بن کے آئے ہلال عید

ماہ صیام کے اختتام پر روزہ داروں کے لیے اللہ تعالیٰ کا تحفہ' پوری دنیا میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے اجتماعی خوشی کا تہوار عید کا دن

عید کا چاند نظر آتے ہی ہر طرف خوشیاں رقص کرتی نظر آتی ہیں۔ مہندی کی خوشبو' چوڑیوں کی کھنک سے آنگن مسکرا اٹھتے ہیں' ہر طرف گہما گہمی' رنگوں اور خوشیوں کی بہار نظر آتی ہے۔ خواتین کے لیے عید خوشیوں کے ساتھ ساتھ ڈھیروں مصروفیتیں اور تھکن بھی لے کر آتی ہے۔

گھر کی صفائی ستھرائی کے ساتھ خود کو بھی سنوارنا ہے' مہمانوں اور گھر والوں کے لیے خصوصی خوش ذائقہ اور مزے دار پکوان کا اہتمام بھی کرنا ہے کہ کوئی کمی نہ رہ جائے۔

اپنی قارئین کے ساتھ عید منانے اور ان کی خوشیوں میں شامل ہونے کے لیے ہم نے عید سروے کیا ہے۔ سوالات یہ ہیں۔

1۔ عید ہمارا مذہبی تہوار ہے' جو روایتی انداز سے منایا جاتا ہے۔ آپ کو یہ تہوار اپنے انداز سے منانے کا موقع ملے تو کیسے منانا پسند کریں گی؟

2۔ اپنی کسی یادگار عید کا احوال لکھیے۔ شادی کے بعد پہلی عید یاد ہے' کیا تحفہ ملا تھا اور کیسے مبارک باد دی گئی تھی؟

3۔ آپ کے گھر میں عید کی کوئی خصوصی ڈش بنتی ہے؟ آپ کے ہاں عید کیسے منائی جاتی ہے؟

آیئے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

انیقہ انا۔۔۔ چکوال

1 ابھی چند روز قبل غالباً" 29 شعبان المعظم کو سعدیہ نے مجھ سے کہا تھا "ہمیں عید' عید اس لیے نہیں لگتی کیونکہ اب ہم بڑے ہو چکے ہیں' ورنہ بچوں کے لیے اب بھی وہ وہی عید ہے جیسی ہمارے بچپن میں ہوتی تھی۔" واقعی عید تو زمانہ طفولیت میں ہوا کرتی تھی۔ اب تو۔۔۔

مانا کہ عقل و شعور نے کچھ چھین تو دی
پر وہ مزہ کہاں جو نادانیوں میں تھا

اب اگر میں اپنے روایتی انداز میں عید مناؤں تو زرق برق لباس' ہم رنگ جوتے' پرس' جیولری خاص کر چوڑیاں اور مہندی اور عید کارڈ کی وہ روایت جو موبائل فونز اور انٹرنیٹ نے ختم کر دی ہے۔ اسے پھر سے زندہ کروں اور مل جل کر باہم محبت سے عید کا دن مناؤں۔ دعا کیجیے کہ میں اس میں کامیاب ہو جاؤں۔ (آمین)

2 یادگار عید۔ ابھی تک میری شادی تو ہوئی نہیں۔ لہٰذا یادگار عید کا تعلق میرے بچپن سے ہے۔ 1994ء کا وہ زمانہ جب میری نانی اماں زندہ تھیں۔ ہم سات بہن'



بھائی، امی اور نانی اماں (ابو تو بیرون ملک ہوا کرتے تھے) رات کو باجی سے مہندی لگواتا، صبح باجی کے ہاتھ کی سویوں سے عید کا آغاز کرتا۔ سعدیہ، میں اور جنید۔ ہم مل کر محلے میں سویاں بانٹتے۔ ندیم بھائی سفید کاٹن کے لباس میں ملبوس (بڑے خوب صورت ہوا کرتے تھے میرے بھائی۔ تھے اس لیے کہ اب ان کی خوب صورتی ان کے بیٹے یادی میں منتقل ہو گئی ہے۔) عید کی نماز کے بعد ہمیشہ گھر مٹھائی کا ڈبہ لے کر آیا کرتے تھے۔

میں اور جنید عیدی وصولنے کے بعد ساری کی ساری اسی روز کھلونوں، آئس کریم اور کولڈ ڈرنکس پر خرچ کر دیا کرتے۔ بڑا اچھا دور تھا۔ پانچ روپے کی پیپسی یا سیون اپ اور پولکا کی آئس کریم اور ڈھیروں کھلونے۔

اب کہاں وہ عیدیں۔ سات بہن بھائی۔ بہنیں تو سسرال و شوہر اور بچوں کی مصروفیت میں دور ہو گئیں اور بھائی شورش زمانہ میں دور ہوئے۔ خیر۔ وقت ہے جناب ابھی پچھلی عید پر مجھ سے چھوٹے جنید نے ہم سب بہنوں کو پہلی بار عیدی دی۔ آج تک اسے نہیں کہا پر آج شعاع کے توسط سے اسے کہتی ہوں کہ "مجھے اپنا یہ بے حد ذہین بچا اور مخلص بھائی بہت پیارا ہے۔"

3۔ ہمارے ہاں۔ یار اب کوئی لمبا چوڑا کھڑاگ تو ہے نہیں کہ خاص اہتمام کیا جائے۔ گنتی کے چار بہن بھائی اور جن میں ہر ایک کا مزاج اور پسند الگ، ایک شمال ہے تو اک مغرب۔ اب کہاں عید کا وہ مزہ رہا جو پہلے تھا۔ لباس کے معاملے میں بھی یہ ہوتا کہ عید، بقر عید کے مواقع پر خصوصی لباس تیار ہو کر آتا اور اسی دن کو پہنا جاتا تھا۔ اب تو یہ ختم ہو گیا ہے۔ خود مختار (جاب کرنے کے بعد) ہو گئے تو موقع بے موقع لباس سلتے ہیں۔ کوئی بھی پہن لیا جاتا ہے۔ ہاں اب فون پر بھانجیوں سے ان کی عید کا احوال ضرور سن لیا جاتا ہے۔ عید کا مزہ جو پہلے عیدی لینے میں تھا، اب عیدی لینے والوں کے بعد اب عیدی دینے والوں کی صف میں شامل ہو گئی۔ میری بھانجیاں اور بھانجے، بہت خاص خوشی ہوتی ہے جب عیدی دیتی ہوں کہ عید تو معصوم بچوں کی ہی ہوتی ہے۔

فرخندہ خالد۔ فرام اٹک

1۔ عید اپنے انداز سے منانے کا موقع ملے تو کیسے منائیں گی؟ اس سوال کے جواب کے لیے تو زیادہ سوچنے کی



ضرورت ہی نہیں۔ بندی ہمہ وقت 'بن کھلے' بہت سے منصوبے ساتھ لیے پھرتی ہے۔ میں چاند رات کو خالاؤں کے ساتھ چوڑیاں پہننے جاؤں گی۔ پارلر سے دونوں ہاتھوں پر مہندی لگواؤں، پھر عید والے دن اڑوس پڑوس میں میٹھا بانٹنے کے بعد اچھی سی تیار ہو جاؤں۔ پھر سب گھر والے گھومنے جائیں۔ دوپہر کا کھانا کسی ریسٹورنٹ میں کھانے کے بعد اپنے شہر کے جناح پارک (جس کے دیدار سے میں تاحال محروم ہوں) میں بیٹھ کے آئس کریم کھائیں۔ دوپہر ڈھلے دریا کنارے چلے جائیں۔ کشتی میں بیٹھیں، جھولے لیں ڈھیر سارے اور شام ڈھلے دریا کے پانی میں چاند دیکھنے کے بعد گھر لوٹیں۔ (ہزاروں خواہشیں ایسی.....)

2۔ بچپن کی ساری عیدیں ہی یادگار ہیں جو نانی کے گھر منائی گئیں۔ عید سے ایک ہفتہ پہلے تک امی سے ساری خریداری مکمل کرا لینا اور پھر انتیسویں روزے کا انتظار کہ کب گاؤں جائیں۔ نانی کے گھر افطار سے کچھ دیر پہلے پہنچتے تو افطار کے شان دار انتظام کے ساتھ نانی کا شفیق وجود بانہیں پھیلائے منتظر ملتا۔ سویرے نماز کے بعد جب نانا کو عید مبارک کہنے جاتے تو سب کو 50'50 روپے عیدی ملتی، سوائے چھوٹی خالہ کے۔ انہیں سو کا نوٹ ملا کرتا۔

عیدی ملنے کے بعد چھوٹا سا پرس لٹکائے بھائیوں کے ساتھ گاؤں کی گلیاں ناپنے نکل کھڑی ہوتی۔ بہت عرصے تک میری عید کے دن کی خریداری غباروں اور بسکٹ تک محدود رہی۔ شام ڈھلے امی کے ساتھ دادی سے ملنے جانا، جہاں سے اگلے دن واپسی ہوتی۔ بہت سی عیدیں یوں ہی گزریں، پھر بچپن رہا، نہ نانا، نانی۔ اب تو عید آتی ہے بچھڑے ہوئے پیاروں کی یادیں لے کر اور روٹھی روٹھی گزر جاتی ہے۔

3۔ عید پر ساری روایتی ڈشز ہی بنتی ہیں۔ خاص طور پر بنائی جانے والی ڈش دودھی۔ حلوہ ہے جو گندم کا نشاستہ نکال کر بنایا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں عید سادگی سے گزاری جاتی ہے۔ کچھ سالوں سے چھوٹا بھائی آرمی میں ہے تو چاند رات تک اس کے آنے کا کنفرم نہیں ہوتا۔ ایسے میں اس کی اچانک آمد عید میں رنگ بھر دیتی ہے۔ کھانے پر معمول سے زیادہ



اہتمام کے علاوہ ہمارے ہاں کی عید میں کچھ بھی خاص نہیں ہوتا۔

شائستہ اکبر۔۔۔ ڈگری کالج کدو

1 یہ سوال میری پسند کا سوال ہے۔ اگر عید مجھے اپنے انداز سے منانے کا موقع ملے تو میں عید پہ اپنے فیورٹ کلر یعنی کہ بلیک کلر کا سوٹ پہنوں گی۔ کیونکہ مما عید کے دن بلیک کلر پہننے نہیں دیتیں اور بلیک کلر میرا ہائے فیورٹ کلر ہے۔ اور میں تیار شیار ہو کر بس بیٹھی رہوں اور مما مجھے کوئی بھی کام کرنے کو نہ کہیں۔ خاص کر کچن کا کام۔ عید تو خوشیاں منانے کا نام ہے نہ کہ کام کرنے کا' لیکن بڑی ہونے کی وجہ سے یہ بھی مجھے کرنا پڑتا ہے۔

2۔ خوش گوار یاد کوئی نہیں ہے۔ ہاں جب ہم بچپن میں نانی کے گھر عید منانے سب جمع ہوتے تھے تو بہت اچھے دن تھے۔ اب تو سب اپنے اپنے گھروں میں عید مناتے ہیں۔ ہم بھی اپنے گھر میں' بہن بھائیوں کے ساتھ جھگڑتے لڑتے عید کا دن گزار دیتے ہیں۔ ہاں لاسٹ ایئر والی عید تو تھوڑا بہت خاص ہوا تھا کہ ہمارے چاچو۔۔۔ نے ہمارے ہم آرہے ہیں تو ان کے لیے پہلی دفعہ عید پر کچن کو سنبھالا اور ان کے لیے اپنے ہاتھوں سے کباب بنائے جو کہ اچھے بنے تھے۔ بعد میں سب نے تعریف کی اور میں خوامخواہ شرمندہ ہوئے جا رہی تھی۔ اور ہاں یہ "شادی شدہ" کے لیے مخصوص ہے سوال جواب نہیں دے سکتی۔

3۔ ہمارے ہاں عید بہت خوشیوں سے (اللہ کا شکر ہے) منائی جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آج کچھ بہت خاص ہے اور خاص ہوتی بھی ہے۔ عید ہمارا مذہبی تہوار ہے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ بہت سے اچھے اچھے پکوان بناتے ہیں' سب کچھ مما بناتی ہیں میں بس ان کی ہیلپ کرواتی ہوں۔ بہن بھائی تیار ہو کر پورے گھر میں ادھر ادھر گھومتے رہتے ہیں اور ڈش تو بہت ساری بنائی جاتی ہیں پر جو مخصوص ہے وہ بریانی اور بھنے ہوئے چھولے جو کہ سب کھاتے ہیں اور خاص بنائے جاتے ہیں۔

سائرہ سحر ریاض احمد۔۔۔ فرام چھبل ٹوالہ

1۔ عید ہمارا مذہبی تہوار ہے۔ ماہ رمضان میں افطاری کروانا' غریبوں کو زکوٰۃ دینا' ضرورت مندوں کی امداد کرنا' نماز عید کے بعد اپنوں کو گلے لگانا' عیدی دینا' یہ ہی ہمارا روایتی انداز ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ دنیا کا کوئی بھی تہوار اس خوب صورت انداز سے نہیں منایا جاتا۔ الحمد للہ ہمیں اس کی گنجائش نہیں۔ میں روایتی انداز سے ہی عید منانا پسند کروں گی۔

2 یادگار عید۔۔۔

بابا جان کے ساتھ گزری ساری عیدیں ہی یادگار ہیں۔ آج اللہ کا دیا سب کچھ ہے' وہ ہم میں موجود نہیں۔ اف۔ یہ کیا پوچھ لیا۔ دل کے راکھ ہو گیا۔ شادی کے بعد کی عید۔ اور "ان" کے تحفے؟ ہمیں خوابوں کی سرزمین میں لے آئے؟ کہاں کی شادی' کون سی شادی' ہائے مایہ دولت کی شادی کے پیچھے ہی رہے' شادی نہ ہوئی۔ بڑا ظلم کیا یہ سوال پوچھ کے۔ (!!!)

3۔ صبح کا آغاز نماز عید سے کرتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر ہمارے ہاں عیدی نہیں ملتی۔ (دعا کریں اس بار بہت زیادہ عیدی ملے۔ آمین) عید سعید (سعید اتم یہ نہ سمجھنا کہ تمہارا ذکر ہے) ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ عید کے لوازمات میں مہندی' چوڑیاں' نیا لباس' سب کچھ شامل ہوتا ہے۔ شاپنگ کی میں ویسے بھی دیوانی ہوں' پھر عید کی ڈریسنگ۔ اوئے اتنا اہتمام کرتے ہیں۔

"نئے کپڑے بدل کے جاؤں کہاں۔"

خوب دل لگا کر تیار ہوتی ہوں اور کچن میں چلی جاتی ہوں' پھر صبح سے شام' شام سے رات میری تو کچن میں ہی گزر جاتی ہے۔ ہم تو کہیں جاتے نہیں' البتہ ہمارے گھر اتنے مہمان آتے ہیں۔ بڑی رحمت ہوتی ہے۔ (اف) میرے ہاتھوں کے بنے کھانوں کی تعریف ہر کوئی کرتا ہے۔ جس نے بھی کوئی چیز میرے نایاب ہاتھوں کی بنی ہوئی کھائی ہو۔ نایاب ہاتھوں کو دیکھ کر جب ناظم بھائی کہتے ہیں کہ سائرہ! اپنے ہاتھ دیکھے ہیں۔ (اندر کی باتیں ہیں' رہنے دیں بڑی شرم آتی ہے۔) گھر والوں نے بھی تعریف نہیں کی۔ پھر بھی مجھے کچن سے کوئی نکلنے نہیں دیتا۔ ہمارے ہاں ہر طرح کے پکوان بنتے ہیں' میٹھا' نمکین اور پھیکا' کیونکہ آپی کو مرچیں بہت لگتی ہیں۔ (خود بھی ہر وقت مرچیں چباتی رہتی ہیں۔)

میرے ہاتھوں کے بنے فرائیڈ رائس' سندھی بریانی' شامی کباب' فرائیڈ فش' چکن میکرونی' چکن کڑاہی' وائٹ قیمہ' گاجر کا حلوہ' کھیر' سب بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ اور سے کسی عمدہ پکوان کی ترکیب لکھ دی تو اگر وہ بھولا ہوا ہے تو گھر والوں کو پڑھ کے یاد آجاتا ہے۔ پھر وہ بنانا پڑ جاتا ہے۔

چلیں آسان سا بتا دیتی ہوں' تاکہ مجھے اور آپ کو بھی بنانے میں آسانی ہو۔

چکن پکوڑے

اجزاء :

چکن بون لیس کیوبز میں کاٹ لیں۔ بیسن' سرخ مرچ' ادرک' لہسن' کالی مرچ۔ سبز مرچ (باریک کاٹ لیں) نمک' سونف (پوٹلی بنا لیں)

ترکیب :

چکن کی بوٹیوں کو ادرک' لہسن' نمک' کالی مرچ ڈال کر ابال لیں' سونف والی پوٹلی بھی ساتھ شامل کر دیں۔ بیسن میں سبز مرچ' سرخ مرچ حسب منشاء نمک شامل کر کے پیسٹ بنا لیں۔ 5 منٹ میں چکن بوائل ہو جائے تو بیسن کے آمیزے میں چکن بوٹیوں کو ڈبو کر فرائی کر لیں۔ دس منٹ میں مزے دار چکن پکوڑے تیار ہیں۔ آخر میں میری طرف سے سب کو دلی عید مبارک۔

☼

عامر قریشی اور مہ وش عامر

شاہین رشید

عامر قریشی + مسز مہ وش عامر

آج کل کی نسل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کچھ والدین کی تربیت' کچھ ملکی حالات اور سب سے بڑھ کر میڈیا اور خاص طور پر کیبل کے ذریعے نظر آنے والے چینلز نے انہیں باغی' منہ زور اور اپنی من مانی کرنے والا بنا دیا ہے' خاص طور پر شادی کے معاملے میں تو وہ مکمل خود مختاری چاہتے ہیں اور کسی کی نہیں سنتے' بس شادی کرنی ہے تو اپنی پسند سے ورنہ نہیں مگر اس دور میں کچھ نوجوان ایسے بھی ہیں جو شادی بیاہ کے معاملات کو اپنے والدین پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ والدین کی اپنی اولاد کے لیے بہت سی خواہشات میں سب سے اولین خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کی شریک سفر کا انتخاب وہ خود کریں۔ ملک کے نامور فنکار مصطفیٰ قریشی کے نامور بیٹے عامر قریشی نے یہ اعزاز اپنے والدین کو دیا اور ان کی پسند سے شادی کی۔

"کیسے ہیں عامر قریشی صاحب۔ آپ کی شادی ارینج ہے' آپ کی تو پوری فیملی ماشاءاللہ شوبز سے وابستہ ہے' پھر آپ نے اپنی پسند کے بجائے والدین کی پسند کو ترجیح دی کوئی خاص وجہ تھی؟"

"والدین کی خوشی میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے' ان کی خواہش تھی کہ ان کی بہو گھر میں آئے۔ میں نے بھی یہی سوچا کہ کوئی ایسی لڑکی ہو جو ان کے ساتھ خوش رہ سکے یا جس کے ساتھ والدین خوش رہ سکیں۔ میرا کیا تھا میں تو کسی سے بھی شادی کر سکتا تھا۔"

"کوئی رشتے داری ہے؟ اور آپ نے "مہ وش" کو دیکھا ہوا تھا؟"

"نہیں رشتے داری نہیں ہے۔ میرے والد کے جاننے والوں میں سے ہیں اور حیدر آباد میں رہتے ہیں' اور میں نے انہیں دیکھا ہوا نہیں تھا' صرف ان کی تصویر دیکھی تھی اور تصویر دیکھ کر میں نے "اوکے" کر دیا کہ ٹھیک ہے اور جب اصل میں چہرہ دیکھا تو خوشی ہوئی کہ تصویر جیسی ہی ہیں جبکہ تصویر کچھ سال پرانی تھی۔"

"شادی کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں' بور کے لڈو کھانے چاہئیں یا نہیں؟"

"میں تو شادی کے بارے میں یہی کہتا ہوں کہ یا تو فیصلہ کر لو کہ ساری زندگی نہیں کرنی تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر یہ کہتے ہو کہ کبھی نہ کبھی تو کرنی ہے تو پھر دیر نہ کرو بلکہ جلدی کر لو تاکہ اپنی زندگی کو انجوائے تو کر سکو۔"

"اپنی بیگم کے بارے میں کچھ بتائیں؟"

"بیگم کا تعلق [illegible] بھی سندھ ہی سے ہے۔ تعلیمی لحاظ سے ڈاکٹر ہیں۔ الٹرا ساؤنڈ میں ماہر یعنی ریڈیالوجسٹ ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی فوٹو شوٹ کرنا شروع کر دو اور آپ کو بتاؤں کہ یہ بہت زیادہ گھریلو ہیں۔ اور والدین بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کی بہو گھریلو لڑکی ہو۔ ان کا ایک بھائی اور یہ تین بہنیں ہیں۔"

"منگنی کتنا عرصہ رہی۔ اور شادی دھوم دھام سے ہوئی' رسمیں انجوائے کیں آپ نے؟"

"ایک مہینہ منگنی رہی۔ شادی بہت دھوم دھام



سے نہیں بلکہ نارمل طریقے سے ہوئی اور شادی حیدر آباد میں ہوئی جبکہ ولیمہ کراچی میں ہوا تھا' رسمیں سب ہوئیں اور سچ پوچھیں تو مجھے شادی میں جانا اور رسموں میں حصہ لینا پسند بھی نہیں ہے اور میرا بس چلتا تو میں اپنی شادی میں بھی نہ جاتا۔ لیکن اپنی شادی تھی تو تمام رسموں میں حصہ لینا پڑا اور حقیقت میں بہت تنہائی پسند ہوں اور کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ غلط فیلڈ میں آ گیا ہوں میں بالکل بھی سوشل بندہ نہیں ہوں' مجھے بلاوجہ ادھر ادھر پھرنے کے بجائے گھر میں رہنا زیادہ پسند ہے۔"

"بیگم ڈاکٹر' آپ فنکار اور پروڈیوسر۔ کیا بیوی کو بھی کمانا چاہیے۔ اور کیا بہترین زندگی کے لیے پیسہ بہت سارا ہونا چاہیے؟"

"آپ کا یہ سوال کہ بیوی کو کمانا چاہیے تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے تو مہ وش کو اختیار دیا ہوا ہے اور چاہیے یا نہیں چاہیے تو یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ میں نے شادی کے بعد صاف کہہ دیا تھا کہ میں نہ آپ کو فورس کروں گا اور نہ میں آپ کو منع کروں گا' یہ آپ کی اپنی مرضی ہو گی۔"

"مگر ڈاکٹری تو ایسا پیشہ ہے کہ....."

"لیکن وہ پریکٹس نہیں کر رہیں۔ انہیں ہاؤس وائف بننا زیادہ پسند ہے۔ تو ہم نے بھی کہا کہ ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔"

"تو ایک سیٹ ضائع کر دی انہوں نے؟"

"بالکل ضائع کر دی اور کسی کا حق مار دیا' جو غلط ہے وہ غلط ہے اور جہاں تک یہ سوال آپ کا کہ پیسہ بہت سارا ہونا چاہیے تو اچھی زندگی گزارنے کے لیے پیسہ بہت ضروری ہے اور اتنا تو ہو کہ آج کل لوڈشیڈنگ کے جو حالات ہیں تو بندہ ایک جنریٹر تو خرید سکے اور آرام سے رہ سکے۔ بہت زیادہ پیسے کا میں قائل نہیں ہوں کہ ہر مہینے کبھی سوئٹزر لینڈ تو کبھی لندن تو کبھی کہیں اور کبھی کہیں' میرے نزدیک یہ بہت بڑی فضول خرچی ہے۔"

"تو پھر ملک سے باہر جا کر ہنی مون منانا بھی فضول خرچی ہو گی' ویسے یہ کیوں ضروری ہے۔"

"میں اپنی شوٹنگ کے لیے دبئی گیا تھا تو ساتھ بیگم کو بھی لے گیا تھا بس وہیں ہمارا ہنی مون ہو گیا تھا۔ "ایک پنتھ دو کاج" والی بات ہو گئی اور اللہ جانے

کیوں یہ رسم رکھی گئی ہے اور کیوں یہ رواج چل پڑا ہے کہ ہنی مون منایا جائے۔ اس کا کوئی نہ کوئی بیک گراؤنڈ تو ہوگا شاید ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے ایسا ہوتا ہوگا اور شاید ارینج میرج والوں کے لیے ہنی مون منانا ضروری ہے۔ لو میرج والے تو ایک دوسرے کو جانتے ہی ہیں۔"

"مزاج کی کیسی ہیں؟ سگھڑ ہیں۔ کیونکہ ڈاکٹرز کی پڑھائی بہت ٹف ہوتی ہے۔ گھرداری کا ٹائم نہیں ملتا؟"

"مزاج کی بہت ہی ٹھنڈی ہیں۔ غصہ نہیں آتا اور بہت سگھڑ ہیں۔ بہت سمجھ دار ہیں، خود بہت اچھی ہیں فیملی بہت اچھی ہے۔ کسی کی بھی اچھائی برائی اس کی فیملی سے پتا چلتی ہے تو ان کی تربیت بہت اچھی ہوئی ہے فیملی بیک گراؤنڈ سے بہت فرق پڑتا ہے ان کا تعلق پنو عاقل سے ہے۔ حیدر آباد کے ہی لیاقت میڈیکل کالج سے انہوں نے تعلیم حاصل کی۔"

"سسرال سے تعلقات کیسے ہیں؟"

"اپنے سسرال میں میرا بہت زیادہ آنا جانا نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ میں اتنا سوشل نہیں ہوں۔ حالانکہ ہونا چاہیے مگر کیا کروں کہ میری فطرت میں نہیں ہے۔ لیکن یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میرے سسرال والے بہت اچھے ہیں۔ وہ بھی فورس نہیں کرتے۔ کبھی مائنڈ نہیں کرتے میں جاؤں یا نہ جاؤں۔ وہ سمجھتے ہیں میری طبیعت کو۔ میں، میرا کمپیوٹر، میرا کمرا، میری فیلڈ مجھے بہت عزیز ہیں۔"

"بہت کم کام کرتے ہیں۔" "دل نہیں چاہتا کہ دن رات کام ہو۔ ہر چینل پہ نظر آرہے ہوں۔"

"اصل میں کام لینے کے لیے جو کچھ کرنا پڑتا ہے وہ مجھ سے ہوتا نہیں ہے۔ "خوشامد کرنا" السلام علیکم سر! کیا کررہے ہیں سر، کیسے ہیں سر، یہ کام مجھ سے ہوتا نہیں کہ جی ویسے ہی آپ کی یاد آرہی تھی سوچا آپ کو فون کرلوں۔ یہاں جتنے بھی ڈائریکٹرز ہیں سب کو میرے بارے میں علم ہے۔ جس کو ضرورت ہوگی خود ہی فون کرلیں گے۔"

"لڑائی جھگڑا ہوتا ہے آپ دونوں میں؟"

"نہیں ابھی نہیں۔ کیونکہ میں لڑاکا قسم کا انسان نہیں ہوں اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے کبھی لڑائی جھگڑے کا موقع ہی نہیں دیا ہے۔ اور میں بھی کافی ٹھنڈے مزاج کا انسان ہوں۔"

"شادی کے لیے لڑکی کا خوب صورت ہونا کتنا ضروری ہے؟ اور کس عمر میں لڑکی لڑکے کی شادی ہونا چاہیے؟"

"لڑکے کی شادی 30 سال کی عمر کے اندر اندر یعنی 25 سے 30 کے درمیان اور اس لحاظ سے میں نے تھوڑی دیر میں شادی کی۔ لڑکی کی شادی بھی 25 یا 26 سال میں ضرور ہوجانا چاہیے۔ اور خوب صورت ہونا تو ضروری ہے۔"

"شاپنگ ملک کے اندر کرتے ہیں یا باہر؟"

"میں تو سال میں ایک مرتبہ ملک سے باہر جاتا ہوں اور اپنی سال بھر کی شاپنگ کرکے لے آتا ہوں۔ یہاں میں ان کے ساتھ یا خود سے بالکل بھی شاپنگ پر نہیں جاتا۔"

"بہت کفایت شعار لگ رہے ہیں آپ۔ بیگم بھی آپ جیسی ہیں؟"

"فضول خرچی کی ضرورت کیا ہے؟ اگر کسی [illegible] کے لیے یا کسی ڈرامے کے لیے ضرورت ہو تو خرید لیتا ہوں ورنہ کیا ضرورت ہے۔ میں [illegible] اپنی نارمل لائف میں تو ایک جینز اور ٹی شرٹ میں رہتا ہوں۔ بیگم میرے جیسی [illegible] تھوڑا زیادہ خرچ کرتی ہیں مگر ان کو فضول خرچ نہیں کہہ سکتے۔"

"شادی کے فائدے ہیں یا نقصانات؟ کیا روٹین لائف تبدیل ہوئی؟"

"میرا نہیں خیال کہ لائف میں اس کا کوئی نقصان ہے اور نہ ہی میری روٹین لائف میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ میں ویسے کا ویسا ہی ہوں۔ میں پہلے بھی صبح چھ یا سات بجے تک سوتا تھا اور دوپہر تین چار بجے اٹھتا تھا اب بھی ایسا ہی ہے۔ بلکہ مہ وش بھی میرے رنگ میں رنگ گئی ہے۔ میری دس پندرہ سال کی روٹین آج تک ویسی ہی چلی آرہی ہے میرا سوشل سرکل پہلے بھی نہیں تھا اب بھی نہیں ہے۔ گنتی کے دو ہی دوست ہیں۔"

"جن لڑکوں کی شادی نہیں ہوئی ان کے لیے کیا کہنا چاہیں گے؟"

"کہ یار خوب انجوائے کرلو بعد میں یہ مت کہنا کہ ہم نے شادی جلدی کرلی ابھی نہ کرتے تو اچھا تھا اور جب آپ محسوس کریں کہ بہت انجوائے کرلیا۔ اب سیٹل ڈاؤن ہوجانا چاہیے تو پھر دیر نہ کریں اور شادی کرلیں۔"

مہ وش عامر

"13 جون 2009ء کو آپ کی شادی ہوئی۔ آپ ماشاءاللہ ڈاکٹر ہیں تو کیا پروفیشنل لائف ڈسٹرب ہونے کی وجہ سے آپ نے پریکٹس چھوڑی ہے؟"

"پروفیشنل لائف میری ڈسٹرب ہوئی ہے اور میں ایک اسپتال میں کام کررہی تھی۔ لیکن عامر کے کام کے سلسلے میں لاہور آنا جانا بہت لگا رہتا تھا اس لیے میں نے جاب چھوڑ دی۔"

"آپ نے پڑھائی پہ اتنا پیسہ خرچ کیا۔ آپ کا دل نہیں چاہتا کہ اس کا ریٹرن لوں، اپنی پاکٹ منی کے لیے اور اپنے اطمینان کے لیے کماؤں؟"

"میرے پاس ایک آپشن ہمیشہ سے اوپن ہے کہ میں کسی وقت بھی جاب کرسکتی ہوں۔ اب دونوں کے بعد ہمیں ملک سے باہر جانا ہے۔ تو مجھے بھی موقع ملا میں ضرور جاب کروں گی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر لڑکیاں پڑھتی لکھتی ہیں اور ان کی کوئی پروفیشنل فیلڈ ہے تو انہیں ضرور کام کرنا چاہیے۔"

"کہتے ہیں کہ شادی کے بعد لڑکیوں کی زندگی میں بہت تبدیلیاں آتی ہیں میکے جیسی زندگی نہیں ہوتی ہے۔ کیا ایسا ہے؟"

"ایسا ہوتا ہے لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا کیونکہ عامر کی فیملی بہت مختصر سی ہے ایک بہن اور والدین ماشاءاللہ سب بہت لبرل ہیں اور سب بہت ہی اچھے ہیں۔ سب مل جل کر بہت ہی پیار و محبت کے ساتھ رہتے ہیں۔ میں اسے کبھی بھی جوائنٹ فیملی نہیں کہوں گی بلکہ مکمل فیملی ہی کہوں گی۔"

"فیملی کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ مگر پھر بھی لڑکیوں کی خواہش ہوتی ہے کہ ہمارا اپنا گھر ہو، ہماری اپنی حکومت ہو۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں اور ایسا ہوتا بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں اس بات کو اچھا نہیں سمجھتی، میرے خیال میں ایسا ہی ہونا چاہیے لیکن جہاں تک میری بات ہے تو مجھے کوئی پرابلم یا ایشو نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اور مسئلہ ہے۔ کوئی کسی قسم کی پابندی نہیں ہے۔ کب سوتے ہیں، کب جاگتے ہیں، کب آتے ہیں، کب جاتے ہیں۔ کسی چیز میں روک ٹوک نہیں ہے۔ مجھے کبھی اس بات کا احساس ہوا ہی نہیں ہے کہ ہمیں الگ ہونا چاہیے۔ اور سچ بتاؤں کہ ہمارے گھر کا ماحول اتنا اچھا ہے کہ مجھے میکہ بھی یاد نہیں آتا۔ انکل، آنٹی (ساس سسر) کی بات بتاؤں کہ اگر عامر مذاق میں بھی مجھے کچھ کہہ دیں تو عامر کی ایسی شامت آتی ہے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں پھر میں ان کو کہتی ہوں کہ عامر مذاق کررہے ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اپنے دونوں بچوں سے زیادہ انکل، آنٹی مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ مجھ پر بھروسا بہت کرتے ہیں تو جہاں اتنی محبتیں ہوں وہاں علیحدہ ہونے کی سوچ تو آہی نہیں سکتی۔"

"میاں کے دل میں گھر کرنے کے لیے کیا ضروری ہے، میاں کی خدمت، ان کے ماں باپ کی خدمت یا اچھا کھانا؟"

"تینوں چیزیں ضروری ہیں۔ عامر کھانے پینے کے بہت شوقین ہیں۔ میں اتنی اچھی کک نہیں ہوں لیکن مجھے کوکنگ کا شوق بہت ہے۔ اور میں کوکنگ چینل بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔ شادی سے پہلے ایسا کچھ دھیان نہیں تھا لیکن شادی کے بعد سب لوگوں کی محبت نے مجبور کیا کہ مجھے کوکنگ کرنا چاہیے۔ عامر کو میٹھا کھانا بہت پسند ہے تو کچھ نہ کچھ میٹھا ضرور بنالیتی

بولیں۔

"عامر مزاج کے کیسے ہیں۔ منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور رومانٹک ہیں؟"

"عامر کو غصہ آتا ہے مگر زیادہ نہیں۔ مگر جانے نہیں کیوں میں ڈر جاتی ہوں۔ منہ دکھائی میں انہوں نے مجھے لاکٹ دیا تھا جو پرل اور ڈائمنڈ کا تھا جو میرے خیال میں عامر نے خود ڈیزائن کیا تھا۔ بہت ہی قیمتی اور خوبصورت گفٹ تھا۔ عامر زبان سے اظہار نہیں کرتے لیکن ہمارا جو کمرا ہے اس کی چھت پر اے اور ایم لکھوایا ہے اور لائٹس لگوائی ہیں تو اس سے اندازہ لگائیں کہ کتنے رومانٹک ہیں۔ ان کا پریکٹیکلی رومانٹک ہونا اچھا لگتا ہے۔"

"آپ دونوں ایک دوسرے کو کس نام سے بلاتے ہیں اور مشہور شخصیت سے شادی کرکے کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا کہیں آنے جانے میں؟"

"میں تو انہیں عامر ہی کہتی ہوں۔ یہ مجھے "P" بلاتے ہیں۔ نہیں مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوا میں چونکہ ڈرامے وغیرہ نہیں دیکھتی تو شادی سے پہلے مجھے ان کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں معلوم تھا ویسے بھی ہماری ارینج میرج ہے۔ گھر والے بہت ہی سادہ طبیعت کے مالک ہیں۔ اور کہیں آنے جانے میں تو کوئی پرابلم نہیں ہوتا۔"

"شادی کا جوڑا کیسا تھا؟ ہلکا یا بھاری اور کون سی رسمیں انجوائے کیں، میکہ چھوڑنے کا غم ہوگا؟"

"مہندی کی رسم بہت انجوائے کی۔ شادی کا جوڑا خاصا بھاری تھا اور سسرال سے ہی آیا تھا۔ اور بہت خوب صورت تھا۔ ولیمہ کا جوڑا لائٹ پنک تھا کیونکہ گرمی میں شادی ہوئی تھی۔ میکہ چھوڑنے کے بارے میں تو سوچ ہی نہیں رہی تھی کیونکہ میکہ چھوڑنا ظاہر ہے کہ ہر لڑکی کے لیے مشکل ہوتا ہے میری اپنے پاپا کے ساتھ بہت زیادہ قربت تھی۔ گزشتہ سال اکتوبر میں ان کا انتقال ہوگیا جس کی وجہ سے مجھے بہت زیادہ دکھ تھا میکہ چھوڑنے کا، پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ اور رونا بھی بہت آیا اور میں ان کے پاس زیادہ بیٹھتی بھی نہیں تھی کہ مجھے رونا آجاتا تھا اور میرے پاپا میرے آنسو دیکھ کر پریشان ہوجاتے تھے۔"

"عامر کو آپ سجی بنی اچھی لگتی ہیں یا سادگی میں؟"

"عامر کو میں سادگی میں اچھی لگتی ہوں۔ اور مجھے خود بھی سادگی میں رہنا اچھا لگتا ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے تو اچھا میک اپ کرنا بھی نہیں آتا۔ بہت ہلکا میک اپ کرتی ہوں۔"

"عامر صاحب کی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"

"عامر کی بہت سی عادتیں بہت اچھی ہیں۔ عامر کے ساتھ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی اور ان کی سب سے بہترین عادت جس کی وجہ سے میں ان کی بہت زیادہ عزت کرتی ہوں ممبت انڈر اسٹینڈنگ ہیں۔ پریکٹیکلی بہت اسٹرونگ ہیں۔ ہر فیصلہ بہت اچھے انداز میں کرتے ہیں اور بھی بہت سی عادتیں بہت اچھی ہیں۔ اب مجھے نہیں پتا ہے کہ انہیں میری کون سی عادت اچھی لگتی ہے مگر مجھے اپنی یہ عادت اچھی لگتی ہے کہ مجھ میں صبر ہے۔"

"اور اب آخری سوال کہ گھونگھٹ اٹھا کر آپ کو دیکھ کر دلہن کے روپ میں عامر نے کیا کہا تھا؟"

"کمرے میں آکر کہا تھا ... خیال ہے میں "معشاء" پڑھ لیں اور ... نفل بھی پڑھنے ہیں۔"

"آپ خوش ہیں؟"

"جی الحمدللہ، بہت خوش ہوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔ ہم یہ بات ضرور کہنا چاہیں گے کہ عامر قریشی ان چند اچھے فنکاروں میں سے ایک ہیں جو بہت عزت اور بہت اپنائیت سے بات کرتے ہیں۔ اور ان کی مسز سے بھی بات کرکے بہت اچھا لگا۔ ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

☼

رضیہ جمیل

خط آئے



خط بھجوانے کے لیے پتا

ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔ آپ سب کو ہماری جانب سے عید کی دلی مبارک باد اور دعائیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وطن عزیز کے ہر گھر میں عید خوشیوں کا پیغام لے کر اترے۔ ہر آنگن آباد ہو اور سب کے دل خوشیوں سے معمور ہوں۔ (آمین)

پہلا خط کراچی سے مسرت الطاف پراچہ کا ہے، لکھتی ہیں

سب سے پہلے تمام رائٹرز اور شعاع کے ادارے سے وابستہ لوگوں کو عید کی خوشیاں بہت بہت مبارک ہوں۔

"دیوار شب" بہت ہی خوب صورتی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ عالیہ جی سے ریکوئسٹ ہے کہ جویا کا کردار مجھے بے حد پسند ہے، اس لیے جویا کے ساتھ زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ "ستارہ شام" کی یہ قسط بھی اچھی لگی۔ راحت جی آپ نے بہت انتظار کروایا۔ گل صنوبر اس پورے شمارے کی جان تھا۔ راحت نے ناول میں جس طرح منظر نگاری کی ہے ایک پل کو مجھے لگا کہ میں بھی شاید وہیں کھڑی ہوں۔ "سو ویل ڈن" "دل کے رستے دشوار بہت تھے" پڑھ کر بالکل مزہ نہیں آیا۔ بس اوپن ہوتا کہانی بوریت کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ شاہم کے کردار میں مجھے بہت جھول نظر آیا، جہاں ارسل کی بہن کو شاکڈ کیا، وہاں شاہم کا منصور سے شادی کے لیے اصرار کرنا کچھ اچھا نہیں لگا، وہ بھی باہم ہی کی طرح خود غرض نکلی۔ منصور کا کردار بھی کچھ اچھا نہیں لگا۔ ساہم کے کہنے پر اس کو چھوڑ دینا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن شاہم کے زبردستی کرنے پر اس سے شادی کر لینا کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ منصور تو دونوں بہنوں کی کٹھ پتلی بن کر رہ گیا ہے۔ "میری صبح کا ستارہ" یہ قسط بھی اچھی لگی۔ پلیز ناہین کے ساتھ کچھ بھی برا نہ ہو۔ افسانوں میں حرا قریشی کے افسانے نے بہت فریش کر دیا۔ نبیلہ ابر راجہ کو میں اس خط کے ذریعے یہ پیغام دینا چاہوں گی کہ میں آپ سے بے پناہ محبت کرتی ہوں اور پلیز، پلیز جلد از جلد ہمیں اپنی خوب صورت تحریروں سے نوازیں۔

ہمارے چھوٹے سے پیارے لاڈلے اور اکلوتے بھائی سے بھانجے محمد راحیل کی پہلی برتھ ڈے ہے۔ اسے وش کر دیجیے گا۔ ہم پانچ بہنیں ہیں بھائی نہیں ہے۔ خاندان کے لوگوں نے ہمیشہ ہمیں اس بات کا احساس دلایا جبکہ ہمارے والدین نے ہمیشہ ہمیں ہر لحاظ سے سراہا۔ ہمیں اچھی اور معیاری تعلیم دی۔ ہمیں کبھی بھائی کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ میں اپنے والدین کو خراج تحسین پیش کرنا چاہوں گی اور یہاں تک کہ میری تحریریں بھی میرے ابو خود ہی پوسٹ کرتے ہیں۔

ج: پیاری مسرت! بیٹیاں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہیں، آپ کے والد نے اس رحمت کی قدر کی، یہ جان کر خوشی ہوئی۔

محمد راحیل کو ہماری جانب سے مبارک باد اور دعائیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں نیک اور نصیب والا بنائے۔ (آمین) شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

اقراء ظرف نے لاہور سے ای میل کی ہے

اس ماہ کا شعاع عید کو ہی مل گیا اور ذہنی اور جسمانی تمام کلفتوں کو دور کر گیا۔ آمنہ ریاض دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں۔ "کلیہ و دمنہ" اچھا لگا۔ نگاہ پڑی راحت کی جانب تو دل باغ باغ ہو گیا۔ "گل صنوبر" بہت خوب صورت محسوس ہوا۔ سعدیہ عزیز نے اس ماہ بہت اچھا لکھا۔ تقریباً سب ہی افسانے اچھے تھے۔ آمنہ ریاض نے ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لکھا۔ عزیزہ سے ایک شکایت ہے۔ جہاں تک میری ناقص عقل کام کرتی ہے تو عالیہ نے کبھی دو چاہنے والوں کو ساتھ رہنا مناسب نہیں سمجھا۔ (ظالم سماج) اب جو سالار اور یمنی کو ملا دیا تو مجھ سے خوشی برداشت نہ ہو سکی۔ آخر جویا کا کیا قصور ہے۔ اس وفا کی دیوی کی زندگی میں بھی تو ذرا رونق لے آئیں۔ خاص بات تو رہ گئی ٹائٹل بہت اچھا تھا۔

ج: پیاری اقراء! عالیہ بخاری کے سلسلے میں ہم آپ کی رائے سے بالکل متفق نہیں۔ عالیہ نے کبھی بھی چاہنے والوں کے ساتھ ظالم سماج کا کردار نہیں کیا۔ ان کی کہانیوں میں سچے دل سے پیار کرنے والے لوگوں کا کسی نہ کسی طرح ملن ہو جاتا ہے۔ جویا کے سلسلے میں آپ کی سفارش ان تک پہنچائی جا رہی ہے۔ ای میل کا شکریہ۔

مدیحہ نورین نے گلوں برنالی سے لکھا ہے

شعاع کو پڑھتے ہوئے چار سال ہو گئے ہیں اور ہر دفعہ ہی نیا نیا سا لگتا ہے۔ اس کے تمام رائٹرز بہت اچھا لکھتے ہیں۔ خاص طور پر رخسانہ نگار کے ناول اور حال کی رائٹرز میں عالیہ بخاری کا "دیوار شب" بہت اچھا ہے اور مریم عزیز بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔

ج: پیاری مدیحہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

لنیقہ اتانے چکوال شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

بعد مدت کے میرے گھر کی خاموشی ٹوٹی
پھر اک روز خود سے کلام میں نے کیا

آج ایک طویل ترین مدت کے بعد شعاع میں خط لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ کتنے ہی شان دار ناول گزرے، کیسے موسم بیتے پر میں نے دل پر جبر کیے رکھا، لیکن اب کی بار نہ جانے کیوں میں خود کو روک ہی نہیں پائی۔ وجہ شاید یہ کہ اس بار بہت ہی تحریریں پسند آئیں اور دل نے کہا کہ مصنفین کو خراج تحسین نہ بخشنا تو خاصی زیادتی ہوگی۔ لہٰذا میں ساری ناراضی اور غصہ بھلا کر حاضر محفل ہوں۔

"دیوار شب" کیا خوب لکھتی ہیں اور ان دو ماہ میں تو اور بھی۔ سالار اس ناول میں میرا پسندیدہ ترین کردار ہے۔ یمنی اور سالار کی شادی نے تو دل ہی خوش کر دیا۔ جویا کے حوالے سے اس کے گھر والوں کی بے حسی پر بہت غصہ آتا ہے اور سچ پوچھیں تو مجھے جویا سے بڑی عقیدت سی ہو گئی ہے۔ جو بھی ہو ناول زبردست جا رہا ہے۔

آمنہ ریاض بھی خوب لکھتی ہیں، آغاز میں، میں نے پڑھا نہیں تھا، پھر جنت کے کردار کی وجہ سے کچھ دلچسپی پیدا ہوئی۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ثمینہ بیگم ہادی کو سارے حقائق، جلال سے جھوٹ بولے بغیر بھی تو بتا سکتی تھیں؟ خواہ مخواہ اس بے چاری کے جذبات مجروح کیے جا رہے ہیں۔

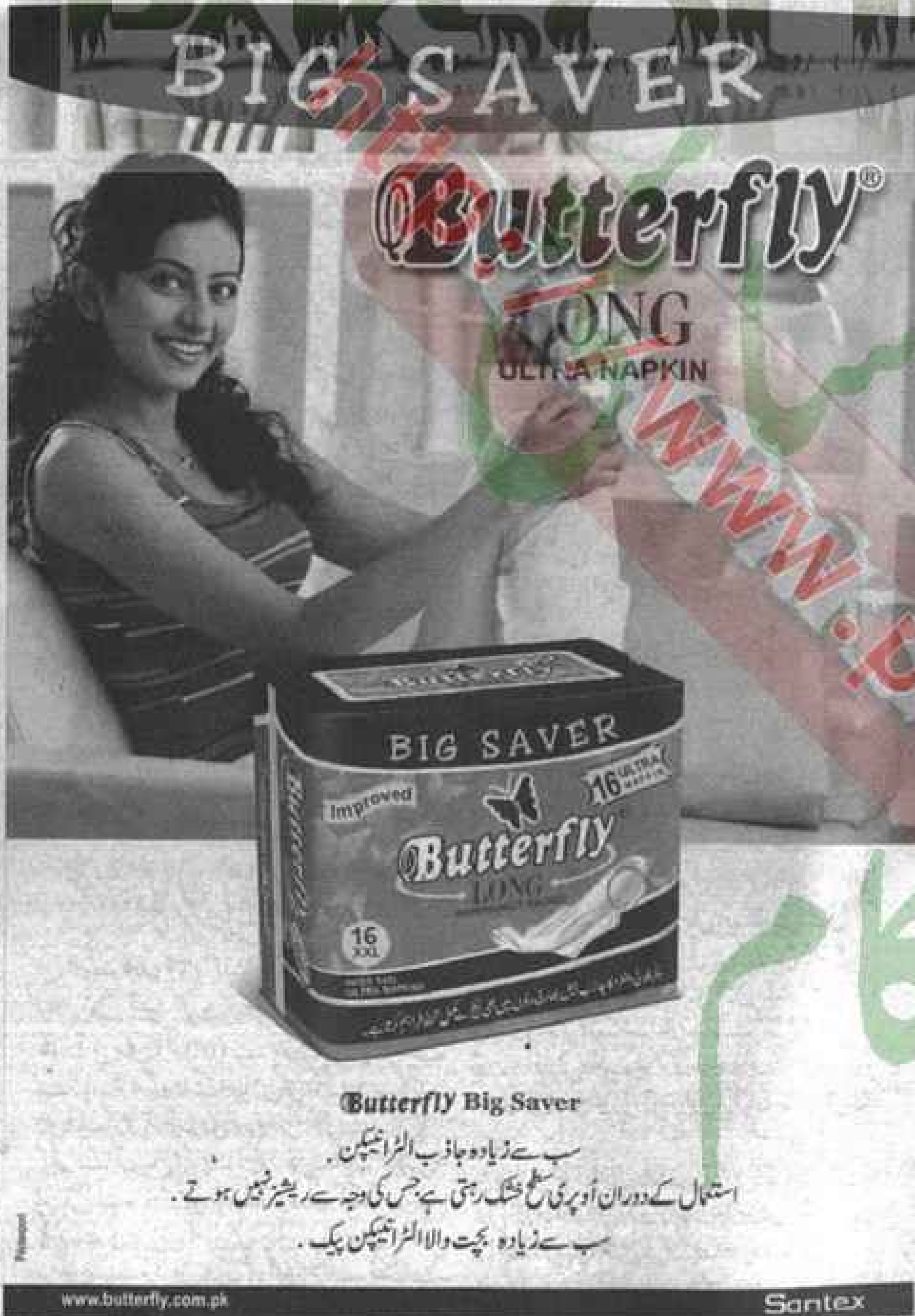
سلویٰ علی سے بڑے گلے ہیں، کچھ بھی ہوتا ارسل کو نہیں مرنا چاہیے تھا۔ یہ کیا ظلم کر دیا آپ نے سلویٰ؟ منصور کے ساتھ جو ہوا اس کی سزا ارسل کو کیوں ملی؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنفہ نے ناول پر گرفت بھی خوب رکھی ہے مگر یہ ضرور کہوں گی کہ جہاں کاشا کا ذکر آتا ہے وہیں ان کا قلم بھی خاصا کھلا ڈلا ہو جاتا ہے۔ مانا کہ کردار کا تقاضہ ہے پر مصلحت پسندی بھی کوئی شے ہوا کرتی ہے۔

راحت جبیں کا تو نام ہی دیکھ کر دل بلیوں اچھلنے لگا۔ آغاز سے اختتام تک شوخی و شرارت، سنجیدگی و بردباری اور اداسی اور اشکوں کا امتزاج لیے "گل صنوبر" بے حد پسند آیا۔ خصوصاً آخری فقرے نے تو دل لوٹ لیا۔

"جو میرا ہے اسے لوٹ کر میرے ہی پاس آنا ہے۔"

واہ واہ کیا جملہ ہے؟ اور یہ ذکی صاحب اس جیسے شخص کے لیے تو شائستہ جیسی بیوی ہی سوٹ کرتی تھی۔ یوں تو سارے کے سارے ناول و افسانے اس بار کمال رہے، پر سعدیہ عزیز بازی لے گئیں۔ شاہ میر اور دائم کی دوستی، برجستہ مکالمے اور سب سے بڑھ کر سعدیہ کے قلم سے نکلے طلسماتی الفاظ۔ دل چاہا کہ ان کے ہاتھ چوم لوں کہ جن سے انہوں نے اتنا شان دار ناولٹ لکھا۔ میں تین بار یہ ناولٹ پڑھ چکی ابھی بھی سیر نہیں ہوئی۔

"میری صبح کا ستارہ" آغاز میں تو کچھ دلچسپ لگا تھا پر



اب نہ جانے کیوں بوریت سی ہونے لگی ہے۔
فہیمہ ناز نے بھی رشتوں کے تانے بانے بنتے سادہ سے الفاظ میں خوب صورت تحریر پیش کی۔
افسانے اچھے رہے، کچھ اتنے خاص بھی نہیں کہ خصوصیت سے کچھ کہوں۔
مستقل سلسلوں میں "میسر دو جہاں کرنا" میں مذکورہ کتاب بہت پسند آئی۔ شاید آمنہ کا انداز بیاں ہی بہت اچھا رہا۔
ج: پیاری انیقہ! طویل غیر حاضری کے بعد آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ ثمینہ نے جلال سے جھوٹ کیوں بولا آگے چل کر واضح ہوگا تھوڑا انتظار کرلیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ہمیں احساس ہے کہ سلویٰ علی بٹ کی کہانی میں "سوا" کچھ ایسی سطریں شائع ہوگئیں جو نامناسب تھیں۔ آئندہ احتیاط رکھیں گے۔ تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔

یہ ای میل مسز سعدیہ ہارون کی ہے لکھا ہے

سب سے پہلے "دیوار شب" پڑھا۔ اس دفعہ کہانی نے کافی موڑ لیے۔ پچھلی قسطوں میں سست روی کی جتنی شکایات تھیں نمایہ جی نے سب کا ازالہ کر دیا۔ سلویٰ بٹ کے ناول میں ارسل کی اچانک موت نے کافی دکھی کر دیا۔ جبکہ "ستارہ شام" اس دفعہ کچھ خاص متاثر نہیں کر سکا۔ مکمل ناول میں راحت جبیں کی اچھی کوشش تھی۔ تاہم کئی جگہ جھول محسوس ہوئے۔ نعیمہ ناز کا "بھنور کا سفر" اچھا لگا۔ خاص طور پر علی کا کردار۔ باقی کہانیاں بھی بہترین تھیں۔ درخواست یہ ہے کہ رسالے میں مکمل ناول کی تعداد بڑھائیں۔ ان سے رسالے میں بہت دلچسپی رہتی ہے۔
ج: مسز سعدیہ! آپ کی فرمائش پر اس ماہ تین مکمل ناول شامل ہیں۔ مصنفین تک آپ کی تنقید و تبصرہ پہنچا رہے ہیں۔
ای میل کا شکریہ۔ معذرت خواہ ہیں کہ آپ کی پچھلی ای میل شامل نہ ہو سکیں۔

رقیہ ارشد نے وزیر آباد سے لکھا ہے

جس ناول نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا وہ راحت آپی کا "گل صنوبر" ہے۔ بلاشبہ یہ ایک بہترین ناول تھا۔ راحت آپی ماہ ناظر کی کردار کشی نہایت بہترین الفاظ میں

کرتی ہیں کہ میں خود کو تصور میں ناول کے کردار کا حصہ سمجھنے لگتی ہوں۔
"دل کے رستے" سلویٰ علی بٹ کی ایک اچھی کاوش ہے۔ ماہم کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ کم ہے۔ مگر ارسل کے ساتھ ناحق ہوا، اسے مارنا نہیں چاہیے تھا۔
آمنہ ریاض کا "ستارہ شام" مجھے بہت پسند ہے۔
آخر میں آپ سے ایک گزارش ہے کہ پلیز شعاع میں ایک دو صفحات فیشن کے متعلق شامل کر دیا کریں۔ کیونکہ الگ سے فیشن میگزین لینا ہر کسی کے لیے ممکن نہیں۔
ج: آمنہ! آپ کی تجویز نوٹ کر لی ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

آمنہ امیر گوندل اللو گوجرانوالہ سے شریک محفل ہیں

سالگرہ نمبر میں ماہر القادری کی نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہت ہی پسند آئی۔
سالگرہ نمبر میں راحت جبیں کا نام پڑھ کر باچھیں کھل گئیں۔
گل کا کردار اس کا صبر اور ناول کا آخری جملہ خراج تحسین کا حق دار ہے۔ "ستارہ شام" بہت اچھا ناول ہے۔ مجھے ثروت اور ثمینہ کا رشتہ سمجھ میں نہیں آیا۔ باقی مجھے انیبا اور "دیوار شب" کے خیام پر بڑا ترس آتا ہے۔ خیام بے چارے کا اتنا قصور نہیں لگتا جتنا اسے [illegible] زندگی ہے زندگی۔ سالار کی ڈرامائی انٹری مزہ دے گئی۔ بے چاری جویریہ پر بھی کچھ رحم کر دیں عالیہ آپی۔
"دل کے راستے" سلویٰ صاحبہ کا انداز اور ناول کا تھیم بہت اسٹرونگ اور [illegible] کیا بہت زیادہ ہی بولڈ نہیں۔ "حسن زندگی کا [illegible]" شاہ میر نے متاثر کیا۔
افسانے سب زبردست۔
اور [illegible] تو شعاع حسب معمول ہی بہت اچھا تھا۔ مگر پھر بھی آپی اس میں سالگرہ نمبر والی بات نظر نہیں آئی۔ (سوائے گل صنوبر کے)
آمنہ زریں کا "انوار سہیلی" پر تبصرہ بہت شان دار اور دلنشین تھا۔ مجھے آمنہ کا انداز بیان بہت متاثر کن لگا۔ آمنہ آپ افسانے لکھنا شروع کر دیں۔ سروے "ایک تصویر بنتی جاتی ہے" کے جوابات مزہ دے گئے۔
ج: پیاری آمنہ! ہم ہر ممکن احتیاط رکھتے ہیں۔ لیکن بھی غلطی سے کچھ چیزیں ایڈٹ ہونے سے رہ جاتی ہیں۔ سلویٰ

کے ناول میں بھی ایسا ہی ہوا اور اس کے لیے ہم اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ آئندہ مزید احتیاط کریں گے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

مسز شمیم امجد نے گجراں ہری پور سے لکھا ہے

سب سے پہلے بات ہو جائے سلسلے وار ناول "دیوار شب" کے بارے میں عالیہ بخاری کی بہترین کاوش جو چھوٹے سے چھوٹے کردار کو بھی خوب لکھتی ہیں۔ استاد فراغت بیگ سے لے کر کرشا تک ہر کردار کا حق ادا کرتی ہیں۔ دل کے رستے دشوار بہت تھے۔ ارسل جیسے اتنے اچھے اور مخلص شخص کی موت دل قبول ہی نہیں کر رہا۔ مجھے بے جا تنقید اچھی نہیں لگتی، لیکن اتنا کہوں گی مصنفہ نے اس قسط میں کاشا کے بارے میں بہت کھلا ڈلا لکھا۔ راحت جبیں کا نام پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ واہ کیا کہنے گل صنوبر کے بہت اچھا ناول تھا۔ پڑھ کے مزہ آ گیا۔ شائستہ کا انجام یہی ہونا چاہیے تھا۔ افسانوں میں مجھے حرا قریشی کا افسانہ اچھا لگا۔ اور یہ رخسانہ نگار صاحبہ لگاتار لکھتے لکھتے کہاں غائب ہو گئیں، ان کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ عید نمبر میں ثمرہ بخاری سے بھی کچھ لکھوائیں۔

ج: شمیم! ہم خود اس بات کا بے حد خیال رکھتے ہیں کہ کوئی ایسی چیز شامل نہ ہو۔ سلوی کے ناول میں کچھ سطریں غلطی سے شائع ہو گئیں۔ آئندہ مزید احتیاط کریں گے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

کنزہ مریم مغل للیانی تحصیل کوٹ مومن (للیانی) ضلع سرگودھا سے لکھتی ہیں

میرے گاؤں کا نام "للیانی" ہے۔ ضلع سرگودھا کا نواحی قصبہ تحصیل کوٹ مومن ہے۔ وجہ شہرت اس علاقے کی یہاں کا کنو (مالٹا) ہے۔ پورے پاکستان میں سب سے زیادہ کنو سرگودھا کے ایریا میں ہی ہوتے ہیں۔ گاؤں میں ایک گرلز ہائر سیکنڈری اور بوائز اسکول ہے۔ تقریباً آٹھ کے قریب پرائیویٹ اسکولز ہیں۔ ایک سرکاری اسپتال ہے۔ دو، تین چھوٹے موٹے کلینک ہیں۔ ضرورت کی ہر چیز با آسانی مل جاتی ہے۔ یہاں کی فضا پرسکون ہے۔ ٹرانسپورٹ سسٹم بھی بہتر ہے۔ ایک عدد پیٹرول پمپ ہے۔ ہر موسم کی فصل یہاں کاشت ہوتی ہے۔ 24 کے قریب مساجد ہیں اور تین عدد لڑکیوں کے مدرسے ہیں۔ للیانی کی مشہور شخصیت استاد نقل احمد ہیں۔ انہوں نے ہی للیانی کا نقشہ بنایا، لیکن اب وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔ (آمین)

للیانی کے آس پاس بہت سی کنو کی فیکٹریاں ہیں۔ یہاں سے ہی کنو کی پیکنگ ہوتی ہے اور یہ دوسرے ممالک میں ایکسپورٹ کیے جاتے ہیں۔ اب آتے ہیں شعاع کی جانب تو جی یہ تو ہر بار کا شمارہ زبردست ہوتا ہے۔

ج: کنزہ! آپ کے گاؤں کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیارے وطن کو دنیا کی ساری نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ کاش ہم اس کی قدر کرنا سیکھ سکتے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے ہمارے ملک کے ہر شہر گاؤں قصبے کو ترقی اور خوش حالی عطا کرے اور ہر آفت سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

افسانہ مل گیا ہے۔ ابھی پڑھا نہیں۔ اطمینان رکھیں قابل اشاعت ہوا تو ضرور شائع ہو گا۔

شائلہ وسیم نے نیوزی لینڈ سے ای میل کر کے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے

میں نیوزی لینڈ (آک لینڈ) سے پہلی مرتبہ آپ کے شعاع میں شرکت کر رہی ہوں۔ جب میں بیاہ کر نیوزی لینڈ آ رہی تھی تو دکھ امی، ابو سے دور ہونے کا یا اور جانے کا نہیں تھا، بلکہ شعاع سے دور ہو جانے کا تھا۔ میری امی نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ باقاعدگی سے شعاع بھجوایا کریں گی اور اب تقریباً دو سال ہو گئے ہیں، میری امی باقاعدگی سے مجھے شعاع بھجواتی ہیں اور میں شعاع کی مستقل قاری ہوں۔ کوئی بات ایسی نہیں ہے جو شعاع میں بیان نہ کی جاتی ہو۔ بہت اعلا معیار ہے شعاع کا، مگر اب قدرے افسوس ہوا یہ دیکھ کر کہ سائرہ عارف کا "میری صبح کا ستارہ" ڈائجسٹ اور ٹی وی دونوں پر ایک ساتھ چل رہا ہے۔

ج: پیاری شائلہ! سائرہ عارف نے ہمیں ایک سال پہلے یہ ناول بھجوایا تھا۔ اس وقت رخسانہ نگار عدنان کا ناولٹ چل رہا تھا۔ اس لیے شامل نہ کر سکے۔ بہرحال یہ ناول آگے چل کر ٹی وی سے مختلف ہو جائے گا۔

صبا افضل بٹ نے ربلہ خورد سے لکھا ہے

"دیوار شب" اور "ستارہ شام" اچھے جا رہے ہیں۔ "میری صبح کا ستارہ" مجھے پسند نہیں آیا۔ وہی عام سی اسٹوری ہے، کچھ نیا پن نہیں ہے اس میں۔

سعدیہ عزیز آفریدی "حسن زندگی کا" زبردست تھا۔ بہت ہی اچھا لکھا۔ سعدیہ جی نے شاہ میر کا کردار بہت ہی حساس اور خوب صورت لکھا۔ "بصور کا سفر" نفیسہ ناز کا ناولٹ بھی اچھا لگا خاص کر اینڈ۔ مکمل ناول دونوں ہی اچھے تھے۔ افسانے سب ہی اچھے لگے۔

"ایسی طرح تو ہوتا ہے" حرا قریشی کا افسانہ سب پر بازی لے گیا۔ بہت زبردست۔ حرا جی! اپنی سلسلے بھی بہت اچھے ہیں۔ اس بار تو رمضان کے حوالے سے "پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں" اور صحت کے حوالے سے مشورے سے مستفید ہوئے۔ "بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا" آمنہ زرین کا بہت اچھا رہا۔

"ناموں کے جھروکوں سے" بہت ہی اچھا اور معلوماتی سلسلہ ہے۔ "باتوں سے خوشبو آئے" میں مجھے مسرت کا انتخاب ماں کی دعا بہت پسند آیا۔ سروے میں ام ثمامہ کا پہلا جواب میرا بھی یہی ہوتا کیونکہ میں بھی اس سروے میں شامل ہونا چاہتی تھی، لیکن کچھ مصروفیت کی وجہ سے لکھ نہیں سکی۔

باقی سب کے جوابات بھی دلچسپ تھے، پڑھ کر مزہ آیا۔ بند حسن میں آمنہ محب سے سادہ اور ہلکی پھلکی سی ملاقات پسند آئی۔ اب گلوکارہ حمیرا ارشد اور احمد بٹ سے بھی ملاقات کروائیں۔ "خط آپ کے" پڑھ کر میں حیران ہو جاتی ہوں کہ قارئین بہنیں اتنا اچھا اور خوب صورت کیسے لکھ لیتی ہیں۔

ج: پیاری صبا! قارئین کے خط پڑھ کر ہمیں حیرانی کے ساتھ ساتھ خوشی بھی بہت ہوتی ہے۔ قارئین بلاشبہ بہت اچھے خط لکھتی ہیں اور جب ہم سارے خط شامل نہیں کر پاتے تو یقین کریں ہمیں دلی افسوس ہوتا ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

طاہرہ ناز اور حلیمہ ناز پشاور سے شریک محفل ہیں، لکھتی ہیں

شعاع اور خواتین کے تمام سلسلے مجھے بے حد پسند ہیں اور ان کو میں تب سے اپنے گھر میں دیکھ رہی ہوں، جب مجھے صحیح طرح پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔ اب اللہ کے کرم سے میں سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔

شعاع سے ایک گزارش کرتی ہے کہ آپ پلیز ہماری فیورٹ رائٹرز فائزہ افتخار، عمیرہ احمد، زہرہ ممتاز کا انٹرویو شائع کریں اور عید کے موقع پر چند مزاحیہ افسانے بھی شائع کریں۔

ج: طاہرہ اور حلیمہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ اتنے عرصہ سے شعاع پڑھ رہی ہیں اور ہمیں پہلی بار خط لکھا وہ بھی اتنا مختصر۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ فرمائش نوٹ کر لی ہے، جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

اقراء اعوان اور اسری اعوان کسووال سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

سب سے پہلے سلوی علی بٹ کا ناول "دل کے رستے" پڑھا۔ یہ آپ نے کیا کیا سلوی جی! ارسل کو اتنی بری موت مروا دیا۔ میرا خیال ہے قبرستان میں جانے والی بے حال لڑکی شاہم ہے۔ پلیز سلوی جی اس کے ساتھ کچھ برا مت کیجیے گا۔

"ستارہ شام" بہت اچھا جا رہا ہے۔ زین محمد پہ بہت غصہ آیا اور یہ ثمینہ نے کیا انکشاف کر دیا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔

"صبح کا ستارہ" پڑھ کر زیادہ مزہ نہیں آیا۔ اس کو اب جلدی ختم کریں کیونکہ ہر قسط میں ایک سی باتیں چل رہی ہیں۔ راحت جبیں نے بہت اچھا لکھا۔ ان کا ناول پڑھ کر بے حد مزہ آیا۔ سعدیہ عزیز کے ناولٹ نے متاثر کیا۔ نفیسہ ناز نے بھی اچھا لکھا۔ افسانوں میں "سعدیہ رئیس" کا "تحفہ" سبقت لے گیا۔

اگست کا یہ شمارہ مجموعی طور پر زبردست تھا کیونکہ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں اور شعاع کے مستقل سلسلے تو ہمیشہ سے ہی اچھے ہیں۔

پلیز آپی ناکمل غزل کا نام ضرور شائع کیا کریں اور آپ سے ایک بار ٹی وی اداکار سمیع خان کے انٹرویو کی فرمائش کی تھی جو آپ نے ابھی تک پوری نہیں کی۔

ج: اقراء اور اسری! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ "صبح کا ستارہ" کی ایک یا دو اقساط مزید ہیں۔



عالیہ بخاری

دیوانہ عشق

خیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دلدار نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے، پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار احمد سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملات فوراً سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار اس کی اتنی مدد کرتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا رویہ حیران کن ہے۔ گھبرا کر اسے کئی روز تنگ، بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بابر شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ گمشدگی کی اطلاع دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھروسا ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایماندار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل بابا کا پرتو۔ ربیعہ ہر چیز بھولے رکھتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعا گو ہیں۔

دوسرا گھرانا زبیر کا ہے جو ظاہری نمود و نمائش اور پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری محکمے میں کلرک ہونے کے باوجود وہ اوپر کی کمائی سے اچھا خاصا کما لیتے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی امارت کی دھوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت ربیعہ جبکہ حوا کی بات معاذ سے طے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر خاک ڈال دی ہے۔ جبکہ سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس مین یوسف کمال کی بیٹی زرمینہ کمال سے کر دی جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ربیعہ اس اقدام پر نہایت مطمئن ہے۔ حوا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موافق نہیں ہیں۔



زرتاج بیگم کے بیٹے کو شہر بھر میں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ بیٹے کی اصل جھوٹ بیان سے غریب عورتوں کو امداد دی جاتی ہے۔ خالہ افروز اعجاز احمد کی بھی کوئی ہیں۔ لوگوں کے گھر ان کے امداد کے سامنے کے سلسلے میں ہوتے ہیں۔ بوا نصرت 'زرتاج بیگم کی ملازمہ ہے جو عرصہ دراز سے اس کام کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ طبعاً سخت مزاج ہے۔

سلمان مرتضیٰ زوبیہ کی اطاعت سے متاثر ہو کر اس کے ہی رنگ میں آجاتا ہے۔ زوبیہ اپنی ماں سے بہت زیادہ جارح ہے اس کی خواہشات حدوں سے ہے۔ اعجاز چچا 'شاکرہ بیگم اور آپا گل سوائے سلطان کے کچھ نہیں کرتے۔ ان کی تمام ا میدیں زوبیہ کو ملنے والے بنگلے اور پیسے سے وابستہ ہیں۔

اسکول کے بچے ساجد کے معاملے پر معاذ پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے جس سے وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ سلام صاحب کی پوری فیملی شدید خوف اور پریشانی کا شکار ہوتی ہے۔ یہ بعد اس معاملے کے بعد معاذ سے اسکول کے معاملات سے علیحدگی چاہتی ہے۔ اعجاز چچا خاندان مع سوائے جویا اور زوبیہ کے اس حادثے سے خوب خط اٹھاتا ہے۔ جویا چاہتے ہوئے بھی معاذ کے لیے کچھ نہیں پاتی۔

دلدار نانی کے جو پاسکی رونق دن بدن بڑھتی جارہی ہے جس پر نگینہ آئے دن جلتی کڑھتی رہتی ہے۔ شاہ ہر موقع پر اس کی اشک شوئی کرتی ہے۔ نگینہ کی تمام امیدیں اپنی بڑی بیٹی صندل سے وابستہ ہیں۔ نگینہ زیادہ تر پڑھائی کی وجہ سے معاملات سے الگ ہی رہتی ہے۔ لیکن خیام کی یاد اس کے خیالوں کی دنیا کو آباد رکھتی ہے۔ ستارہ نانی کے یہاں سالار کی آمد و رفت اسے قدرے بے چین کرنے لگتی ہے۔

خیام کچھ عرصے بعد ہی ایک بس سروس کمپنی میں معمولی نوکری کر لیتا ہے۔ دن رات اپنوں سے دُوری اسے بھی ستاتی ہے۔ خاص کر گیتی کی جوڑی اسے ملال کی کیفیت سے دوچار رکھتی ہے۔ بدنامی کا خوف اسے کسی کے قریب نہیں ہونے دیتا۔ صرف بابو شوکت سے اس کی اچھی دعا سلام ہے کہ اچانک تمام تر احتیاط کے باوجود گھر سے لائے زیورات کی چوری ہو جاتی ہے۔ یہ زیورات اس کے مستقبل کی ضمانت تھے۔ اس کے بعد مستقبل پر ایک سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

زرتاج بیگم اپنے کلاس کی دیگر عورتوں کی طرح خود نمائی اور خودستائشی کا شکار ہیں۔ بیٹا عرصے سے باہر مقیم ہے۔ انہیں لباس کی طرح سکریٹریز بدلنے کی عادت ہے۔ عالیہ سکریٹری نبیل سے ان کا "تعلق" سب کی نظر میں ہے۔ نبیل جسے ذرا عمر دراز کی مدد سے یہ نوکری ملی ہے۔ زرتاج بیگم کی دی مراعات سے بھرپور استفادہ کر رہا ہے۔ بوا نصرت اسے کڑے تیوروں کی زد میں رکھتی ہے، جس پر وہ خاصا جز بز ہوتا ہے۔ زرتاج بیگم کے بھائی یوسف کمال، نبیل کی عیار فطرت کو پہچان کر انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہیں جسے زرتاج بیگم چٹکیوں میں اڑا دیتی ہے۔

زیورات کی چوری کے بعد سے خیام کے برے دن شروع ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی نوکری ختم ہونے سے وہ پیسے پیسے کو محتاج ہونے لگتا ہے۔ بابو شوکت کا بیٹا خیام کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کرتا ہے۔ ایسے وقت میں بابو شوکت اس کی ہمت بندھاتے ہیں۔ لیکن گھر کی یاد اسے بے چین رکھتی ہے۔ خاص طور پر گیتی کی چوڑیاں اسے یاد کی ڈور سے باندھے ہوئے ہیں۔

گھر میں جویا کے رشتے کی بات چل رہی ہے جس پر جویا، آپا گل سے بحث کرتی ہے۔ آپا گل کی لایعنی باتوں پر وہ براہ راست اپنے ماں باپ سے بات کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اسے معاذ کے ارادوں کی سچائی کا پختہ یقین ہے۔ دوسری طرف آپا گل مسلسل اپنے اثر و رسوخ سے معاذ کو ملنے والی نوکری کسی اور کو دلوا دیتے ہیں۔ معاذ اس بات کا تذکرہ اپنے والد سے کرتا ہے تو وہ اسے حادثہ کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں۔ سلمان زوبیہ کے گھر میں شفٹ ہو چکا ہے اور شاذ و نادر ہی ماں باپ کو شکل دکھاتا ہے۔ جس پر شاکرہ بیگم اور اظہار صاحب پریشان رہتے ہیں۔

جویا کا رشتہ آنا فاناً طے ہو جاتا ہے جس میں اظہار چچا، آپا گل اور شاکرہ بیگم کی کوششیں شامل ہیں۔ شاکرہ بیگم کو طلاق کی دھمکی اپنا کام دکھاتی ہے۔ وہ جویا کی تمام مزاحمت دم توڑ جاتی ہے۔ معاذ کی نوکری اور جویا کے رشتے کی خبر ایک ساتھ ملتی ہے۔ وہ غم زدہ سا ہو جاتا ہے۔ جویا کے رشتے پر طوبیٰ، چچا اظہار کے خاندان سے قطع تعلق کا اعلان کر دیتی ہیں۔ زوبیہ جویا کو آگاہ کرتی ہے کہ اگر وہ چاہے تو رشتہ ختم کروانے میں مدد کر سکتی ہے۔ زوبیہ، آپا گل اور شاکرہ بیگم کو بھی ایسا ہی ناپسند ہے۔ تاہم جویا ایسا کرنے سے منع کر دیتی ہے۔

صندل کو بانی صاحب کی نظم دنوں میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے۔ نگینہ میں اسے ماں نگینہ کے طور طریقے کھٹکنے لگے ہیں۔ وہ اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیتی ہے تو نگینہ کو دھچکا لگتا ہے۔ تاہم نیلی کی ستارہ کو اس کا علم نہیں ہونے دیتی۔

۴۳

تینتالیسویں قسط

راستہ عجیب کشمکش میں کٹا تھا۔

لیکن وہ کچھ بھی کرنے سے پہلے اتنا سوچنے کا عادی نہیں تھا۔ لوگ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں 'بے غرضی کے ساتھ کیے جانے والے ہر عمل کی کس کس طرح ہنسی اڑائی جاتی ہے۔ اس نے کبھی ایک پل کے لیے بھی رک کر نہیں سوچا تھا۔

بہت بچپن میں ابا 'حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک قول بار بار سنایا کرتے تھے کہ "نیکی کا کام کرنے میں ہمیشہ جلدی کرو۔" یہ وہی عمر تھی جب اس نے ابا کی کہی ہدایات اور ان کے طرز زندگی کی پیروی کرنا شروع کر دی تھی 'سوان کی بہت سی باتوں کے ساتھ یہ سنہری قول بھی فطرت کا حصہ بنا تھا۔ اب بھی بھی اسے لگتا تھا جیسے وہ کچھ کچھ تو ویسا ہی بنا ہے جیسا کہ ابا نے اسے بنانا چاہا۔

اپنی سابقہ ساری نااہلی اور غیر ذمہ داری کے باوجود وہ ابا کو چھوڑ کر گھر کا فیورٹ بچہ۔

اور اگر وہ سب اس کے پیچھے نہ کھڑے ہوتے تو کیا وہ یہاں تک پہنچ سکتا تھا۔

اسکول کی چھوٹی سی عمارت کے آگے گاڑی روکتے ہوئے اس نے فخر سے سامنے دیکھنا چاہا 'تو نگاہ وہیں جمی رہ گئی۔

خیام دیوار کے ساتھ بنی کیاری میں پائپ لگا کے پانی دے رہا تھا 'سو جو مسئلہ لیے وہ گھر سے نکلا تھا 'خیال کی رو کہیں سے کہیں بہکنے میں اب بھی نتیجہ خیز نہیں ثابت ہوا تھا۔

"کیا کرتا تھا اس لڑکے کا؟"

اسٹیئرنگ پر انگلیوں کو حرکت دیتے ہوئے اس نے ایک بار پھر خود سے سوال کیا۔

"کون تھا 'کہاں سے آیا تھا 'کہیں کسی واردات میں ملوث نہ ہو یا پھر آگے کچھ اور کر گزرنے کا پلان رکھتا ہو۔"

ان سے کئی سوال تھے 'جو جواب طلب تھے اور مشکل یہ تھی کہ وہ اپنے بارے میں کچھ بھی بتانے کے لیے تیار نہیں تھا 'بقول ساجد کے وہ تنہا تھا 'مصیبت زدہ تھا 'لیکن اس کی صورت 'شکل 'رکھ رکھاؤ اور تیور کچھ بھی ایسا نہیں کہتے تھے۔

صرف اس کے کپڑے پرانے تھے اور آنکھوں میں بے حد اداسی 'سو یہ ایسی بڑی افتاد بھی نہیں۔

شہر میں کتنے ہی اداس چہرے

اور کپڑے تو خیر وہ خود بھی بڑی مستقل مزاجی سے پرانے ہی پہنتا چلا آیا تھا۔

خیام نے اس کی گاڑی دیکھ لی تھی 'سو اب وہ نل بند کر کے پائپ لپیٹ رہا تھا۔

معاذ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور گاڑی سے نکلا۔

"اب جو بھی خدا کو منظور۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔

"السلام علیکم!" خیام قریب آیا تھا۔

"وعلیکم السلام 'رات کیسی گزری 'پریشانی تو نہیں ہوئی۔"

"نہیں 'اکیلے میں پریشانی کیسی 'بہت دن بعد میں سکون سے سو سکا ہوں۔" وہ ہلکے سے مسکرایا۔

معاذ سے جواباً مسکرایا نہیں گیا تھا۔

ساجد کی بات اتنی غلط بھی نہیں تھی۔

"نوجوانی کے اس دور میں اتنی تنہائی پسندی۔" اس نے بہت غور سے خیام کے چہرے کو دیکھا تو وہ تھوڑا سا کنفیوژ ہوا۔

"آپ کی گاڑی صاف کر دوں۔" اس نے معاذ کی خود پر جمی نگاہ سے بچنے کے لیے ہی ایسا کیا تھا 'مگر معاذ نے

فوراً ہی منع کر دیا۔

"نہیں شکریہ، تم نے صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں ہوگا۔ پہلے جا کر کچھ کھا لو، یہاں اس طرف سڑک پر ایک چھوٹا سا ہوٹل ہے۔" اپنی جیب سے والٹ نکال کر معاذ اس کے لیے پیسے نکالنے لگا تھا کہ وہ فوراً ہی بول پڑا۔

"میں نے کھانا کھا لیا تھا معاذ بھائی! یہاں تالا لگا کر چلا گیا تھا ادھر سامنے ہوٹل پر۔"

"اچھا کیا۔" معاذ کو اطمینان ہوا۔ "لیکن یہ پیسے تم رکھو اپنے پاس۔" ہاتھ میں تھامے پیسے وہ اس کی طرف بڑھانے لگا تھا، لیکن خیام نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچا تھا۔

"پیسے میرے پاس ہیں ابھی۔"

"لیکن جب تک تم یہاں ہو ہمارے مہمان ہو نا۔" معاذ کا اصرار بڑھنے لگا۔

"فی الحال تو میں آپ کا مہمان بھی نہیں ہوں معاذ بھائی! زبردستی کا سودا کیے، میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ آپ مجھے رکھیں گے بھی یا نہیں اپنے پاس، ایسے میں آپ سے کیسے کچھ لے سکتا ہوں۔" معاذ نے کچھ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

یہ لب و لہجہ، کسی تہذیب یافتہ گھرانے کی تربیت کی دین تھا۔ رات وہ ہوں ہاں سے زیادہ بات نہیں کر پا رہا تھا، تھکا ہوا تھا اور ذہنی حالت بھی اچھی نہیں تھی مگر اب گفتگو پر آمادہ محسوس ہو رہا تھا۔

"اندر آؤ!" وہ اس سے کہتے ہوئے چھوٹا سا ادھ کھلا گیٹ دھکیل کر اندر داخل ہوا تو صحن میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک گیا۔

صحن، برآمدہ سب دھلا دھلایا شفاف، ترتیب سے لگی کرسیاں اور میزیں اور دیوار کے ساتھ قطاریں رکھے گملوں میں موسمی پھولوں کے تر و تازہ رنگ۔ روزانہ پھیلی ہوئی ابتری کا نام و نشان نہیں۔

لگتا تھا کہ صبح سے اب تک وہ ایک منٹ کے لیے بھی فارغ نہیں بیٹھا تھا، معاذ کو فطری طور پر سب بہت اچھا لگا۔

"تم نے تو زبردست کام کیا خیام! اچھا ہے آج کل یہ سب کرنا ہمارے لیے بڑا مشکل ہو رہا ہے، بچے بڑھ رہے ہیں، ان کی کتابوں، کاپیوں کا انتظام رکھنا مشکل ہونے لگتا ہے۔ کبھی کبھی ہم کسی ملازم کو افورڈ نہیں کر سکتے، اس لیے ہم دوست کوشش کر کے سب کچھ خود ہی کرتے ہیں، مگر ایسا تو بالکل بھی نہیں ہو پاتا جیسے تم نے کیا ہے۔"

وہ کہتے ہوئے اندر برآمدے میں آیا، خیام ساتھ تھا۔

"بہت شکریہ کہ تم نے خیال کیا۔" معاذ نے شکر گزار لہجے میں اس سے کہا تو وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

"فارغ ہی تو بیٹھا تھا معاذ بھائی! اور ایسا میں نے کیا بھی کیا ہے، آپ کی مہربانی ہے، جو آپ نے مجھے یہاں ایک رات سر چھپانے کی جگہ دی۔"

"بیٹھو!" معاذ نے ایک کرسی کھینچتے ہوئے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ کچھ جھجکتے ہوئے اس کے قریب بیٹھا۔

ابھی پڑھنے کے لیے آنے والے بچوں اور اس کے ساتھیوں کے آنے میں تھوڑا وقت تھا۔

معاذ نے گھڑی دیکھ کر وقت کا اندازہ لگایا تھا۔

"سنو خیام! اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے کسی کام آسکوں تو پلیز! اپنے بارے میں مجھے سچ سچ بتا دو، اتنا اعتبار تو تمہیں مجھ پر کرنا ہی پڑے گا۔"

بنا کسی تمہید کے معاذ اصل بات پر آیا تھا۔

"میں نے آپ سے رات ہی کہا تھا کہ میرے پاس اپنے بارے میں بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے، میں اس

دنیا میں تنہا ہوں بالکل۔" خیام کی نگاہ فرش پر جمی تھی اور وہ اپنا وہی رات کا رٹا رٹایا بیان دہرا رہا تھا۔

معاذ نے ایک بار پھر پورے تحمل سے اس کی بات سنی۔

"اس کا مطلب ہے تم مجھ پر اعتبار نہیں کرنا چاہتے ہو، ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟"

"یہ بات نہیں ہے معاذ بھائی! لیکن میری سچائی یہی ہے۔" وہ اب بھی اپنی بات پر مصر تھا۔

"انسان درختوں پر نہیں اگتے خیام! ہم میں سے ہر ایک کا کوئی نہ کوئی حوالہ ہے، چاہے وہ خاندان ہو یا یتیم خانہ، پلنے بڑھنے کے لیے کوئی ٹھکانا تو اللہ بنا ہی دیتا ہے۔"

"ہر ایک اتنا خوش قسمت نہیں ہوتا خیام بھائی! اگر اس کے پاس یتیم خانے کا ہی حوالہ ہو۔ مگر آپ نہیں سمجھیں گے، کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔"

اس بار اس نے بات کرتے ہوئے نگاہ اٹھا کر معاذ کی طرف دیکھا تھا، اس کی آنکھوں کا سنہرا پن دھندلا رہا تھا اور چہرے پر بے بسی اتر رہی تھی۔

معاذ کی نگاہ ایک پل کے لیے بھی خیام کے چہرے سے نہیں ہٹی تھی۔

"کچھ تو تھا جو اس لڑکے کے لیے اتنا تکلیف دہ ہے کہ وہ اس تک نہیں پہنچ پا رہا۔ یا پھر اسے جاننے کی کوشش بھی نہیں کرنا چاہیے۔"

اپنی فطری نرم دلی کے ہاتھوں وہ ساری احتیاط پسندی ایک طرف رکھنے پر مجبور ہو رہا تھا۔

"آپ پریشان مت ہوں۔ میں چلا جاتا ہوں، ساجد تھوڑی دیر میں میرا بیگ دینے یہاں آئے گا، میں باہر بیٹھ کر تھوڑی دیر انتظار کر لوں اگر آپ اجازت دیں۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔

اگلے بہت سے پریشان کن امکانات اس کے چلے جانے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے تھے، معاذ نے شدت سے زری کے ساتھ کی گئی ہمدردی کے ثمرات کو یاد کرنا چاہا۔

ایک بار پھر یوں ہی اندھا دھند کی گئی غلطی۔

محض چند منٹ خاموش رہنے ہی کی تو بات تھی، محض چند قدم اور وہ اس دروازے سے باہر چلا جاتا اور قصہ ختم۔

"اس اتنے بڑے شہر میں آخر تو ہر ایک ہی کھپ جاتا ہے، کون سا وہی ہر ایک کا ٹھیکیدار ہے۔"

معاذ نے خود کو سمجھانے کی ایک آخری بھرپور کوشش کرنا چاہی۔ مگر۔

"خیام!" معاذ نے بے تابی سے اسے پکارا۔

اسے لگا تھا جیسے وہ چلا گیا تو شاید وہ خود کو ساری عمر بھی معاف نہیں کر سکے گا۔

خیام کو توقع نہیں تھی کہ وہ روکا جائے گا، سو حیرت زدہ تھا۔

معاذ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"پتا نہیں کیوں، لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں تمہیں جانے نہ دوں یہاں سے اور میں نے ہمیشہ اپنے دل کی ہی مانی ہے۔" وہ ذرا رک کر مسکرایا۔ "تم رہ سکتے ہو یہاں، جب تک تمہارا دل چاہے۔" معاذ نے ہلکے سے خیام کا کندھا تھپکا۔ "امید ہے کہ تم میرے بھروسے کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گے، تم نے نہ سہی، لیکن میں تم پر اعتبار کر رہا ہوں خیام۔"

اس بار خیام کا سر احترام سے جھکا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح بے حد روشن اور اجلی تھی۔

آسمان پر ابھی بھی گہرا سرمئی غبار جھکا پڑتا تھا‘ مگر اس بڑے سے خوب صورت گھر میں جو روشنی اتری تھی‘ آنکھوں کو چکا چوند کرتی تھی۔

گیتی کے دل نے پل پل شکرانہ ادا کیا تھا۔

سالار کا پروگرام تھا کہ وہ اسے لے کر دوپہر تک نانی ستارہ کے ہاں جائے گا‘ لیکن صندل کچھ زیادہ ہی جلد باز ثابت ہوئی۔

بالی صاحب کو ساتھ لیے صبح ہی آموجود ہوئی۔

سالار سے زیادہ گیتی اس کی آمد پر حیران تھی۔ جب وہ اسٹار نہیں بنی تھی تب بھی اس کی صبح ایک بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی اور اب تو خیر سے اس کے نخرے ہی الگ تھے۔

"مجال ہے‘ جو رات ایک پل کے لیے بھی مجھے نیند آئی ہو‘ بس یہ ہی دل ہو رہا تھا کہ صبح ہو اور تم سے جا کر مل لوں۔ بڑی مشکل سے وقت کٹا ہے۔"

اور اب وہ آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ ہال کے ایک گوشے میں بیٹھی گیتی کو اپنی بے چینی کا حال سنا رہی تھی۔

پچھلے کافی عرصے سے دونوں کے مابین کوئی ایسا خاص ربط ضبط نہیں رہ گیا تھا‘ پھر بھی گیتی اس کی محبت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔

"کون کہتا ہے کہ صندل میں اسٹار بننے کے بعد بڑی لاتعلقی آگئی ہے‘ اس کے لیے تو وہ آج ہمیشہ سے زیادہ فکر مند ہے۔"

"رشتے یوں جھٹ پٹ کب طے ہوتے ہیں‘ تمہاری جلد بازی نے کچھ بھی لکھوانے منوانے کا موقع نہیں دیا‘ ہم سے زیادہ تو وہ ملک ہی فائدے میں رہا جو اتنی بھاری رقم کا چیک سالار سے لے کر رخصت ہو گیا‘ وہی اصل وقت تھا جب تمہیں بھی کچھ شرائط رکھوانی چاہیے تھیں‘ مجھے تو اسی پر حیرت ہو رہی تھی‘ اتنی spoken out (منہ پھٹ) اتنی زمانہ ساز ہونے کے باوجود بھی انہوں نے ایک لفظ بھی تو منہ سے نہیں نکالا‘ ورنہ ساری تو پیسے پیسے پر جھگڑتی چلی آئی ہیں۔"

اس کے ایک ایک لفظ سے تشویش جھلک رہی تھی‘ لیکن جب وہ ذرا سانس لینے کو رکی تو گیتی بڑی ملائمت سے مسکرائی تھی۔

"تم میری بالکل فکر مت کرو صندل! میں بہت خوش ہوں۔ سالار بہت اچھے ہیں اور مجھے ان کے ساتھ کے علاوہ کچھ اور درکار بھی نہیں ہے۔"

"پھر وہی فضول کتابی باتیں‘ تم سدا بے وقوف ہی رہیں گیتی! اور اب بھی عقل پکڑنے کو تیار نہیں ہو۔" صندل نے بے اختیار ہی ماتھے کو چھوا۔ "شروع کے چار دن سب ہی اچھے ہوتے ہیں‘ وہ ملک‘ سالار سے بھی زیادہ اچھا ثابت ہوتا‘ پانی کی طرح پیسہ بہاتا تم پر‘ اصل میں تم نے نخرے اٹھانے والے دیکھے ہی نہیں ہیں اور یہ ملک تو سنا ہے کہ اتنا شوقین مزاج ہے کہ۔۔۔"

گیتی کو لگا جیسے اسے ابکائی سی آرہی ہے۔

صندل نے اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھ کر ہی بات ادھوری چھوڑی۔

"اب یہ مت کہنا کہ تمہیں سالار سے محبت ہو چکی ہے‘ کوئی بھی جو تمہیں دیکھے گا اور پھر اسے اس بات پر بھی یقین نہیں کر سکتا‘ ایسے ہی جیسے میں کہوں کہ مجھے بالی سے محبت ہے تو یہ سب سے بڑا جھوٹ ہو گا۔" اس کا لہجہ پر یقین تھا۔

کامیابی نے اسے خود ہی اندازہ کرنے اور پھر ان پر سو فیصد یقین کر لینے کی اضافی کوالٹی بخشی تھی‘ سو گیتی نے

اس کے خیال کی تردید یا تصدیق کی ضرورت ہی نہیں تھی‘ مگر سالار پر کیا گیا تبصرہ اسے بے حد برا لگا ضرور تھا۔

ڈرائنگ روم کے دوسرے گوشے میں سالار‘ بالی صاحب کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا۔

"اور معلوم نہیں وہ اس سے کس قسم کی باتیں کر رہے ہوں گے۔"

اس نے ذرا فکر مند ہو کر اس طرف دیکھا‘ تب ہی سالار نے بھی اچانک ہی اس طرف دیکھا اور دھیرے سے مسکرا دیا۔

گیتی نے شرما کر نگاہ چرائی۔

بنا ایک لفظ بھی کہے وہ اس کے دل کی سب سے بڑی تسلی تھا اور پچھلی رات سے اب تک خود کو محفوظ و مامون پانے کا جو سکون بخش احساس اس نے حاصل کیا تھا‘ وہ انمول تھا۔

ملازم لوازمات سے بھری ٹرالیاں لیے سرو کر رہے تھے‘ یہاں اتنا کچھ انتظام بغیر کسی عورت کی نگرانی کے ہوتا خوش گوار سی حیرت میں مبتلا کر رہا تھا‘ گیتی کا خیال تھا کہ شاید یہ سلسلہ سامنے نظر آتے ڈائننگ ایریا میں چلے گا۔

لیکن سالار‘ بالی صاحب سے معذرت کر کے دو منٹ کے لیے اس طرف آیا تھا۔

"تم اور صندل یہیں اطمینان سے چائے پیو‘ میں اور بالی صاحب وہیں ٹھیک ہیں‘ صندل بہت مصروف رہتی ہے‘ پھر شاید کبھی اسے تم سے ملنے کا موقع بھی نہ ملے۔"

یقیناً ساری زندگی وہ اسی طرح چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی اس کی خوشی و سکون کا خیال کرنے والا تھا۔

گیتی کی محبت بھری نگاہ‘ سالار کے چہرے پر جا کر جمی تھی‘ آنکھوں میں وہی مہربان‘ نرم سا احساس‘ جو اسے کچھ نہ کچھ بتاتا تھا۔

بھلا کون تھا اس جیسا‘ کوئی بھی تو نہیں۔

"ابھی بھی بڑی مشکل سے وقت نکالا ہے‘ ورنہ اگلے چار ماہ تو سر اٹھانے کی فرصت نہیں ہے‘ ابھی چار دن یہاں کا کام ہے اور آگے پھر پچیس دن کا ماریشس کا شیڈول ہے‘ پھر اس کے بعد۔۔۔"

صندل کے ہاتھ من پسند موضوع آیا‘ سو وہ چند لمحوں کے لیے وہ سب کچھ بھول‘ سالار نے پوری توجہ سے اس کا صندل نامہ سنا اور پھر واپس بالی صاحب کے پاس جا بیٹھا۔

"اس اتنے بڑے گھر میں اور کون رہتا ہے۔" صندل کی نگاہ بار بار اطراف میں الجھ رہی تھی۔

یہ گھر اس کے اندازے سے زیادہ بڑا اور شان دار تھا۔ قدیم طرز کا انداز آرائش جو بڑا ہی منفرد اور قیمتی سا احساس دیتا تھا۔

"سالار بتا رہے تھے کہ یہاں صرف ملازم ہی ہیں۔" چہرے پر آئی لٹ کو کان سے پیچھے کرتے ہوئے وہ سادگی سے بتانے لگی تھی‘ تب ہی صندل کے چہرے پر بڑی طنزیہ مسکراہٹ اتری۔

"اس نے کہا اور تم نے مان لیا‘ ایک بار بھی یہ نہ سوچا کہ اگر وہ ایسا ہی امیر رئیس شخص ہے تو پھر اتنے سالوں سے وہاں ایک کمرے کا گھر لے کر کیسے رہتا تھا‘ چھوٹی سی لوکل ریڈیو کی نوکری کیوں کرتا تھا‘ سخت پر اسرار آدمی ہے یہ‘ کہیں سے اچانک پیسہ ہاتھ لگا ہے‘ پتا نہیں کس ذریعے سے۔"

"سالار شریف آدمی ہیں‘ یہ مجھے پتا ہے۔" وہ اب تک خاصا برا مان چکی تھی۔

"تم نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے گیتی! یہ ہی دو چار لوگ‘ برا مت ماننا‘ مگر تمہاری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بالکل واجبی سی ہے‘ تمہاری زندگی میں صرف دو شخص آئے‘ پہلا خیام اور دوسرا یہ۔"

اس نے ہاتھ سے ہلکا سا اشارہ سالار کی طرف کیا۔ "اور تم دونوں پر ہی باری باری فدا ہو چکی ہو‘ بے وقوفی کی بھی حد ہوتی ہے۔"

گیتی کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔

اسے سالار کا ذکر چھیڑنا تھا یا خیام کا؟

"میرا خیال ہے کہ ہم کوئی اور بات کریں صندل۔"

"نہیں۔ میں اب چلوں گی' کچھ دیر بعد میری فلائٹ ہے اسلام آباد کی' پھر پتا نہیں تم سے کب ملاقات ہو' یہ ہی چند باتیں تھیں' جو تم سے کرنا ضروری تھیں' ابھی شروع کے دن ہیں' ذرا عقل سے کام لو' جو کچھ اپنے نام کرا سکتی ہو کروالو' اگر سالار سچا ہے تو تمہاری بات ماننے میں دیر نہیں لگائے گا اور اگر یہ سب صرف دکھاوا ہی ہے تو اس کی اصلیت کھلنے میں بھی دیر نہیں لگے گی' ایسی صورت میں جلد ہی علیحدہ کی۔"

ہاتھ میں پکڑا ہوا چائے کا کپ' اس نے بے ساختہ ہی اس طرح میز پر رکھا کہ چھناکے کی آواز سارے میں گونجتی چلی گئی۔

سالار اور بالی صاحب دونوں ہی نے مڑ کر اس طرف دیکھا تھا۔

"کچھ نہیں' بس ایسے ہی۔" صندل نے کھڑے ہوتے ہوئے ان کی تسلی کروائی اور پھر تیز قدم اٹھاتے ہوئے ان دونوں کی طرف چلی گئی۔

گیتی کو چند لمحے خود کو سنبھالنے میں لگ گئے۔

"میرا خیال ہے' ابھی ہم تھوڑی دیر اور بیٹھ سکتے تھے۔" بالی صاحب نے صندل کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

انہیں سالار پسند آیا تھا اور اس کے بیک گراؤنڈ اور رکھ رکھاؤ سے جھلکتا ہوا پیسہ اس سے بھی زیادہ۔ اور ابھی ابھی وہ اس سے فلم پروڈیوس کرنے کے بزنس کے بارے میں ابتدائی بات چیت شروع کر چکے تھے۔ مگر صندل اب رکنے کے موڈ میں نہیں تھی' اسے کچھ شاپنگ کرنی تھی اور شاید تھوڑی بہت پیکنگ بھی۔

گیتی نے صاف محسوس کیا تھا کہ اب بالی جیسا دبنگ شخص صندل کے سامنے دبنے لگا تھا۔

وہ چاروں ایک ساتھ چلتے ہوئے باہر تک آئے تھے اور اس تھوڑے سے وقفے میں سالار نے کتنی ہی بار گیتی کے چہرے کو دیکھا تھا۔

صبح سے چھائی شرمیلی مسکراہٹ کی جگہ سنجیدگی نے لے لی تھی یا شاید پریشانی۔

وہ اندر ہی اندر بے چین ہوا تھا۔

صندل نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ایک گہری نگاہ سامنے پوری شان و شوکت سے کھڑے اس [illegible] جس میں اس کی کوٹھی جیسی چار کوٹھیاں سما سکتی تھیں۔

"اور اگر کہیں یہ سب واقعی گیتی کی قسمت میں لکھا گیا ہے تو؟"

اندر سے ایک کمزور سی آواز ابھری' جسے اس نے فوراً ہی رد کیا۔ "نا ممکن۔"

بالی صاحب اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑے تھے۔ گیتی اور سالار نے ایک ساتھ کھڑے ہو کر دور جاتی اس گاڑی کو دیکھا اور پھر واپس اندر آنے کے لیے مڑ گئے۔

"کیا ہوا' جو تم اتنی پریشان ہو گئی ہو؟" بنا کسی تمہید کے سالار نے اندر آتے ہوئے اس سے پہلی بات یہ ہی کی تھی۔

"صندل نے کچھ کہا یا پھر دن کے اجالے میں [illegible] دیکھ کر تمہیں اپنے فیصلے پر افسوس ہو رہا ہے۔" گو اس نے بڑے لائٹ سے موڈ میں کہا تھا' مگر پھر بھی گیتی کے دل کو دھکا لگا تھا' آج شاید سب نے ہی اسے تکلیف دینے کی ٹھان لی تھی' اندر آتے آتے اس [illegible] سے اپنی آنکھوں کو رگڑا۔

سالار کو اصل بات بھول کر پہلے اپنے [illegible] کی معذرت کرنی پڑی۔

"مذاق کر رہا تھا' اتنا بھی نہیں سمجھتیں' بے وقوف ہو بالکل۔"

"یہ مذاق نہیں ہے۔" وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی تھی۔ "رات بھی آپ نے ایسا کچھ کہا تھا' مجھے تب بھی بہت برا لگا تھا۔ اتنا گرا ہوا سمجھ لیا ہے کیا مجھے' یا پھر خود آپ کے اندر ہی کوئی پچھتاوا۔"

سالار نے اپنا ہاتھ اس کے لبوں پر رکھا تھا۔

"ایک لفظ اور نہیں۔" اس کی آواز اتنی دھیمی تھی جیسے سرگوشی ہو۔

"اور جن حالات میں ہماری شادی ہوئی ہے' اس میں مجھے یا تمہیں خود کو ثابت کرنے کے لیے ایک لفظ کی بھی ضرورت نہیں ہے' گیتی! اللہ نے ہم پر بڑا کرم کیا کہ کسی ناقابل تلافی نقصان سے پہلے ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا' میں ساری عمر بھی شکر ادا کروں تو کم ہے۔"

"میں بھی۔"

سالار نے محبت سے اس کے دونوں ہاتھوں کو تھاما۔ "ہمیں خود کو واہموں' وسوسوں سے بچانا ہے گیتی! اگر ہم ایسا نہ کر پائے تو وہ کچھ ہو سکتا ہے' جس کا اس وقت گمان کرنا ناممکن ہے۔"

"اس بات کو یاد رکھنے کی ضرورت آپ کو ہے' مجھے نہیں۔" اس کے لہجے میں بڑا بے نیازی بھرا یقین تھا۔

چند لمحوں کے لیے سالار بالکل خاموش سا اس کے چہرے کو تکتے گیا۔

"اتنا یقین ہے خود پر؟"

"خود پر نہیں' اپنے رب پر۔ اسی نے میرا ہاتھ تھاما' جب میں منہ کے بل گری تھی۔"

دھیمے انداز میں کہتے ہوئے وہ بیڈ پر آ کر بیٹھی تھی۔ سالار نے دیکھا۔ گیتی کے چہرے پر بڑی تمکنت' بڑا وقار تھا۔

اور اب یہ پوچھنا کہ وہ صندل کی کس بات پر ہرٹ ہوئی تھی' محض اپنی شرمندگی بڑھانے والی بات تھی۔ کان کی لو کو چھوتے ہوئے سالار کے چہرے پر ایک جھینپی سی مسکراہٹ ابھری تھی۔

"اچھا چلو' تمہیں نگینہ آنٹی سے ملوا لاؤں' انتظار کر رہی ہوں گی تمہارا' واپسی میں کچھ شاپنگ وغیرہ کر لیتا یا پھر وہیں کراچی میں کرو گی؟"

سوال' جواب' مشورہ سب ہی کچھ حاضر تھا۔

گیتی نے مڑ کر سالار کی طرف دیکھا۔

"سچ بتائیے کیا آپ اب بھی وہاں جانا چاہتے ہیں یا صرف میری وجہ سے چلنے کا کہہ رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔

"میرا گھر کسی نیک نام محلے میں نہیں ہے' آپ نے بے شک کبھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا' مگر جو حقیقت ہے سو ہے۔" گیتی کی آواز بتدریج دھیمی پڑی "اور میں نہیں چاہتی کہ آپ محض اپنی شرافت اور نیک دلی کی وجہ سے اس شرمندگی میں مبتلا ہوتے رہیں' جس میں آپ کو نہیں ہونا چاہیے۔"

سالار نے ایک گہری سانس لی اور اس کے بالکل قریب آ کر کھڑا ہوا۔

"میرے لیے وہ جگہ کبھی شرمندگی کا باعث نہیں بنی گیتی! میں وہاں ہمیشہ پوری محبت اور پورے خلوص کے ساتھ گیا ہوں' اس وقت بھی جب میرے پاس اپنی تمام تر آرزو کے باوجود تمہیں پانے کی ایک فیصد بھی امید نہیں تھی اور اب تو میں اس گھر کا ساری زندگی کے لیے مقروض ہوں' میں نے تمہیں وہیں پایا ہے' میرے لیے بہت مبارک ہے وہ گھر۔"

اس کے دل کی سچائی' الفاظ اور لہجے کو سحر عطا کرتی تھی' گیتی سے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھنا بھی محال ہوا۔

"اور گیتی! ایک بات یاد رکھنا‘ جگہ کوئی بری نہیں ہوتی‘ ہمارا نظریہ‘ ہمارے حالات‘ ہماری مجبوریاں اچھے برے کے خانوں میں ہمیں بانٹتی ہیں‘ ہمارا المیہ ہے کہ ہم کسی کی طرف ایک انگلی اٹھاتے ہوئے ان تین انگلیوں کو بھول جاتے ہیں‘ جو خود ہماری طرف اشارہ کرتی ہیں۔"

ٹپ ٹپ ٹپ

گیتی کی آنکھوں سے کتنے ہی آنسو گرے اور چہرے کو گیلا کرتے چلے گئے۔

سالار نے نرمی سے اسے اپنے کندھوں سے لگایا "اور ابھی ابھی تم نے کیا کہا تھا۔ واہموں‘ وسوسوں سے بچنے کی مجھے ضرورت ہے‘ تمہیں نہیں۔ اتنی جلدی بھول گئیں؟"

"میں واہموں میں مبتلا نہیں ہوں سالار! میں نے اپنا سب سے بڑا کمپلیکس دور کرنا چاہا‘ جو آپ نے کر دیا‘ اب میرے دل پر کوئی بوجھ نہیں۔" آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے پورے یقین سے سالار کو دیکھا اور ہلکے سے مسکرا دی۔

"میں تیار ہو جاتی ہوں۔" وہ مڑ کر ملحقہ ڈریسنگ روم میں جا چکی تھی۔

"کاش وہ بھی ایسا ہی کر سکتا۔" سالار نے سامنے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ "مگر شاید گیتی زیادہ بہادر ہے۔" وہ بے بسی سے مسکرایا۔

☼ ☼ ☼

اندر کمرے میں نہ جانے کیسی چیخ پکار مچی تھی۔

جویا ذرا بھی دھیان دیے بغیر اپنے ساتھ ٹیوشن سینٹر سے لائی کاپیاں چیک کیے گئی‘ تھوڑی دیر پہلے اس نے رات کے کھانے اور چائے سے فراغت پائی تھی‘ سو اب رات گئے تک بیٹھ کر کاپیوں کا یہ ڈھیر بھی نمٹایا جا سکتا تھا۔

ایک کے بعد ایک۔

اس کے قریب ہی چیک ہوئی کاپیوں کا ڈھیر بڑھنے لگا تھا۔ تب ہی اندر کوئی بہت زور سے چیخا۔

جویا کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکا۔

"الو کا پٹھا‘ بے غیرت‘ کمینہ۔"

ابرار صاحب کی آواز باہر تک آرہی تھی اور یہ سارے القاب وہ کس کو دے رہے تھے‘ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی‘ ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے جویا پھر سے کام میں محو ہونے لگی تھی‘ تب ہی زویا نے کمرے سے باہر جھانک کر دیکھا۔

"کیا تماشا ہو رہا ہے وہاں۔" وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

جویا نے جواباً "صرف اشارے سے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ زویا چلتی ہوئی باہر آگئی۔

"آپ کو تو صرف میری بے عزتی کرنا آتی ہے‘ آپ کا بیٹا‘ تو میرا جرم بن کر رہ گیا ہے‘ ارے میں نے کوئی ٹھیکہ لے رکھا ہے آپ کی پریشانیاں دور کرنے کا‘ جب دیکھو ایک ہی رٹ ہے۔" اندر سے اب سلمان کی آواز آرہی تھی‘ زویا نے بے اختیار ہی ماتھے کو چھوا۔

"ہر وقت کی کٹ کٹ‘ یہ نہیں اور کیا‘ تنگ آ گئے یہ نحوست۔" جویا کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ کمرے کے ادھ کھلے دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔

وہاں اب ابرار صاحب کی باری تھی۔

وہی گھسے پٹے سے طعنے جن کو اب سننے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔

"آخر کیا میری پریشانیاں دور کرے گا‘ تو تو خود میری روشنیاں توڑنے آیا ہے۔ اس نوویدیہ سے جوتے کھا کر جان چھڑالی اس نے اپنی تجھ سے‘ عقل مند تھی‘ سمجھ گئی کہ زندگی بھر کا بوجھ ہے‘ ورنہ سیکڑوں لوگ نوکری کر رہے تھے اس کے باپ کے پاس‘ مگر تجھ نالائق کو وہ بھی نہیں‘ نہیں کھپائے‘ دیکھ لینا کسی بھی دن آ کر رہے گا اس کے نام خلع کا نوٹس۔"

ابرار صاحب کمرے کے بیچ میں کھڑے تھے اور سامنے صوفے پر ہاتھ پاؤں پھیلائے بیٹھا سلمان اور دونوں میں سے کوئی بھی خاموش ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔

زویا چند لمحے یوں ہی چپ چاپ انہیں دیکھے گئی۔

بدزبانی اور بدکلامی میں یہ گھر شاید حرف آخر تھا‘ اس نے باپ اور بھائی کے بگڑے ہوئے چہرے دیکھے اور دونوں کے درمیان شٹل کاک کی مانند [illegible] شاکرہ امی۔

عجیب بات تھی کہ اسے ان تینوں میں سے کسی پر بھی رحم نہیں آیا۔

"میرا ٹیسٹ ہے کل‘ آپ لوگ اتنا شور مت۔" اس کی آواز ان تینوں کی آوازوں کے بیچ میں کھو گئی۔

"کل میرا ٹیسٹ ہے ابو! سلمان بھائی پلیز۔" اس بار وہ کوشش کر کے زور سے بولی تھی‘ پھر بھی اس کی آواز صدا بصحرا قرار پائی۔

وہ تینوں لڑنے میں اتنے مصروف تھے کہ ان میں سے کسی نے اس کی موجودگی کو نوٹ بھی نہیں کیا تھا۔

زویا نے بڑی بے بسی سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"زویا‘ زویا۔" صحن میں سے جویا اسے پکار رہی تھی‘ زویا نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"آجاؤ‘ کوئی فائدہ نہیں۔"

زویا نے کچھ کہنا چاہا‘ مگر اس بار وہ خود ناکام رہی‘ بہت سا نمکین پانی حلق میں اچانک ہی اٹکنے لگا تھا۔

وہ اس طرح جذباتی نہیں ہوتی تھی اور جویا کی نسبت خود کو ہر وقت حساسیت کی زد پر بھی نہیں رکھتی تھی مگر اس وقت دونوں ہاتھوں سے آنسو صاف کرتی پیچھے ہٹی تھی۔

"زویا‘ زویا!"

جویا نے اسے پکارا بھی‘ لیکن وہ تیزی سے اس کے پاس سے گزرتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

جویا نے بڑی افسردگی سے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ زویا کا یہ غیر متوقع رویہ‘ خود اس کا حوصلہ ختم کرنے لگا تھا۔ ہاتھ سے پین ایک طرف رکھ کر وہ زویا کے پاس جانے کے لیے اٹھنے لگی تھی‘ تب ہی کچھ گرنے کی زوردار آواز رات کے سناٹے میں گونجتی چلی گئی۔

ابرار صاحب نے کوئی بھاری چیز اٹھا کر ماری تھی سلمان کو۔

"بدبخت‘ شرم آتی ہے تجھے اپنی اولاد کہتے ہوئے بھی‘ نکل جا ابھی اسی وقت میرے گھر سے‘ ایک پل اب نہیں ٹکنے دوں گا یہاں‘ چلا جا‘ ورنہ دھکے دے کر میں خود نکال دوں گا تجھے۔" ان کی آواز پہلے سے زیادہ بلند تھی۔ اور ساتھ ہی سلمان کا واویلا اور شاکرہ امی کی چیخیں۔

جویا نے اپنے ہاتھ‘ پاؤں ٹھنڈے ہوتے محسوس کیے۔

ابرار صاحب‘ سلمان کو دھکیلتے ہوئے کمرے سے باہر نکال رہے تھے اور چلاتی ہوئی شاکرہ اس کے پیچھے۔

"کیا غضب کر رہے ہو‘ جوان اولاد ہے‘ کہاں جائے گا اس رات میں‘ چھوڑو اسے‘ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔"

"تو بھی دفع ہو جا اس کے ساتھ' سب تیرا ہی کیا دھرا ہے' نکل جا میرے گھر سے' ابھی اسی وقت' اپنی اس منحوس' آوارہ اولاد کے ساتھ۔"

وہ حلق کے بل چلا رہے تھے' مگر کوئی اور تھا جو ان سے بھی زیادہ بلند لب و لہجہ رکھتا تھا۔

"ابرار صاحب' ابرار صاحب۔"

نیچے سے مالک مکان کی کڑک دار آواز ابھری تھی۔

"شریفوں کا محلہ ہے' کچھ تو خیال کیجئے' ہر وقت طوفان' بد تمیزی مچا رہتا ہے' میں تو گھر کرائے پر دے کر پچھتا رہا ہوں۔"

اس ایک آواز میں حقیقی طاقت اور دبدبہ تھا۔

اس پُر ہنگامہ منظر پر لمحوں میں خاموشی کا طلسم طاری ہوا تھا۔ ابرار صاحب کی گرفت سلمان کے گریبان پر ڈھیلی پڑی اور وہ ایک جھٹکے سے خود کو ان سے چھڑا کر اندر جا چکا تھا اور اس کے پیچھے شا کر بھی۔

صحن میں اب — صرف اظہار صاحب کھڑے رہ گئے تھے یا پھر ایک طرف سمٹ کر بیٹھی جویا۔

"پتا نہیں' وہ اس وقت کیا سوچ رہے ہیں۔"

اس نے اپنے باپ کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر بہت تکلیف محسوس کی تھی۔

کتنا کچھ بھگت چکے' مگر نجات کا در کھلتا نظر نہیں آتا' مال' اولاد' بیوی' سب ہی ایک ایک کر کے ان کی آزمائش بنے تھے' مشکل تھی کہ آسان ہونے میں نہیں آتی تھی۔

کسی کسی وقت تو اس کا شدت سے دل چاہتا کہ وہ انہیں بہت سی تسلی دے' بتائے کہ وہ اکیلے نہیں ہیں' وہ بے ان کے ساتھ' جو ان کے لیے فکر مند رہتی ہے' بہت ساری دعائیں کرتی ہے اور ایک محبت بھری نگاہ کے لیے منتظر بھی۔

مگر ایسا کچھ بھی کرنا ناممکن تھا۔

وہ ان کی گڈ بک میں کبھی بھی نہیں رہی تھی اور اب تو خیر کہیں بھی نہیں تھی۔

"یہ لڑکی میرے لیے مر چکی ہے' اس سے کہو میرے سامنے مت آیا کرے۔"

اس نے کتنی ہی بار انہیں یہ جملہ کہتے سنا تھا' مگر اس بالکل چھوٹے سے پورشن میں وہ ان کی اس ایک خواہش کو پورا کرنے سے بھی قاصر تھی۔

سمٹ کر دیوار کے ساتھ بیٹھتے ہوئے جویا نے انہیں اپنے کمرے میں جاتے دیکھا۔

گھر میں بڑا ہی پُر ہول سا سناٹا چھایا تھا۔

زویا اتنے ہنگامے میں بھی کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی' جویا نے ساری کرچیاں سمیٹ کر اٹھائیں اور اندر چلی آئی' زویا لائٹ بند کر چکی تھی' لیکن باہر سے آتی روشنی کمرے کی تاریکی کو دور کر رہی تھی۔

"زویا — زویا۔"

اس نے تکیوں میں منہ دیے لیٹی زویا کو آواز دی' مگر وہ یوں ہی ساکت لیٹی رہی۔

جویا نے اسے ہلانے کے لیے ہاتھ بڑھایا' مگر پھر رک سی گئی۔

سوئے ہوئے کو تو اٹھایا جا سکتا ہے' مگر جو سوتا بن رہا ہو۔

اگر وہ اس وقت اکیلا ہی رہنا چاہتی تھی تو اسے یہ رعایت تو ملنی ہی چاہیے تھی۔

مزید کچھ بھی کہے جویا اس کے قریب لیٹ گئی۔

آنکھوں میں ہمہ وقت جلن سی رہنے لگی تھی' جس کا احساس آنکھیں بند کرتے وقت زیادہ شدت سے ہوتا

تھا' سونے سے پہلے وہ کتنی ہی بار آنکھیں کھولتی اور بند کرتی۔

اور اسی تکلیف دہ لمحے میں وہ اس طرح آنسو جو ہوتا ہے' کبھی گیلا نہیں تھا۔

اس کی طرف کی ہر کھڑکی' دروازہ' روزن بند ہونے کے باوجود۔

کروٹ لیتی ہوئی جویا نے سختی سے آنکھیں بند کر کے خود اپنے آپ سے نگاہ چرائی تھی۔

ٹک' ٹک ٹک۔

رات لمحہ لمحہ کر کے بیتتی چلی گئی۔

صبح نیم گرم اور زرد تھی۔

زویا کا پوائنٹ علی الصبح ہی آتا تھا اور گھر میں ان دونوں کے علاوہ کوئی بھی سحر خیز نہیں تھا۔ زویا کا ناشتا بنا کر وہ کمرے میں ہی لے آئی تھی۔

"مجھے بالکل بھوک نہیں ہے' جویا بس چائے ہی لوں گی۔"

وہ بالوں میں ہیئر بینڈ ڈالتے ہوئے نرمی سے منع کر رہی تھی۔

جویا نے دیکھا' اس کی آنکھوں پر ہلکی سی سوجن آ رہی تھی' شاید وہ بہت زیادہ روئی تھی گزشتہ رات اور اپنی اس کمزوری پر شرمندہ بھی تھی' جب ہی وہ اس سے نگاہ ملانے سے بھی گریز کر رہی تھی۔

جویا کو اس پر بہت پیار آیا تھا۔

ایک وہی تو تھی جو گھر میں صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے میں ایک پل نہیں لگاتی تھی اور خود اس کے آگے تو ہر وقت دیوار بن کر کھڑی رہی تھی۔

گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کے باوجود سب سے باحوصلہ اور سمجھ دار۔

"ناشتا کرو شاباش' اور کوئی ضرورت نہیں ہے دل پر لگانے کی' ایک نہ ایک دن تو سب ٹھیک ہو ہی جائے گا' ان شاء اللہ۔" اس نے قریب آ کر بہت محبت سے زویا کو سمجھانا چاہا' مگر وہ اسی طرح دل گرفتہ رہی۔

"تمہیں اب بھی لگتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے جویا' ہمارے حالات بری طرح بگڑ چکے ہیں اور یہ لوگ سنبھلنے' کچھ سبق سیکھنے سے اب بھی قاصر ہیں' مزید کیا ہونا باقی رہ گیا ہے' جس کے انتظار میں یہ اس طرح جانوروں کی مانند لڑ رہے ہیں' ابو کے مقدمے کا اس ہفتے فیصلہ بھی ہو جائے گا اور دیکھ لینا' وہ بجائے اسے قبول کرنے کے آگے اپیل پر جائیں گے' جن چند پیسوں میں شاید کھینچ تان کر اگلے سال کا کرایہ ہی نکالا جا سکتا ہے' وہ عدالت' وکیلوں کے چکر میں چند ماہ میں ٹھکانے لگ جائیں گے۔"

تھکے تھکے سے انداز میں وہ اسے اگلے منظر نامے تک لے آئی اور اس کی کہی کسی ایک بات کی بھی تردید نہیں کی جا سکتی تھی۔

جویا چپ چاپ اس کی شکل دیکھے گئی۔

اور اب تو میں یہ ہی سوچتی ہوں جویا کہ تمہاری شادی اعجاز سے ہو ہی جاتی تو شاید اچھا رہتا' اس جہنم سے تو تمہاری جان چھوٹ جاتی' آرام سے اپنے گھر میں رہتیں' پاگل کی طرح یہاں کی اس لاحاصل مشقت سے تو بچ جاتیں نا۔"

"پاگل کی طرح!" مایوسی کے اس چار سو چھائے کہرے کے باوجود بھی جویا کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ "اب تم مجھے ایسی بد دعائیں تو نہ دو' کم از کم' جو ہوا بالکل ٹھیک ہوا اور اگر وہی صورت حال دوبارہ بھی آتی ہے تو میں پھر سے وہی کروں گی جو میں نے پہلی بار کیا تھا۔"

بات کے اختتام پر اس کے انداز میں پھر سے وہی مضبوطی جھلکی جو اس کے دل کا حال سناتی تھی۔

زویا کے ماتھے پر ہلکی سی شکن آئی۔

"اور وہ جن کے لیے تم نے ہر خوشی خود پر حرام کرلی ہے' انہیں ذرا سی بھی پروا ہے تمہاری' ان حالات کی' انہیں سب خبر ہے' پھر بھی کبھی پلٹ کر پوچھا معاذ بھائی نے کہ تم کس حال میں ہو۔"

"جب ہمارا کوئی تعلق ہی نہیں تو کسی کے پوچھنے نہ پوچھنے کا کیا سوال اور تم سب نے یہ کیوں فرض کرلیا ہے کہ میں نے معاذ کی وجہ سے شادی سے انکار کیا ہے' مجھے نہیں کرنی تو نہیں کرنی بس۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ جھنجلائی تھی۔

"تمہاری یہ جھنجلاہٹ' یہ غصہ خود گواہی دیتا ہے کہ تم جو کہہ رہی ہو وہ سب جھوٹ ہے۔" زویا کے دل کا بوجھ اتنی گفتگو میں تھوڑا ہلکا ہوچکا تھا' سو وہ اپنا ناشتا شروع کرچکی تھی۔

"مجھے کوئی غصہ نہیں آرہا اور یہ تم سب نے کیا مل کر معاذ کے نام کو میری چڑ بنالیا ہے' آپا کل بھی ہر بات کو کھینچ تان کر یہیں لاتی ہیں' آج تمہیں بھی۔"

"ویسے اللہ معاف کرے' آج ہم دونوں کو ہی صبح صبح آپا یاد آرہی ہیں' کہیں آہی نہ جائیں تھوڑی دیر میں۔" زویا نے مسکراتے ہوئے بات کالی تھی۔

"نہیں آنے کے لیے کسی کے یاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے' وہ آئیں گی اور ضرور آئیں گی بیچنا ناممکن ہے' میں تو خود سوچ رہی ہوں کہ صائمہ باجی کو کہہ کر صبح اسکول کی جاب بھی لے لوں' صبح اسکول سہ پہر ٹیوشن' کافی وقت کٹ جائے گا عافیت میں۔"

جویا اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھی۔

"وہ تو ہے!" زویا نے کچھ سوچتے ہوئے نیم رضامندی ظاہر کی۔

"لیکن بہت کام بڑھ جائے گا تم پر جویا! پہلے ہی کیا کم ذمہ داریاں ہیں' سارا گھر سنبھال رکھا ہے' اوپر سے سلمان بھائی کا قیام بھی طویل ہوتا نظر آرہا ہے اور وہ تو موتا "ابھی کوئی کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں' کچھ بھی نہیں چھوڑیں گے تمہارے پاس اور کوفت ہوگی۔"

وہ جلدی جلدی کرتے ناشتا ختم کرچکی تھی۔

اور جویا کے لیے فی الحال اتنا ہی اطمینان کافی تھا۔

"پیسے رکھ لو۔" اس نے یاد دلایا۔

"ہیں ابھی میرے پاس۔" وہ اپنی چیزیں سنبھالتے ہوئے تیزی سے اترتی چلی گئی۔

کم از کم یہ تو ہوا کہ ادھر ادھر کی باتوں میں وہ اپنی اداسی کو ساتھ لے کر نہیں گئی۔

جویا مطمئن ہو کر واپس کچن میں آگئی۔

روز کے کام اس کے منتظر تھے۔

چائے' ناشتا' صفائی اور ابھی تھوڑی دیر میں ان سب کو اٹھ جانا تھا' جو رات کے جھگڑے کو تمام کر اب چین کی نیند سو رہے تھے۔

جویا نے فریزر کھول کر دیکھا' پچھلے دنوں کا آیا گوشت' قیمہ سب ختم۔

سلمان کا چٹورا پن اور شاکرہ امی کا لاڈ' کچھ بھی بچنے نہیں دیتا تھا' سو آج پھر دال میسر ی۔

اور نتیجتاً "سلمان کا خراب موڈ۔"

وہ فکرمند ہو کر چائے کا پانی رکھنے لگی۔

کبھی کبھی سوچتی تو صاف لگتا تھا کہ گھر میں ہمیشہ ہی ناشکرا پن چھایا رہا' جب ایک وقت میں دس چیزیں بنا سوچے سمجھے پکالیتی تھیں' تب بھی کھانے پر سب کے منہ ہی بنا کرتے تھے' اس کو کبھی نہیں یاد آتا کہ کبھی کوئی شکر کا کلمہ پڑھ کر دسترخوان سے اٹھا ہے' بلکہ صرف غرور بھرے قہقہوں سے گونجتا تھا اور اپنے سے پیچھے رہ جانے والوں کو تحقیر بھری نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

کتنے ہی پل' کتنی باتیں۔

پتا نہیں کس کی بددعا لگی تھی۔

معاذ کی؟ مگر نہیں' وہ تو اتنا بے نیاز کہ بددعا دینے کی بھی فرصت نہیں اور باقی رہ گئیں دادی' تو وہ ضرور آج بھی دکھی ہوں گی۔

ابھی کچھ ہی دیر پہلے اس نے زویا کے سامنے جو اعلان لاتعلقی پوری شدت کے ساتھ کیا تھا' ایک بار پھر خاموشی سے پس پشت ہوا تھا۔

کچھ یادیں' جو وہ خود سے بھی چھپا کے رکھتی تھی' تنہائی میں آج پھر سے ساتھ نبھانے چلی آئی تھیں۔

سب زویا کا کیا دھرا تھا' صبح صبح معاذ کا ذکر چھیڑتی اور نہ ہی یہ گم گشتہ جھونکا پھر سے اسے چھو کر گزرنے لگتا' سر جھٹک کر اس نے زویا کو قصہ وار ٹھہرایا اور باہر نکل آئی۔

سامنے کمروں میں بیداری کے آثار نمودار ہونے شروع ہوگئے تھے' لیکن بستر چھوڑنے کے لیے ابھی بھی خاصا وقت درکار تھا۔

گھر بھر میں بیداری کی علت رائج تھی۔

ابھی دس ہی بجے تھے' جب اس نے مالک مکان کی بیوی کو اوپر آتے دیکھا۔

شاکرہ امی کی صبح اتنی جلدی نہیں ہوتی تھی' ہڑبڑاہٹ میں کسی دوسرے سوٹ کا دوپٹہ اوڑھ کر وہ مہمان کے استقبال کو تیار ہوئیں اور سلمان اپنے چائے پاپے کی ٹرے اٹھا کر جویا اور زویا کے کمرے میں گیا۔

"ایک تو گھر بھی اتنا چھوٹا لیا ہے کہ جہاں کوئی ایک کونا نہیں ملتا بیٹھنے کے لیے۔"

جویا نے اسے کہتے سنا تھا۔

"پتا نہیں یہ کونا اسے وہاں نوبیہ کے اس بڑے سے گھر میں کیوں میسر نہیں آسکا' جو وہ یہاں اپنی خواری کروانے کے لیے چلا آیا ہے۔"

جویا کا دل چاہا کہ پوچھ لے' مالک مکان کی بیگم' مختصر سی بات کرنے کے لیے ہی آئی تھیں' سو پندرہ بیس منٹ میں چائے پیے بغیر ہی رخصت ہوئیں۔

آپا کل کا ان سے سامنا سیڑھیوں ہی پر ہوا تھا۔

"یہ کیوں اتنا منہ پھلائے گئی ہیں' سلام کا جواب بھی نہیں دیا' دل تو چاہا تھا کہ ابھی اچھی طرح سناؤں' بس ضبط کرگئی۔"

بنا کسی دعا سلام کے' وہ شاکرہ امی کے کمرے میں بولتے ہوئے داخل ہوئیں۔

وہ ابھی ابھی موصول ہوئی نئی الجھن میں گرفتار تھیں' بجھی سی گئیں۔

"بڑی مہربانی کی ہمارے حال پر جو تم ان سے نہیں الجھیں' ورنہ ابھی جو مہینے کا نوٹس ان کی طرف سے ملا ہے' گھٹ کر بیٹھنے کا بھی نہیں رہتا۔"

"کیا مطلب؟" وہ بری طرح چونکیں۔

"گھر خالی کروا رہے ہیں ہم سے مالک مکان' یہ جو آفت مچی رہتی ہے نا اس سے عاجز آگئے ہیں' کہہ رہی تھیں کہ ہم نے تو شریف لوگ سمجھ کر دے دیا تھا کرائے پر' اب جھگڑے خالی پڑا رہے' وہ منظور ہے۔"

شاکرہ امی رو دینے کو ہو رہی تھیں۔ زندگی میں سوائے اپنے میاں کے انہوں نے کسی کی الٹی سیدھی نہیں سنی تھی' آج ایک عام سی عورت علی الاعلان بے عزتی کر کے چلی گئی۔

آپا گل کو ان سے بھی زیادہ غصہ آ رہا تھا۔

"وہ مٹھی بھر کر کرایہ دیتے ہیں اس چیچڑ سے گھر کا پھر بھی اتنے نخرے' اس گھر کو تو کوئی مفت میں بھی نہ لے۔ بالکل کھنڈر تو ہو رہا ہے۔"

"آہستہ بولیں آپا! اگر انہوں نے سن لیا تو پھر تو ہمیں آپ کو اپنے ہی گھر لے جانا پڑے گا۔" جویا نے دھیمے لہجے میں یاد دلایا تو وہ فکر مندی ہو کر واقعی خاموش ہو گئیں' شاکرہ امی نے انہیں رات کا تازہ جھگڑا سنانا شروع کر دیا تھا' سلمان ابھی تک دوسرے کمرے میں تھا سو کہنے سننے کی تھوڑی سی آزادی تھی۔

"میری مانیے تو سلمان کو ابو سے کہہ کر کہیں کام پر لگوائیں' گھر بیٹھ بیٹھ کر بالکل ہی نکما ہو جائے گا' اب اگر زوبیہ سے اس کی صلح نہیں ہو رہی ہے تو کیا عمر بھر گھر میں ہی بیٹھا رہے گا۔ آخر پہلے بھی تو نوکری کرتا ہی تھا۔"

بڑے عرصے بعد آپا گل نے کوئی ڈھنگ کی بات کی تھی۔ مگر شاکرہ امی نے مایوسی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہ گاڑی نہ موٹر سائیکل' نوکری ڈھونڈے گا کہاں' دس چکر لگانے پڑتے ہیں آفسوں کے' کیسے آرام سے رہ رہا تھا وہاں ڈیفنس میں' دشمنوں کی نظر کھا گئی میرے بچے کو۔" انہیں سلمان کا غم اب بھی چین نہیں لینے دیتا تھا۔

آپا گل نے ناگواری سے ہاتھ ہلایا۔ "اب دشمنوں کا رونا چھوڑ دیں' ان کے تو خوب مزے آ رہے ہیں' باپ بیٹا دونوں ہاتھوں سے کما رہے ہیں' کل اچانک ہی مل گئیں شائستہ چچی زبیر ماموں کے گھر' معاذ کے ساتھ گاڑی میں آئی تھیں اور پہلی بار سونے کی چوڑیاں بھی ہاتھ میں تھیں' میری تو جان ہی جل کر رہ گئی ان کے ٹھاٹھ دیکھ کر۔" کمرے میں سے باہر صحن تک ان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی' باہر کھڑی جویا کا دل بہت زور سے دھڑکا۔

"سونے کی چوڑی!" شاکرہ امی کی نگاہ بے ساختہ اپنے خالی ہاتھوں پر گئی' ایک نہ دو پوری بارہ چوڑیاں انہیں اپنی چوڑیوں کے ساتھ کتنا ہی کچھ یاد آیا۔

"آج کل معاذ کے لیے لڑکیاں دیکھتی پھر رہی ہیں' پچھلے دنوں سنا ہے کسی ڈاکٹر لڑکی سے رشتہ طے ہو رہا تھا' بلکہ طے ہو ہی چکا تھا' مگر اچانک ہی ختم ہو گیا۔ ابھی تک وجہ پتا نہیں چلی ہے' مگر کب تک چھپی رہے گی' پتا تو چل ہی جانا ہے۔ اصل میں تو جو لڑکی معاذ نے گھر میں لا کر رکھی ہے اس کی وجہ سے بدنامی ہو رہی ہے' اسلام چچا کے گھر والے تو کہہ رہے ہیں کہ معاذ نے نکاح کر رکھا ہے اس سے۔"

"نکاح تو شرعی کام ہے' اس لڑکے کے اطوار تو اللہ معاف کرے' پتا نہیں کیا کروا کر چھوڑیں گے۔ شکر ہے کہ ہم تو بال بال بچ گئے۔"

شاکرہ چچی کی آواز میں آج ہمیشہ جیسی کھنک نہیں تھی۔ معاذ کے حوالے سے سب کچھ کہا اور سنا جا چکا تھا اور وہ یہ سب سننے کی عادی تھیں مگر آج ایک چوٹ ان کی منتظر تھی۔

"تو تم اب شادی کر رہے ہو۔" [illegible] ڈھنگ کے کپڑے کو ایک طرف رکھ کر اس نے بہت بہادری سے اس اطلاع کو جھیل لیا تھا' بہت عرصے سے ایسا کچھ متوقع تھا مگر بے یقینی کے اس طویل دور سے گزر جانے کے بعد بھی شاید وہ ابھی تک [illegible] رہ گئی تھی۔

"جویا اے جویا!" اندر سے آپا گل بے تابی سے پکار رہی تھیں۔ اس نے ہتھیلی سے رگڑ کر اپنی آنکھیں خشک

کیں۔

"جویا ارے کہاں چھپی بیٹھی ہو' بات تو سن لو۔"

حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ یہاں کہا ہر لفظ کچن تک بھی جا رہا ہے' لیکن وہ ایسی ہی تھیں۔ پوری طرح توڑ پھوڑ مچا کر تماشا دیکھ کر لطف اندوز ہونے والی۔

وہ کم از کم انہیں یہ خوشی بخشنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"آ رہی ہوں۔" اس نے قدرے اونچی آواز میں کہا اور خود کو کمپوز کرتی ہوئی اندر چلی آئی۔

"کیا ہوا؟" آپا بہت غور سے اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

"کچھ نہیں۔ آپ نے ہی تو آواز دے کر بلایا ہے۔" اس کا لہجہ بالکل نارمل تھا اور چہرہ بالکل بے تاثر۔

وہ جو کچھ دیکھنا چاہ رہی تھیں ویسے کچھ نہ ملا تو بد مزہ سی ہو گئیں۔ "اگر فارغ ہو تو میرے ساتھ بازار چلی چلو' بہت ساری شاپنگ کرنی ہے مجھے اپنے اور بچوں کے لیے' تم ساتھ ہو گی تو ذرا آسانی رہے گی۔"

"کس میں' سامان اٹھانے میں؟" اس نے برجستہ کہا اور ہنس پڑی' وہ حسب عادت برا مان گئیں۔

"میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ ایک آدھ جوڑا تمہیں اور زویا کو بھی دلا دوں' کب سے کوئی نیا کپڑا نہیں بنا ہے تم لوگوں کا' اگلے ہفتے میرے ہاں قرآن خوانی ہے' وہاں کے لیے کوئی ڈھنگ کے کپڑے تو چاہئیں نا تم دونوں کے لیے۔"

"آپ فکر نہ کریں' ہمارے پاس ابھی تک ڈھنگ کے کپڑے باقی ہیں' پہن لیں گے کچھ نہ کچھ! ویسے قرآن خوانی کس خوشی میں ہو رہا ہے؟" آج سے پہلے اس نے ان کے ہاں سوائے سالگرہ کے اور کچھ نہیں سنا تھا' سو ذرا حیرت سے پوچھنے لگی۔ آپا گل بڑے فخر سے مسکرائیں۔

"اوپر کے دو کمرے بنے ہیں' بچوں کے لیے' اب پوری طرح سیٹ بھی ہوئے ہیں' ایک بڑا سا لاؤنج وہ بھی ماشاء اللہ پوری طرح فرنشڈ' جو بھی دیکھ رہا ہے تعریف کرتے نہیں تھک رہا۔ سوچ رہی ہوں ایک ساتھ سب ہی کو بلا لوں۔"

"تعریف کرنے کے لیے۔" وہ ایک بار پھر بولی تھی۔ مگر اس بار آپا گل برا ماننے کے بجائے ہنس پڑیں۔

"یہی سمجھ لو! اکبر تو حیران ہیں کہ اتنی آسانی سے سب کچھ کیسے ہو گیا' میں نے کہہ دیا کہ شکر کریں مجھ جیسی سمجھ دار بیوی ملی' ورنہ اپنے دونوں بھائیوں کی طرح ابھی تک بچوں کے ساتھ ایک ایک کمرے میں ہی پھنسے رہ جاتے۔"

"یہ وہی سامان ہے جو تم نے جویا کی سسرال سے اٹھوایا تھا۔"

شاکرہ امی نے آپا گل سے بڑے بے وقت پوچھا تھا۔

"ہاں وہی ہے امی! اب دیکھ لیں' وہاں پڑا رہ جاتا تو پتا نہیں کیا حشر ہو چکا ہوتا' اب کام میں تو آ گیا اور مجھے ویسے بھی آپ نے بہت سی چیزیں نہیں دی تھیں' اب کچھ تو حساب برابر ہوا۔"

شاکرہ امی کا منہ حیرت سے کچھ کھلا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہیں۔" وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں تھیں۔

"جب پیسے ہوں گے دے دیں گے' ابھی تو آپ کی ہی سارے میں عزت بڑھی ہے نا۔"

"اور یہ تم اب تک بیٹھی ہو' چلنا ہے تو تیار ہو جاؤ' مجھے بھی دیر ہو رہی ہے۔" انہوں نے جویا کی طرف ذرا بگڑے ہوئے موڈ میں دیکھا۔

"نہیں آپا! مجھے رہنے دیں' ابھی سارا کام پڑا ہے اور ابو' سلمان بھائی دونوں ہی کو وقت پر کھانا چاہیے ہوتا

وہ سکون سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"نہ جاؤ' تمہارے ہی بھلے کے لیے کہا تھا' نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں۔"
وہ ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی باہر نکل آئی تھی۔ عجیب بات تھی۔
آپا گل یا سلمان' دونوں ہی طرف سے ہونے والا خود غرضی کا کوئی بھی نیا مظاہرہ دل کو تکلیف سے زیادہ خوشی پہنچانے لگا تھا' اس بات سے قطع نظر کہ وہ بقیہ گھر والوں کے لیے کیا ثابت ہو رہا ہے۔ شاید وہ ان کی اصلیت کو سامنے آتا دیکھنے کی کب سے خواہش مند تھی۔
بھلے کوئی فرق پڑے نہ پڑے' آج ایک پرت اور اتری تھی۔

☼ ☼ ☼

آسمان پر ستاروں کا روپہلا غبار پھیلا تھا اور شہر گہری ہوتی رات کے سحر میں مکمل گرفتار۔
سالار نے گھر کی طرف جانے والے آخری موڑ پر گاڑی کو موڑا اور گیتی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔
"پتا ہے گیتی! مجھے ہمیشہ ایسا لگا تھا جیسے میری اور تمہاری شادی کی سب سے زیادہ مخالفت تہمینہ آنٹی کی طرف سے آئے گی' میں ان سے ہمیشہ بہت ڈرتا رہا اور وہ بھی مجھے کچھ خاص پسند نہیں کرتی تھیں' مطلب مجھے کچھ ایسا ہی لگا ہمیشہ۔ نانی کی مخالفت کے بارے میں تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا مگر دیکھو بالکل الٹ ہوا۔"
"لوگ عموماً توقع کے برعکس ہی نکلتے ہیں' آپ بھی تو میری امید کے بالکل برخلاف ہی کراچی سے چلے آئے' ورنہ میں تو مایوس ہی ہو چکی تھی' مکمل طور پر' جا کر ایک بار بھی خبر نہیں لی تھی آپ نے اتنے مہینے۔"
سالار صرف مسکرایا تھا۔
"بہت کچھ ہے ایک دوسرے سے کہنے سننے کے لیے ہمارے پاس۔ سناؤں گا اپنی مجبوریوں کی داستان بھی تمہیں' بلکہ اپنی زندگی کی کہانی' کراچی پہنچنے سے پہلے تمہیں بہت کچھ جاننا ہو گا گیتی' یہ ضروری ہے۔"
گاڑی گھر کے گیٹ پر تھی' اور گارڈ نے مستعدی سے دروازہ کھولا تھا' سالار تیزی سے گاڑی اندر لیتا چلا گیا۔
برآمدے کی سیڑھیوں کے پاس بیٹھا ہوا راجو انہیں دیکھ کر اٹھ کر کھڑا ہوا تھا۔
سالار نے صبح گیتی سے ملازمین کی باقاعدہ رسم تعارف بھی کروائی تھی' سو اب اپنی اہمیت کا احساس نمایاں ہو رہا تھا' وہ گیتی کے ہاتھ میں شاپنگ کا شاپر دیکھ کر آگے بڑھا تھا۔
"لائیے بھابھی! میں کمرے تک پہنچا دوں سامان۔"
سالار نے زور دے کر کہا تھا کہ وہ یا کوئی بھی گیتی کو بیگم صاحب کہنے کی غلطی ہرگز بھی نہ کرے۔
"مجھے اچھا نہیں لگتا' حالانکہ یہ راجو مجھے منع کرنے کے باوجود سالار صاحب ہی کہتا ہے۔ مگر تمہارے معاملے میں سختی کرنے والا ہوں۔" اس نے مصنوعی سا رعب دکھایا تھا تو سب ہی ہنس پڑے تھے۔
گیتی کے لیے یہ سب اس خواب کی تعبیر تھا جو ڈر کے مارے اس سے کبھی دیکھا بھی نہیں گیا تھا' بس یوں ہی دور دھندلکے میں لپٹا ہوا کوئی منظر۔
"آپ تکلیف مت کریں راجو بھائی! ہلکا سا شاپر ہے۔" نرمی سے کہتی ہوئی وہ اندر جانے لگی' تب ہی سالار نے پیچھے سے آواز دی تھی۔
"ہم لوگوں کے لیے ذرا چائے بنوا کر بھجوانا گیتی! مجھے راجو سے کچھ بات کرنا ہے۔"
"جی!" اس نے مسکرا کر صرف اتنا ہی کہا اور اندر مڑ گئی۔

"وہ میں خود ہی چائے بنا کر لے آتا ہوں سر' بھابھی کو کیوں۔" راجو کو عجیب سا لگا تھا' مگر سالار کے ہاتھ کے اشارے نے بات کو ادھوری چھوڑنے پر مجبور کیا۔
"وہاں بیٹھتے ہیں۔" اس نے سامنے پڑی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں مجھے تم سے' نبیل کے بارے میں۔" بنا کسی تمہید کے سالار نے بات شروع کی تھی۔
"جی!" راجو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
سالار بہت پرسکون انداز میں بیٹھا تھا۔ "گھبراؤ نہیں راجو! یہ میرے لیے ضروری ہے کہ میں یہ سارا قصہ شروع سے جان لوں' تب ہی ہم کسی ٹھیک نتیجے پر پہنچیں گے' تم نے کل کہا تھا کہ وہ وہاں بھی جاتا رہا ہے' جب یہاں لاہور میں تھا۔"
"جی!" راجو نے دھیرے سے سر ہلایا۔ "وہاں برابر والے چوبارے پر۔ ان کا زیادہ وقت وہیں گزرا تھا' ان کا جو میزبان تھا' سنا ہے وہ بیگم زرتاج کا بھی کوئی ہے' وہ ہی نبیل کو۔"
آہستہ آہستہ وہ اسے ساری تفصیل سناتا گیا۔ چائے بن کر آچکی تھی اور چائے ختم ہونے کے ساتھ ہی نبیل کی لاہوری تفصیلات بھی۔
گو کچھ ایسا نیا نہیں تھا' پھر بھی جاننا ضروری تھا۔
سالار نے اٹھنا چاہا تھا' تب ہی راجو دھیرے سے بولا۔
"نبیل پہلے ہمارے محلے میں ہی رہتا تھا سر! اسے میں نے ہی زرتاج میڈم کے پاس نوکری دلوائی تھی' اور یہ بات کسی کو بھی نہیں پتا ہے' زرتاج میڈم کو بھی نہیں۔"
"کیا؟" اس بار وہ واقعی چونکنے پر مجبور ہوا تھا۔
"اور... اور کیا جانتے ہو اس کے بارے میں' اس کا خاندان' اس کا بیک گراؤنڈ۔"
سالار کو یکایک ہی بہت گہری دلچسپی اس نئی کہانی میں محسوس ہوئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



ثمرہ بخاری

تو عید کا چاند

ناولٹ

"اچھا تو پھر آ رہی ہے تو؟" جب اللہ جھوٹ نہ بلوائے کوئی دسویں بار یہ جملہ ممتاز نے دہرایا تو کچھ فاصلے پر بیٹھی ناہید کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"فون کو باپ کی جاگیر سمجھ بیٹھتی ہے تو لپ زلوی! اور یہ فسادن "اس کی پر کٹی کبوتری۔ بس ابھی پندرہ دن پہلے ہی تو ہو کر گئی ہے۔ بے شرم لوگ۔ بے حیا خاندان کیسے مزے سے دس دس دن بہن کے گھر آ کر پڑ رہتی ہے۔ ذرا بھی غیرت نہیں آتی نہ بہن کو نہ اس لڑکی ممتاز کو نہ ان کی منحوس اماں کو۔ بھلا کوئی بہنوئی کے گھر بھی یوں بار بار آتا اور اس کا کھاتا ہے۔ یہ نہ جی اتنی غیرت ایسی آن والے ہوں تو پھر رونا کس بات کا ہے؟"

فون اٹینڈ کرنے کے بعد ممتاز نے گنگناتے ہوئے ریسیور رکھا اور اٹھلاتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

دوپہر کی ہانڈی روٹی کی باری آج ناہید کی تھی۔ سو ممتاز فارغ تھی اور فارغ وقت کو گھر میں بیٹھ کر ضائع کرنا اس کو کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔ کمرے میں جا کر میلے پاؤں میں نئی سلور اور پنک کے امتزاج سے بنا جوڑا ڈالا۔ صبح کے دھلے منہ پر فیس پاؤڈر لگایا۔ ہونٹوں پر شاکنگ پنک لپ اسٹک پھیری۔ بالوں کو سنوارنے کی ضرورت نہیں تھی کہ سر پر [illegible] کے کناروں پر ستاروں کا بارڈر [illegible] تھی سویرے بھی بالوں میں کنگھی [illegible] کی تھی اب جو یہ زلف کھول [illegible] مشکل ہو جاتا۔ بال بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ کالے ستاروں کے بارڈر والی چادر اوڑھ کاندھے پر لٹکے سے لیا خوبصورت [illegible] پرس جس کی اندر کی دونوں جیبیں پھٹی ہوئی تھیں مگر خیر اندر جو بھی ہو بظاہر پرس خوبصورت تھا" ڈال کر وہ کمرے سے برآمد ہوئی۔

ناہید نے کانی آنکھ سے اس ساری تیاری کو دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔

"میں ذرا بڑے بازار تک جا رہی ہوں۔ بچے اسکول سے آجائیں تو روٹی دے دینا۔ تمہیں اپنوں کو ہی دے کر



ہمیشہ کی طرح میرے دونوں کو بھول جاتو۔"
ناہید نے اطمینان سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ "تمھوا!" یادداشت میری بھی تیرے جیسی ہی ہے۔ تو بھی تو بھول جاتی ہے بلکہ اکثر ساری ہانڈی چٹ کر دیتی ہے یاد ہی نہیں ہوتا گھر میں کوئی اور بھی رہتا ہے۔"

ممتاز کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ یہ بھی جانتی تھی۔ ناہید اسے باتوں میں الجھا کر ٹائم ضائع کرنے کی پالیسی پر عمل کر رہی ہے۔ اس لیے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور گنگناتی ہوئی گھر سے نکل گئی۔ ناہید نے دانت پیس کر جاتی ہوئی جیٹھانی کو دیکھا۔

"اب آئے گی بازار سے سموسے اور چاٹ کھا کے۔ اللہ کرے آج ہی رمضان کا چاند نظر آجائے اور اس کی یہ روز روز کی عیاشی تو ختم ہو۔" جیسے ہی ممتاز گھر سے نکلی فون بجنے لگا۔

ناہید نے بڑھ کر اٹینڈ کیا۔ دوسری طرف ممتاز کی چھوٹی بہن تھی۔ اس کے لیے صرف "چھوٹی بہن کہنا" کافی ہے کیونکہ وہ نام تبدیل کرنے کی بڑی شوقین تھی اور پتا نہیں آج کل کس نام سے پکاری جا رہی تھی۔

"ہیلو آپا! میں ایمان بول رہی ہوں۔" (اچھا تو آج کل وہ ایمان علی سے متاثر ہو رہی تھی اور ایمان نام چل رہا تھا)

"توبہ کرنی تو ایمان کا مطلب بھی سمجھتی ہے۔" ممتاز گھر میں نہیں تھی ہمس کی بہن کے لتے لینے کا اس سے بہتر موقع بھلا اور کون سا ہو سکتا تھا۔

"اچھا تو آپ بھابھی ناہید بات کر رہی ہیں۔ ہائے مزاج میں ذرا فرق نہیں آیا۔ اسی طرح جلی بھنی ہوئی ہیں۔ ماشاء اللہ۔"

"اوہو۔ تم دونوں تو رنگیلا اور منور ظریف کی بہنیں ہو نا۔ وڈی آئی مجھے باتیں سنانے والی اور نام تو دیکھو جو رکھ لیا ہے نا بی بی لوگ جوڑ تو ہو ایمان، عشرت کتے کے بیل ہکسی سے یہ تو پوچھ جائے

"تو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے بھی۔ آج کل ایمان علی ہٹ جا رہی ہے، میں نے اس کا نام رکھ لیا ہے۔

کل کوئی دوسری ہٹ ہوگئی تو اس کا رکھ لوں گی۔ یہ سب پیار کے نام ہیں۔ اصل نام تو میرا وہی سڑا بسا زرینہ ہی ہے۔"

"ویسے تیرے منہ پہ جچتا بھی زرینہ ہی ہے۔ کالا منہ تے بھورے بال۔ میرے ابا جی نے جب پہلی واری تجھے ہمارے گھر میں دیکھا تھا تو بھجھل پیری سمجھے تھے۔ عمل کر کے تجھے غائب کرنے لگے تھے۔ وہ تو میری بدنصیبی عین وقت پہ میرے منہ سے نکل گیا یہ میری جٹھانی کی چھوٹی بہن ہے۔"

"ہائے بچی بھابی! تیرا ابا تو بڑا چول ہوا پھر دیکھ ناں اسے کڑی اور بھجھل پیری میں فرق ہی معلوم نہیں ہے۔"

"قصور ابا جی کا نہیں ہڑی کا ہے جس میں کڑی اور بھجھل پیری کا فرق بڑا کم ہے۔"

"اچھا اچھا۔ میں بھی کن باتوں میں لگ گئی۔ کدھر ہے آپا اسے فون پکڑاؤ۔"

"تیری آپا گھر بیٹھتی ہے بھلا۔ نکلی ہے آوارہ گردی کرنے۔"

"اچھا بازار گئی ہے؟ ہائے بچی! زندگی ہے... تو اماں نے صبح سے کپڑے دھلوا دھلوا کے حشر کر دیا ہے۔ اچھا آپا سے کہنا میں کل ... تک ... تیار رہے۔ بازار جانا ہے ...

"دفع دور۔" ناہید نے ریسیور ... پھر کچھ خیال آیا۔

"یہ مرجانی ... میری بچاری معصوم بہن ... ایک ... ہونے کا یہ بڑا نقصان ہے۔ ہر وقت ... ہوں نہ ادھر سے کوئی آسکتا ہے۔ ... اماں کو فون۔ چھوٹا بھائی چھوڑ جائے مجھے ... لے پروین کو۔" یہ سب سوچ کر مسکراتے ہوئے گاؤں میں مقیم اپنی بہن کا نمبر ملایا۔ بہن کی اس وقت بھابھی سے زوروں کی جنگ چل رہی تھی۔ دھیان بھابھی کی طرف تھا۔ ریسیور اٹھا تو لیا مگر جواب بھابھی کو دیا۔

"اللہ کرے تیرا میاں تیرے سے بددل ہو جائے اور تیری ہی بہن پہ دل آجائے اس کا۔" ناہید نے دہل

کر سینے پہ ہاتھ رکھا۔

"بی! یہ کیا بکواس کر رہی ہے؟ بے شرم، بے حیا ڈوب مر۔ مینڈک کی شکل والی! تیرے جیسی انسان تو کیا گھوڑے کا بھی دل آجائے نا تو میرا نام بدل دینا۔"

"آپا! یہ تو ہے" پروین چہکی۔ مگر ناہید کا موڈ سخت خراب ہو چکا تھا۔

"آپا! میں تو بھابھی سے لڑ رہی تھی۔ اس ... کے مار رہی تھی۔ تو پتہ نہیں کیا سمجھی ہے۔"

"اچھا یہ سب تو اس بچ کی چال والی ... رہی تھی، پھر ٹھیک ہے۔ پر ایک بات ... دہلا دیا تو نے میرا۔"

"اچھا آپا! معاف ... بتا بے وقت فون کیوں کیا ہے؟ کوئی ... ہاں پھر کوئی فرمائش؟ نیو اناہو گا اماں سے اچار ... ہوں گے میرے سے گرمیوں کے کپڑے یا ابا سے کچھ پیسوں کے لیے بولنا ہو گا تو آپا! تمہارے تو کر نہیں لگے ہوئے شہر کے اس قبر پر ... بیاہ کر جانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم ... اونچی شے ہو گئی ہو۔ ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں بلکہ میرے سلیقے، میرے حسن کی مثالیں تو سارا پنڈ دیتا ہے۔ ابھی کل ہی بڑے زمین دار کی بیوی اپنے چھوٹے پتر کا رشتہ لے کر آئی تھی میرے لیے۔"

"اچھا۔ وہ جواندھی ہے۔"

"ہاں ہاں وہی"

"پھر کیا بنا ہائے۔ اس کا چھوٹا بیٹا تو گبھرو جوان ہے، کالوں کو تیسوں والا ہے۔"

"پتر کیسی تو نے تو دی چھلا گما دی ہے۔"

"کہاں آپا! اس کے لڑکے کو پتہ چلا تو بڑا رولا ڈالا اس نے گھر میں۔ ماں سے بولا جب رشتہ ڈالنے جاتی ہے تو کسی آنکھوں والی کو ساتھ لے جایا کر، غصے سے دل لہو لہو ہو رہا ہے۔ میں بڑی اداس ہوں۔ سویرے سے تین بار فلم دیوداس دیکھ چکی ہوں۔"

"دفع کر چوہدریوں کے پتر کو، اس کی ماں کو، تے دیوداس کو تو بس شہر آنے کی تیاری پکڑ۔"

"شہر کیوں؟ تیرے اس تنگے جیے گھر میں میرا دم گھٹتا ہے۔"

"پاگلے ایس تیرے دل کی کلی کھلانے کے منصوبے بنا رہی ہوں تو دم گھٹنے کی بات کر رہی ہے، نی، وہ میرا دیور ہے نا خالد، خیر سے اچھا خاصا پڑھ لکھ گیا ہے۔ پتا نہیں کون کون سے ڈپلومے بھی کر لیے ہیں اس نے تے اب دوبئی جا رہا ہے۔"

"اچھا۔ دوبئی جا رہا ہے۔"

"اہو تے میں نے سوچا، چلا کو تو بچپن سے ہے۔ فلمیں دیکھ دیکھ کے تیرا اچھا کا بالکل ہی کھل گیا ہے۔ تیرے لیے اس بھلے مانس کو قابو کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا۔"

"جے اے گل ہے آپا! تے پھر میں سمجھو کہ اڑ کے پہنچ رہی ہوں۔"

"دیکھ لے پھر میں تیرا کتنا خیال کرتی ہوں اور تو ہے کہ میرے ایک سوٹ پہ کڑھائی کرتے تجھے موت پڑتی ہے۔ میرے لیے ایک سوئٹر تک نہیں بن سکتی۔ تے نہ کبھی تو نے مجھے ست رنگا دوپٹہ رنگ کے دیا ہے۔ اپنے رنگ برنگے دوپٹے اوڑھ کے چھمک چھلو بنی پھرتی ہے۔" مگر تب تک پروین فون بند کر چکی تھی۔ اسے شہر آنا تھا اور بہت سی تیاری ابھی باقی تھی۔

جب ممتاز بازار سے چاٹ اور سموسے کھا کے گھر پہنچی تو ناہید کو مسکراتے گنگناتے کام کرتے دیکھ کر شدید حیرت ہوئی "کمال ہے اس کے ہاتھ بھلا کون سا خزانہ لگ گیا ہے" مگر پوچھا نہیں۔ پتا تھا ہنسی اور اکڑ جائے گی۔ بچے کھانا کھا کے گلی میں فساد برپا کرنے نکل گئے تھے۔ گرمی زوروں کی تھی۔ ممتاز کو تھکن بھی خاصی ہو رہی تھی۔ پیروں سے جوتی اتاری۔

"ہائے! کیسی مٹی مٹی ہو رہی ہے۔" دوپٹے کے کونے سے اچھی طرح جھاڑی اور سنبھال کر الماری میں رکھ دی۔ پیروں پہ بھی اتنی ہی مٹی پڑی تھی مگر خیر ہے پیر صاف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی لیے تو

بستر کی چادر اپنے میل خورے رنگوں کی بنا جاتی ہے مہینہ بھر بھی بچھی رہے ویسی ہی لگتی ہے جیسی پہلے روز بچھانے پر دکھائی دیتی تھی۔ عقل مند عورتیں اسی طرح صابن اور وقت کی بچت کیا کرتی ہیں۔

خالد کے کمرے سے میوزک کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔ مطلب یہ کہ دیور جی گھر آچکے ہیں اب تو رشتہ بھی ڈبل ہونے جا رہا ہے۔ پورا یقین ہے مجھے زرینہ اوں ہوں ایمان ضرور اس بیبے لڑکے کو قابو کر لے گی۔ بس ہم دو بہنیں ایک گھر میں ہو جائیں۔ اس ناہید بی بی کو تو نکاویں کی کونے میں۔ ہونہہ چینڈو پروڈکشن۔"

ناہید کچن سمیٹ چکی تھی اور آج اس نے سالن سے چن چن کے سب سے اچھی بوٹیاں خالد کی پلیٹ میں ڈالی تھیں۔ ویسے تو جب سے دو بہنیں جانے کا چانس بنا تھا' دونوں بھابیوں کے انداز و اطوار میں مثبت تبدیلی وہ دیکھ رہا تھا مگر یہ بوٹیوں بھری پلیٹ

"بھابی! یہ اپنی پلیٹ آپ غلطی سے میرے لیے اٹھا لائی ہو۔" کہہ کر پلیٹ ناہید کی جانب بڑھائی تھی۔

"نہ نہ' یہ تو میں نے تیرے لیے نکالی ہیں۔ تو بڑا کمزور ہو رہا ہے' پرائے دیس جا رہا ہے' وہاں کس نے تیری صحت کا خیال رکھنا ہے' جتنے دن یہاں ہے بس صحت بنالے اپنی۔ میں روزانہ تیرے لیے دودھ کا گلاس نکالا کروں گی' چپ کرکے پی لینا کہیں ممتاز کو پتا نہ چلے۔ بڑا جلتی ہے تیرے سے۔"

خالد کو اس محبت پر جھٹکا ضرور لگا مگر تحمل اور تحمل کی دھار خاموشی سے دیکھنے کا عادی تھا۔ سو کر اٹھا۔ نہانے کے لیے گھسا اور واپسی پر حیرت کی انتہا نہیں رہی اس کے کمرے کا دھول مٹی سے اٹا فرش دھل چکا تھا۔ وہ نفاست پسند تھا۔ بے چارہ جتنا بھی ہو سکتا تھا۔ اپنی الماری میز کرسی جھاڑ پونچھ کر رکھتا تھا۔ بستر کی چادر اکثر خود ہی واشنگ پاؤڈر میں ڈال کر دھو لیتا تھا مگر آج تو فضا بدلی ہوئی تھی۔ پرانی چادر کی جگہ نئی ڈال دی گئی تھی۔ اور صاف ستھرا اکتا رو شرو دکھائی دے رہا تھا۔

"اچھی ہے ناں؟ یہ بیڈ شیٹ میں آج ہی تیرے کمرے کے لیے خرید کر لائی ہوں۔"

بھائی ممتاز بھی بھابھی ناہید کی طرح حیران کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ مگر خالد نے کہا کچھ نہیں۔ کمرے سے باہر خاصی دور صحن میں سامنے کھڑی ناہید یہ ساری کارروائی دیکھ بھی رہی تھی اور سمجھ بھی رہی تھی۔

"کچھ بھی کرلے سیاست دان کی اولاد۔ جیت تو میری سگھڑ بہن کی ہونی ہے۔ تیری وہ نسواری بھونڈی جیسی بہن جو ہر ماڈل سے متاثر ہو کر ویسے ہی کپڑے پہن کے ہنسی مذاق کا سامان بنتی ہے' اسے کوئی سرکس والا ہی پسند کرتا ہے' میرا خالد تو بڑا سلجھا ہوا بچہ ہے۔"

ممتاز کے بچوں کے کمرے میں ایک نئے بستر کا اضافہ ہوا۔ بچوں نے پوچھا۔

"اب کون سیاپا آرہا ہے ایک تو جو بھی جہنم جو کا مہمان آتا ہے' ہمارے ہی کمرے میں گھسا دیا جاتا ہے۔" ممتاز نے جواب نہیں دیا۔

ناہید کے بچے بھی کمرے میں نئے بستر کے اضافے پر پوچھتے رہے۔ برعکس ہے بجاپ اس نے بھی نہیں بتایا۔ ہاں ممتاز دیکھ کر ٹھٹکی "کہیں اس کا بھوتنی کی عقل والا وہ جاہل ابا تو نہیں آرہا۔ تعویز گنڈے کا ماہر۔ آج تک اس کے کسی تعویز کا اثر بھی ہوا نہ اس کے والد پہ ہوا۔ پر اس کی شکل ..."

"اے ناہید بھابھی! یہ کیا تیاریاں کر رہی ہو کہیں تمہارا وہ ... ہے تو نہیں آرہا جس سے تمہاری بات پکی ہونے سے پہلے ہی ... سال ... بنا کے لاہور گیا اور خالہ کی بیٹی سے نکاح کر لیا تھا۔"

ناہید بری طرح تلملائی۔ سیانے کہتے ہیں اپنا راز اپنے تک ہی رکھنا چاہیے پر ناہید نے کب کسی سیانے کو کچھ سمجھا تھا۔ شادی کے شروع دنوں میں جب دیورانی جیٹھانی کے تعلقات اچھے تھے۔ ممتاز کو ماضی کا ایک دکھی رنگ دکھا دیا تھا اور ممتاز نے تو اسے بلیک میل ہی کر ڈالا تھا۔

اس نے جواب نہیں دیا منہ بنا کر اسٹور میں گھس گئی مگر ممتاز کا قہقہہ دیر تک ہی جلاتا رہا۔ "خالد ایک بار پسند کرلے پروین کو۔ ایسے ہی قہقہے میں بھی لگاؤں

گی' یہ ٹھیک کہ پروین کی صلاحیتیں ناقابل شکست ہیں مگر پھر بھی اباجی سے اگر ایک عدد تعویز بھی بنوا لیا جائے تو سونے پر سہاگا ہو سکتا ہے۔" جونہی ممتاز رات کے کھانے کی تیاری کے لیے کچن میں گھسی ناہید نے چپکے سے فون پر اباجی کے سیل فون کا نمبر گھمایا مگر اباجی اس وقت اپنی ایک نوجوان مریض کا ہاتھ اپنے فولادی ہاتھ میں لیے اس کا قصہ غم سننے اور غم غلط کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے ایسے میں اگر فون آجائے تو صرف نظر انداز ہی کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے بھی ایسا ہی کیا مگر فون کرنے والا بھی ڈھیٹ تھا۔ فون توڑ کے دم لیا۔ مریضہ پھر آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوئی۔ اباجی نے ڈانٹ بیٹی کو غصہ ضبط کرتے ہیلو کہا۔

"اباجی کیسے ہیں' گھر میں سب ٹھیک۔ فون کیوں نہیں کیا؟" بیٹی خفا تھی۔

"جب نہیں اٹھا رہا تھا تو بار بار کیوں تنگ کر رہی تھی' کیا کاٹ رہا تھا میں' دل و دماغ کی راحت کے لیے سب کچھ تھے سوا کر دیا تو نے۔ ہاں بول کیوں فون کیا تھا؟"

جواب میں ناہید نے سب کہہ سنایا۔

"ٹھیک ہے میں پروین کو بھجواتا ہوں اپنے کالے منتر کے ساتھ۔ تیرے لیے تعویز بھی دے دوں گا۔ تو منتر کو بھی اپنے پاس رکھ لے کچھ دنوں کے لیے۔ ادھر ہوتا ہے تو مجھے دھیان سے کام نہیں کرنے دیتا۔" (اب یہ نہیں بتا سکے وہ کون سے کاموں کی راہ میں رکاوٹ ہے)

اور ممتاز یہ نہیں کہہ سکی "اباجی آپ کا دماغ ٹھکانے جتنا بھی نہیں ہے۔ جوان بھائی گھر میں موجود ہو گا تو اپنی پروین بھلا کیا رنگ ڈھنگ دکھا سکے گی۔"

کچھ ایسا ہی فون رات کو ممتاز نے بھی ایمان کو کیا تھا۔

"پھر آرہی ہے ناں تو کل؟"

"ہو باجی ... بھائی یونس کے ساتھ آرہی ہوں۔

ویسے یونس تو مان نہیں رہا تھا۔ کہتا ہے' آپا کے پھر تبھیر بچے ... کی مصنوعی محبتیں مجھے وارا نہیں کھاتیں۔"

"ہائے ایسا کہتا ہے یونس میرے بارے میں۔ میرے ہاتھوں میں پلا بڑھا' یہ قدر ہے اسے میری۔"

"جذباتی نہ ہو آپا! وہ ہے ہی بڑا بکواسی۔ کسی چھوٹے بڑے کا کوئی لحاظ ہی نہیں ہے اسے۔ کل بڑی پھپھو آئی تھیں۔ اسے بھی بڑی باتیں سنائی ہیں اس نے۔"

"خیر' یہ تو بڑا اچھا کیا ہے۔" ممتاز کا دل باغ باغ ہوا۔ سارے رنج و ملال جاتے رہے۔

"بڑی پھپھو اپنی پلپلی کھٹی بیٹی کا رشتہ کرنا چاہتی تھی نا یونس کے ساتھ۔ یونس نے کہہ دیا' جج کسی قاتل کو قتل کی سزا دیتا ہو تو اسے تمہاری بیٹی کے ساتھ بیاہ دینا چاہیے۔ رو رو کے کہے گا' اس سے بہتر ہے مجھے پھانسی دے دو۔ پھپھی ایسی باتیں سن کے روتی ہوئی ہمارے گھر سے نکلی ہے اور اباجی نے بعد میں یونس کی چھترول کرنے کی بھی کوشش کی ہے پر' آپا' اتنا پھرتیلا ہے کہ باندروں کو بھی اس سے ٹریننگ لینی چاہیے مجال ہے جو ایک وار بھی کارگر ثابت ہوا ہو۔ بے چارے اباجی ہانپ کانپ کے خود ہی بیٹھ گئے تھے۔"

ممتاز کو اباجی پر ذرا ترس نہیں آیا کہ وہ اس وقت پھپھی کی حسرت و غم میں ڈوبی تصویر تصور کی آنکھ سے دیکھ کر نہال ہو رہی تھی۔

"آپا میں سوچ رہی ہوں بالوں میں سبز اور سرخ لہریے ڈلوا لوں۔" زرینہ عرف ایمان کی آواز جھٹکے سے حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔

"نی میں نے تیرا ویاہ کسی طوطے سے نہیں کرنا' خبردار جو ایسا کیا ورنہ میں نے لحاظ نہیں کرنا۔ ٹنڈ کر دینی ہے۔"

اچھا اچھا نہیں ڈائی کرواتی۔ ایک تو کسی کو فیشن کی سمجھ ہی نہیں ہے۔"

"جے تو آٹھ کے بجائے چودہ جماعتیں پڑھ لیتی تو پھر یہ فیشن تیری سمجھ سے بھی باہر ہوتے۔ خیر جو ہونا تھا

ہو گیا۔ حسرت منہ پل دو ہی جا کے کر لیں سارے شوق پورے۔"

"تیرے منہ میں گھی شکر آپا!"

"نی گل سن لو ہی جا کے بہن کو بھول نہ جانا۔ یاد رکھنا تیری قسمت میری وجہ سے کھلی ہے۔" مگر تب تک زرینہ عرف ایمان فون بند کر چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

شام کو ٹی وی آن کیا گیا۔ رات کے گیارہ بجنے کو تھے اور ابھی تک رویت ہلال کمیٹی والے اجلاس جاری رکھنے پر بضد تھے۔

"اب تو لگتا ہے انہوں نے خود ہی کوئی چن چڑھانا ہے۔"

ناہید کے میاں شوکت نے جل کر کہا تھا۔

"میرا خیال ہے اب سونا چاہیے۔" ممتاز کا میاں جلال بھی تھکن اور نیند سے بے حال تھا۔

"نہیں، نہیں ابا! یہ ٹی وی والے پورے شیطان کے چیلے ہیں۔ یہ تو چاہتے ہی ہیں کل آدھا ملک بغیر روزے کے ہو۔" بیٹے کی بات پر سارے پھر ڈٹ کے بیٹھ گئے۔

بارہ بجے اعلان ہوا۔ "رمضان المبارک کا چاند نظر آگیا ہے۔ کل ملک میں پہلا روزہ ہو گا۔" وہی اناؤنسر جو گیارہ بجے تک دوپٹہ رسی کی طرح گلے میں ڈالے بیٹھی تھی۔ اب سر پہ دوپٹہ اوڑھے نورانی میک اپ کروا کر اعلان کر رہی تھی اور ساتھ بیٹھا مرد اناؤنسر جس کی آنکھوں سے اسکرین پر بھی شیطانیت سی جھلکتی محسوس ہوا کرتی تھی۔ اب ٹیز لگا کر مہذب بنا بیٹھا قوم کو بابرکت مہینے کی آمد پر نیک تمناؤں سے نواز رہا تھا۔ ان سب نے بھی ایک دوسرے کو مبارک باد دی اور گھر میں ایک خوب صورت سی چہل پہل کا آغاز ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

سحری کھانے کے بعد عورتیں جو سوئی ہیں تو پھر آنکھ دن کے دس بجے ہی کھلی۔ مرد صبح سویرے معمول کے مطابق گھر سے نکل گئے تھے۔ بچوں کے لیے ناشتا سحری کے ٹائم ہی بنا دیا گیا تھا۔ وہ بھی اپنے مقررہ وقت پر اٹھے۔ ناشتا کیا اور موسم گرما کی طویل چھٹیوں کو یادگار بنانے کے لیے گلی محلے میں نکل گئے۔

جب ان دونوں کی آنکھ کھلی ہے تو سورج پوری آن بان سے چمک رہا تھا۔ تیز آنکھوں کو چبھنے والی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ بچوں نے پورے برآمدے کو بطور ڈائننگ ٹیبل استعمال کیا تھا۔ یہاں سے وہاں تک برتن لڑھک رہے تھے۔ غرض گھر پر عجیب نحوست کا راج تھا۔

"صحیح کہہ گئے ہیں علامہ صاحب "وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ" آج ہم دونوں سو گئی ہیں تو ہر پاسے پھٹکار برس رہی ہے۔"

ناہید نے ممتاز کی بات سے پورا اتفاق کیا، پھر یاد آیا" آج تو گاؤں سے پروین اور صفدر بھی آرہے ہیں۔ دونوں ہی روزہ رکھنے کے چور ہیں۔" "آئے ہائے بازار میں بھی کھانے پینے کو اس وقت کچھ نہیں ہو گا۔ خیال ہی نہیں رہا، بہنی سے کہتی یا تو افطاری کے وقت آتے پھر اپنا بندوبست کر کے آتے۔" "میں ایک وقت بھی یہی خیال ممتاز کو بھی آیا تھا۔

"اگر جو ایمان اور یونس اس وقت آگئے تو بڑی مصیبت ہو جانی ہے۔ اب ... یا ان کے لیے کچھ پکاؤں۔ چلو ... ایک تو یہ بچے بھی نا ... رستے میں پھینکتے ہیں۔ اگر جو گر جائے ... تے ہی گزر جانی ہے۔"

... برتن سمیٹے اور دھونے بیٹھ گئی۔ ممتاز صفائی پہ لگ گئی۔ اس گھر میں کوئی لمبی چوڑی صفائی تو ہونی نہیں تھی، بس آدھے گھنٹے میں ان کے حساب سے سب سیٹ تھا۔ فریزر میں چکن رکھا تھا۔ پیاز، ادرک، ٹماٹر، لہسن، آئل، مسالا جات، چکن سمیت کوکر میں ڈال کر چولہے پر چڑھا دیے گئے۔ ہاں البتہ یہ شر نہیں دیا گیا کہ چکن کا حلوہ کھلانے کا موڈ نہیں تھا۔

"او ویں عورتیں اتنی محنت کرتی ہیں ہانڈی تو اس طریقے سے بھی اچھی خاصی بن جاتی ہے۔"

ادھر ہانڈی تیار ہوئی تھی ادھر موٹی پروین تے صفدر نے دروازے سے جھانکا۔

"آپا! میں آگئی۔" پروین نے لاؤڈ سے نعرہ لگایا تھا اور کمرے میں بیٹھی ممتاز یہ آواز سن کر حیران پریشان باہر کو لپکی تھی۔

"ہائے ہائے اس مصیبت نے بھی آج ہی نازل ہونا تھا اور ساتھ یہ سرکس کے جوکر کی شکل والا ناہید کا بھائی۔ توبہ نرالے نمونے ہی لا دیتا ... ہیں یہ رب نے۔"

"بھابھی آنکھیں ... کیا دیکھ رہی ہو۔ پنڈ سے میرے بھائی ... آئے ہیں اور خیر سے خالی ہاتھ نہیں آئے ... ہمارے ... میکے والوں کی طرح۔"

ممتاز ... اس بات نے بری طرح تپایا۔ "آہو جو ہوتے چاولوں کے بورے بھر کے یہ لاتے ہیں نا سب ... ہے۔"

"تو چھوڑ پروین ان باتوں کو۔ چل چادر اتار، منہ ہاتھ دھو لے۔ تجھے کس نے کہا تھا بس میں میک اپ کر کے سوار ہونے کو؟ میک اپ پہ مٹی جے خالد نے دیکھ لیا تے سمجھ لے میں بندوق کی نوک پہ نکاح کرنے کو بولوں گی، تب بھی نہیں کرے گا۔ تے صفدر میرا چن، میرا ویر تو کیوں حیران پریشان کھڑا ہے، چل اندر چل کے بیٹھ، ٹی وی لگا لے، اس وقت بڑے اچھے پروگرام آرہے ہوتے ہیں۔"

ممتاز نے دانت پیس کر دونوں نمونوں کو دیکھا اور کمرے میں گھس کر دروازہ زور سے بند کر لیا۔

"نی پنڈ سے لائی کیا ہے؟" ناہید بہن سے پوچھ رہی تھی۔

"آپا یہ دیسی گھی ہے۔ کافی پرانا ہو گیا تھا بساند بھی پڑ گئی تھی تو اماں کہنے لگی شہر لے جاؤ۔ ناہید کے بچے سب کھا لیتے ہیں اور یہ اچار ہے۔ ہلکی ہلکی پھپھوندی لگ رہی ہے۔ جلدی کھا لینا۔"

"دفع دور۔ آئے اماں کا فون، کروں گی بات ناں، بیاہ دیا تو کیا میری محبت بھی دل سے نکل گئی۔"

"چھوڑو آپا! یہ بتاؤ پکایا کیا ہے؟"

"تیرے بھائی کا ... ولایت سے آرہے تھے جو میں مرغے بنایاں بڑھائی، فریج میں کل کی دال رکھی ہے۔ آٹا بھی پڑا ہوا ہے۔ روٹی پکاؤ اور کھاؤ۔ میرا روزہ ہے، مجھے تنگ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔"

"دال تے وہ بھی باسی۔" پروین بری سی شکل بنا کر بولی۔

"یاد رکھ! تو یہاں میرے لیے نہیں، اپنے رشتے کے لیے آئی ہے۔ مجھ پر رعب پانے کی بالکل کوشش نہ کریں۔"

دھاڑ سے دروازہ بند کر کے ناہید بھی غائب ہو گئی۔ راستے میں گھر سے ساتھ لایا ناشتا تو کر لیا تھا۔ اب خوامخواہ دال کیوں کھائی جائے۔ افطاری تک آرام سے انتظار کیا جا سکتا ہے۔ پروین یہیں برآمدے میں بیٹھ گئی۔ دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ آنے والے ایمان اور یونس تھے۔ ایمان کو سخت گرمی لگ رہی تھی۔ تیزی سے چلتی سامنے ٹی وی والے کمرے میں گھس گئی۔ یونس اس کا بھاری بیگ اٹھائے خاصا تھک چکا تھا۔ یہیں برآمدے میں پڑی ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

"پانی لاؤں آپ کے لیے؟" پروین نے آنکھیں پٹپٹائیں۔ یونس کی تھکان ہوا ہوئی۔

"ضرور۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔" اور پروین شرما گئی۔ ذرا دیر بعد ٹھنڈے ٹھار پانی کے پورے جگ کے ساتھ حاضر تھی۔

"آپ کی اور میری باجیاں غالباً گھر میں نہیں ہیں۔"

"گھر ہی میں ہیں۔ سو رہی ہیں۔ اللہ نے شاید مجھ سے آپ کی خدمت کروانی تھی۔" پھر سے شرما کر کہا گیا۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں جب ایمان داخل ہوئی صفدر ایک انگریزی فلم کے "خالص انگریزی" سین میں مگن تھا۔

"ہائے اللہ!" ایمان گڑبڑائی۔ صفدر چونکا۔ ٹی وی

آف کر دیا۔

"آپ... میرا مطلب ہے آپ بہن ہو نا اپنی بھابھی ممتاز کی۔"

"ہاں جی! اور آپ بھابھی ناہید کے بھائی ہو۔"

"ہاں جی! اس غلام کو چوہدری صفدر کہتے ہیں۔ پورے چار مربعوں کا مالک ہوں۔ یہاں سے وہاں تک ہماری ہی زمینیں ہیں۔"

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

"آؤ جی بیٹھو! کھڑی کیوں ہو۔ اتنی نازک سی ہو۔ تھک جاؤ گی۔"

ایمان ٹھٹکی پھر مسکرائی۔

"اف کیسا پیارا لفظ ہے نازک ورنہ اماں اور بھائی چھپکلی اور محلے والے ماچس کی تیلی کہہ کر چھیڑتے ہیں۔ چوہدری صفدر کو دل رکھنا آتا ہے۔ ہیرے کی قدر جوہری کو نہیں تو پھر کسے ہوگی۔"

☼ ☼ ☼

پانی کے دو گلاس پی کر یونس کی جان میں جان آئی تھی۔

"بہت اچھی ہو آپ۔ شہر میں ایسی سگھڑ اور خدمت گزار لڑکیاں ڈھونڈے سے نہیں ملتیں۔"

پروین نے اس تعریف پر چونک کر یونس کو دیکھا۔ وہ بھی ادھر دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملیں اور جھک گئیں۔

"میں نے اتنی خوب صورت آنکھیں آج تک نہیں دیکھیں۔"

یونس کی اس تعریف پر پروین جتنا بھی خوش ہوتی، کم تھا۔ آج تک ان آنکھوں پر یقیناً کسی نے غور نہیں کیا تھا، ورنہ تعریف ضرور کرتے۔

"آپ کا روزہ تو ہے نہیں۔ بھوک لگی ہوگی۔ روٹی ڈالوں آپ کے لیے؟"

"نہیں ابھی نہیں۔ بیٹھو کچھ باتیں کرتے ہیں۔"

کمرے میں بھی ایسی ہی سچویشن تھی بلکہ اس سے بھی فاسٹ۔ ایمان نے صفدر کو اپنا [illegible] دے دیا تھا اور اس کا لے لیا تھا۔

شام کو ناہید اور ممتاز اپنے اپنے کمرے سے افطاری کی تیاری کے لیے نکلیں تو یہ سب گھل مل کر بیٹھے تھے۔ خوب ہنسی مذاق چل رہا تھا۔ دونوں کو حیرت ہوئی۔ کچھ اچھا بھی نہیں لگا مگر اس وقت بولیں کچھ نہیں۔

جلدی سے پیسے نکال کر پپو اور جانی کو قریبی بازار سے سموسے، پکوڑے لینے کے لیے دوڑایا اور گھر میں شربت بنانے کی تیاری ہونے لگی۔

"آپا! بازار کے باس پڑے سموسے، پکوڑے کیوں منگوا لیے؟ میں ہوں ناں سب بنا لیتی۔" پروین نے بطور خاص یونس کو سنانے کے لیے کہا تھا اور یونس نے سن بھی لیا۔

"آپا! صرف سموسے، پکوڑے؟ اتنی دور سے مہمان آئے ہیں، کچھ تو گھر پر بنا لیتیں۔" یہ سمجھانے والی ایمان تھی۔

"ناں اتنی گرمی اور پھر ہمارا روزہ بھی ہے۔ شرم نہ آئے گی روزہ داروں سے کام کرواتے۔"

"چلو آؤ پروین! ہم خود کچھ بنا لیتے ہیں۔" دونوں کچن میں گھس گئیں۔

دوپہر کو اسی گھر میں استعمال ہونے والی ترکیب بنایا گیا۔ چکن سالن پڑا قسمت کو رو رہا تھا۔ ایمان نے پیاز کاٹی، دیگچی میں آئل ڈال کر چولہے [illegible] ذرا گلابی ہوئی تو اسی سالن کی بوٹیاں نکال کر اس میں ڈال دیں۔

پروین نے اور [illegible] افطاری سے پندرہ منٹ پہلے چکن [illegible] کے چاول تیار تھے۔

جمال اور شوکت [illegible] چکے تھے۔ دونوں بھابھیوں نے بے دلی سے [illegible] کے بارے میں پوچھا تھا۔ پتا چلا وہ [illegible] افطاری تھی۔ ادھر چلا گیا ہے۔

"[illegible] بتا کے تو جاتا۔" ناہید کو کوفت ہوئی۔

"تو اور کیا! آئے گا تو پوچھوں گی۔" ممتاز کو بھی اس غیر ذمہ داری پر قلق تھا۔

افطاری کے بعد ممتاز اور ناہید پر تو عجیب سستی سوار ہوئی۔ جہاں بیٹھی تھیں، بیٹھی ہی رہ گئیں۔ لڑکیوں نے سب سمیٹا اور پھر چاروں چھت پر چلے

گئیں۔

یہ ایمان بھی پاگل ہے اس موٹو سے دوستی گانٹھ کر اسے یہاں رکنے کا جواز مہیا کر رہی ہے۔ سمجھاؤں گی اسے۔ دور، دور رہے۔" کچھ ایسا ہی ناہید بھی سوچ رہی تھی۔

خالد دیر سے گھر آیا۔ دونوں بھابھیوں نے ایک تو کھانے کے بارے میں پوچھا مگر وہ کھانا کھا کر آیا تھا۔ اگلے روز یونس اور صفدر کی واپسی تھی۔ ان کے جانے کے بعد ناہید اور ممتاز نے بہنوں کو کمرے میں بلا کر خوب ڈانٹا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے [illegible] کاٹنے کی۔ انسان بن کے رہو۔"

"ناں [illegible] ہے، تو سویرے سارے برتن دھونے کھڑی [illegible]"

"[illegible] نے یہ نہیں دیکھا آپا! سارا کچن پروین نے سمیٹا تھا۔"

"اوہو! کچن سمیٹنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ تو بڑی بھولی ہے، ان دونوں بہنوں کی مکاریوں کو نہیں سمجھتی۔"

ناہید نے بھی بہن کو سمجھایا تھا۔

"یہ دونوں بھینسیں صورت ہی انسانوں والی رکھتی ہیں۔ اصل میں پوری ڈائنیں ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے منہ لگانے کی۔"

"ہاں پر آپا! میں اتنے دن کیا دیواروں سے باتیں کروں۔"

"ناں موٹے تجھے میں نظر نہیں آتی۔"

"آپا! تیری گفتگو بڑی بور ہوتی ہے۔"

"بہنو! تیرا دماغ کچھ زیادہ خراب نہیں ہو گیا۔"

"ناں آپا! میں نے بھلا غلط کہا ہے۔ تجھے فلموں کے اداکار پسند ہیں تو وہ اس زمانے کے جب میں آٹھ دس سال کی بچی تھی۔ گانے پسند ہیں تو وہ نحوست مارے رونے دھونے والے۔ ان دو باتوں سے ہٹتی ہے تو بھائی شوکت کے قصے لے کر بیٹھ جاتی ہے، جنہیں سننے سے بہتر ہے بندہ پرانی موٹر سائیکل کی آواز سن لے۔"

"نی تو تو بڑی بدلحاظ ہو گئی ہے۔ آنے دے اماں کا فون۔ بتاؤں گی اسے۔"

"اچھا چھوڑ ان باتوں کو یہ بتا آپا! آج افطاری میں کیا بنے گا؟"

"[illegible] بس کر۔ ہر وقت کھانے پینے کے بارے میں نہ سوچا کر۔ کھا کھا کے تو موٹی بھینس بن چکی ہے۔"

"مجھے لگتا ہے آپا! تو نے مجھے بے عزت کرنے کے لیے ہی بلایا ہے۔"

"اچھا تیری کبھی کوئی عزت بھی رہی ہے۔ چل اٹھ دفع ہو۔ بال بنا اٹھ کے۔ پوری کڑک مرغی لگ رہی ہے۔ وہ دیکھا ہے اس سینک سلائی کو کیسی بنی ٹھنی رہتی ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بندہ دوسری نظر ڈالنے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔"

"آپا! یہ تیرے بچے پہلے سے بھی زیادہ بدصورت نہیں ہو گئے۔" وہ کیا کہہ رہی تھی، بنو کیا پوچھ رہی تھی۔ پہلے تو زور کا دھکا بنو کو دیا پھر چلانے لگی۔

ادھر ایمان کے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی سچویشن تھی۔ اس نے بیگ سے اپنے کچھ نئے لان کے جوڑے نکالے تھے، جو آپا بیگم کو ازحد بھا گئے تھے۔

"نی تو اور بنا لینا، یہ مجھے دے دے۔"

"میں دے تو دوں آپا! پر یہ سوچ لے تو اس ہیوی ویٹ کے ساتھ انہیں پہنے گی کیسے۔ یہ تو نازک حسینہ کے ناپ کے ہیں۔"

"رمضان کے بعد میں بھی تو اسمارٹ ہو جاؤں گی۔"

"اوہو! اگر افطاری میں چار بندوں کا حصہ اکیلے ہڑپ کرنا چھوڑ دے تب۔"

"نی ایمان، بے ایمان مجھے لگتا ہے تجھے دیورانی بنانے کا خواب دیکھ کے میں کچھ اچھا نہیں کر رہی۔ تو بہن نہیں ڈائن ہے۔ نظر رکھتی ہے میرے کھائے پیے پر۔ چل نکل جا میرے کمرے سے، روزہ نہ ہوتا تو میں نے طبیعت صاف کر دینی تھی تیری۔ فاقہ زدہ بیمار چڑیا، وہ بھی نسواری رنگ کی۔"

"آپا!" ایمان کا احتجاج بلند ہوا۔

"وہ یاد مت بھول تو یہاں میرے لیے نہیں آپ نے لی گئی ہے۔" آپا نے بولتی بند کروادی۔

اب اگر پنو کی کمپنی نہ بھاتی تو کسی کی بھاتی۔ دونوں آپائیں روزہ رکھ کر یا تو سوتی رہتی تھیں یا پھر محلے کے دورے پر نکل جاتی تھیں۔ گھر میں یہ دونوں ہوتی تھیں اور ان کی باتیں۔ ایمان نے پنو کے چہرے کا مساج بھی کیا، فیشل بھی اور پنو نے جواب میں ایمان کو ایک لان کا سوٹ سی کر دیا اور دوپٹے پر کروشئے کی خوب صورت بیل بھی لگادی۔

اسی روز بھی دونوں آپائیں ٹوئٹر پر تھیں۔ پنو نہا رہی تھی۔ ایمان برآمدے میں بیٹھی ہاتھ پر مہندی سے بیل بوٹے بنانے کا سوچ رہی تھی کہ اچانک خالد گھر آگیا۔

یہ خالد سے اس کی تیسری ملاقات تھی۔ پہلی دو ملاقاتوں میں وہ اسے خشک مزاج اور اکھڑ لگا تھا اور ان دونوں ملاقاتوں کے بعد ایمان اور پنو نے چپکے چپکے اس پر تبصرے بھی کافی کیے تھے۔

"السلام علیکم!" مہندی کی کون سائیڈ پر رکھ کر اس نے جلدی سے کہا۔

"بھابھی کہاں ہیں؟" جواب میں وعلیکم کہنا بھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔

"گھر پہ نہیں ہیں کوئی کام ہے تو بتائیں۔ پانی پئیں گے آپ اگر کہیں تو شربت بنا لاتی ہوں۔"

"الحمدللہ! مسلمان ہوں میں۔" ایسے کھلے انداز میں جتایا گیا کہ ایمان جیسی بڑی سے بڑی بے عزتی کو بھی خاطر میں نہ لانے والی کٹ کے رہ گئی۔

کچھ ایسا ہی اتفاق ایک روز پنو کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ آپائیں ٹوئٹر پر تھیں۔ ایمان کمرے میں تھی۔ خالد صاحب کی آمد ہوئی اور آتے ہی پھر سے جانے کی تیاری بھی ہونے لگی۔ شرٹ استری نہیں تھی۔ پنو نے پیش کش کردی اور خالد صاحب برا مان گئے۔

"معذور نہیں ہوں میں۔ ہاتھ سلامت ہیں۔ خود بھی پریس کر سکتا ہوں۔"

"آپا! تمہارے دیور کا دماغ مجھے کچھ خراب لگتا ہے۔" پنو نے بہن سے شکایت کی اور قصہ بھی سنا دیا۔

"چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پہ نہ لو۔ آخر کو اتنا پڑھا لکھا ہے، پھر باہر بھی جا رہا ہے۔ اتنا تو حق بنتا ہے ناں اس کا۔ تو ذرا عقل کو ہاتھ مار۔ قابو میں کر اس کو۔ میں تیرے بھلے کے لیے ہی کہہ رہی ہوں۔"

"خالد! میرا پیارا بھائی، یہ روز روز گھر سے باہر کیوں افطاریاں کرتا ہے؟ گھر میں ہم تیرا انتظار ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔ قسمے تیرے بغیر دسترخوان پہ بالکل رونق نہیں ہوتی۔"

ممتاز نے جب بڑے وارے۔ بات کہی تھی، خالد نے جواب میں صرف اچھا کہا تھا۔ اصل میں ماضی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا تھا۔ ابھی چند سال پہلے تک وہ گھر کا نکما ناکارہ فرد تھا۔ افطاری میں اس کو ایک گلاس شربت، چند پکوڑے تھماتے ہوئے بھی بھابھیوں کا دل دکھتا تھا۔ یہ رب کی مہربانی تھی کہ آج وہ ہی بھابھیاں آگے پیچھے تھیں، مگر اب اسے کسی کی ضرورت نہیں تھی۔

"خالد کے جانے میں بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں اور تو وہیں کی وہیں کھڑی ہے، بالکل بھس۔" ممتاز نے بہن کو ڈانٹا تھا۔

"تیرا دیور توجہ دے تب ناں آپا!" اس نے بے نیازی سے کہا تھا۔

"ہاں اتنی بڑی توپ ہے ہونی چڑیلے سارے گر تجھے آتے ہیں۔"

ایمان موبائل پر کوئی گیم کھیل رہی تھی، مصروف رہی۔

☆ ☆ ☆

خالد چلا گیا، بھابھیوں نے جانے سے پہلے پچھلے سارے برسوں کی کسریں نکالیں اور گزرا وقت اس کے ذہن سے بالکل صاف کرنے کے لیے خاصے جتن کیے۔

"ویسے جی! چاہیے تو یہی تھا خالد کے پیروں میں

نکاح کی بیڑی ڈال کے اسے روانہ کیا جاتا۔ پر آپ نے میری ایک نہیں سنی۔ تیرا ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ بات پکی کردیں اس کی۔" ممتاز نے میاں سے اصرار کیا تھا۔

"ہاں پر ایسے کیسے، وہ کوئی دودھ پیتا بچہ تھوڑی ہے۔"

"او ہو میرا مطلب ہے دباؤ ڈالیں اس پہ۔ دیکھیں ناں اگر میری بہن ایمان سے اس کی شادی ہو جاتی ہے تو اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔ ہم دونوں بہنیں، آپ دونوں بھائی، خالد کو ایمان کبھی ہماری مدد کرنے سے نہیں روکے گی۔"

"خالد کا دماغ خراب نہیں ہے، جو وہ تمہاری بہن سے شادی کرے گا۔"

"کیوں میری بہن میں کیا کمی ہے جی؟"

"جی تمہاری بہن میں نہیں تم میں ہے۔ تنگ دل عورت بھول گئی ہو، ابھی تھوڑے سال پہلے تک کیا سلوک تھا تمہارا میرے بھائی کے ساتھ۔"

"تم زور دو ناں خالد پہ۔ دیکھو ناں فائدہ صرف مجھ اکیلی کا تو نہیں ہے۔"

کچھ ایسا ہی سبق ناہید نے بھی میاں کو پڑھایا اور کافی حد تک قائل کر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

عید سے کوئی ایک ہفتہ پہلے دونوں بہنوں نے واپسی کا اعلان کر دیا۔

"ہائے ہائے ایسی کیا جلدی ہے۔ عید کر کے جانا۔" ناہید نے پنو کو سمجھانا چاہا۔

"ناں آپا! تمہارے ہاں عید پہ بھلا بنتا کیا ہے، پھیکی بدمزہ سویاں اور دو سیر میں پاؤ گوشت سے ایک کلو چاول کی بریانی۔ میں تو عید اپنے گاؤں جا کے کروں گی۔"

"خالد کی تنخواہ آنے دے۔ حالات بدل جائیں گے ہمارے، پھر تجھے پتا چلے گا میں جو کہہ رہی ہوں، بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔"

"نہیں آپا! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ عید تو گاؤں جا کے اپنی سکھی سہیلیوں کے ساتھ ہی مناؤں گی۔ دیکھو ناں اگلے سال تو پتا نہیں کہاں ہوں گی۔ سسرال والے عید پہ میکے جانے بھی دیں گے یا نہیں۔" ناہید بہن کی بات پر قہقہہ لگا کے ہنس پڑی۔

"ہے بڑی چالاک تو۔" "ناں میں تیری بہن، تیری پیاری، تجھے بھلا کیوں منع کروں گی، بلکہ ہم دونوں عید پہ گاؤں جائیں گے اور دبئی کی کمائی کی شو ماریں گے۔ بھابھی تو جل جل جائے گی۔"

اس بات کا پنو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ادھر پنو نے گاؤں جانے کی بات کی، ادھر ایمان نے بھی واپسی کی رٹ لگادی۔ یونس اور صفدر ایک ہی دن انہیں لینے کے لیے آئے۔ جلدی واپسی کا شور مچا دیا۔ ممتاز نے ٹھیک تین گھنٹے بعد میکے فون کر کے ایمان اور یونس کے گھر پہنچ جانے کا پوچھا تو پتا چلا یونس شام تک واپسی کا کہہ کر گیا ہے۔ کچھ ایسا ہی جواب میکے سے ناہید کو بھی ملا، وہ حیران تو ہو گئی مگر بچوں کی لڑائی نے زیادہ دیر اس موضوع پر سوچنے کا موقع نہیں دیا۔

☆ ☆ ☆

عید سے دس بارہ دن پہلے خالد نے عیدی بھجوائی تھی جو اتنی کم تھی کہ بھابھیوں کے ارمان کسی طرح بھی پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ "کنجوس، مکھی چوس، پر چلو خیر ہے اگلے سال تو تگڑی رقم ہوگی ہمارے ہاتھ میں۔" دونوں نے اپنی اپنی جگہ یہی سوچا تھا۔

پنو کا رنگ ہے تو کالا کالا سا۔ منگنی کا جوڑا کسی ہلکے رنگ کا ہی اچھا لگے گا۔

ادھر ممتاز سوچ رہی تھی ایمان نے میری کہاں سننی ہے۔ فیشن کے مطابق ہی کوئی سڑن جوگا رنگ پہن کے اپنی طرف سے حور پری بن کے بیٹھ جائے گی۔ ویسے خود پہ اتنا اعتماد بھی اچھا نہیں، ہونا لوگ اشارے کر کر ہنس رہے ہیں اور آپ غرور سے سر اٹھا کر بیٹھی ہیں۔ ویسے اللہ نے قسمت بڑی اونچی بنائی ہے میری بہن کی۔ شکل میں مجھ سے کہیں کم ہے، پر نصیب دیکھو، دبئی چلی جائے گی۔

"دیکھ رہے ہو نا۔ ان جی! کتنے کم پیسے بھیجے ہیں خالد نے۔ بھول گیا ہے بھائیوں کی محبت کو۔ اس لیے کہتی ہوں پروین کے لیے راضی کر لو اسے۔"

"اوہو! پروین تو جیسے آدھی تنخواہ تجھے بھجوا دیا کرے گی۔ ہے نا! اور تیری بہن شکل سے ہی خود غرض لگتی ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ بڑا پیار کرتی ہے وہ مجھ سے اور میرے بچوں سے۔"

ناہید نے اپنے میاں کو قائل کیا تو ممتاز نے اپنے سرتاج کو مجبور کر دیا تھا۔ دونوں نے اپنے اپنے طور پر خالد کو قائل کرنے کی کوششیں تیز تر کر دی تھیں۔

عید سے کوئی چار دن پہلے ممتاز کی اماں کا فون آیا تھا۔

"اس واری عید تم میرے ساتھ کرنا۔"

ممتاز نے اترا کر ناہید کو بتایا تو پتا چلا ادھر سے بھی ایسی ہی دعوتیں آچکی ہیں۔

ایک ہی دن ناہید اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ گاؤں کو اور ممتاز اپنے شہری میکے کو روانہ ہوئی تھیں۔

عید اور اس سے پہلے رمضان کی رونقیں ہوتی ہیں مگر اس مرتبہ تو چمک دمک ہی اور تھی۔ پتا چلا اماں نے پروین اور صفدر کے رشتے ایک ہی گھر میں طے کر دیے ہیں۔

"مجھے بتایا تک نہیں؟" ناہید بگڑی تو اس کے میاں نے بھی اسے ہتک عزت قرار دے دیا۔

"یہ عزت ہے ہماری۔ ہم تو واپس جا رہے ہیں۔" والدہ نے دلداری دکھانے کی کوشش کی۔

اماں نے جھاڑ کر ہوا نکال دی۔

افطاری سے پہلے مہمانوں کی آمد ہوئی تب تک ناہید غصہ تھوک کر میک اپ تھوپ چکی تھی۔ مگر یہ کیا؟ آنے والی تو ممتاز، اس کی بھی ناک والی اماں، سڑی سڑی بہن اور بینگنی رنگ کا بھائی تھے۔ ناہید کی اماں اور بھابھی لپک لپک کر ان سے مل رہی تھیں۔

"انہیں کیوں بلا لیا ہے۔" چپکے سے ناہید نے بھابھی کے کان میں کہا۔

"ہائے نی! انہیں کیوں نہیں بلاتا تھا۔ یہ ہی تو صفدر اور پروین کے سسرالی ہیں۔ ہم نے پروین کا رشتہ یونس سے اور صفدر کا ایمان سے طے کر لیا ہے۔ ویسے اب ایمان نے اپنا نام بدل کر جاناں ملک رکھ لیا ہے۔"

"ہائے ربا! اے کی؟ مجھے خبر ہی نہیں۔" ایسی ہی بجلی ممتاز پر بھی گری تھی۔ ماں نے یہ تو بتایا تھا بھائی بہن کا رشتہ گاؤں میں طے کیا ہے، مگر یہ نہیں بتایا میسنی ناہید کے گھر میں طے کیا ہے۔

"اور وہ خالد؟" ممتاز نے میاں سے پوچھا۔

"خالد نے انکار کر دیا تھا۔ وہ کہتا ہے شادی اپنی پسند سے کسی معقول لڑکی سے کرے گا۔"

"اور ادھر یہ سب ہوا کیسے؟" دونوں حیران تھیں۔

"یہ چن آپ کے گھر ہی چڑھائے تھے ہم نے۔" دونوں چھوٹیوں نے شرما کر اطلاع دی تھی۔

"کلمے منہ!" اماؤں نے ایک ساتھ فرمایا۔

"لڑائی بعد میں کر لینا ابھی افطاری کر لو۔ آخری روزہ ہے۔ کل ان شاء اللہ عید ہوگی۔" [illegible] نے کہا تھا۔

"ادھر تو آج بھی عید ہے۔" ایمان عرف جاناں ملک نے مسکراتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

ایسی ہی سرگوشی صفدر اور یونس کی بھی تھی۔ ہر طرف سے عید مبارک کی صدائیں آرہی تھیں۔

راحت نذیر

عیدی



اس کی نظریں دروازے پر لگی تھیں۔ شام ہونے والی تھی اور افطاری میں بس ڈیڑھ گھنٹہ رہ گیا تھا۔ اس نے افطاری کا سارا سامان تیار کر لیا تھا۔ بس فرقان کا انتظار تھا۔ اس کا آفس رمضان میں پانچ بجے آف ہوتا تھا اور وہ ساڑھے پانچ بجے تک گھر پہنچ جاتا تھا مگر آج چند منٹ اوپر ہو گئے تھے۔ وہ انتظار کر رہی تھی۔ کب وہ آئے اور وہ دستر خوان پر افطاری کا سامان لگائے۔

آج آخری یعنی تیسواں روزہ تھا۔ اس نے جتنا اہتمام آج کیا تھا پورے رمضان میں نہیں کر سکی تھی۔ سب بجٹ تھا، جس میں اس نے پورا مہینہ گزارنا ہوتا تھا۔ اس مہنگائی کے دور میں ذرا سی فضول خرچی پر بجٹ آؤٹ ہو جاتا تو مشکل سے کنٹرول میں آتا۔ سو اس دفعہ اس نے میانہ روی ہی اپنائی۔

چچا چچی کے گھر بھی کھانا پکانے کی ذمہ داری اس کی تھی۔ وہاں زیادہ اہتمام ہوتا تھا۔ لہٰذا ہر دفعہ بجٹ خراب ہو جاتا۔ مگر یہاں یہ صرف دو لوگ تھے اس لیے میانہ روی کام آئی۔ افطاری کے لیے وہ ایک دن پکوڑے، ایک دن سموسے بنا لیتی۔ ایک دن دہی بھلے، ایک دن چنا چاٹ اور ساتھ میں تھوڑا سا فروٹ، دونوں مل کر تھوڑا تھوڑا کھا لیتے اور اللہ کا شکر ادا کرتے جس نے اس دور میں بھی ان کی عزت رکھی ہوئی تھی۔

ویسے اس مہنگائی کے دور میں یہ بھی ان کے لیے من و سلویٰ سے کم نہیں تھا۔ دونوں خوش تھے۔ اور رانیہ تو بہت ہی خوش تھی کیونکہ اس کا بجٹ زیادہ متاثر نہیں ہوا تھا۔

رمضان میں دوسرے مہینوں کی نسبت خرچا زیادہ بڑھ جاتا ہے اور پھر عید کی شاپنگ بھی۔ اس دفعہ اس نے بجٹ کو کنٹرول میں رکھا۔ شاپنگ کے لیے پیسے اس نے بچا کر رکھ لیے تھے ویسے بھی اس کے بری کے جوڑے ابھی صحیح سلامت تھے کچھ پیسے فرقان کے پاس پڑے تھے۔ آج فرقان کو تنخواہ بھی مل جانا تھی جس میں عید بونس بھی شامل تھا۔ وہ بہت خوش تھی شادی کے بعد یہ اس کی پہلی عید تھی۔

☼ ☼ ☼

ان کی شادی چار ماہ پہلے ہوئی تھی۔ فرقان اور خود اس کا تعلق مڈل کلاس گھرانے سے تھا۔ فرقان کے والدین چار سال پہلے ایک حادثے میں وفات پا گئے تھے۔ خود ہانیہ کے والدین بھی حیات نہیں تھے۔ وہ دس سال کی تھی جب پہلے اس کے والد کا انتقال ہوا پھر چھ ماہ بعد اس کی امی بھی وفات پا گئیں تو اس کی ذمہ داری چچا' چچی پر آ گئی۔ انہوں نے اس کو بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح پالا تھا کسی چیز کی کمی نہ ہونے دی تھی۔ گریجویشن کے بعد اس کے لیے چند رشتے آئے جن میں سے فرقان سب پر بازی لے گیا۔ وہ فرقان کے سنگ رخصت ہو کر اس گھر میں آ گئی۔ فرقان پرائیویٹ کمپنی میں درمیانے عہدے پر فائز تھا۔ تنخواہ بھی ٹھیک ہی تھی بس زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طرح چل رہی تھی۔ ہانیہ فرقان کے سنگ بہت خوش تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے فکر مندی سے گھڑی کو دیکھا۔ سوا چھ ہو گئے تھے۔

"آج کچھ زیادہ ہی لیٹ ہو گئے ہیں' اللہ خیر کرے۔" وہ کچن کے دروازے میں ہی کھڑی تھی۔ سارے دن کا تھکا ماندہ سورج مغرب میں غروب ہونے کے بالکل قریب تھا۔ افطاری میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔

"شاید ٹریفک میں پھنس گئے ہوں۔" اس نے سوچا "چلو دسترخوان لگاتی ہوں۔ تب تک وہ آ جائیں گے۔" وہ برآمدے میں دسترخوان بچھانے لگی۔ پہلے برتن سیٹ کیے پھر تیار کی ہوئی چیزیں لا کر رکھنے لگی۔

سموسے' پکوڑے' فروٹ چاٹ' دہی بھلے' سیب کیلے' آم' شربت کا جگ اس نے سب چیزیں رکھ کر مسکرا کر دیکھا۔ ہر چیز قرینے سے سجی ہوئی' اس کے سگھڑاپے کا منہ بولتا ثبوت تھی اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دوپٹہ درست کرتے ہوئے سر پر پھیلایا اور دوڑ کر دروازے تک پہنچی۔ آنے والا فرقان ہی تھا۔

"السلام علیکم" اس نے مسکرا کر خوش آمدید کہا۔

"وعلیکم السلام" وہ بھی ہلکے سے مسکرایا اور دروازہ بند کر دیا۔

"آج کچھ زیادہ ہی لیٹ ہو گئے آپ" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ اے ٹی ایم پر بہت رش تھا۔ میں نے سوچا تنخواہ لے کر ہی گھر چلوں۔ چاند رات ہے' چوڑیاں' مہندی' جیولری اور شاپنگ" اس کے دل کی بات کہے ہی وہ سمجھ گیا تھا۔

"ہاں جی۔ یہ تو ضروری ہے۔ نئی نویلی دلہن کے لیے تو بہت ضروری ہے۔" وہ اترائی۔

ابھی وہ دونوں ... تھے جب ساتھ والے گھر سے ... آوازیں ان کے کانوں سے ... علاقے میں وہ رہائش پذیر تھے ... لوگ ایک دوسرے کے رازوں کے امین تھے ... دیواریں بھلا کب آوازوں کو قید کر سکت رکھتی ہیں جو کہ دیوار کے پار نفوس سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے لیکن ان کو سرگوشیاں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"مجھے آج بھی تنخواہ نہیں ملی۔ صاحب کہتا ہے فیکٹری گھاٹے میں جا رہی ہے۔ میں نے بہت منتیں کیں مگر وہ نہیں مانا۔ کہتا ہے کہیں اور کام ڈھونڈ لو' میں بھلا کہاں کام ڈھونڈوں' کون دے گا کام مجھے۔"

"یہ تو منصور بھائی کی آواز ہے" فرقان زیر لب بڑبڑایا۔

ہانیہ کو ہمسائیوں کا زیادہ پتا نہیں تھا۔ یہاں لوگوں کا ایک دوسرے کے گھروں میں کھلا آنا جانا تھا مگر وہ تھوڑا کتراتی ہی رہتی تھی۔ کسی کے گھر آتی جاتی نہیں تھی۔ شروع سے ہی اس کی یہ عادت تھی۔ منصور اور ثریا کو جانتی تو تھی لیکن آنا جانا کم ہی تھا۔

"آج آخری روزہ ہے اور چاند رات بھی۔ افطاری کے لیے صبح کی دو روٹیاں رکھی ہیں۔ لیکن نوید اور سائرہ کپڑوں کی ضد کر رہے ہیں۔ ہر سال ہی بچوں کو عید کے نئے کپڑے ... ہوتے ہیں۔ اس دفعہ ان سے بھی گئے ... نے ان کو ڈانٹ کر سلا دیا ہے۔" منصور کی گھر والی آواز سے ہی لگ رہا تھا کہ رو رہی ہے۔

"میں اب کیا کروں۔" منصور کی آواز پھٹی پھٹی سی لگ رہا تھا جیسے وہ بھی رو تا رہا ہے۔

"یہ دوسرا مہینہ ہے اس نے تنخواہ نہیں دی۔ تمہارے پاس کو خدا یاد نہیں ہے۔ پورا رمضان بھی فاقے کر کے گزرا ہے۔ بچوں کے لیے جیسے تیسے ہو جاتا ہے مگر مجھ سے اب یہ بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ میں تھک گئی ہوں منصور علی۔"

ثریا کی آواز سن کر ہانیہ اور فرقان نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ "بچے اٹھ جائیں گے ابھی۔ وہ ضد کریں گے میں ان کو کپڑے کہاں سے دلاؤں۔"

"ادھار بھی نہیں ملا۔ میں نے پوچھا تھا دو تین لوگوں سے۔" منصور بولا۔

ان دونوں کی باتوں نے ان کو پچھتاوے کی کھائیوں میں دھکیل دیا تھا۔ پورا مہینہ ہو گیا تھا ان کی اس حالت کو اور وہ دونوں کتنے اہتمام سے افطاری اور سحری کرتے رہے۔ ان کو کچھ خبر نہ ہو سکی کہ ہمارے ہمسائے بھوکے سوتے ہیں۔ ہمسائیوں پر کیسی قیامت گزر رہی ہے۔

افطاری میں تھوڑا ہی ٹائم رہ گیا تھا۔ دونوں نے اندر آ کر دسترخوان کو دیکھا۔ ہر چیز وافر تھی۔ پھر فرقان نے جیب سے تنخواہ نکال کر ہانیہ کے ہاتھ میں رکھی اور منہ دھونے چل دیا۔ واپس آیا تو ہانیہ وہیں کھڑی تھی۔

"میرا خیال ہے افطاری کا آدھا سامان اور کچھ پیسے منصور بھائی کو دے آتے ہیں" فرقان احمد نے ہانیہ کو دیکھا۔

"آدھا سامان اور کچھ پیسے نہیں۔" ہانیہ بولی تو فرقان نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"کیا مطلب ہے؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ کم سے کم اتنے پیسے تو ہوں کہ وہ بچوں اور اپنے لیے خریداری کر سکیں۔ اتنے تو ہم دے سکتے ہیں۔" اس نے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ



فرقان احمد کے ہاتھ میں تھمائے۔

"اور شاپنگ؟" فرقان احمد نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرے بری کے سوٹ پڑے ہیں اور آپ کے سوٹ بھی ابھی نئے ہیں تو کیا ضرورت ہے اس فضول خرچی کی۔" اس نے آرام سے کہا "اور چلیں آج آخری افطاری ان کے ساتھ مل کر کرتے ہیں۔" وہ بولی اور بیٹھ کر دستر خوان سے چیزیں سمیٹنے لگی۔ جبکہ فرقان یک ٹک اسے دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا...؟" اس نے فرقان کو ساکت کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

"میں سوچ رہا ہوں ایسی کون سی نیکی کی تھی، جو مجھے تمہاری جیسی بیوی ملی۔" فرقان احمد نے شرارت سے کہا تو وہ مسکرا دی۔

"اچھا یہ میں بعد میں بتاؤں گی افطاری میں تھوڑا ہی ٹائم رہ گیا ہے۔ چلیں میرا ہاتھ بٹائیں۔ اندر سے شاپر لے کر آئیں چیزیں ڈالنا ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ساتھ والے گھر میں موجود تھے۔

"السلام علیکم بھابھی۔" ہانیہ نے داخل ہوتے ہی سلام کیا تو ثریا اور منصور دونوں ہی حیران رہ گئے۔

"وعلیکم السلام" ثریا نے مسکرا کر جواب دیا۔ منصور بھی فرقان کے گلے لگ گیا۔

سامنے ہی دستر خوان پر دو ڈونگے میں پتلی سی دال اور پلیٹ میں دو روٹیاں رکھی تھیں۔ یہ ان کی افطاری کا کل سامان تھا۔

"بھابھی! ہم نے سوچا۔ آخری روزہ ہے، افطاری مل کر کرتے ہیں۔" ہانیہ نے مسکرا کر کہا اور کوئی بھی بات سنے بغیر کچن میں گھس گئی، پانچ منٹوں میں دستر خوان سج گیا۔ وہ خود جا کر نوید اور ساجد کو بھی بلا کر لے آئی۔ بچے بھی بھرا پرا دستر خوان دیکھ کر خوش ہو گئے۔ منصور اور ثریا بھی اس پر خوش اور حیران تھے۔

روزہ کھلا۔ سب نے مل کر افطاری کی۔ آتے ہوئے ہانیہ نے پہلے چاند کی مبارک دی جو کہ کالے بادلوں کی وجہ سے نظر نہیں آ سکا تھا پھر فرقان سے پیسے لے کر چپکے سے ثریا کے ہاتھ میں تھما دیے۔

"بھابھی! یہ عیدی ہے، بچوں کے لیے" وہ مسکرائی تو ثریا نے اسے گلے لگا لیا۔ اور پھپھک کر رو دی وہ تو ان کے لیے فرشتہ بن کر آئے تھے۔

"ہم دونوں کا بہت شکریہ" منصور نے فرقان کے گلے لگ کر کہا۔

"شکریہ کس بات کا منصور بھائی! یہ تو ہمارا فرض تھا۔" فرقان یہ نہ کہہ سکا کہ ہمیں تو آپ سے معافی مانگنا چاہیے کیونکہ ہم ہمسایوں کے حقوق اچھی طرح ادا نہیں کر سکے۔ اس نے دل ہی دل میں کتنی بار اللہ سے معافی مانگی تھی۔

گھر آ کر عشاء کی نماز پڑھی۔ پھر چائے پی۔

"چلیں باہر۔" فرقان نے چائے پیتے ہی کہا۔

"کیوں؟ باہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟" ہانیہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"شاپنگ نہیں کرنا۔ تو کیا مہندی اور چوڑیاں بھی نہیں چاہئیں۔" فرقان نے اسے [illegible] کھل کر ہنس دی۔ وہ اسے گدگداتا رہا۔

"ہاں... ہاں کیوں نہیں... [illegible] کریں" ہنس ہنس کر اس کا برا حال ہو [illegible]

"منصور [illegible] تیار ہیں آ جائیں جلدی۔" ثریا کی [illegible] آواز سنائی دی پھر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز [illegible]۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہانیہ نے اپنا سر فرقان کے کندھے پر رکھ دیا۔

دونوں کے ہونٹوں پر ایک انوکھی اور طمانیت بھری مسکان آ کر ٹھہر گئی تھی۔

آسیہ مقصود

درد میں گندھی کوکھ

"نی کیا کر رہی ہے۔"

عقب سے آتی پاٹ دار آواز کو گردن موڑے بغیر خاموشی سے سنتے ہوئے نصیباں نے روٹی لوہے کے سینکنے پر رکھی اور کچی مٹی کے چولہے میں لکڑیوں کی آگ پر الٹ پلٹ کر سینکنے لگی پھر دو پرت ہوئی روٹی چنگیر میں رکھ دی۔

"روٹیاں پکا رہی ہے یا جلا رہی ہے۔" سکینہ نے ایک بار پھر چنگھاڑتی ہوئی آواز میں کہا۔

"سارے میں جلی روٹی کی بو پھیل گئی ہے نصیباں بی بی! جس دن سے تو نے یہ دہلیز پار کی ہے میرے گھر سے تو ساری برکت ہی اٹھ گئی ہے نامراد منحوس کہیں کی۔" نصیباں نے گرم روٹیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو اپنی سانسوں میں اتاری اور سر جھکا کر سالن گرم کرنے لگی۔

"کلی (اکیلی) بیٹھی میری ماں کس سے باتیں کر رہی ہے؟" اکرم نے جو ابھی ابھی گھر میں داخل ہوا تھا کندھے سے ہل اتار کر دیوار کے ساتھ رکھا اور کشادہ صحن کے وسط میں بچھی چارپائیوں کی طرف آگیا۔

"میں نے کس سے باتیں کرنی ہیں پتر! بیٹھی اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں' جانے وہ کون سا منحوس ویلا تھا' جب میں نے اس نامرادے فضل کے پیچھے لگ کر اس پچھل پیری کو گھر لانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میری تو ساری جد (نسل) کے مقدر ہی پھوٹ گئے۔"

اکرم نے ایک دزدیدہ سی نظر چولہے کے پاس بیٹھی نصیباں پر ڈالی اور بات پلٹنے کی کوشش کی "اماں! تیری لاڈو نظر نہیں آ رہی۔"

"تو اس نے کہاں جانا ہے' یہیں کہیں ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ چھمو کی طرف چلی گئی ہوگی۔"

اماں کی آواز ذرا دیر کو دھیمی ہو گئی۔ دل ہی دل میں لاڈو کو دو تین گالیاں بھی دے ڈالیں۔ بھلے بتائے بنا گھر سے غائب رہنا معمول سہی' پر ویرے کے کھیتوں سے لوٹنے سے پہلے اسے آ ہی جانا چاہیے۔ کم از کم اکرم کے اوکھا ہونے کی نوبت تو نہ آئے۔

"اماں! میں کتنی بار کہہ چکا ہوں' اس وقت اسے اکیلا باہر جانے مت دیا کر' پر تو میری سنتی کہاں ہے۔ اک واری (ایک دفعہ) کی نصیحت کافی نہیں۔" اکرم صافہ اتار کر زور سے چارپائی پر مارتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بس بس کاکا! مجھے زیادہ سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں' گھر آتے ہی تو کل کلیش کرنے لگتا ہے۔ ماں بہن تو تجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ سب سمجھتی ہوں کہ کون لگاتا ہے آگ ... یہ جو منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی ہے ... کیا دھرا اسی کا ہے۔ کھیتوں میں رہتا ہے ... تیرے کان بھر کے آتی ہے۔ اسی لیے تو گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اوکھا ہونے لگتا ہے۔"

اکرم کو چپ کروانے کے لیے اماں نے ہمیشہ کا آزمودہ حربہ استعمال کیا نتیجتاً "دستی نلکے پر ہاتھ منہ دھوتا اکرم غصے میں باہر نکل گیا۔

اماں نے غصہ نصیباں پر اتارنا شروع کر دیا۔ "مر گئی تیرے کلیجے میں ٹھنڈ' ماں بیٹے کو آمنے سامنے کر کے خود بیٹھی تماشا دیکھ رہی ہے۔ اٹھ اب لٹا لالٹا میرے تو من کی مراد پوری ہو گئی۔"

سر جھکائے بیٹھی نصیباں کو اماں نے بہتیروں سے پیٹ ڈالا۔ وہ مٹی کی مادھو بنی چپ چاپ پٹتی رہی۔

✡ ✡ ✡

"محبت" کانوں میں رس گھولتا ہوا ایک شیریں لفظ اور دلوں میں لطیف احساسات جگاتا ہوا ایک حسین جذبہ مگر وہ جو ایک صدا سے بیری ہے اس کے تعاقب میں رہتا ہے۔ جہاں محبت ہو نفرت بھی قریب ہی کہیں کسی گوشے میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ نفرت محبت سے اسی طرح منسلک ہے جیسے ایک ہی خط کی دو سمتیں مخالف مگر جڑی اک دوجے سے ہی ہوتی ہیں۔ خط کے وسط میں ان کی حدیں کہاں تک ہیں یہ تعین نہیں ہو پاتا۔ اسی طرح محبت کی آخری حدوں میں ہی نفرت بھی کہیں پنہاں ہوتی ہے اور جب نفرت اپنی انتہا کو پہنچ جائے تو اسی کی کوکھ سے ایک نیا جذبہ جنم



لیتا ہے' جو نفرتوں کو اپنی دھیمی اور ٹھنڈی پھوار سے بجھا دیتا ہے۔ حشمت اور اسلم جگری یار تھے۔ یک جان دو قالب' ایک دوسرے کی پرچھائیں' ہر وقت کا ساتھ۔ اپنے اپنے کھیتوں میں ہل چلا رہے ہیں تو وہیں سے ہانک لگا کر گفتگو کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک کے گھر سے کھانا آیا تو دونوں کھا رہے ہیں۔ فارغ ہیں تو گاؤں میں واقع بوڑھے برگد کے درخت کے نیچے چارپائیاں بچھائے فرصت بھی بانٹ رہے ہیں۔ گھر بھی ایک ہی گلی میں بالکل آمنے سامنے تھے۔ ان دو دوستوں کی محبت مٹی گارے کے ان گھروندوں کی کچی چار دیواریاں پار نہیں کر سکی تھیں۔ دونوں کے باپ اچھے تعلقات نبھاتے اس دنیا سے رخصت ہو گئے جبکہ مائیں۔ عمر بھر کی بیری۔ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں۔

ان ہی محبتوں اور نفرتوں کی دھوپ چھاؤں کے سنگ چلتے چلتے جانے کس نازک لمحے اسلم حشمت کی من موہنی سی بہن کو دل دے بیٹھا۔

"اماں نے کڑھی بنائی تھی ساسی! تجھے پسند ہے ناں اس لیے تیرے لیے لائی ہوں۔"

وہ اپنے بھائی کے ساتھ آئی تھی۔ حشمت صحن میں اسلم اور اکرم کے پاس چارپائی پر جا بیٹھا جبکہ وہ باورچی خانے کے پاس بیٹھی خواتین کے پاس چلی آئی۔

"کس دل سے بھیج دی تیری ماں نے' نہیں کوئی کلام (تعویذ) تو نہیں ڈال دیا' اور کیا بھی' اس کا تو کوئی بھروسہ بھی نہیں ہے۔"

سکینہ بی بی نے لکڑی سے چولہے کی راکھ کریدتے ہوئے جلی کٹی سنائی۔

"چھوڑ تو اماں کو۔ لا مجھے دے۔" بلو نے اس کے ہاتھ سے پیالہ لیا اور کھینچ کر اسے بھی اپنے ساتھ نیچے بٹھا لیا۔ اور وہ بلا چوں چراں بیٹھ بھی گئی۔ تھی ہی ایسی خاموش طبع اور بے ضرر سی۔ جب بھی گھر میں اسلم کی پسندیدہ کوئی چیز بنتی تو وہ ضرور لاتی۔ اسلم آنکھوں ہی آنکھوں میں شکریہ ادا کرتا تو ایک دھیمی سی مسکراہٹ اس کے معصوم چہرے کی زینت بن جاتی۔

اور وہ نگاہوں میں حیا سموئے سر جھکا لیتی۔

اسی طرح گرد و پیش سے بے نیاز دو دلوں میں محبت کا ننھا سا پودا دھیرے دھیرے پروان چڑھ رہا تھا۔ دوسری طرف ماسی برکتے اور سکینہ بی بی کے درمیان جنگ و جدل بھی جاری تھی۔

ان کے آئے روز کے شدید جھگڑے جہاں زور پکڑ رہے تھے' وہاں اسلم اپنی نوزائیدہ محبت کے مستقبل کے لیے فکر مند رہنے لگا تھا۔ اکرم کو گاؤں کے ہائی اسکول سے مڈل پاس کرنے کے بعد کھیتی باڑی میں اس کا ہاتھ بٹاتے گو کہ زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا مگر وہ بھائی کے دل کے راز کو پا گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

"بھائی! اسلم! کس کے خیالوں میں گم ہو؟"

اسلم کھیتوں سے فارغ ہو کر ذرا سستانے کو بوڑھے درخت کے نیچے اپنی چارپائی پر لیٹا تھا اور خلا میں یک ٹک گھورتے ہوئے آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا کہ گھر کی طرف سے آتے ہوئے اکرم نے دور ہی سے اسے آ لیا۔ قریب ہی پڑی حشمت کی چارپائی خالی تھی۔ خلاف معمول وہ اسلم کے ساتھ موجود نہ تھا۔ اکرم نے موقع غنیمت جانتے ہوئے موضوع چھیڑ ڈالا جو وہ کافی دنوں سے سوچ رہا تھا۔

"بھائی! اسلم! بہت کھویا کھویا رہتا ہے تو آج کل کہیں دل تو نہیں اٹک گیا؟"

اکرم نے محبت بھری نظروں سے دیکھنے پر وہ بڑبڑا گیا مگر منہ سے کچھ بھی انکار ہی کیا۔

"نہیں بتاتا تو چل تیری مرضی' پر ایک بات تجھے بتا دوں' اماں سیالکوٹ جانے کا ارادہ باندھ رہی ہے ماسے حیات سے آپا کلثوم کو تیرے لیے مانگنے۔"

اکرم کا تیر نشانے پر لگا اور کچھ پس و پیش کے بعد آخر کار اسلم نے اپنی پوشیدہ محبت کا اظہار کر ہی ڈالا۔

"ہاں یار! مجھے نصیباں بہت اچھی لگتی ہے اور میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"اگر ایسی کوئی خواہش حشمت کی بھی ہوئی

تو؟" کافی دیر کی خاموشی کے بعد اکرم نے بہت عجیب سوال کیا تھا۔

"کیا بکواس کر رہا ہے تو!" وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

اس کی تمام تمناؤں اور آرزوؤں کا محور ایک لڑکی تھی جو یقیناً "کسی کی بہن" تھی' اس کے باوجود یہ تصور بھی اس کے لیے ناقابل برداشت تھا کہ کوئی اس کی بہن کو اس نظر سے دیکھے۔ آخر کو وہ بھی تو اسی معاشرے کا حصہ تھا۔ بلو اور لاڈو کے سراپے تصور میں ابھرتے ہی اس کی نام نہاد غیرت جاگ اٹھی۔

"حشمت نے تجھ سے کچھ کہا ہے کیا؟" اس کی سرخ انگارہ آنکھوں میں بے چینی اور غصہ بھرا تھا۔

"نہیں۔ تو میں تو ویسے ہی فرض کر رہا تھا۔" اکرم اس کے تیور دیکھ کر اس سے گھبرا گیا۔

"آئندہ ایسی بات سوچنا بھی مت۔" وہ دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

✲ ✲ ✲

اکرم کو تو اس نے چپ کروا دیا تھا مگر ایک پھانس تھی جو اس کے دل میں چبھ کر رہ گئی۔

"لاڈو تو ابھی چھوٹی ہے تو کیا بلو۔" وہ کروٹ پر کروٹ بدلنے لگا۔

اکرم کھانے کے برتن اٹھا کر گھر جا چکا تھا۔ بوڑھے درخت کے نیچے بچھی کئی ایک چارپائیوں پر دن بھر کے تھکے ہارے کسان اونگھ رہے تھے۔ کچھ مکمل سو چکے تھے' چند ایک ٹولی کی صورت میں ملکی حالات پر بساط بھر بحث کر رہے تھے۔ عام حالات میں وہ بھی حشمت کے ہمراہ اس گفتگو میں حصہ لیتا تھا مگر آج حشمت نے ماسی برکتے کے ساتھ اپنے ننھیال' برابر والے پنڈ جانا تھا۔ اس لیے کھیتوں سے سیدھا گھر چلا گیا تاکہ نہا دھو کر تیاری پکڑ سکے۔

اس خبر پر اسلم کو اندر ہی اندر ایک انجانی سی خوشی محسوس ہوئی تھی۔ نصیباں نے ان دونوں کی واپسی تک جو کہ شام ڈھلے تک متوقع تھی' یقیناً "بلو اور لاڈو کے ہمراہ ان ہی کے گھر پر ہونا تھا لیکن اکرم کی اس بات نے اس کی ساری خوشی غارت کر دی تھی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر ٹیوب ویل کی طرف چل دیا۔

"چلو دماغ ٹھنڈا کرتا ہوں۔ کچھ دیر چوہدری کے ڈیرے پر بیٹھوں گا۔ وہاں لڑکے رونق لگا کر رکھتے ہیں۔ اور ہاں منشی! کو اپنی پانی کی باری کی یاد دہانی بھی کروانی ہے۔"

اس کے چہرے کا تناؤ کافی حد تک کم ہونے لگا تھا۔ وہ خود کلامی کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

✲ ✲ ✲

ٹیوب ویل چوہدری امتیاز کے کھیتوں کے دوسری جانب تھا۔ کپاس کے کھیتوں کے بیچوں بیچ گزرتی پگڈنڈی سے گزرتے ہوئے اس نے چھوٹا راستہ اختیار کیا تھا۔ اچانک سامنے سے بلو آتی ہوئی نظر آئی۔

"تو اس وقت کدھر سے آ رہی ہے؟" اس نے درشت لہجہ میں پوچھا۔ ادھر بلو کا رنگ بھی فق ہو گیا۔ اسلم نے چھوٹے بہن بھائیوں پر کبھی سختی نہ کی تھی۔ بڑا ہونے کے ناتے ہمیشہ باپ کا پیار دیا' کبھی جھڑکا تک نہیں مگر آج اچانک اس کے آتے غصیلے لہجے پر بلو نہ صرف حیران تھی بلکہ بری طرح ڈر بھی گئی تھی۔

"وہ۔ وہ میں۔ رانی ہے ناں چوہدری کی بہن' اس نے بلوایا تھا۔ چھمو اور لالی کو اور مجھے بھی۔" وہ بری طرح ہکلائی۔

"تو چوہدری کی بیگار کرنے کیوں گئی تھی۔ ہم اپنا کماتے ہیں' اپنا کھاتے ہیں۔ کسی کے نوکر نہیں۔" وہ مزید بگڑنے لگا۔

"بیگار کرنے نہیں' بس ملنے گئی تھی۔ وہ دونوں کام کرنے لگیں تو میں واپس آ گئی اور پھر تو نے ہی تو کہا تھا کہ کبھی کبھار چلی جایا کروں' وہ بے چاری اکیلی ہوتی ہے' دل بہل جائے گا اس کا۔" اتنی لمبی وضاحت پر اسلم کا لہجہ نرم پڑ گیا۔

"اچھا اچھا زیادہ بڑبڑ نہ کر اور گھر جا۔"

کماد کے کھیتوں سے ہوتا ہوا جب وہ ٹیوب ویل پر

پہنچا تو اچھی حس نے ایک بار پھر خطرے کی گھنٹی بجائی۔ حشمت وہاں نہا رہا تھا۔

"اوئے تو نے بھی نہانا تھا تو میرے ساتھ ہی آجاتا۔ میں تو سمجھا کہ تو سو گیا ہوگا۔"

حشمت اسے دیکھ کر چونک اٹھا مگر اس کے چہرے پر خوشی کا کوئی تاثر نہ ابھرا۔ "سو ہی تو رہا تھا ابھی جاگا ہوں۔"

☆ ☆ ☆

کہتے ہیں شک کی زمین بڑی زرخیز ہوتی ہے۔ ایک بیج گرنے کی دیر ہے فوراً "لہلہاتی فصل تیار ہو جاتی ہے۔ کانٹوں سے بھری یہ فصل اسلم کے دل میں کب اُگ آئی" اسے قطعاً" خبر نہ ہوئی اور اب تو کانٹوں کی چبھن اس کے حلق تک آپہنچی تھی۔ ہر نئے دن کا سورج مزید موافق آب و ہوا فراہم کر رہا تھا۔ وہ جس قدر حشمت اور بلو کے رویوں پر غور کرتا' پہلے سے زیادہ چوکنا ہوتا جاتا۔

بلو کھیتوں میں کھانا لے کر آتی تو وہ ہاتھ دھونے کے بہانے اِدھر اُدھر ہو جاتا اور کسی درخت کی اوٹ سے مشاہدہ کرتا حشمت کی سرگوشیاں اور بلو کا شرما کر سمٹنا' ذومعنی جملوں کا تبادلہ تو اسلم کے سامنے بھی جاری رہتا جو کہ اب اسلم کے لیے اتنے ذومعنی بھی نہیں رہے تھے۔ لہٰذا وہ بت اکھڑا اکھڑا رہنے لگا۔ بلو کے وقت بے وقت گھر سے نکلنے پر اعتراض کرتا تو اماں سے تو تو میں میں ہو جاتی۔

☆ ☆ ☆

"قمیص تیری کالی وے سوہنے پھلاں والی۔"

اکرم ریڈیو کان سے لگائے گانا سننے میں محو تھا۔ ریڈیو کی آواز دھیمی ہونے کے باوجود صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ تیزی سے چھاتے ہوئے اندھیرے سے نبرد آزما صحن کے اکلوتے بلب کے نیچے چارپائیاں بچھائے اسلم اور اکرم اپنے اپنے شغل میں مصروف تھے۔ دیہی علاقوں میں رات کا کھانا مغرب کی اذانوں کے ساتھ ہی کھا لیا جاتا۔ لوگ عشا تک کا وقت چوپالوں میں گزارتے تھے یا پھر سو جاتے تھے۔ یہاں بجلی آجانے کے باوجود معمولاتِ زندگی کو ٹیلی وژن اور کیبل نے اتنا متاثر نہیں کیا۔

ان کے گھر میں بھی کھانا کھایا جا چکا تھا۔ اکرم نے گانے کے اختتام پر ایک نظر اسلم کو دیکھا' وہ حقہ کی نے ہاتھ میں پکڑے کسی گہری سوچ میں گم تھا' پھر چلم میں جھانکتے ہوئے ارد گرد دیکھنے لگا۔ اماں اور لاڈو کھانے کے برتن سمیٹ رہی تھیں۔

"اماں لیلو کہاں ہے؟" اسلم نے صحن میں اچھی طرح نظر دوڑانے کے بعد پوچھا۔

"پتر! یہیں کہیں ہوگی۔" اماں نے حسبِ معمول لاپروائی کا مظاہرہ کیا۔

"وہ لالی سے کڑھائی کا نمونہ لینے گئی ہے۔" لاڈو کے بھانڈا پھوڑنے پر اسلم تلملا اٹھا۔

"اماں! کم از کم تجھے اتنا تو پتا ہونا چاہیے کہ وہ ہے کہاں۔ کڑھائیوں سلائیوں کے لیے سارا دن کیا کم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی گھر میں نہیں ٹک سکتی۔"

"بس بس کاکا! اتنا شور کرنے کی لوڑ (ضرورت) نہیں۔ اِدھر دو قدم پر باڑے کے پاس تو لالی کا گھر ہے۔ جا وے اکرم! اٹھ بلا لا اسے۔"

اماں کے چہرے پر ناگواری سے بھی ایک شکن سی ابھر آئی۔ مگر اس وقت اسلم کو اماں کی ناراضی کی قطعاً" پروا نہ تھی۔ اس نے اکرم کو بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ خود باہر نکل گیا۔ اب اس کا رخ اپنے اور حشمت کے کھیتوں کی جانب تھا' جو باڑے کی مخالف سمت میں تھے۔

آج حشمت کے کھیتوں کو پانی لگنا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کے قدموں میں تیزی آگئی۔ آدھے گھنٹے بعد جب پاؤں کی زوردار ٹھوکر سے گھر کا دروازہ کھلا تو گھر میں موجود تینوں نفوس کے دل دھک سے رہ گئے۔

بلو اس کے پہلو میں کھڑی خوف سے کانپ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کی سیاہ چادر آہستہ آہستہ سرک رہی تھی مگر نیند اس کی بے خواب آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کی چارپائی کے عین سامنے انگیٹھی میں دہکتے ہوئے انگارے دھیرے دھیرے راکھ بن کر ختم ہو رہے تھے۔ وہ ان پر نظر ٹکائے کہیں اور کھوئی ہوئی تھی۔ کل رات کے واقعے نے اس کے ارادوں کو ہرگز متزلزل نہیں کیا تھا۔ وقتی خوف اس کا کچھ بگاڑ نہ پایا۔ چاند کی اجلی روشنی میں نہائے کھیت اور جادوئی چھپالی کی ندی کا سحر آج بھی اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا' جب وہ اپنے ارد گرد سے بے نیاز ہو کر حشمت کے سنگ حسین مستقبل کے اجلے سپنے بننے میں مصروف تھی تو کہیں سے اچانک بھائی اسلم ان کے سر پر آن کھڑا ہوا۔

انہیں کسی قسم کی وضاحت کا موقع دیے بغیر اور منہ سے کچھ بولے اسلم نے کھینچ کر بلو کا بازو پکڑا اور واپس ہو لیا۔

سارے راستے اس کے آہنی ہاتھ کی مضبوط گرفت میں بلو کی نازک کلائی کی ہڈیاں چرمراتی رہیں۔ خوف اور تکلیف کی ملی جلی کیفیت میں تقریباً" گھسٹتے ہوئے وہ بمشکل اس کے تیز قدموں کا ساتھ دے رہی تھی۔ ایک آدھ بار دزدیدہ نظروں سے اس کے تنے ہوئے چہرے کو دیکھا مگر منہ سے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ دل تھا کہ سینے کی دیواریں توڑ کر باہر آجانے کو بے قرار تھا۔ دھک دھک کی آواز گویا اسے اپنے گردوپیش کی ہر چیز میں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

گھر پہنچ کر اس کے ساتھ جو سلوک ہونے والا تھا اس کا تصور ہی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کا جما دینے کے لیے کافی تھا مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔

اسلم سیدھا اپنی چارپائی پر جا لیٹا اور سرتاپیر لحاف اوڑھ کر سو گیا۔ جبکہ وہ رات بھر یہی سوچتے ہوئے کروٹیں بدلتی رہی کہ جانے اگلے دن کا سورج اس کے لیے کیا پیغام لائے۔ بھائی اسلم اور اماں مل کر اسے اس کی نوزائیدہ محبت سمیت کسی اندھے کنویں میں دھکیل دالیں' مگر جب سورج طلوع ہوا تو خلاف توقع اور خواہش کے عین مطابق اسلم اپنے معمول کے کاموں میں اسی طرح مصروف تھا جیسے گزشتہ رات اس کی زندگی میں آئی ہی نہ ہو۔ بلو نے دہکتے ہوئے انگاروں سے نظر ہٹا کر ذرا سا سر اٹھایا اور ارد گرد دیکھا' اماں اور لاڈو بے خبر سو رہی تھیں۔

اس نے لحاف میں چھپائی ہوئی کپڑوں کی پوٹلی نکالی اور بہت سنبھل کر قدم رکھتی ہوئی دروازے تک آگئی۔ زنجیر کو بے آواز گرا کر کامیابی سے باہر نکلتے ہوئے وہ یہ قطعاً" فراموش کر چکی تھی کہ جو کھیل وہ اماں باوا کی عزت کو داؤ پر لگا کر کھیلنے جا رہی تھی اس کے بدلے میں تقدیر بھی اپنا ایک کھیل کھیلے گی۔

☆ ☆ ☆

پتھر پر سنگین کی دھار کو تیز کرتے ہوئے وہ مسلسل ایک ہی بات سوچے جا رہا تھا۔

کیا وہ واقعی حشمت تھا' میرا دوست جو میرے لیے فکر مند رہتا تھا۔ مجھے کھلا کر خود بعد میں کھاتا تھا۔ میرا دشمن اس کا دشمن تھا اور میرا دوست اس کا دوست لیکن کل وہ میری بہن سے رات کے اس پہر جو کہہ رہا تھا' اگر میں خود اپنے کانوں سے نہ سنتا تو کبھی یقین نہ کرتا۔

"یہ تیرا بھائی اسلم ہی ہماری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ ہمیں کبھی ایک ہونے نہیں دے گا' اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے بھاگ چلتے ہیں۔ ایک بار ہم لاہور پہنچ گئے تو پھر وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر!" بلو ذرا دیر کو متذبذب ہوئی "اچھا ٹھیک ہے۔" اگلے ہی لمحے اس نے اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کر ڈالا اور جن الفاظ میں اظہار محبت کیا' اسلم سن کر پانی پانی ہو گیا۔ اب حشمت اپنے آئندہ منصوبے سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔

"کل ساڑھے بارہ سے ایک بجے کے درمیان میں ٹیوب ویل کے پاس تیرا انتظار کروں گا۔ دیکھ دیر مت کرنا ورنہ لاری نکل جائے گی۔ ہمیں ڈیڑھ بجے نے

پہلے اڈے پر پہنچنا ہے۔ وہاں سے سیدھے ہم لاہور چلے جائیں گے۔"

اس کا جگری یار اس کے اندھے اعتماد کو پامال کرتے ہوئے اندھیرے میں اس کے منہ پر کالک ملنے جا رہا تھا۔ محبت تو اس نے بھی کی تھی مگر کتنی پاکیزگی تھی اس کے جذبوں میں کہ نظر بھر کر دیکھ لینے سے بھی کتراتا تھا۔ اسے دوستی کا پاس تھا اور دوست کی عزت کا بھی مگر حشمت! ایک ٹیس سی اٹھی اور وہ کراہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب نہیں چھوڑوں گا' زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے چل دیا۔

☼ ☼ ☼

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ تاریکی میں ڈوبے گمبھیر سناٹے کو جھینگروں کی آواز مزید پراسرار بنا رہی تھی۔ لحاف اپنے گرد اچھی طرح لپیٹے وہ گولا سا بنا گہری نیند سو رہا تھا۔ مگر خاموشی کے ان سنے شور نے کچھ اس طرح سے جھنجوڑا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔

خاموشیاں تو ہمیشہ طوفانوں کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہیں۔ ایک طوفان اس گھر کے نصیب میں بھی لکھا جا چکا تھا جس سے قطعاً" بے خبر وہ اپنے کانٹے پڑتے حلق کو تر کرنے کے لیے اٹھا تھا۔

"ہیں یہ کیا!" وہ یک دم ٹھٹک گیا "اس وقت بھائی اسلم کہاں چلا گیا؟"

تکیے کے نیچے سے ٹٹول کر گھڑی نکال کر وقت دیکھا تو ایک بج رہا تھا۔

"او میرے خدا!" صحن میں نکلا تو بیرونی دروازے کی زنجیر بھی گری ہوئی تھی۔ اب وہ کیا کرے۔ ابھی اسی کشمکش میں تھا کہ باہر کھیتوں کی طرف کچھ فاصلے پر گولی چلنے کی آواز آئی' جس پر ارد گرد کے گھروں میں بھی آہٹیں بے دار ہوئیں اور آہستہ آہستہ شور میں بدل گئیں۔

"وے اکرم!" اماں اندر سے بری طرح گھبرائی ہوئی باہر آئیں۔ "ہم لٹ گئے پتر! بلو اپنے بستر پر نہیں ہے اور پیٹی کا تالا بھی کھلا ہوا ہے۔ وہ اپنے ونگ (جہیز) کا سارا زیور اور کپڑے بھی لے گئی۔ ہائے مرن جوگی۔"

اماں صحن کے فرش پر بیٹھ کر واویلا کرنے لگی۔ اکرم کئی دن سے اسلم اور حشمت کے درمیان تناؤ کو واضح طور پر محسوس کر رہا تھا۔ اب بھی چھٹی حس نے کسی انہونی کے احساس سے خبردار کیا۔

وہ اماں سے کسی بھی قسم کی بات کیے بنا تیزی سے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"او اکرم یار!" پیچھے سے شیدے نے آواز لگائی۔ "قتل ہو گیا ہے قتل۔ ادھر ٹیوب ویل کی طرف۔"

ہاتھ میں ایک مضبوط لاٹھی پکڑے وہ تقریباً" بھاگتے ہوئے اس کے قریب سے گزر گیا۔ کئی اور لوگ بھی اپنے اپنے گھروں سے نکل کر اس طرف جا رہے تھے۔ وہ بھی دھڑکتے دل کے ساتھ ان کے ہمراہ ہو لیا۔

گزشتہ دنوں گاؤں کے کئی ایک نوجوانوں کی زبانوں سے بلو اور حشمت کا نام ایک ساتھ سن کر وہ چوکنا ہو گیا تھا۔ ان ہی اندیشوں کے [illegible] بڑے بھائی کو خبردار کرنا چاہتا تھا [illegible] ایک باپ کی حیثیت سے سارے معاملے کو [illegible] سے نمٹائے۔ مگر اس نے بھی جو شک [illegible] ظاہر ہو گیا۔ اکرم کو یقین ہو چلا تھا کہ گولی اسلم [illegible] نے چلائی ہے اور بلو اور حشمت میں سے کسی ایک کو تو ضرور مار ڈالا ہے۔ ابھی کچھ ہی روز [illegible] میں ابا کی بندوق ڈھونڈ رہا تھا' جسے خود ابا نے بھی کبھی استعمال نہ کیا تھا۔ ٹیوب ویل سے نکلنے والی پلی کی کھال پورے چاند کی روشنی میں کسی شعلے کی مانند دکھائی دی تو اس کا دل ایک لمحے کے لیے بند ہی ہو گیا۔

نہ من من بھر کے ہوتے قدموں میں اتنی سکت تھی کہ وہ آگے بڑھ کر ہجوم کے اس طرف کا منظر دیکھ لیے اور نہ ہی آنکھوں میں اس ممکنہ منظر کو دیکھنے کی تاب۔ ارد گرد کی ہر شے اسے گھومتی ہوئی لگ رہی تھی۔ سہارے کی تلاش میں ارد گرد بازو پھیلاتے ہوئے وہ گرنے ہی کو تھا کہ کسی نے تھام لیا۔

"اوئے! یہ تو اکرم ہے مقتول کا بھائی۔"

"بہن کے یار نے ماری ہے گولی۔"

"گھر سے بھاگتے ہوئے پکڑی ہوگی شاید۔"

"چوہدری کے مزارعوں نے خود دیکھا ہے جی۔"

مکمل بے ہوشی میں جانے سے قبل ہی بے شمار بولیاں' بھنبھناہٹوں کی صورت اس کی سماعت سے ٹکرائیں۔

☼ ☼ ☼

دستی نلکے کو چلاتے ہوئے اس کی گوری گوری کلائیوں میں پڑی کانچ کی چوڑیوں کی چھن چھن سے فضا میں جلترنگ سے بکھرے ہوئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ نلکا چلنے اور بالٹی میں پانی گرنے کی آواز سے باہم مل کر کوئی موسیقی ترتیب دے رہی ہوں۔ اپنے گرد بکھرے ان سُروں سے بے نیاز وہ مگن سے انداز میں نلکا چلائے جا رہی تھی اور اس بات سے بے خبر تھی کہ وہ مسلسل کسی کی نظروں کے حصار میں ہے۔

کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا اکرم حقے کی نے منہ میں دبائے خاموشی سے اسے تکتے ہوئے سوچ رہا تھا "اسلم سچ ہی کہتا تھا کہ یہ لڑکی نہ بھی بولے تب بھی اس کی خاموشی باتیں کرتی ہے۔"

"تو اسلم۔۔۔" اس سے پہلے کہ کوئی کمزور لمحہ اسے اپنے حصار میں لیتا' ایک تکلیف دہ حقیقت اس کے سامنے تھی۔

"اسلم میرا بھائی! اس قدر چاہتا تھا اس لڑکی کو۔ بلو نے اگر وہ انتہائی قدم نہ اٹھایا ہوتا تو سب کچھ کتنا مختلف ہوتا۔ صحن میں چلتا پھرتا یہ وجود مجھ سے کسی اور رشتے سے مخاطب ہوتا۔"

بے چین سا ہو کر اس نے' نے چارپائی پر پٹخ کر حقہ پرے دھکیل دیا۔ وہ اسلم کے حصے کی زندگی جی رہا تھا۔ یہ خیال ہر بار ہی اس کا قرار لوٹ لیتا تھا۔

نمبردار کرم دین اور چوہدری اقبال نے مل کر دونوں فریقین کے بیچ صلح کروائی تھی۔ بڑے جتن کیے' پھر کہیں جا کر اماں خون بہا کے طور پر نصیباں کا نکاح اکرم سے کرنے پر رضامند ہوئی تھی۔ جوان بیٹے کے قاتل کو معاف کر دینا اتنا آسان نہ تھا۔ دل پر پتھر تو اکرم کو بھی رکھنا پڑا۔ مدعی ہو کر بھی وہ کتنا بے بس تھا۔ پیارے بھائی کا قاتل اب اس کی بہن کا سہاگ تھا۔ نکاح نامہ پر انگوٹھے لگنے کے بعد ہی چوہدری کی حویلی میں چھپے ہوئے حشمت اور بلو سامنے آئے تھے۔ پہلی بار انہیں دیکھ کر اس کا خون کھول گیا مگر سوائے نفرت سے منہ پھیر لینے کے وہ کچھ نہ کر سکا تھا۔

اسی شام نصیباں اس کے نصیب میں لکھ دی گئی۔ بہت خاموشی کے ساتھ وہ اس گھر اور اس کی زندگی کا حصہ بن گئی۔ کیسا موت کا سا سناٹا تھا اس پہلی رات' جب وہ ہولے ہولے خوف سے کانپتے ہوئے گٹھڑی سی بنی اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

گھر کے در و دیوار اور مکینوں کی آنکھوں سے جھلکتی وحشت اور نفرت وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ کسی اور کے کیے کی سزا کو اپنی قسمت کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لینے والی اس معصوم صورت لڑکی کو دیکھتے ہوئے وہ عجیب سی الجھن کا شکار ہو رہا تھا۔ دل کی حالت بھی ناقابل فہم تھی۔ اسلم کے قاتل کی بہن اس کے سامنے تھی مگر وہ اس سے نفرت نہیں کر پا رہا تھا۔ ہر نوجوان لڑکے کی طرح اس نے بھی اپنے جیون ساتھی کا سراپا ذہن میں تراش رکھا تھا۔ اور کئی نرم و نازک جذبے دل میں سینت کر رکھے تھے۔ نصیباں اس تراشیدہ سراپے سے مشابہ تھی یا نہیں' اس سے قطع نظر اب وہ اس کی بیوی تھی اور اس کے تمام جذبات و احساسات کی حق دار۔

"کیا اماں کی نفرت اور سگے بھائی کا خون اسے یہ حق ادا کرنے دیں گے؟" وہ سوچ رہا تھا۔

نکاح کے فوراً" بعد اماں پنچایت سے اٹھ کر اکیلی ہی گھر آگئی تھی۔ جب گاؤں کی عورتیں نصیباں کو گھر

لائیں تو اس نے کوسنوں، گالیوں اور بین کرتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ پھر روتے روتے کمرے میں جاکر کنڈی لگالی۔ لاڈو بھی لاتعلق سی ادھر ادھر پھرتی رہی۔ اگر جاتے جاتے عورتیں اسے اکرم کے کمرے میں لاکر چارپائی پر نہ بٹھاتیں تو شاید وہ اسی طرح صحن میں ہی کھڑی رہتی، بے جان اور بے حس پتھر کی مانند۔

☆ ☆ ☆

"نصیباں بی بی! اماں مرگئی ہے؟"

یہ وہ جملہ تھا، جو ہر وقت گھر کی فضا میں گونجتا تھا۔ اماں کا نصیباں سے روز اول جو رویہ تھا، چار سال گزرنے کے بعد بھی اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ ذرا ذرا سی بات پر اسے دھنک کر رکھ دیتی۔ زبان کے نشتر تو دن رات کسی لمحہ بھی چلنے سے نہ چوکتے۔

اکرم کے دل میں اس کے لیے روز اول سے جو ایک نرم گوشہ تھا، وہ ہمدردی سے بڑھتے بڑھتے محبت میں ڈھلنے لگا تھا۔ وہ خاموش، شکر دھیرے دھیرے اسے اندر تک گھائل کر رہی تھی مگر۔۔۔ وہ خواہش کے باوجود قربت کا ایک لمحہ بھی اس کے دامن میں نہ ڈال سکا۔ وہ نادیدہ آنکھیں سدا اس پر پہرہ ڈالے رہیں۔ کبھی جو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر قدم بڑھائے بھی تو اس کے لمس کا احساس پائے بنا ہی پیچھے ہٹنا پڑا۔ حد درجہ ناگواریت لیے وہ آنکھیں اسے خود پر گڑی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اسلم مرچکا تھا مگر اس کی محبت زندہ تھی، جو کسی محافظ کی طرح محبوب کو اپنے حصار میں لیے رکھتی۔ جب ہی تو نصیباں کو اکرم سے کوئی شکوہ شکایت نہ تھا۔ وہ نہایت مطمئن نظر آتی جبکہ رقابت کا جذبہ اس کے من میں لگی آگ کو مزید ہوا دے رہا تھا اور وہ بھڑ بھڑ جلتے ہوئے اپنا تن من سب فنا کر بیٹھا تھا۔ اسے اپنا آپ کسی مردے کی مانند بے حس محسوس ہوتا اور جو مرچکا تھا وہ آج بھی اس کے اندر بس رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں نے ایک ضروری بات کرنا ہے آپ سے۔" نصیباں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

وہ سحری کرنے کے بعد کھیتوں کی طرف نکل گیا تھا۔ پہلے روزے سے اس کا یہی معمول تھا۔ دھوپ چڑھنے سے پہلے باہر کا کام ختم کرلیتا اور وہ پہر دوسرے کسان بھائیوں کی طرح درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آرام کرتے ہوئے گزارتا۔ یوں مغرب سے ذرا پہلے ہی گھر لوٹنا ہوتا۔ پھر روزہ کھول کر مسجد جانا پھر نماز تراویح کے بعد ہی پلٹنا معمول بن چکا تھا۔

تیزی سے گزرتے روز و شب نے اسے گھر اور گھر والوں سے قطعاً "بے نیاز" کر رکھا تھا۔ آج بھی جب وہ تراویح سے فارغ ہو کر گھر آیا تو نصیباں صحن میں چھوٹے موٹے کام نمٹا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے کمرے میں آکر بستر پر دراز ہوگیا۔ نصیباں اندر آئی تو وہ ابھی جاگ رہا تھا۔

"ہاں بولو۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یقیناً کوئی خاص بات تھی جو وہ اسے خود مخاطب کر رہی تھی اور ایسا ان چار سالوں میں پہلی دفعہ ہوا تھا۔

"بیٹھ جاؤ ادھر۔" ٹانگیں سمیٹتے ہوئے اس نے چارپائی پر اس کے لیے جگہ بنائی۔ وہ پائنتی پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ "ہاں اب کہو کیا کہنا ہے؟"

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔" جھجکی، اٹکی پھر تیزی سے [illegible]

"آج اٹھائیسواں روزہ تھا۔" وہ چونک [illegible] اس کے چہرے پر کچھ کھوجنے کی [illegible] رہا۔ وہ پلکیں جھکائے مکمل خاموش [illegible]

"اچھا تو پھر۔" وہ اس کی گھبرائی گھبرائی خاموشی سے محظوظ ہوتے ہوئے [illegible] "نصیب کا جوڑا لینا ہے؟ اور اگر چوڑیاں شہر جا [illegible] تو۔" زبان یک دم ہی جیسے جلد ہو گئی۔ گزشتہ چار سالوں میں کب وہ اس کے لیے کچھ لایا تھا۔ وہ اس سے کیوں کچھ مانگنے لگی۔ نیا لباس تو اس گھر میں آنے کے بعد شاید اس نے کبھی پہنا ہی نہ تھا۔ اکرم کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی روز مرہ کی ضروریات کیسے پوری ہوتی ہیں۔

وہ اس کی سیاہ گھنیری پلکوں کے سحر میں کھو کر ایک غیر متوقع بات کہہ گیا تھا۔ جواباً وہ مسلسل خاموش تھی۔ وہ سر جھٹک کر اپنے خیالات کے بھنور سے

نکلا۔

"کہہ دو جو بھی کہنا ہے۔"

"اماں آج کل بہت اداس ہے۔ سارا دن منہ پر کپڑا ڈالے لیٹی رہتی ہے۔ اب تو مجھے کوسنے بھی نہیں دیتی۔" وہ سر جھکائے آہستہ سے بولی۔

"اسے روزہ لگ جاتا ہوگا نا۔ چل اچھی بات ہے۔ تیرا تو فائدہ ہوگیا۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"نہیں، مجھے لگتا ہے کوئی اور بات ہے۔ چپ چپ کر روتی ہے۔ سامنے جاؤ تو چپ ہو جاتی ہے۔"

اکرم نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ [illegible] متفکر تھی اس عورت کے لیے جس نے چار سال سے اس کی زندگی جہنم بنا رکھی تھی۔ [illegible] وہ اس کی اپنی ماں روتے ہوئے اس کو دیکھنے [illegible] تھی۔ وہ گاؤں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے بڑے بھائیوں کے پاس جا رہی تھی مگر اسے بیٹی کی ایک جھلک نہ دیکھنے دی گئی اور وہ روتے بلکتے پلٹ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اماں! نماز نہیں پڑھو گی؟ سحری بھی ٹھیک سے نہیں کی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے، تاپ تو نہیں آرہا؟"

اماں واقعی سحری کے دو چار لقمے لے کر اٹھ گئی تھی اور چپ چاپ بستر پر جالیٹی۔ اکرم فجر کی نماز پڑھ کر آیا تو سیدھا کمرے میں چلا آیا۔

"کچھ نہیں پترو!" سکینہ کا لہجہ لفظوں کا ساتھ نہ دے رہا تھا۔

"بات کہہ دینے سے جی ہولا (ہلکا) ہو جاتا ہے اماں!" اکرم دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"ہا۔۔۔ ہائے۔" اماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ "یہ اولاد بھی بڑا وکھرا (انوکھا) پھل ہے۔ جس کی جھولی میں گرے، وہ دنیا کا سب سے امیر بندہ اور جس سے رہ چھن جائے وہ فقیر۔ جب تم چاروں بہن بھائی اس ویڑھے (صحن) میں کھیلا کرتے تھے تو دیکھ کر میرا سیروں خون بڑھتا تھا۔ کتنا مان، کتنا غرور تھا مجھے اپنی اس دولت پر لیکن مجھ جھلی کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ کھیتی تو پکنے سے پہلے ہی لٹ جائے گی۔" اماں زار و قطار رونے لگی۔

"صبر کر اماں! اسے مقدر کا لکھا سمجھ کر قبول کرلے اور جو گزر گیا اسے بھولنے کی کوشش کر۔" اماں کی اداسی کا سبب جان کر وہ اسے حوصلہ دینے لگا۔

"کیسے بھول جاؤں؟ کڑیل جوان پتر کی لاش آج بھی مجھے ان بوڑھی آنکھوں کے سامنے ویسے ہی پڑی نظر آتی ہے، خون میں لت پت۔ ہائے میرا تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ میں کیسی بدنصیب ماں ہوں۔ ابھی اس کی قبر کی مٹی بھی نہ سوکھی تھی کہ ادھر میں اس کے دشمنوں سے صلح کرکے بیٹھ گئی۔" اماں نے دوپٹے سے رگڑ رگڑ کر آنکھیں اور ناک پونچھی اور پھر سے رونے لگی۔

"مگر اماں! یہ دکھ تو چار سال سے ہمارے دلوں کو زخمی کر رہا ہے، کوئی نئی بات تھوڑا ہے۔" اکرم آج دانستہ ماں سے نظریں چرا گیا۔

دزدیدہ نظروں سے کھڑکی کی سلاخوں کے پار جھاڑو لگاتی نصیباں کو دیکھتے ہوئے وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ اماں کہنے لگی۔

"میرے اسلم کی روح بڑی بے چین ہے پتر! ان چار سالوں میں جب بھی میں نے اسے خواب میں دیکھا، وہ ناراض اور روٹھا روٹھا سا نظر آتا ہے۔ بات نہیں کرتا بس شکایتی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔ پچھلے کئی دنوں سے میں پھر ایسے ہی خواب دیکھ رہی ہوں۔"

اس کی نظروں کا تصور کرتے ہی اکرم کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ گھبرا کر اس نے ہاتھ چہرے پر پھیرا گویا دل کی چوری چہرے پر تحریر ہو۔ کوشش کے باوجود اس کے ہاتھ میں لرزش تھی۔

"اچھا اماں! میں چلتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"سن پتر اکرم! ویسے تو میں اسلم کے نام کا صدقہ خیرات کرتی ہی رہتی ہوں پر اس بار جی میں کچھ اور ہی آئی ہے۔"

"کیا اماں!" اکرم نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں لاڈو کو لے کر ساتھ والے پنڈ سائیں جی کے ڈیرے جانا چاہتی ہوں۔ بڑے گیان والے ہیں وہ

۔اپنے خواب ان کو سناؤں گی تو ضرور کوئی حل بتائیں گے۔ میری اور میرے پتر کی روح کے سکون کے لیے۔"

اماں کی نخوت بھری نظروں نے کھڑکی کے اس طرف ایک چہرہ ڈھونڈنے کی کوشش کی اور جیسے ہی وہ نظروں کے حصار میں آیا، نفرت سے سر جھٹکتے ہوئے رخ بھی پھیر لیا۔

"کب جانا ہے؟" دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے اکرم کی نظریں دہلیز کو چھو رہی تھیں۔

"سوچ رہی ہوں کہ آج ہی چلی جاؤں بس تھوڑے سے گڑ والے چاول پکانے ہیں، وہاں مسکینوں میں بانٹ دوں گی۔"

گھنٹے ڈیڑھ تک چلی جاؤں تو شام تک لوٹ آؤں گی۔"

اماں اسے بتانے سے زیادہ خود کلامی کر رہی تھی مگر وہ "جیسے تیری مرضی" کہہ کر باہر نکل آیا۔

☼ ☼ ☼

گلابی رنگ کا نرم و نازک پھول اس کے ہاتھوں میں کسی معصوم بچے کی مانند مچل رہا تھا جبکہ اس کو شاخ سے توڑنے والے کی اس پر "قطعاً" کوئی توجہ نہ تھی۔ سو وہ تو بے دھیانی میں توڑ لیا گیا تھا۔ پھر اسے پتی پتی کرکے دور اچھالتے ہوئے بھی وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ دل تھا کہ کسی بھی کام کے لیے "قطعاً" انکاری تھا۔

وہ کپاس کے ہرے بھرے کھیت میں اضافی جڑی بوٹیاں نکالنے کی غرض سے بیٹھا تھا مگر پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے گلابی پھولوں اور ہرے ٹنڈوں کو گھورنے کے سوا کچھ نہ کر پایا تھا۔ دور تک لہلہاتی کپاس کی فصل اس کی اس قدر بے توجہی پر حیران سی اسے تک رہی تھی۔ گھٹنوں تک آتے ان بے شمار پودوں کے درمیان گھرے اس کے وجود کے برعکس دل و دماغ کہیں اور کھوئے تھے۔ کانوں میں صرف ایک ہی جملے کی بازگشت تھی۔

"اسلم کی روح بڑی بے چین ہے۔" اس جملے کی چبھن اسے کوئی اور کام کرنے ہی نہ دے رہی تھی۔ آخر بے کاری کی اس مشقت سے بے زار ہو کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ قریبی پانی کی کھال میں ہاتھ اور [illegible] دھو کر صاف کیے اور چوپال میں آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ مگر ذہن و دل کی کشمکش کا وہی عالم تھا۔ اسلم اور نصیباں کا جو تعلق بھی رہا ہو اب وہ ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔ آج کی زندہ حقیقت یہ تھی کہ اب وہ اس کا شوہر تھا۔ محبت کی جو وہ پہلی چاندنی اس کے من آنگن میں اتر آئی تھی، وہ آج اسلم کی بے چینی سے خائف تھی اور اپنی کوتاہی کے باوجود نصیباں کی لاتعلقی سے شاکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں تمہارے گھر کے آنگن میں اپنی محبت کا بوٹا لگا ہی نہ پائی۔ سچے من سے کوشش تو پوری کی پر آج مجھے اندازہ ہوا، میں محبت کا نازک بیج اس پتھریلی زمین میں نہیں اگا سکتی۔ شرمندہ ہوں، تجھ سے کیا وعدہ نہیں نبھا سکی۔ ان دونوں گھروں میں اگے ببول اکھاڑ پھینکنا میرے بس میں نہیں رہا۔ اماں تو ایک طرف، میں تو تیرے بھائی کے دل کی زمین بھی نہ چھو سکی۔ اس سے تو میرا شرعی رشتہ ہے، رب کا بنایا ہوا اور..."

وہ کہتے کہتے رو پڑی جبکہ دروازے کی اوٹ میں اکرم ششدر کھڑا تھا۔

چوپال میں لیٹے لیٹے جب اندر کی بے چینی حد سے بڑھنے لگی تو وہ اٹھ بیٹھا اور چپل پہن کر بلا مقصد ہی چل پڑا۔ جانے کون سی نادیدہ قوت تھی، جو اس کے قدموں کو گھر کی طرف کھینچ لائی۔

صحن خالی تھا مگر اماں کے کمرے سے آتی ہوئی دھیمی دھیمی بھنبھناہٹ نما آواز نے اسے چونکا دیا۔ یقیناً وہ نصیباں ہی تھی مگر باتیں کس سے کر رہی تھی۔ اماں اور لاڈو تو کب کی جا چکی تھیں۔ کھلے دروازے کی اوٹ لیتے ہوئے ذرا سا جھانکا تو حیران رہ گیا۔ نصیباں کمرے میں لگی اسلم کی تصویر سے باتیں کر رہی تھی۔

"ماسی سکینہ آج میرا فیصلہ کروا دے گی۔ وہ جاتے ہوئے مجھ سے کہہ کر گئی ہے۔ اور اکرم... محبت تو ایک طرف وہ شاید مجھے بیوی کے روپ میں عمر بھر قبول نہیں کرے گا۔ پر میں اس دل کا کیا کروں، جو اسے اپنا مجازی خدا مان کر صرف اسی کی طرف ہمکتا ہے۔"

اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ رہے تھے اور اکرم کو اپنے دل پر پڑا منوں بھاری پتھر سرکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

بڑی پکی سڑک گاؤں کی بیرونی حدود کو چھو کر گزرتی تھی۔ جس کے دوسری طرف ایک چھوٹا سا بازار تھا، جہاں ضروریات زندگی آسانی سے دستیاب تھیں۔ یہ بازار تین دیہاتوں کے عین بیچ واقع تھا، اس لیے تقریباً سب ہی لوگوں کو ضروریات زندگی کی خریداری کی آسانی تھی۔

ان دنوں چونکہ عید قریب تھی اس لیے گاہکوں کا خاصا رش تھا۔ اکرم بھی خاصی دیر سے ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ اماں، لاڈو اور نصیباں کے لیے عید کا جوڑا تو وہ لے چکا تھا، مگر ابھی دل کی تسلی نہ ہوئی تھی۔ وہ نصیباں کے لیے کوئی خاص سوغات لینا چاہتا تھا، جسے دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشیوں کے سارے رنگ سمٹ آئیں۔ ایک دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے رنگ برنگے پھندنوں والے بے شمار پراندے لٹکے ہوئے نظر آئے تو نصیباں کی موٹی سی چوٹی اس کی نظروں میں گھوم گئی، جو بہت سخت ہاتھوں سے گندھی ہونے کے باوجود بے شمار لٹیں نکل کر ادھر ادھر بکھری رہتی اور اس کے دودھیا چہرے کے گرد ہالہ سا بنائے رکھتی۔ وہ مسکراتے ہوئے دکان کے اندر چلا گیا۔ اس کے جوڑے کا ہم رنگ پراندہ لینے کے ساتھ ساتھ دکان دار کے کہنے پر سرخی، پاؤڈر اور ایک چھوٹا سا شیشہ بھی لے لیا۔ یہ ساری چیزیں نصیباں کے حوالے کرنے کے خیال پر آج نہ تو اسے اماں کے غصے سے ڈر لگا اور نہ ہی کسی نادیدہ آنکھ کے گھورنے کا احساس ہوا۔

☼ ☼ ☼

اماں اور لاڈو مغرب کی اذان سے پہلے ہی گھر لوٹ آئی تھیں۔ افطاری سب نے اکٹھے بیٹھ کر کی۔ اس دوران ایک غیر معمولی خاموشی سب کے درمیان حائل رہی۔ اماں کا انداز بھی ناقابل فہم تھا۔ وہ صرف مسلسل خاموش تھی بلکہ اس کے ماتھے پر کرب کی ایک گہری لکیر بھی تھی۔

کن انکھیوں سے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بڑی رغبت سے دہی بھلے کھا رہا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے کٹوری رکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"پتر اکرم!" ابھی وہ باہر نکلنے کا قصد کر ہی رہا تھا کہ اماں کی دھیمی مگر رنجیدہ آواز نے اسے روک لیا۔ نصیباں جھوٹے برتن لے جا چکی تھی۔ اس نے بیٹھتے ہوئے کشادہ صحن کے دوسرے کنارے پر ایک نظر ڈالی۔ وہ معمول کے مطابق مگن سے انداز میں دستی نلکا چلاتے ہوئے بالٹی میں پانی بھر رہی تھی۔ پاس ہی جھوٹے برتنوں کا ڈھیر پڑا تھا۔

"ہاں تو اماں ہو آئیں سائیں کے ڈیرے سے۔" اماں اسے روک کر بھول چکی تھی اور اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔ آخر اسے خود ہی خاموشی توڑنا پڑی۔

"کیا ہوا؟ کیا کہا سائیں نے؟" کہتے ہوئے اکرم کا دل ایک بار زور سے دھڑکا۔

"سائیں نمانے نے کیا کہنا ہے پتر! اپنی جان کا سیاپا تو ہم خود ہی ہوتے ہیں۔"

"کیا بات ہے اماں! خیر تو ہے؟" اماں کے ٹوٹے ہوئے لہجے سے گھبرا کر اس نے اماں کے چہرے کو بغور دیکھا، وہاں بہت کچھ بدلا بدلا سا تھا۔

"جب اپنا لہو ہی بیری ہو تو شکایت ہی کمک ختم ہو گئی۔"

"اماں پہیلیاں نہ بجھوا، سیدھی طرح بتا کیا بات ہے۔" وہ سچ مچ گھبرا گیا۔

"مجھے بلولی تھی۔ بڑے سائیں کے مزار پر منت کی

چادر چڑھانے آئی تھی۔"

"اکیلی تھی؟"

"نہیں۔ حشمت اور اپنے دو بچوں کے ساتھ۔" اماں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"حشمت مجھے دیکھ کر چھپ گیا تھا۔ پہچانا تو میں نے بلو کو بھی نہیں۔ اتنی موٹی تازی ہو گئی ہے۔ خوشی تو اس کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی۔" اماں کا لہجہ بہت عجیب سا تھا۔ اس میں نہ خوشی تھی نہ غم، صرف خالی پن کا سناٹا تھا۔

"کہنے لگی حشمت کے گھر والوں نے اسے اتنی عزت اور محبت دی ہے جو یہاں رہ کر اسے ساری زندگی نصیب نہ ہوتی۔" اب اماں ہلکی ہلکی سسکیاں لینے لگی تھی۔

"اسے نہ تو بھائی کے مرنے کا دکھ ہے، نہ گھر سے بھاگنے پر شرمندگی۔" دو موٹے موٹے آنسو آنکھوں کے کناروں سے بغاوت کرتے ہوئے اماں کے چہرے پر بہہ نکلے۔

"بڑی حقارت سے کہہ رہی تھی، میرے راستے میں آکر اسلم تو کیا مل گیا۔ اور... اور وہ تو یہ بھی کہہ رہی تھی کہ وہ تو نصیباں کو بھی یہاں سے لے جانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ حشمت کئی دفعہ بہروپ بھر کر گاؤں آیا، مگر نصیباں نہیں مانی۔ کہتی ہے یہی چوکھٹ اب میرا نصیب ہے۔ میرا مرنا جینا ان ہی لوگوں کے ساتھ ہے۔ مت ماری گئی ہے اس نصیباں کی بھی ورنہ تو اپنی بیٹیوں کی نہ بن سکی تو اس کی کیسے بنے گی، جو زبردستی خون بہا میں تیری سونپی ہے۔"

اماں زار و قطار رونے لگی اور وہ اماں کا ہاتھ تھامے سر جھکائے خاموشی سے زمین کو گھور رہا تھا۔

"ادھر آ میرے پاس۔" اماں نے اس سے ہاتھ چھڑا کر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

اکرم نے اماں کی نظروں کے تعاقب میں مڑ کر دیکھا۔ نصیباں جانے کب اس کے عقب میں آکھڑی ہوئی تھی۔ وہ لرزتی ہوئی آگے بڑھی۔ اماں نے اپنے دونوں بازو پھیلا لیے اور وہ اماں کے سینے سے جا لگی۔ دونوں ایک دوسرے کے وجود سے لگی دیر تک سسکیاں لیتی رہیں۔

"اماں مجھے معاف...۔" اس نے لرزتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر اماں کے سامنے کیے۔

"جھلی نہ ہو تو کس لیے معافی مانگ رہی ہے۔ تو تو وہ ہیرا ہے، جس کی مجھے نہ تو پہچان ہوئی اور نہ قدر۔ میں تو بس اپنی جھولی کے پتھروں کو ہی ہیرے سمجھتی رہی۔" اماں نے اپنے پلو سے اس کے آنسو پونچھ دیے۔

دونوں ہی روتے روتے ہنس دیں۔ ادھر اکرم بھی آج کھل کر دل سے مسکرایا تھا۔

"اب بس بھی کر اماں! کچھ لاڈ آئندہ کے لیے بھی رہنے دے۔ تم ماں بیٹی کے دکھ سکھ تو اب چلتے ہی رہیں گے۔ بڑی رات ہو گئی ہے اب آرام کرنے دے۔" وہ انگڑائی لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

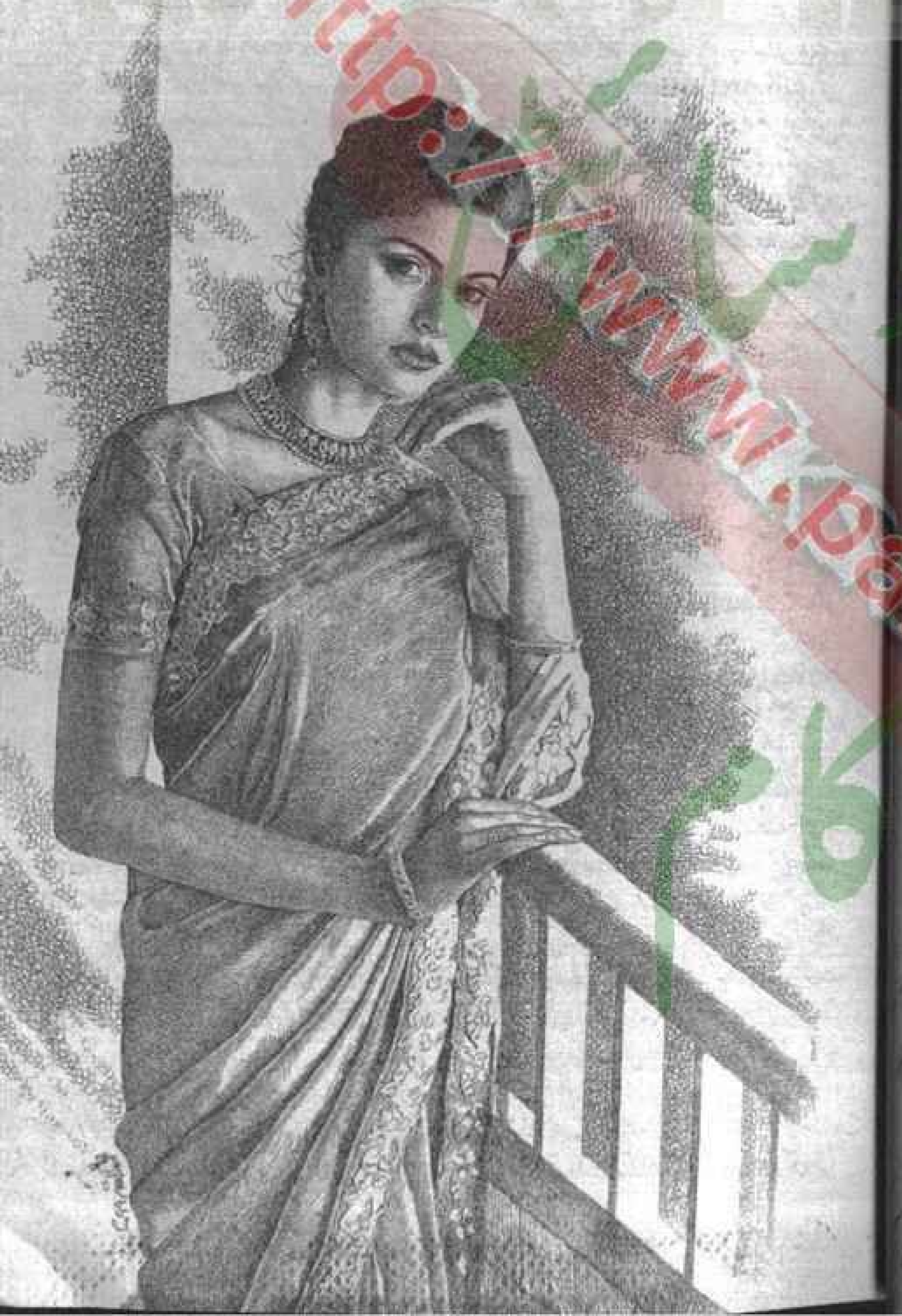
"ہیں! میں نے تجھے کب روکا ہے۔ تو جا، جا کر آرام کر۔" اماں نے کچھ اس انداز میں کہا کہ وہ [illegible]

"میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ [illegible] کے لیے بھی تو اٹھنا ہے نا۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔" اس نے سمجھاتے ہوئے [illegible] کہا۔

"تو اگر آج ہی چاند نظر آ گیا تو؟" [illegible] عین وقت پر تو دھمکی۔

"چاند... یہاں پہ تو ہے۔" اکرم نے سر اٹھا کر ایک نظر آسمان پر ڈالی پھر پلٹ کر نصیباں کو بہت گہری نظروں سے دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔

"میرا چاند تو نظر آ چکا۔"



راشدہ رفعت

زندگی خوبصورت ہے

مکمل ناول

اس نے بس ٹرمینل کے آگے گاڑی روک کر ٹرمینل سے باہر نکلنے والے مسافروں پر نگاہیں دوڑائی تھیں۔ بہت تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد وہ مقررہ وقت پر ٹرمینل پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔ مسافر اپنا سامان اٹھائے باہر نکل رہے تھے۔ اسے بھی زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ یقیناً "ماہا ہی تھی" اگرچہ وہ اسے ایک طویل عرصے کے بعد دیکھ رہا تھا مگر اسے پہچاننے میں اسے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اس کے چہرے پر ویسی ہی معصومیت تھی جیسی اس کے بچپن میں ہوتی تھی۔ بیضوی چہرہ اور حیران پریشان بڑی بڑی آنکھیں۔ سعد گاڑی سے اتر کر اس کے قریب گیا تھا۔

"ماہا؟" اس نے قریب جا کر کنفرم کرنا چاہا تھا۔ ماہا کا دھیان اس کی جانب ابھی تک نہیں گیا تھا' یوں پکارے جانے پر اچانک چونکی تھی مگر اگلے ہی پل اس کے چہرے پر مطمئن سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"تھینک گاڈ! آپ آگئے۔ میں تو پریشان ہو رہی تھی کہ جانے کوئی مجھے لینے آئے گا بھی یا نہیں۔"

ماہا نے فوراً" سے پیشتر اپنا بیگ اسے پکڑایا تھا۔ سعد نے ڈگی میں بیگ رکھ کر اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولا۔

"لیکن مجھے یقین تھا کہ بے شک باقی سب بھول جائیں لیکن آپ کو میری آمد کا وقت یاد رہے گا۔" وہ مسکرائی



بھرے لہجے میں بولی۔ سعد کو اس کی خوش گمانی پر حیرت ہوئی۔ اس کا جی چاہا کہ ایک سیکنڈ سے پہلے اس کی غلط فہمی دور کر دے۔ اسے تو اس کی آمد کے متعلق ابھی آدھا گھنٹہ پہلے ہی پتا چلا تھا۔ وہ ایک ضروری فائل لینے آفس سے گھر آیا تھا۔ اپنے کمرے سے فائل اٹھا کر جب وہ واپس جاتے ہوئے لاؤنج سے گزرا تو تائی جان کسی سے فون پر بات کر رہی تھیں۔ انہوں نے اشارے سے اسے روکا۔ وہ بادل نخواستہ رکا تھا مگر اگلے ہی پل تائی جان کی بات سن کر چونکا تھا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو مدحت! بھلا مجھے بھول سکتا ہے کہ ماہا پہنچنے والی ہو گی۔ تم نے اسے کوچ میں بٹھا کر مجھے اطلاع دے تو دی تھی۔ میں تو اس وقت سے اپنی بچی کا انتظار کر رہی ہوں۔" تائی جان نے لہجے میں مٹھاس بھر کر فون کی دوسری طرف موجود ہستی کو مخاطب کیا تھا اور چند لمحوں کے لیے سعد بھی اسی ہستی کی یاد میں کھو سا گیا تھا۔ کتنے برسوں بعد ان کا نام سنا تھا۔

"ہاں ہاں تم فکر نہ کرو۔ سہیل گیا ہوا ہے اسے لینے، جیسے ہی گھر پہنچتی ہے، میں تمہیں فون کر کے بتاتی ہوں۔" تائی جان نے فون پر بات ختم کی تو جیسے وہ بھی اپنے خیالوں کی دنیا سے واپس آیا۔

"کہیں جا رہے ہو بیٹا؟" انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

"ایک فائل گھر بھول گیا تھا، وہی لینے آیا تھا۔ اب واپس جا رہا ہوں۔" اس نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا۔

"تمہیں تکلیف تو ہو گی مگر ماہا کو لے کر آنا ہے۔ لوگ تو بس زبان ہلا کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ بھابھی اکیلا پہلی بار اتنی دور آئی ہے، کسی کو بھیج دیجیے گا اسے لینے۔"

تائی جان نے مدحت چچی کی نقل اتاری [illegible] اور سعد کو ان کے اس انداز سے تکلیف پہنچی تھی۔ بے شک مدحت چچی کے لیے اس کے دل میں برسوں کی ناراضی اور خفگی موجود تھی لیکن تائی جان کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ ان کا یوں مذاق اڑائیں۔

"استانی ہے نا! اسی لیے حکم دینے کی عادت پڑ گئی ہے لیکن یہاں کون اتنا فارغ بیٹھا ہے کہ اس کی بچی کو لینے اتنی دور جائے اور اب ابھی بھی وہ چچی بچی نہیں ہو گی ماہا، ٹیکسی کر کے آ جائے۔ خود کو گھر یاد نہیں تو ٹیکسی والے کے ہاتھ پر ایڈریس کی پرچی رکھ دے۔ اب میں نے مدحت سے کہہ تو دیا کہ سہیل لینے گیا ہوا ہے لیکن سہیل کے پاس اتنی فرصت کہاں۔ اس کی جان کو کیا کم بکھیڑے ہیں۔ شادی بھی اس کی اور ساری ذمہ داریاں بھی اسی کے سر۔ وہ تو مانو ایک ٹانگ پر کھڑا ہے۔ کل کہہ رہا تھا۔" تائی جان اپنی عادت کے مطابق طویل اور لایعنی بات چھیڑ چکی تھیں۔

"کوچ کس ٹائم تک پہنچے گی؟" اس نے کوفت زدہ ہو کر ان کی بات کاٹی اور تائی جان کو بھی اس کے وقت کے قیمتی ہونے کا احساس ہو گیا تھا، جب ہی جلدی سے کوچ کی آمد کا ٹائم بتایا تھا۔ سعد نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ اگر وہ تیز رفتار ڈرائیونگ کرتا تو مقررہ وقت تک ٹرمینل تک پہنچ سکتا تھا۔

"لیکن اگر تمہیں آفس پہنچنے کی جلدی ہے تو رہنے دو۔ میں سہیل کو فون کر کے [illegible] آفس پاس ہوا تو [illegible]۔" سعد نے ان کی بات مکمل ہونے کا انتظار کیے بنا باہر کی جانب قدم بڑھا دیے تھے۔

اور اب [illegible] رہی تھیں کہ مجھے یقین تھا کوئی آئے نہ آئے آپ مجھے لینے ضرور آئیں گے۔

"آپ [illegible] میں پورے تیرہ برس بعد اس شہر میں آئی ہوں۔" کچھ دیر تک باہر کے نظاروں کو تکنے کے بعد اس نے پھر سعد کو مخاطب کیا۔ عجیب حسرت زدہ تھا اس کا لہجہ۔

"کتنی تبدیلیاں آ گئی ہیں نا یہاں۔" گاڑی سبک خرامی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی، جب اس نے ایک بار پھر خود کلامی کے سے انداز میں اسے مخاطب کیا۔

"گزرتے وقت کے ساتھ تبدیلیاں تو آتی ہی

ہیں۔" سعد نے بھی جیسے خود کلامی ہی کی تھی۔

"اور سب سے زیادہ تبدیل تو آپ ہوئے ہیں۔" اس نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے سعد کو دیکھا۔ سعد نے اس بات کی وضاحت مانگے بغیر نگاہیں سامنے ونڈ اسکرین پر ہی جمائے رکھیں۔

"آپ پہلے کی نسبت بہت ڈیشنگ اور اسمارٹ ہو گئے ہیں۔ میں تو آپ کو دیکھ کر حیران ہی رہ گئی۔" ماہا نے اس کی خاموشی سے بد مزہ ہوئے بغیر بات جاری رکھی تھی اور اپنی ذات پر [illegible] کے بکھرے نے سعد کو حیران تو کیا ہی، ساتھ ہی قدرے دکھ بھی ہوا۔ مدحت چچی جیسی [illegible] خاتون کی بیٹی سے وہ پہلی ملاقات میں اس بات کی توقع نہ کر رہا تھا۔ کتنے بولڈ انداز میں اس نے سعد کی تعریف کی تھی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ اس لڑکی کی تربیت مدحت چچی کے ہاتھوں انجام پائی ہے۔

"ویسے آپ نے بھی مجھے فوراً ہی پہچان لیا۔ کیا میں ذرا سی بھی نہیں بدلی، بالکل ویسی کی ویسی ہوں؟ آخر ہم اتنے برسوں بعد ایک دوسرے سے ملے ہیں۔" اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں دریافت کیا تھا۔

"معلوم نہیں۔" اس کا لہجہ خود بخود سپاٹ ہو چلا تھا۔

"اچھا چلیں چھوڑیں۔ یہ بتائیں گھر میں سب کیسے ہیں۔" سعد کے چہرے پر چھائی بیزاری کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔

"ٹھیک ہی ہیں۔" اس نے مختصر ترین جواب دیا تھا۔

"سنا تھا تایا جان کو ہارٹ پرابلم ہو گئی تھی۔ اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟" مختصر جواب پا کر اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی، جب ہی نام لے کر سب کی خیریت دریافت کرنے کا آغاز کر دیا تھا۔

"اب بہتر ہیں۔" یہ باتونی لڑکی اسے کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔

"اور تائی جان کے جوڑوں میں شدید درد تھا۔" اس نے اگلا سوال لڑھکایا۔

"وہ سدا کی بیمار ہیں۔" وہ بڑبڑایا تھا لیکن مخاطب نے یا تو اس کی بڑبڑاہٹ سنی ہی نہ تھی یا پھر ان سنی کر کے نظر انداز کر دی۔

"[illegible] باجی کیسی ہیں؟ ویسے تو بچپن میں بھی بہت بہادر تھیں۔ مجھے یقین ہے، انہوں نے اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کو بہت بہادری سے فیس کیا ہو گا۔" اس نے سعد کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے اپنے یقین کی تائید چاہی تھی۔ سعد نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔

"میں نے ان کے لیے بہت دعائیں کی تھیں۔ میں اور مما آنا بھی چاہ رہے تھے لیکن ان دنوں میرے میٹرک کے امتحان ہو رہے تھے۔ چار سال تو ہو گئے ہیں نا ان کے ایکسیڈنٹ کو؟" اس نے تصدیق

چاہی۔

"ہاں شاید۔" وہ گفتگو کے اس سلسلے سے بیزار ہو رہا تھا۔ اس نے آج تک کسی لڑکی کو اتنی جلد خود سے بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دی تھی اور یہ لڑکی جو بلاشبہ اس کی فرسٹ کزن تھی لیکن اتنے برسوں بعد اس کے لیے اجنبی ہی تو تھی۔ سہیل مدحت چچی سے بڑا اس کی ذات کا حوالہ اتنا مضبوط ضرور تھا کہ سعد آفس کے انتہائی اہم کام چھوڑ کر اسے یہاں لینے موجود تھا۔

"میں نے بہت بار کوشش کی کہ نگی باجی کو فون کر کے تسلی دوں ان کا حوصلہ بڑھاؤں لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ میری ہمت ہی نہ پڑی۔ ایسے کام مجھے ہمیشہ سے بہت مشکل لگتے ہیں۔ کسی کی عیادت کرنا تعزیت کرنا یا حادثے کے بعد حوصلہ دینا' رسمی جملے بولنے کو دل نہیں کرتا اور غیر رسمی جملے بولنے ہی نہیں آتے۔" سعد نے پہلی بار دل میں اس کی کسی بات سے اتفاق کیا تھا۔

"اور آپ اتنے کم گو کیوں ہو گئے ہیں بلکہ سچ کہوں تو مجھے آپ کچھ مغرور سے لگ رہے ہیں۔ مجھے تو آپ کا وہی پرانا روپ اچھا لگتا تھا۔ آپ کو یاد ہے آپ میرے ساتھ کتنا کھیلتے تھے۔ مجھے سائیکل پر بٹھا کر پوری کالونی کی سیر کرواتے تھے اور اسکول سے واپسی پر میرے لیے چاکلیٹ بھی لاتے تھے۔"

وہ جو باتیں یاد دلا رہی تھی' سعد کی یادداشت میں ان میں سے کوئی بھی بات موجود نہ تھی۔ وہ تو بچپن میں بہت اکھڑ قسم کا بچہ تھا یا پھر اس کی محرومی نے اسے ایسا بنا دیا تھا۔ سات آٹھ برس کی عمر میں ماں' باپ دونوں کی جدائی کا صدمہ سہنا کتنا مشکل کام تھا۔ اگر مدحت چچی کی محبت بھری آغوش میسر نہ آتی تو وہ بالکل ہی بکھر کر رہ جاتا۔ سعید چچا اور مدحت چچی دونوں ہی اس کی دلجوئی میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے۔ اس کی بے جا ضدیں خوش دلی سے پوری کرتے۔ انہیں نہ تو اس کے ضدی پن پر غصہ آتا تھا اور نہ اس کی ہٹ دھرمی پر کوفت ہوتی تھی بلکہ اکثر اوقات وہ غصے میں آ کر بابا کو جھڑک دیتا تھا' تب بھی مدحت چچی اس سے خفا نہ ہوتی تھیں۔ حالانکہ بابا گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ بڑے تایا

اور تائی جان کو تو خیر اپنی اولاد کے علاوہ کسی سے غرض نہ تھی لیکن ان کے اپنے بچے بابا کے خوب لاڈ اٹھاتے تھے۔ وہ تھی بھی اتنی پیاری کہ راہ چلتے لوگ بھی اسے پیار کرنے پر مجبور ہو جاتے۔

سعید چچا اور چچی کی بھی اپنی اکلوتی بیٹی میں جان تھی لیکن بڑے بھائی اور بھاوج کی وفات کے بعد انہوں نے بھتیجے کو بھی بیٹوں سے بڑھ کر چاہا تھا اور یہ چچا' چچی کی محبت ہی تھی کہ اس بچے کی الجھی ہوئی شخصیت میں سدھار آنے لگا۔

بچپن گزار کر لڑکپن کی حدود میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک بار پھر بہت بڑا صدمہ سہنا پڑ گیا۔ سعید چچا بھی بھری جوانی میں سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر راہی عدم سدھار گئے تھے۔ مشیت الٰہی پر تو جیسے تیسے صبر آ ہی گیا لیکن جب مدحت چچی نے میکے جانے کا فیصلہ کیا' تب وہ حقیقت میں ٹوٹ کر بکھرا تھا۔ وہ انہیں ماں کا رتبہ دیتا تھا اور اب ان کا سہارا بننا چاہتا تھا لیکن شاید مدحت چچی اسے دل سے اپنا بیٹا نہ مانتی تھیں' جب ہی اس کی منت' ناراضی اور خفگی کی پروا کیے بغیر اپنی بیٹی کی انگلی تھام کر ان لوگوں کی زندگیوں سے بہت دور چلی گئیں اور زندگی کسی کے جانے سے کب رکتی ہے' زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں رہی۔ بڑی بابا کی بھی گزرتی گزرتی رہی۔

مدحت چچی سے پھر کبھی کوئی رابطہ نہ ہوا تھا اور آج اتنے برسوں بعد ان کی لاڈلی اس شہر میں اجنبی بن کر آئی تھی۔ کم از کم اتنا تو فرض بنتا تھا کہ اسے بخیر و عافیت گھر تک پہنچا دے۔

"اور ہاں' آپ نے بتایا نہیں' سعد کیسا ہے سہیل بھائی!" اسے اچانک یاد آیا تھا کہ گھر کے ایک اہم فرد کی خیریت دریافت کرنا تو بھول ہی گئی ہے اور چند لمحوں کے لیے تو سعد کو اس کی بات سمجھ میں ہی نہ آئی اور پھر اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

مدحت چچی کی تربیت کو کچھ دیر پہلے وہ بلاوجہ کا دوش دے رہا تھا۔ بابا کی بے تکلفی تو سراسر ایک غلط فہمی کا شاخسانہ تھی۔ وہ اور سہیل کزنز تھے۔ اکثر لوگ کہتے

تھے کہ دونوں کی شکلوں میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ بس سہیل کا قد ذرا سا چھوٹا تھا اور سعد کی نسبت جسم قدرے بھی مائل تھا۔

بابا بی نے اس کو سہیل سمجھ لیا تھا تو شاید اس میں اس کا زیادہ قصور بھی نہ تھا۔ جب وہ یہاں سے گئی تو سات' آٹھ برس کی بچی تھی۔ سہیل بچپن میں واقعی بابا کے خوب لاڈ اٹھاتا تھا اور وہ اتنے ذوق و شوق سے سہیل بھائی کی شادی میں شریک ہونے ہی آئی تھی۔ اس کی اب تک کی گفتگو سمجھ میں آئی تو سعد کے لبوں پر محظوظ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ویسے کیا سعد بالکل ویسا ہی ہے۔ میرا مطلب ہے اس کے سعد ویسا ہی گڑیا ہے یا بدل گیا ہے؟" اگلا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ سعد کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ یک دم غائب ہو گئی تھی۔

"ماما وغیرہ اس کے متعلق سن کر بہت افسوس ہوتا ہے۔ جب بھی تائی جان فون کرتی ہیں ممّا کو سعد کے متعلق بتا کر اور زیادہ پریشان کر دیتی ہیں۔ تائی جان کی باتیں سن کر میرے ذہن میں تو اس کا عجیب و غریب حلیہ آتا ہے۔ بڑے بڑے بال' گلے میں چین' کان میں بالی۔ کیا وہ پونی بھی بناتا ہے سہیل بھائی؟"

"اور کیا بتاتی ہیں وہ سعد کے متعلق۔" اس نے بابا کے سوال کا جواب دیے بنا پوچھا۔

"انہوں نے تو صرف یہ بتایا ہے کہ سعد بہت بگڑ گیا ہے۔ غلط سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے لگا ہے۔ اب بگڑتے ہوئے لڑکے تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میری دوست ہے فائزہ اس کا بھائی بھی بگڑ گیا تھا۔ خیر سعد سے تو وہ بہت کم عمر ہے اس کے ابو نے اسے کیڈٹ کالج بھیج دیا۔ اب گھر آتا ہے تو بالکل انسان کا بچہ لگتا ہے۔ سعد بھی جب بگڑنا شروع ہوا تھا تو آپ لوگوں کو بھی اس کا کوئی ایسا ہی حل سوچنا چاہیے تھا۔ اب تو خیر اس کی عادتیں پختہ ہو گئی ہوں گی۔"

سعد نے اس کی بات کا کوئی جواب دیے بنا محض ہنکارا بھرا تھا۔

"ویسے ضدی اور ہٹ دھرم تو وہ بچپن سے ہی تھا لیکن ممّا اسے ہمیشہ جسٹی فائی کرتی ہیں۔ ماں باپ دونوں ہی سر پر موجود نہ ہوں تو شخصیت میں تھوڑا بہت بگاڑ تو آ ہی جاتا ہے۔ ویسے ذہین بہت تھا۔ ماما بتاتی ہیں کتابوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا' صرف امتحانوں میں پڑھتا تھا۔ پھر بھی پہلی تین پوزیشنز میں سے کوئی ایک اسی کی ہوتی تھی۔" اس نے جیسے سعد کو آگاہ کیا تھا۔

"ویسے اس کی وجہ سے ماما مجھے بھیجتے ہوئے ڈر بھی بہت رہی تھیں۔ میں بہت ضد کر کے آئی ہوں لیکن ماما نے مجھے بہت سمجھا کر بھیجا ہے کہ اپنے کام سے کام رکھنا ہے۔ سعد سے کوئی ادھر' ادھر کی بات نہ کرنا۔ اسے خود سے بے تکلف ہونے کا موقع مت دینا۔ اگر کوئی کہے سعد کو اس کے کمرے میں جا کر چائے دے آؤ تو ٹال دینا' حالانکہ ماما کے خدشے بالکل بے بنیاد ہیں۔ وہ جتنا مرضی بگڑا ہوا شخص ہو' اپنے گھر کے بندوں کا تو لحاظ کرتا ہی ہو گا نا۔" اس نے جیسے تائید چاہی۔

"پتا نہیں۔" وہ لب بھینچ کر بولا۔ کتنا شدید دکھ ہوا تھا مدحت چچی کے خدشوں کے متعلق جان کر لیکن شاید وہ بھی مجبور تھیں۔ ان کے سامنے جیسی تصویر کشی کی گئی تھی' اسی کو سامنے رکھ کر انہوں نے بیٹی کو احتیاطی تدابیر بتائی تھیں۔

"آپ کو پتا ہے سہیل بھائی! میں نے بی اے میں سائیکالوجی رکھی تھی۔ مجھے لوگوں کی نفسیات پڑھنے کا بہت شوق ہے اور میں اس کام میں ماہر بھی بہت ہوں۔ میں نے ماما سے تو اپنے ارادے کا ذکر نہیں کیا لیکن میں چپکے چپکے سعد کی شخصیت کا مطالعہ کروں گی۔ اگر اسے سدھارنے کی کوئی صورت ہوئی تو آپ لوگوں سے ڈسکس کروں گی۔ ویسے اگر اسے کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کو دکھایا جائے تو کیا اس کی شخصیت کا بگاڑ دور نہیں ہو سکتا؟"

اس نے رائے مانگی تھی۔ سعد کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی گویا وہ اسے سدھارنے کا پروگرام لے کر آئی تھی۔

"آپ کو میری باتیں بچگانہ لگ رہی ہیں نا۔" اس

کی نگاہوں سے وہ مسکراہٹ چھپی نہ رہ سکی تھی جب ہی وہ ذرا خفگی سے بولی تھی۔

"ویسے آپس کی بات ہے، آپ مسکراتے ہوئے لگے بہت شاندار ہیں۔ شازمہ بھابھی لکی ہیں جو انہیں آپ جیسا ڈیشنگ شخص ملا۔ تائی جان نے ماما کو بتایا تھا کہ شازمہ بھابھی بھی بہت خوب صورت ہیں۔ یعنی کپل شاندار ہوگا۔"

وہ ایک لمحے پہلے کی خفگی بھلا کر مسکرا کر بولی تھی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ تائی جان اور مدحت چچی کے درمیان ٹیلیفونک رابطہ موجود تھا اگرچہ وہ اس بات سے لاعلم تھا۔

مدحت چچی کے سامنے اس کی کردار کشی کے پیچھے تائی جان کا کیا مقصد ہو سکتا تھا؟ فی الحال یہ بات بھی سمجھ سے باہر تھی۔

ماہا کی باتوں کا جواب دیے بنا وہ اسی سوچ میں الجھا ہوا تھا۔ اس کی خاموشی سے مایوس ہو کر ماہا بھی چپ ہو گئی تھی اور اب کھڑکی کی طرف رخ موڑے باہر کے نظاروں کو تک رہی تھی۔ گاڑی کالونی کی حدود میں داخل ہوئی تو وہ ذرا سیدھی ہو بیٹھی۔ بہت اشتیاق سے وہ ان راستوں کو تک رہی تھی، جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔

"اب لیفٹ پر گاڑی موڑیں گے نا سہیل بھائی۔"

وہ بچوں کی سی خوشی سے بولی۔ مقصد اپنی یادداشت چیک کرنا تھا۔

"آپ کو پتا ہے سہیل بھائی! مجھے اب بھی خوابوں میں اپنا گھر، یہ جگہیں، یہاں کا پارک نظر آتا ہے حالانکہ میں نے وہاں جو وقت گزارا ہے وہ یہاں کی نسبت طویل ہے۔ وہاں ماموں کی فیملی نے ہمیں بہت پیار بھی دیا۔ کبھی اکیلے پن کا احساس نہیں ہونے دیا لیکن میں نے ہمیشہ اپنے شہر، اپنے گھر اور یہاں کے لوگوں کو بہت مس کیا ہے۔ میرے بچپن کی حسین ترین یادیں اس گھر سے وابستہ ہیں سہیل بھائی! وہ خوب صورت ترین وقت جو میں نے اپنی ماما اور پاپا کے ساتھ گزارا تھا بھلائے نہیں بھولتا۔"

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ آنکھوں میں آئی نمی کو چھپانے کے لیے اس نے رخ دوبارہ کھڑکی کی جانب موڑ لیا تھا۔ اس پل سعد کو اس چھوٹی سی پیاری لڑکی سے دلی ہمدردی محسوس ہوئی تھی لیکن وہ اس کی دل جوئی کے لیے کچھ بول نہ پایا۔

"بس اب گھر آنے ہی والا ہے نا۔" گاڑی نے ایک اور ٹرن لیا تو اس نے پرجوش انداز میں دریافت کیا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔ چند لمحوں بعد بڑے سفید گیٹ کے سامنے گاڑی رک گئی تھی۔

"گھر آ گیا ہے۔" سعد نے اسے جیسے آگاہ کیا۔

"جی وہ تو مجھے معلوم ہے لیکن کیا آپ نہیں آئیں گے؟" اسے حیرت ہوئی اور اسی لمحے سعد کو ڈگی میں پڑے اس کے وزنی بیگ کا خیال آیا۔ وہ گہرا سانس کھینچتے ہوئے نیچے اترا۔ بیگ نکال کر گیٹ کے سامنے رکھا اور بیل پر انگلی رکھ دی۔ وہ بھی گاڑی سے اتر کر اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔

"گیٹ نہ کھلے تو ایک بار بیل اور بجا دینا۔ اندر سے باہر آتے ہوئے اتنا وقت تو لگتا ہی ہے۔ مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔" وہ اسے آگاہ کرتے پھر گاڑی میں بیٹھ گیا تھا اور گیٹ کھلنے کا انتظار کیے بغیر گاڑی بھگا کر لے گیا تھا۔

"ایسی بے مروتی؟ کتنا بدل گئے ہیں سہیل بھائی۔" ماہا کو شدید قسم کے قلق نے آن گھیرا۔ اس نے ایک بار پھر بیل دی تھی۔

ذرا دیر بعد گیٹ کھل گیا تھا۔ چالیس، پینتالیس سال کا شخص شکل سے ہی ملازم لگتا تھا گیٹ کھولے اسے تک رہا تھا۔

"میں ماہا۔" اسے کچھ نہ آیا اس کے علاوہ کیا کہہ کر اپنا تعارف کروائے۔

"میں نواب ہوں جی۔" اس نے بتیسی نکال کر جوابی تعارف کروایا۔

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ اندر آنے کا راستہ دیں گے؟" ماہا نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ شرمندہ سا ہو کر ایک طرف ہٹ گیا۔

"میرا بیگ اٹھا لاؤ۔" ماہا کہہ کر اندر داخل ہو گئی تھی۔ نواب نے سر ہلا کر فوراً حکم کی تعمیل کی تھی۔ بیگ اٹھایا، گیٹ بند کیا پھر ماہا کے ساتھ ہی چلنے لگا تھا۔

وہ گرد و پیش کا جائزہ لیتی آگے بڑھ رہی تھی۔ گھر کے نقشے میں بہت سی تبدیلیاں آ گئی تھیں پھر بھی اس کی آنکھوں کے سامنے یہاں گزرا اپنا بچپن پھرنے لگا تھا۔ ماما کی یاد اس شدت سے اچانک حملہ آور ہوئی کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں مگر اگلے ہی پل اس نے خود کو سنبھالا تھا۔ سامنے سے ہی تائی جان آ رہی تھیں۔ گیارہ سال پہلے کی نسبت بہت موٹی ہو گئی تھیں پھر بھی ماہا کو انہیں پہچاننے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی لیکن شاید اتنی جلدی اسے پہچان نہ پائی تھیں۔ جب ہی ٹھٹک کر رک گئی تھیں۔ ماہا نے انہیں آگے بڑھ کر سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام جیتی رہو۔" انہوں نے اسے ساتھ لپٹایا تو تھا مگر اپنائیت کی کوئی گرمی محسوس نہ ہوئی۔

"بہت بڑی ہو گئی ہو۔ میں تو تمہیں پہچان ہی نہ پائی۔"

انہوں نے تسلیم کیا کہ پہلی نگاہ میں وہ اسے پہچان نہ سکی تھیں ورنہ سچ تو یہ تھا کہ وہ اس کی خوب صورتی دیکھ کر ٹھٹکی تھیں۔ کیا رنگ روپ نکلا تھا اس لڑکی نے لمحے کے ہزارویں حصے میں انہیں مدحت کو شادی کارڈ بھیجنے کا فیصلہ شدید احمقانہ لگا تھا۔ ایسا حسن تو کسی کے بھی سر چڑھ کر بول سکتا تھا۔ اس کی کم عمری، چہرے کی شادابی، معصومیت اور بھولپن نے انہیں عجیب سی بے اطمینانی میں مبتلا کر دیا تھا لیکن اب وہ آ گئی تھی تو اسے بھگتنا تو تھا۔

"اور سناؤ سفر تو ٹھیک گزرا؟" وہ اسے لیے لاؤنج میں آ گئی تھیں۔

"جی تائی جان! کوئی پرابلم نہیں ہوئی۔ ماما ویسے ہی مجھے اکیلے بھیجتے ہوئے پریشان ہو رہی تھیں۔" وہ صوفے پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں ٹھیک ہے تمہاری؟" تائی جان خیر خیریت دریافت کرنے کی رسم نبھا رہی تھیں۔

"اللہ کا شکر ہے بالکل ٹھیک ہیں۔ پچھلے دنوں چیسٹ انفیکشن ہو گیا تھا کافی طبیعت خراب تھی۔ کالج سے بھی چھٹیاں لے رکھی ہیں۔ اتنی جلدی دوبارہ چھٹی نہیں مل سکتی تھی ورنہ ماما بھی ضرور آتیں۔"

اگرچہ انہوں نے کسی قسم کا کوئی استفسار نہ کیا تھا پھر بھی ماہا نے ماں کے نہ آنے کی توجیہہ پیش کر دی تھی۔ انہوں نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"کوئی اور نظر نہیں آ رہا تائی جان! بڑی خاموشی ہے گھر میں۔" وہ پوچھے بنا نہ رہ پائی۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ اپنے ایسے استقبال کی توقع نہ کر رہی تھی۔ کتنی پرجوش ہو رہی تھی وہ یہاں آ کر سب سے ملنے پر۔ ماما نے کل فون کر کے اس کی آمد کے بارے میں بتا بھی دیا تھا۔ آج صبح بھی ماما اور ولید اسے کوچ میں بٹھانے آئے تھے، تب ماما نے دوبارہ تائی جان کو فون کر کے کوچ پہنچنے کا ٹائم بتایا تھا۔ اس کا خیال تھا جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہو گی سب اپنے اپنے کمروں سے نکل کر انتہائی گرم جوشی سے اس کے استقبال کو باہر آئیں گے۔ شادی میں محض پانچ دن باقی تھے۔ اس کی دانست میں افراد خانہ کو تو گھر میں موجود ہونا ہی تھا ڈھیر سارے دوسرے مہمانوں کی بھی توقع تھی۔ اسے فرہاد بھائی کی شادی یاد تھی۔ ہفتہ پہلے ہی مہمانوں سے گھر بھر گیا تھا۔ کیا گہما گہمی تھی جبکہ یہاں خالی گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

"تمہارے تایا آفس گئے ہوئے ہیں۔ نگی بھی جاب کرتی ہے، شام کو آئے گی اور رہا سہیل تو وہ بے چارہ شادی کے انتظامات میں مصروف ہے۔" تائی جان نے بتایا تھا۔

"اچھا!" اسے قدرے مایوسی ہوئی۔

"اور مہمان بھی کوئی نہیں آیا۔" وہ پوچھے بنا نہ رہ پائی۔

"ارے آج کل کس کے پاس اتنا فارغ وقت ہے کہ ہفتہ پہلے ہی شادی اٹینڈ کرنے پہنچ جائے۔ مہمان تو وقت پر ہی آئیں گے بلکہ آئیں گے بھی کیا، سیدھے میرج ہال پہنچیں گے۔ سارے اسی شہر کے مہمان ہیں۔ ہال میں شادی کا یہی تو فائدہ ہے، مہمان

داری کا اتنا نہیں ہوتا۔ شادی بیاہ پر مہمان اکٹھے کرنا تو اب پرانے زمانوں کی باتیں ہیں۔"

تائی جان نے نخوت سے کہا۔ ایک لمحے کو وہ دل میں شرمندہ ہوئی تھی یعنی ایک اس کے پاس ہی اتنا فارغ وقت تھا کہ وہ بے وقوفوں کی طرح منہ اٹھائے پانچ سات دن پہلے ہی شادی میں شرکت کے لیے پہنچ گئی تھی لیکن اگلے ہی پل اس نے یہ سوچ ذہن سے جھٹک دی وہ مہمان کب تھی' یہ گھر اس کا بھی تو تھا۔

"چلو تم ہاتھ منہ دھولو۔ میں نواب سے کہہ کر کھانا لگواتی ہوں۔ تم تو صبح گھر سے ناشتہ کرکے چلی ہو گی' کھانا کھالو میں نے تو صبح دیر سے ناشتہ کیا تھا۔ ابھی بھوک نہیں لگ رہی۔"

تائی جان نے واضح کر دیا کہ کھانے کی میز پر وہ اسے کمپنی نہیں دے پائیں گی لیکن اسے واقعی شدید بھوک لگ رہی تھی' سو تکلف برتنا مناسب نہ سمجھا اور فریش ہونے کے بعد ڈٹ کر کھانا کھایا' پھر نگی باجی کے کمرے میں (کہ اسے یہی کمرہ الاٹ ہوا تھا) جا کر لیٹ گئی۔ کچھ سفر کی تھکن تھی پھر کرنے کو کچھ اور کام تھا بھی نہیں' ذرا سی دیر میں وہ گہری نیند میں کھو گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

شام کو نگی باجی کی واپسی ہوئی تھی۔ وہ اس سے اتنی محبت' اپنائیت اور گرمجوشی سے ملی کہ ماہا کا سارا گلہ جاتا رہا۔

"کتنی بڑی ہو گئی ہو تم ماہا اور پیاری بھی۔" اس نے اسے بہت محبت سے دیکھا تھا' وہ جھینپ کر ہنس پڑی۔

"تم اگر اپنے آنے کے بارے میں پہلے سے بتا دیتیں تو میں آج آفس سے چھٹی کر لیتی۔ کتنے برسوں بعد ہم ایک دوسرے سے ملے ہیں۔" نگی باجی نے کہا تھا۔

"ماما نے تائی جان کو فون کرکے بتایا تھا نگی باجی! ورنہ میرا ارادہ تو آپ لوگوں کو سرپرائز دینے کا ہی تھا۔" اس نے کہا تو ایک لمحے کو نگی باجی چپ ہو گئیں۔

"امی کو بتانا یاد نہیں رہا ہو گا۔" کچھ دیر بعد اس نے پھیکی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا' ماہا نے خوش دلی سے ان کی وضاحت قبول کرلی تھی۔

"تم نے بہت اچھا کیا جو تم آگئیں ماہا! اتنے برسوں بعد سہی ایک دوسرے کو دیکھ تو لیا ورنہ میرے ذہن میں تو ابھی تک وہی ماہا آتی تھی' دو پونیوں والی گول مٹول سی لڑکی جس کو اسکول داخل کروایا تو بھاں بھاں کر کے روتی تھی اور اسکول جا کر ضد پکڑ لیتی تھی کہ مجھے نگی باجی کی کلاس میں بیٹھنا ہے۔ کتنے دنوں تک تم میرے ساتھ میری کلاس میں بیٹھتی رہی تھیں' تمہیں یاد ہے ماہا!" نگی اسے اس کا بچپن یاد دلا رہی تھی۔

"مجھے سب یاد ہے نگی باجی! سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کو کبھی بھلا ہی نہ پائی۔ میں نے آپ لوگوں کو ہمیشہ بہت یاد کیا۔" اس نے ان کے ہاتھ تھامے تھے۔

"تم بہت اچھی ہو ماہا! ورنہ اگر میں کہوں کہ میں نے بھی تمہیں بہت یاد کیا تو پتا نہیں یہ سچ ہو گا یا جھوٹ' ہم بہت بے حس اور خود غرض سے لوگ ہیں' اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ورنہ اتنے قریبی رشتوں میں ان دوریوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کتنے برسوں بعد ہم مل رہے ہیں اور یہ بھی تمہارا بڑا پن ہے جو تم ہم لوگوں سے ملنے آگئیں بلکہ تمہاری ماما بھی بہت نائس خاتون ہیں جو تمہیں ہم لوگوں کے پاس بھیج دیا ورنہ جیسی لاتعلقی ہم لوگوں کی جانب سے اپنائی گئی کوئی اور ہوتا تو کبھی تعلق بحال کرنے کی کوشش نہ کرتا۔"

نگی باجی نے اپنی فیملی کو کوئی رعایت دینے کی کوشش نہ کی' ان کی صاف گوئی پر وہ سٹپٹا ہی تو گئی۔ اس میں تو اتنی ہمت نہ تھی کہ نگی باجی کو بتا پاتی کہ یہاں آنے کے لیے اس نے اپنی ماما کو کتنی مشکل سے راضی کیا تھا۔

"نگی باجی! ایسی کوئی بات نہیں۔ ماما اور تائی جان کے درمیان تو ان برسوں میں مسلسل رابطہ رہا ہے۔ دونوں ٹیلی فون پر ہمیشہ ایک دوسرے کی خیریت لیتی رہی ہیں۔" اس نے نگی باجی کی غلط فہمی دور کرنا چاہی تھی۔ وہ اس بار کچھ نہ بولیں' صرف ہنس پڑی تھیں۔ ماہا ان کی خوب صورت ہنسی میں کھو سی گئی۔

"ابھی آپ مجھے کہہ رہی تھیں کہ میں بہت پیاری ہو گئی ہوں' آپ تو خود اتنی پیاری لگ رہی ہیں نگی باجی!" اس نے انہیں محبت سے دیکھا تھا۔

"تم نے شاید ابھی مجھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ابھی تمہارے ساتھ [illegible] میں چل رہی ہوں' ذرا غور سے دیکھنا پھر میں پوچھوں گی کہ اپنے بیان پر قائم ہو یا بیان بدلنا چاہو گی۔" نگی باجی نے ہنستے ہوئے ہی کہا تھا۔

لیکن اس بار ان کی مسکراہٹ نے ماہا کو بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ چار پانچ سال پہلے ایک ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں نگی باجی کی ایک ٹانگ میں واضح لنگڑاہٹ آگئی تھی۔

"نگی باجی۔۔۔!" اس نے روہانسی ہو کر اس بات پر احتجاج کیا۔

"سوری یار! اگر میری بات سے زیادہ ہرٹ ہونے کی ضرورت نہیں۔ پتا نہیں کیوں' کبھی کبھار میں الٹا سیدھا بول دیتی ہوں۔" اس کی شکوہ بھری آنکھیں دیکھ کر نگی نے اس کے ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے معذرت کی۔

"اچھا چلو اب' باقی باتیں کھانے کی میز پر ہوں گی۔ امی انتظار کر رہی ہیں اور مجھے خود بھی بہت بھوک لگی ہے۔ آج کل آفس میں اتنا کام ہے کہ اکثر و بیشتر لنچ بھی گول ہو جاتا ہے۔"

اس نے کہا۔ ماہا سر ہلاتے ہوئے ان کے ساتھ چل پڑی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر تائی جان واقعی منتظر بیٹھی تھیں۔

"آدھا گھنٹہ پہلے کہہ کر کمرے میں گئی تھیں کہ امی کھانا لگوائیں' بہت بھوک لگی ہے اور اب کمرے سے نکل کر آئی ہو۔" وہ نگی باجی پر خفا ہوئی تھیں۔

"برسوں بعد ملاقات ہوئی ہے امی! آدھے گھنٹے میں تو ایک دوسرے کو دیکھنے سے ہی دل نہیں بھرا۔" وہ مسکرائی تھیں۔ تائی جان جواب میں بولیں تو کچھ نہیں البتہ جذباتیت کے اس اظہار پر ان کے چہرے پر واضح بیزاری نمودار ہوئی تھی۔

"اچھا چلو' بیٹھنے سے پہلے اس نواب کو بھی بلا لاؤ' حالانکہ ابھی گزرا تھا یہاں سے' دیکھا ہے کہ میز سج گئی ہے' پھر بھی آنے کا نام نہیں۔ ہم ہی ہیں جو اتنے نخروں کی ناز برداریوں میں لگے رہتے ہیں۔"

"اوفوہ! بلاوجہ ناراض کیوں ہو رہی ہیں' میں بلا کر لاتی ہوں اسے۔" نگی باجی واپس مڑ گئی تھیں۔ ماہا البتہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی' تائی جان نواب کو بھی اپنے ساتھ میز پر بٹھا کر کھانا کھلاتی تھیں۔ ان سے اتنی اخوت اور مساوات کی تو توقع نہ تھی۔

"لیکن نگی باجی اسے کہاں ڈھونڈنے چلی گئیں' یہ آگیا نواب۔" سامنے سے نواب چنگیر میں گرم روٹیاں لا رہا تھا۔ ماہا کی نظر پڑی تو تائی جان کی توجہ بھی اس جانب دلائی' انہوں نے جواب میں کچھ ایسی تیکھی نظر ماہا پر ڈالی کہ وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ اسی لمحے نگی بھی آگئی تھی اور وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھی تو سہیل بھائی بھی آتے دکھائی دیے۔ تب اسے سمجھ آیا کہ نواب سے تائی جان کی مراد دراصل سہیل بھائی تھے لیکن یہ بات اب بھی سمجھ سے باہر تھی کہ اکلوتے بیٹے کا ذکر کرتے ہوئے تائی جان کے لہجے میں اتنی بیگانگی کیوں اتر آئی تھی۔ کہیں سہیل بھائی اپنی پسند سے تو شادی نہیں کر رہے؟ شاید اسی لیے ان کا موڈ آف ہے۔ اس نے خود ہی قیاس کیا تھا لیکن سہیل بھائی کی شادی تو تائی جان کے بھائی کی بیٹی سے ہو رہی تھی اور جب تائی جان نے فون پر ماما کو شادی میں آنے کی دعوت دی تھی تب تو انہوں نے اپنی ہونے والی بہو کے بہت قصیدے پڑھے تھے۔

وہ اسی سوچ بچار میں الجھی کھانے کی طرف متوجہ ہوئی۔

"یہ لو بیٹا! میں نے پالک پنیر تمہارے لیے بنوایا ہے۔" تائی جان کے لہجے کی بیزاری شیرینی میں بدل گئی تھی۔ ماہا نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا' وہ سالن کا ڈونگا سہیل بھائی کی طرف بڑھا رہی تھیں۔

"شکریہ! لیکن آج میرا چاول کھانے کا موڈ ہے۔"

اس نے بے رکھائی سے کہہ کر بریانی کی ڈش اپنی جانب کھسکائی تھی۔

"کتنے بدتمیز ہو گئے ہیں سہیل بھائی۔" ماما کو واقعی افسوس ہوا تھا۔ ماحول میں عجیب سی سنجیدگی اور بوجھل پن چھا گیا تھا۔ ماما اس عجیب سی چھائی خاموشی کو توڑنے بہانہ ڈھونڈ رہی تھیں۔

"لگ ہی نہیں رہا نگی باجی! کہ اس گھر میں کوئی شادی ہے۔ نہ کوئی شور شرابا نہ ہلا گلا۔"

"پھر کیا کرنا چاہیے۔" نگی مسکرائی تھی۔

"کل سے گھر میں ڈھولک بجے گی۔ مجھے بہت اچھی ڈھولک بجانا آتی ہے۔ وہاں ماموں کے گھر فرہاد بھائی کی شادی پر ڈھولک میں نے ہی بجائی تھی۔ آپ ہمیں کل ڈھولک لا دیں گے نا۔"

اس نے اب سامنے بیٹھے سعد کو بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ تائی جان نے حیران ہو کر پہلے اسے اور پھر سعد کو دیکھا۔ ماما کی بے تکلفی نے انہیں چوکنا سا کر دیا تھا' جو خطرہ اسے دیکھتے کے ساتھ ہی انہیں لاحق ہوا تھا' لگتا تھا وہ حقیقت کا روپ دھارنے لگا۔

"یہ بے چارہ کہاں سے لائے گا ڈھولک' تم اب سے کہہ کر میں منگوا دوں گی۔" سعد کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ان کی طرف سے جواب آ گیا تھا۔ اسی لمحے تھکا ہارا سہیل ڈائننگ روم میں داخل ہوا تھا۔

"ہیلو ایوری باڈی! ڈنر چل رہا ہے اور کسی نے میرا انتظار بھی نہیں کیا۔" وہ خالی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"کیا انتظار کرتے میرے بچے! پتا تھا کاموں کی ایک لمبی فہرست ہے تمہارے پاس۔ ایک اکیلی جان اور سو جھمیلے۔ اتنی بار میں نے تمہیں فون کرنے کی کوشش کی مگر رابطہ نہیں ہوا۔"

"ہاں چارجنگ ختم ہو گئی تھی۔"

"اچھا سارے کام ہو گئے نا' ہال کا چکر لگا لیا' مینو کا جو مسئلہ تھا سیٹ ہوا یا نہیں۔" تائی جان پوچھ رہی تھیں۔ ماما کھانا چھوڑ کر حیرانی سے نووارد کو دیکھ رہی تھی۔ ذہن میں کچھ جھماکا سا تو ہوا تھا مگر پھر بھی وہ ابھی تک کنفیوز تھی اور اسی لیے سہیل کی اس پر نگاہ پڑی تھی۔

"یہ۔" اس نے بھی پہچاننے کی کوشش کی اور اگلے ہی پل وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"ارے یہ ماما ہے نا' کتنی بڑی ہو گئی ہے۔" اسے ماما کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔

"دیکھ لیں سہیل بھائی! ماما کتنی دور سے صرف آپ کی شادی میں شرکت کے لیے آئی ہے۔ ہمیں تو کبھی مدحت چچی یا ماما سے جا کر ملنے کی توفیق نہ ہوئی۔" نگی نے سہیل کو مخاطب کیا۔ ماما کو پورا فقرہ تو خیر کیا سمجھ آتا' اس کا فیوز تو نگی کے منہ سے سہیل بھائی سن کر ہی اڑ گیا تھا اگر یہ سہیل بھائی تھے تو..... اس نے بوکھلا کر سامنے بیٹھے سعد کو دیکھا' وہ اس کی بوکھلاہٹ کے پس منظر سے بخوبی آگاہ تھا۔ اپنی ہنسی روکنے اور چہرہ بے تاثر رکھنے میں اسے سخت دشواری ہوئی تھی۔

"کیا ہوا لڑکی کیا تمہارے ہاں سلام دعا کا رواج نہیں ہے۔ بچپن میں تو بہت تمیزدار ہوتی تھیں۔" سہیل نے اسے شرارتی انداز میں مخاطب کیا۔

"سوری سہیل بھائی' اسلام علیکم۔" اس نے کر انہیں سلام کیا تھا۔ اس کے بعد کھانے کے درمیان سہیل بھائی اس سے حال احوال دریافت کرتے ہی رہے تھے۔ اس کی پڑھائی' ماما کی صحت' وہاں کا موسم' ماموں کی فیملی غرض چھوٹے چھوٹے سوالوں کے بھی وہ بہت سنجیدگی سے جواب دیتی رہی۔ اس کی ذہنی رو کہیں اور ہی معاملے میں گم ہوئی پڑی تھی۔ کھانا کھا کر سب سے پہلے میز چھوڑنے والا سعد تھا۔ اس کے اٹھنے کے بعد ماما نے سکون کا سانس لیا تھا۔

"تم سے بڑا احمق اسے روئے زمین پر اور کوئی نہیں پایا جا سکتا ماما بی بی!" جو رائے ولید اس کے متعلق اکثر دیتا رہتا تھا اور وہ پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتی تھی لیکن آج زندگی میں پہلی بار وہ بھی ولید کی رائے سے متفق ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

مدحت اسے بہت یاد کر رہی تھیں۔ دن میں تین

چار بار فون کر کے وہ اس کی خیریت دریافت کرتی تھیں۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں ماما۔" وہ انہیں مسکرا کر یقین دلاتی۔

"اور گھر میں سب کا رویہ تمہارے ساتھ ٹھیک طرح سے ملے تو ہیں؟" انہیں جانے کیا خدشے ستاتے تھے اور اس بار چند لمحوں کے لیے اسے چپ ہونا پڑا تھا۔ تائی جان کا روکھا پھیکا رویہ تو اس نے پہلے دن ہی محسوس کر لیا تھا لیکن اسے کچھ خاص افسوس نہ ہوا تھا۔ وہ تو ہر کسی سے اسی بیزار کن لہجے میں مخاطب ہوتی تھیں۔ تایا جان سے ملاقات اگلے دن شام کو جا کر ممکن ہوئی تھی کہ وہ پچھلی رات اس کے سونے کے بعد گھر لوٹے اور جاگنے سے پہلے آفس چلے گئے تھے۔ شام کو البتہ وہ جلدی گھر آ گئے تھے' ماما نگی باجی کے ساتھ لان میں بیٹھی تھی۔

وہ ذرا دیر ان کے پاس رکے تھے۔ ماما بے قراری ہوئی تھی۔ وہ ان کے گلے لگنا چاہتی تھی۔ پاپا کی شباہت لیے پاپا کے بڑے بھائی کے سینے سے لگ کر وہ باپ جیسی خوشبو اپنے اندر اتارنا چاہتی تھی لیکن انہوں نے تو سر پر ہاتھ پھیرنے کی رسم ادا کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی تھی۔ رسمی انداز میں اس کے سلام کا جواب دے کر اس کی اور ماما کی خیریت دریافت کی تھی۔

ماما کے اندر جیسے چھن سے کوئی چیز ٹوٹی تھی۔ اگر اسے انہیں دیکھ کر پاپا یاد آئے تھے تو کیا تایا جان کو اس کی شکل میں اپنے چھوٹے بھائی کی شباہت نظر نہ آئی تھی؟ مرحوم بھائی کی اکلوتی نشانی' اتنے برسوں بعد ان کی نگاہوں کے سامنے تھی' وہ اگر خود جذباتی نہ ہوئے تھے تو کم از کم اسے سینے سے لگا کر اس کے جذبات کو نکلنے کا راستہ دے دیتے۔

تائی جان سے تو خون کا کوئی رشتہ نہ تھا لیکن تایا کے سپاٹ اور بے حس سے انداز نے ماما کو واقعی بری طرح ہرٹ کیا تھا اور اب مدحت پوچھ رہی تھیں کہ سب اس سے ٹھیک طرح سے ملے تو ہیں؟

"ماما! مجھے نگی باجی کی شکل میں بہن مل گئی ہے۔ وہ اتنی اچھی ہیں کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔" اس نے باقی افراد کے رویے کی شکایت کیے بنا مدحت کو نگی باجی کے متعلق بتانے پر اکتفا کیا تھا۔

"ہاں نگین بہت پیاری بچی ہے۔ بچپن میں بھی بہت خیال رکھتی تھی۔"

"جی ماما! مجھے تو سارا وقت نگین باجی ہی کمپنی دیتی ہیں۔ باقی تو سب بہت مصروف ہیں۔ سہیل بھائی بے چارے تو شادی کے انتظامات میں لگے ہیں۔ تایا جان آفس سے رات گئے لوٹتے ہیں۔ تائی جان کی اپنی مصروفیات ہیں۔"

"اور سعد! اس سے ملی ہو تم۔" مدحت نے بظاہر سرسری سے انداز میں پوچھا تھا لیکن وہ جانتی تھی ماما اس کے متعلق جاننے کی کس شدت سے آرزومند ہیں حالانکہ یہ بھی ان کی ہدایت تھی کہ وہ سعد سے کم سے کم واسطہ رکھے۔

"وہ زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتے ہیں ماما! میں نے تو ان کو ٹھیک طرح سے دیکھا بھی نہیں۔" اس نے دانستہ جھوٹ بولا تھا۔ اگر مدحت کو سعد سے پہلی ملاقات کا احوال سنا دیتی تو کھنچائی ہونا لازمی امر تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے' اس سے ذرا فاصلے پر ہی رہنا۔" انہوں نے ایک بار پھر نصیحت دہرائی تھی۔ اس نے "جی ماما" کہہ کر بات ختم کر دی تھی۔

جانے تائی جان نے ماما کو سعد کے متعلق کیا کچھ بتا رکھا تھا کہ ان کے خدشے ختم ہونے میں ہی نہ آتے تھے حالانکہ سعد میں بظاہر بگڑے لڑکوں والی کوئی بات نظر نہ آتی تھی لیکن اسے آئے ہوئے محض دو تین دن ہوئے تھے اور تین دنوں میں کون کس پر کھلتا ہے۔ ظاہر ہے جو لوگ اس کے ساتھ برسوں سے رہ رہے تھے' وہ ہی اس کی عادتوں کے متعلق اچھی طرح جانتے ہوں گے۔

اس کا مطالعہ کہتا تھا کہ ایسی دوہری شخصیت والے لوگ جن کے ظاہر باطن میں اتنا تضاد پایا جاتا ہو' وہ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ بظاہر تعلیم یافتہ' مہذب

اور دل میں [illegible] لیکن جانے وہ کن کن بری عادتوں میں مبتلا تھا۔ ماما کی نصیحتوں کو اس نے گھر سے نکلتے ہوئے ہنسی میں اڑا دیا تھا لیکن اب وہ خود دل ہی دل میں سعد سے ٹھیک ٹھاک خائف ہو چکی تھی اور ہر ممکن طریقے سے اس سے کنی کترا رہی تھی۔ ویسے تو وہ خود سارا دن گھر میں ہوتا ہی نہ تھا۔ کھانے کے اوقات میں سامنا ممکن تھا اور ماہا بھوک لگنے کا کہہ کر کھانا بھی پہلے ہی کھا لیتی تھی۔ گھر میں اب تک شادی کا کوئی ہنگامہ نہ جاگا تھا۔ وہ حقیقتاً "واحد مہمان" تھی۔ آج رات میرج لان میں ہی مہندی کا فنکشن رکھا گیا تھا' پھر بھی گھر میں صبح معمول کے مطابق ہوئی تھی بلکہ آج تو نگی باجی بھی آفس جا رہی تھیں۔

"میں اتنے شوق اور جوش و خروش سے شادی میں شرکت کے لیے آئی تھی لیکن آپ لوگوں کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے میں بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ بن کر آگئی ہوں۔" نگی باجی آفس کے لیے تیار ہو رہی تھیں، جب اس نے خفگی سے منہ پھلایا۔

"مجبوری ہے بابا! فارن ڈیلی گیشن آنے والا ہے۔ یہ دو تین دن میرا آفس جانا بہت ضروری ہے۔"

"دو تین دن؟ یعنی آپ کل بھی آفس جائیں گی؟ کل سہیل بھائی کی بارات جانا ہے نگی باجی!" اس نے حیرت اور صدمے سے چور لہجے میں جیسے انہیں یاد کروایا۔

"فنکشن تو سارے رات کے ہی ہیں نا لیکن کل میں جلدی آجاؤں گی اور پرسوں شاید چھٹی کر لوں بلکہ پھر دو تین دن کی چھٹی لے لوں گی۔ وہ سارا وقت تمہارے لیے ہوگا۔ خوب گھومیں پھریں گے' انجوائے کریں گے۔"

"بہت شکریہ آپ کا بھائی کی شادی کے لیے چھٹی لے نہیں رہیں اور میرے لیے لے لیں گی۔" وہ ابھی اتنی اچھی تھیں کہ وہ ان کے سامنے کھل کر اپنی ناراضی اور خفگی کا اظہار کر سکتی تھی۔ نگی اس کے انداز پر ہنس پڑی تھی۔

"تم میرے کھڑوس باس کو دیکھ لو تو میری مجبوری کو سمجھ لو' جانا ضروری ہے یار!" نگی نے اس کے ہاتھ تھامے تھے۔

"ٹھیک ہے لیکن شام کو پلیز جلدی آنے کی کوشش کیجیے گا۔"

"اوکے باس۔" نگی نے سر تسلیم خم کیا اور اس بار ماہا بھی ناراضی ختم کر کے ہنس پڑی تھی۔

✡ ✡ ✡

میرج لان میں اس وقت رنگ و بو کا سیلاب امڈا ہوا تھا۔ وہ اتنے مہمانوں کی قطعاً" توقع نہ کر رہی تھی۔ نگی کے ساتھ کی وجہ سے وہ ایک دم سب کی نظروں میں آگئی تو کچھ کنفیوز سی ہو گئی۔ نگی اپنے ننھیالی عزیزوں سے ہنستے مسکراتے ملنے لگی تھی جبکہ گیدرنگ تھی اور تائی جان کے میکے والے اسے تو کچھ ضرورت سے زیادہ فیشن ایبل اور ماڈرن لگے۔ لڑکیاں ڈریسنگ کے لحاظ سے حد سے زیادہ بے باک اور لڑکے ضرورت سے زیادہ نظرباز۔ چند لمحوں میں ہی وہ گھبرا گئی تھی۔

"ویری پریٹی' تعارف تو کروائیں نگمین جی!" کسی نے اتنے قریب آکر کان میں سرگوشی کی [illegible] کر دو قدم پیچھے ہٹی۔ نگی باجی تو کسی اور ہی جانب متوجہ تھیں۔ انہیں یہ سرگوشی [illegible] وہ جی ہی جی میں کھول کر رہ گئی [illegible] تک نگی باجی کے ساتھ رہنے کے بعد وہ "ٹھیک ہی ہوں نگی باجی" کہہ کر ایک خالی [illegible] پر جا کر بیٹھ گئی۔ اتنی رونق اور ہنگامے کے باوجود اس کے اندر عجیب خالی پن سا اتر رہا تھا۔

ماما شدت سے یاد آنے لگی تھیں۔ انہیں شاید اندازہ تھا کہ جتنے جوش و خروش سے سہیل بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے تایا جان کے گھر جانے پر اصرار کر رہی تھی' یہاں آنے کے بعد سارا جوش و خروش ماند پڑ جائے گا اسی لیے انہوں نے اسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔

"اتنے برسوں بعد ان لوگوں سے مل کر تمہیں کیا حاصل ہوگا' وہ سب وہاں اپنی اپنی زندگیوں میں مگن

ہیں اور ہم یہاں اطمینان سے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ کیا کرو گی جا کر۔" انہوں نے رسانیت سے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

"ماما! میں اس گھر میں جا کر اپنے پاپا کو محسوس کرنا چاہتی ہوں۔ میرے بچپن کی ساری یادیں وہاں سے جڑی ہیں۔ پھر سہیل بھائی میرے فرسٹ کزن ہیں' سگے تایا زاد' میرا جی چاہتا ہے ماما کہ میں اپنے ددھیالی رشتہ داروں سے بھی ملوں۔ آپ آخر مجھے وہاں کیوں بھیجنا نہیں چاہتیں۔ کیا تحفظات ہیں آپ کے؟"

اس نے الجھتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس وقت تو مدحت بس اسے خاموشی سے دیکھ کر رہ گئیں [illegible] اگلے دن کالج جانے سے پہلے اسے [illegible] پیسے دیے تھے۔

"میں نے وحید [illegible] دیا ہے۔ گیارہ بجے تک وہ آجائے گا اس کے ساتھ جا کر شاپنگ کر لینا۔ احمد کی طبیعت خراب ہے ورنہ تمہاری زارا بھابھی کو کہہ دیتی۔ بہرحال زیادہ فینسی سوٹ خریدنے کی ضرورت نہیں۔ ڈیسنٹ سی شاپنگ کرنا۔ ایک سوٹ اپنی تائی جان کو اور دو سوٹ نگمین کے لیے بھی لے آنا۔" ماما نے کہا تھا۔ اس نے سر ہلا کر ان کے ہاتھ سے روپے تھام لیے اور شام کو اس نے بہت ذوق و شوق سے ماما کو ساری شاپنگ دکھائی تھی۔ "اب میں نے تم سے اتنی بھی ڈیسنٹ شاپنگ کا نہیں کہا تھا۔ میرا مطلب تھا کہ اوٹ پٹانگ فیشن کی چیزیں مت خرید لینا۔"

"کپڑے تو بہت اچھے ہیں بیٹا بلکہ میری پسند کے عین مطابق لیکن ایسے دھیمے رنگوں والے کپڑے تو ہماری عمر کے بندوں پر جچتے ہیں۔ تم نے اپنے لیے کلرز کا انتخاب صحیح نہیں کیا۔"

"اپنے لیے کیا مطلب ماما! میں نے یہ کپڑے آپ کے لیے خریدے ہیں۔ میرے کپڑے تو یہ ہیں۔" اس نے اپنے پیچھے پڑے دو تین شاپنگ بیگز آگے کیے۔

"تم نے میرے لیے کپڑے خریدے؟ کیوں بیٹا اتنی فضول خرچی وہ بھی مہینے کی آخری تاریخوں میں؟ میں نے تمہیں صرف تمہاری شاپنگ کے لیے پیسے دیے تھے۔" مدحت نے اسے آنکھیں دکھائی تھیں۔

"تو آپ شادی میں پرانے کپڑے پہن کر شرکت کریں گی۔" اس نے مصنوعی حیرت دکھائی۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو ماہا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جا رہی۔" مدحت نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔

"جانتی تو ہوں ماما! لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ میں کبھی بھی اور کہیں بھی آپ کے بغیر نہیں گئی۔" اس نے ان کی گردن کے گرد بازو حمائل کر کے انہیں منانا چاہا تھا۔

"وہ کہیں نہیں ہے ماہا! تمہارے سگے تایا کا گھر ہے اور تمہارے لیے اجنبی جگہ تو نہیں' تمہارا بچپن گزرا ہے وہاں۔" مدحت اب اسی کے الفاظ دوہرا رہی تھیں۔ اس نے خفا ہو کر منہ پھلایا تھا۔

مدحت ہنس پڑی تھیں۔

"تمہیں پتا تو ہے ماہا! پچھلے مہینے کتنی چھٹیاں لینا پڑ گئی تھیں۔ دوبارہ چھٹیاں ملنا مشکل ہے۔" انہوں نے اسے پیار سے سمجھایا تھا۔

"ٹھیک ہے ماما! جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے گہرا سانس کھینچتے ہوئے ان کی بات مان لی اور اب احساس ہو رہا تھا کہ ماما کا یہاں نہ آنے کا فیصلہ کتنا درست تھا۔ تایا جان کی بے التفاتی' تائی جان کی سرد مہری۔ وہ بچی تو نہ تھی کہ محسوس نہ کر پاتی بلکہ تائی جان کے چہرے پر تو اسے دیکھ کر ایسے تاثرات ابھرتے جیسے وہ اس کی آمد پر سخت ناخوش ہوں۔ صرف نگی باجی کی محبت اور اپنائیت تھی کہ اسے اپنے یہاں آنے کے غلط فیصلے کا احساس کم ہونے لگتا۔

اسٹیج پر سہیل بھائی اور شازمہ بھابھی کی رسم حنا جاری تھی اور نگی باجی ہی اسے زبردستی گھسیٹ کر اسٹیج پر لے گئی تھیں۔

"ارے بھئی ماہا! کہاں ہو تم' میری دلہن سے نہیں ملنا کیا؟" اس کی شکل دیکھ کر سہیل بھائی کو بھی یاد آگیا کہ ماہا نام کی ان کی ایک کزن بہت دور سے برسوں بعد صرف ان کی شادی میں شرکت کے لیے آئی ہے۔ اس نے شازمہ کو سلام کیا تھا۔ اس نے رسمی

مسکراہٹ چہرے پر سجا کر گردن ہلائی پھر دوبارہ سہیل بھائی کے دوسری طرف بیٹھی اپنی کزن سے جھک کر کوئی بات کرنے لگی تھی۔ نگی اسٹیج پر موجود اپنی دوسری کزنز سے ملاہا کا تعارف کروانے لگی وہ ذرا دیر کو تو اسٹیج پر رکی پھر جیسے ہی نگی کا دھیان ہٹا وہ چپکے سے پھر نیچے اتر آئی۔ بوریت کے احساس کے ساتھ سر میں درد بھی ہونے لگا تھا۔ وہ پھر اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئی۔ ذرا دیر بعد تائی جان بھی گھومتے پھرتے اس کے پاس چلی آئیں۔

"اکیلی بیٹھی ہو۔ جاؤ فوٹو وغیرہ کھنچوالو۔" جانے کیسے انہیں اس کا خیال آ گیا تھا۔

"ابھی شازمہ بھابھی سے مل کر آئی ہوں تائی جان! تصویر بھی بنوائی ہے۔" اس نے آدھا سچ اور آدھا جھوٹ بولا۔

"توبہ پھر پھر کر ٹانگوں میں اتنا درد ہو گیا۔ تھکا دیا سہیل کی شادی نے مجھے۔" تائی جان نے اپنی کیفیت کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک کرسی سامنے کھینچی اور اس پر پاؤں پسارے۔ ملاہا کو ان کی آمد کی وجہ اب سمجھ میں آئی۔ وہ خالی کرسیوں کی تلاش میں تھیں جہاں کچھ دیر ستا سکیں۔

"اور کیسی لگی تمہیں شازمہ۔" وہ جب ملاہا کے پاس بیٹھ ہی چکی تھیں سو کچھ نہ کچھ بات تو کرنا تھی۔

"اچھی لگیں بہت پیاری۔" اس نے دوبارہ سچ میں جھوٹ کی آمیزش کی۔ پیاری تو وہ تھی مگر اسے اچھی کہیں سے نہ لگی تھی۔ اپنی مہندی میں اتنا چٹر پٹر بولنے والی دلہن اس نے پہلی بار دیکھی تھی۔

"ہاں مہندی کی دلہن تو شرماتی لجاتی ہی اچھی لگتی ہے۔" اسے فرہاد بھائی کی شادی یاد آئی جب وہ لوگ زارا بھابھی کے ہاں مہندی لے کر گئے تو زرد سوٹ میں ملبوس شرمائی شرمائی سی زارا بھابھی کتنی خوب صورت لگ رہی تھیں حالانکہ وہ بھی کم باتونی نہیں مگر کچھ موقعوں پر روایتی طرز عمل ہی بھلا لگتا ہے مگر یہ بات تائی جان سے کہنے کی تو ہمت نہیں سو شازمہ کی مختصر سی تعریف پر ہی اکتفا کیا تھا۔ اتنے میں وہاں تایا جان بھی آ نکلے تھے۔

"پھر میں تو چلوں۔" ملاہا کی سمجھ میں نہ آیا کہ انہوں نے تائی جان کو آگاہ کیا ہے یا ان سے اجازت لی ہے۔

"ابھی سے کیسے چلے فنکشن باقی ہے، گانے بجانے کا پروگرام بھی ہے۔ وہ مشہور سنگر آئے گا کیا بھلا سا نام ہے اس کا۔" انہوں نے یادداشت پر زور ڈالا۔

"آپ کی اور ہماری عمر اب گانا والا سننے کی کہاں رہ گئی ہے۔" وہ بیزاری سے بولے۔

"اچھا آپ نے جانا ہے تو جائیں۔ میں اپنے بیٹے کی مہندی ادھوری چھوڑ کر نہیں جا رہی۔" انہوں نے حتمی انداز میں جواب دیا۔

"تو میں آپ کو چلنے کا کہہ بھی کب رہا ہوں۔ آپ آرام سے آئیے گا لیکن میں اب جا کر آرام کروں گا بہت تھکن ہو رہی ہے۔" وہ واقعی تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔

"تایا جان! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟" دونوں کی گفتگو میں اس کی مداخلت اتنی اچانک تھی کہ ایک لمحے کو تایا جان اور تائی جان دونوں چپ ہو گئے تھے۔

"دراصل میرے بھی سر میں درد ہو رہا ہے۔ فنکشن تو ابھی دیر تک چلے گا آپ مجھے بھی ساتھ لے جائیں تو۔" اس نے [illegible] ہو کر پوچھا۔

"چلو۔" انہوں نے سنجیدہ لہجے میں اسے ساتھ لے چلنے پر رضامندی کا اظہار کیا۔

اس کے لیے یہی بہت تھا۔ اس سے پیشتر نگی باجی کی اس پر نظر پڑتی اور وہ اسے روک لیتی وہ تایا جان کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل آئی۔ سر میں واقعی شدید درد ہو رہا تھا اور اجنبیوں کی اس محفل میں وہ بالکل مس فٹ تھی سو یہاں بیٹھ کر کوفت کا شکار ہونے کے بجائے اس نے گھر جا کر سکون سے سونے کو ترجیح دی تھی۔

سفر خاموشی سے کٹا۔ اسے حسرت ہی رہی کہ تایا جان اس سے اس کے متعلق کچھ تو پوچھیں۔ وہ کون سی کلاس میں پڑھتی ہے؟ سبجیکٹ کون سے ہیں؟

آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ لیکن لگتا تھا کہ انہیں اس کی ذات سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔ پہلی ملاقات کے بعد انہوں نے اسے مخاطب کرنا بھی ضروری نہ سمجھا تھا۔ آج بھی وہ ڈھیٹ بن کر ان کے ساتھ چلی آئی تھی۔ گھر پہنچ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھنے ہی لگی تھی کہ پیچھے سے تایا جان نے پکارا۔ اسے لگا اس کی سماعتوں کو دھوکا ہوا ہے مگر وہ واقعی اسے ہی مخاطب تھے۔

"تمہیں زحمت نہ ہو تو ایک کپ چائے بنا دو۔ نواب سو گیا ہو گا میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"ابھی لائی تایا جان۔" اگرچہ اس کے سر میں بھی شدید درد ہو رہا تھا پھر بھی تایا جان کا مخاطب کرنا اسے اتنا اچھا لگا کہ اپنے سر کے درد کو بھول کر وہ کچن میں چلی گئی۔ تایا جان زینہ چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے حالانکہ تائی جان کا بیڈ روم نیچے تھا اور جب اسے یہ بات پتا چلی تھی کہ وہ دونوں ایک بیڈ روم استعمال نہیں کرتے تو اسے بہت حیرت ہوئی تھی۔ اس نے جھجکتے ہوئے نگی باجی سے اس بارے میں استفسار کیا تھا۔

"کہیں تایا جان اور تائی جان میں کوئی ناچاقی تو نہیں۔" اور نگی اس کا سوال سن کر خوب ہنسی تھی۔

"ارے نہیں دراصل اوپر ابو کی اسٹڈی ہے۔ ابو رات کو دیر تک آفس کی فائلوں میں سر کھپاتے ہیں، امی کو روشنی میں نیند نہیں آتی۔ نہ ابو لائٹ آف کر کے ٹیبل لیمپ کی روشنی سے کام چلاتے ہیں، نہ امی آنکھوں پر دوپٹہ وغیرہ رکھ کر سونے کی کوشش کرتی ہیں، اس لیے ابو نے اسٹڈی کو ہی اپنا بیڈ روم بنا لیا۔ دونوں کے درمیان ہرگز کوئی ناچاقی نہیں بلکہ کمال کی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔"

جانے آخر میں نگی باجی کا لہجہ کیوں طنزیہ ہو گیا تھا اور اب بھی تایا جان نے اسٹڈی ہی کا رخ کیا تھا۔ جھٹ پٹ چائے بنا کر وہ بھی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ دستک دے کر وہ اندر داخل ہو گئی۔ اندر زیرو پاور کے بلب کی ملگجی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

"یہ لیں تایا جان۔" ادھورا فقرہ اس کے منہ میں رہ گیا تھا۔ بیڈ کے پاس کھڑی شخصیت تایا جان کی تو ہرگز نہیں تھی۔ سرخ سرخ آنکھوں والا سعد حیرانی سے اسے تک رہا تھا۔ رات کے اس پہر نامانوس سی دستک نے جتنا حیران کیا تھا اس سے زیادہ حیرانی دستک دے کر اندر داخل ہونے والی شخصیت کو دیکھ کر ہو رہی تھی اور ملاہا بی بی کی تو اپنی بوکھلاہٹ بھی قابل دید تھی۔

ملاہا نے کتنی سختی سے منع کیا تھا کہ وہ سعد سے ذرا دور دور ہی رہا کرے اور وہ کتنے مزے سے آدھی رات کو اس کے کمرے میں منہ اٹھا کر گھستی چلی آئی تھی۔ وہ غلط ٹائپ کا بندہ تھا۔ اس کے ساتھ زبردستی کچھ بھی کر سکتا تھا اور اتنی سرخ آنکھیں کسی نارمل بندے کی تو ہو نہیں سکتی تھیں۔ کہیں اس نے نشہ تو نہیں کر رکھا تھا۔ ماؤف ہوتے ذہن سے بھی اس نے کیا کچھ نہیں سوچ لیا تھا۔ وہ خوف زدہ نگاہوں سے اسے تکے جا رہی تھی۔ واپسی کے لیے قدم اٹھانا بھی جیسے اس کے اختیار میں نہ رہا تھا۔ زمین نے قدم جکڑ لیے تھے۔ وہ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگنا چاہ رہی تھی مگر مڑنے تک کی ہمت نہ تھی۔ سعد اپنی جگہ کھڑا صرف اسے دیکھے جا رہا تھا پھر ہمت کر کے اس نے آہستہ آہستہ قدم پیچھے اٹھانا شروع کیے اور یونہی قدم پیچھے ہٹاتے ہٹاتے اس کی نگاہ سعد کے قدموں پر پڑی۔ اس بار لگنے والا حیرت کا جھٹکا اتنا شدید تھا کہ اس کا منہ حقیقتاً کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ بیڈ اور ڈریسنگ ٹیبل کی درمیانی جگہ پر جائے نماز بچھی تھی۔

"وہ میں... یہ چائے... دراصل میں سمجھی کہ تایا جان..." اس نے ہکلاتے ہوئے اپنی آمد کی وضاحت کرنا چاہی تھی۔

"ان کا کمرا سامنے والا ہے۔" سعد نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے پلٹی اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ پیچھے کھڑے سعد کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

کیا تھی یہ لڑکی، پہلے گھبراہٹ، پھر بوکھلاہٹ اور

اس کے بعد اتنی شدید حیرت کے منہ بند کرنا بھی یاد نہیں رہا۔

"بے وقوف لڑکی۔" سعد سر جھٹکتے ہوئے ہنس پڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

"نگی باجی! یہ سعد کیسا بندہ ہے۔" اگلی صبح ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے کے وقت صرف وہ اور نگی موجود تھے، جب اس نے نگی سے پوچھا۔

"اچھا بندہ ہے۔ ہینڈسم' ڈیشنگ اور اسمارٹ۔" نگی نے چائے میں چینی ملاتے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا تھا۔

"اُفوہ! میرا مطلب ہے کریکٹر کیسا ہے سعد کا؟" اس نے اپنے سوال کی وضاحت کی۔ نگی سے اتنی بے تکلفی کے باوجود وہ اب تک سعد کے بارے میں کھل کر نہ پوچھ پائی تھی کہ اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنی پہلی ملاقات والی حماقت بھی بتانا پڑتی' جس کو وہ خود بھی یاد نہ کرنا چاہتی تھی۔

"لڑکی! وہ تم سے پانچ چھ سال بڑا ہے۔ تم اسے کس مزے سے سعد سعد کہہ رہی ہو۔" نگی نے اسے گھورا تھا۔

"پھر کیا کہوں سعد بھائی؟ نیور۔ جب میں اسے بھائی مانتی ہی نہیں تو بھائی کہوں کیوں؟ ایسا بندہ میرا بھائی نہیں ہو سکتا۔" اس نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔ نگی نے دلچسپی سے اسے دیکھا پھر ایک نگاہ اس کے پیچھے ڈالی۔ بے ساختہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی تھی۔

"ہائے وا رے کیا بندہ ہے سعد۔" اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے استفسار کیا۔

"ویسے' آپ کے ساتھ رہتا ہے اور آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں؟ پتا ہے کل رات کیا ہوا۔ میں تایا جان کو جگانے جا رہی تھی لیکن غلطی سے سعد کے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی آنکھیں اتنی سرخ ہو رہی تھیں اور وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ میں تو۔"

"آنکھیں سرخ ہونے کی وجہ فلو بھی ہو سکتی ہے۔ آخر آپ کو اعتراض کس بات پر ہے۔ سرخ آنکھوں پر یا آدھی رات کو نماز پڑھنے پر۔" پیچھے سے آواز آئی تھی اور ماہا کو لگا وہ آئندہ کبھی اس شخص کے سامنے سر نہیں اٹھا پائے گی۔ وہ جانے کب سے پیچھے کھڑا اس کی گفتگو سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کاش ڈائننگ ٹیبل کے پاس سے تھوڑی سی زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے اور نگی باجی کتنی بری لگ رہی تھیں یوں کھلکھلا کر ہنستے ہوئے۔

"سعد! لوگوں میں تمہاری Repute بہت خراب ہے۔" نگی نے ہنستے ہوئے سعد کو مخاطب کیا۔

"جی کچھ کرم فرماؤں کی مہربانی ہے۔ بہت سلیقے طریقے سے یہ ڈس انفارمیشن پھیلائی گئی ہے' البتہ وجہ جاننے سے قاصر ہوں۔" وہ سنجیدگی سے کہتا کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تھا۔

"تمہارا مطلب ہے؟" نگی نے کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"فارگیٹ اٹ یار! تم جیم کی شیشی پکڑاؤ۔ مجھے ایسی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم جانتی ہو اچھی طرح۔"

اس نے لاپروائی سے جواب دیا اور سر جھکا کر ناشتہ کرتی ماہا کے لیے دونوں کی بے تکلفی حیران کن تھی۔ اتنے دنوں میں اس نے گھر کے کسی بندے سے سعد کو بولتے نہیں دیکھا تھا۔ خیر اتنے دنوں میں اسے سعد کو دیکھنے کا موقع بھی کب ملا تھا لیکن پہلے دن کھانے کی میز پر [illegible] ہوئے تھے؟

سعد کسی سے بولے بنا کتنی خاموشی سے کھانا کھا کر سب سے پہلے اٹھ گیا تھا اور کل سہیل بھائی کی مہندی میں بھی تو وہ شریک نہیں ہوا تھا۔ اس نے خود ہی نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ جس طرح گھر کے باقی بندے اس سے لاتعلق ہیں تو اسے بھی کسی سے کوئی غرض نہیں لیکن اب نگی باجی اور سعد کو بے تکلفی سے گفتگو کرتا دیکھ کر اس کے باقی اندازوں کی طرح یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہوا تھا۔

"آج شام کو سہیل کی بارات ہے اور تم آج بھی آفس جا رہی ہو۔" سعد نگی سے استفسار کر رہا تھا۔

"ہاں دل تو بالکل نہیں چاہ رہا۔ تھکن بھی بہت ہے۔ رات اتنی دیر سے تو لوٹے تھے ہم لیکن مجبوری ہے۔ میرا باس سہیل بھائی کے ولیمہ کی چھٹی دے دے تو اس کی مہربانی ہوگی۔ ویسے کوشش کروں گی آج جلد آجاؤں اور تم؟" نگی نے جواب کے ساتھ سوال داغا تھا۔

"کیا میں؟" سعد ہنسا۔

"تم! اور تم آج سہیل بھائی کی بارات میں تو شامل ہو جاؤ سعد۔" اس نے [illegible]

"کیوں کیا آپ کی والدہ محترمہ نے بارات کے ساتھ جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے؟" اس نے استہزائیہ انداز میں دریافت کیا تھا اور ماہا سر جھکائے جھکائے بھی نگی کا جھینپا جھینپا چہرہ محسوس کر سکتی تھی۔

"سوری یار! میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔" اس نے فوراً سے پیشتر معذرت بھی کر ڈالی۔

"اٹس اوکے سعد۔" نگی نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

"کل جب تم لوگ مہندی اٹینڈ کر رہے تھے' تب میں بازاروں کی خاک چھان رہا تھا۔ ظاہر ہے سہیل کی بارات میں کوئی پرانا سوٹ پہن کر تو شریک نہیں ہو سکتا نا۔" اس نے اس بار شگفتگی سے کہا تھا۔ نگی کا چہرہ پل بھر میں ہی کھل اٹھا تھا۔

"تم واقعی بہت اچھے ہو سعد۔" نگی خوش ہو گئی تھی۔

"اوں ہوں میں ہرگز اچھا نہیں' ٹھیک ٹھاک برا بندہ ہوں۔ یہ تصدیق تم ان سے بھی کر سکتی ہو۔ میری برائیوں پر مفصل روشنی ڈال سکتی ہیں یہ۔"

اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے ماہا پر نگاہ ڈالی جو بالکل سر جھکائے اتنی مگن ہو کر ناشتہ کر رہی تھی جیسے دنیا میں اس سے ضروری کوئی اور کام ہے ہی نہیں۔ سعد کے کہنے پر اس نے ہڑبڑا کر جھکا سر اٹھایا تھا۔

"سوری سعد بھائی!" وہ منمنا ہی سکی۔

"وقت پڑنے پر گدھے کو باپ بنانے کے متعلق تو سنا ہے۔ بھائی بنانے پہلی بار دیکھا ہے۔" سعد نے دوبارہ اس پر چوٹ کی۔ وہ اس بار اتنی خفیف ہوئی کہ بول ہی نہ پائی۔

"بس کرو سعد! اس نے سوری کہہ تو دیا ہے۔ کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو گی ماہا کو۔" نگی فوراً اس کی مدد کو آئی۔

"جانتا ہوں میں۔" وہ مسکرایا تھا۔

"نگی باجی! میں کمرے میں جا رہی ہوں۔ ماما کو فون کروں گی پھر وہ کالج نکل جائیں گی۔ پیریڈ لیتے ہوئے موبائل آف رکھتی ہیں نا۔" اتنی دیر تک دماغ لڑانے کے بعد آخر بہانہ سوجھ ہی گیا تھا اور کہنے کے ساتھ ہی وہ اٹھ گئی تھی۔

پیچھے یقیناً سعد اور نگی باجی مل کر اس پر ہنسے ہوں گے۔ مارے خفت کے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ تائی جان نے ماما سے غلط بیانی کی تھی۔ اس کا اندازہ اب جا کر ہوا تھا لیکن انہیں یہ غلط بیانی کرنے کی ضرورت کیوں پڑی' یہ بات اب بھی سمجھ سے بالاتر تھی۔

"آئندہ میری توبہ۔ جو میں سعد کے بارے میں کسی کے بھی سامنے کسی قسم کا اظہار خیال کروں' کیسے چپکے سے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے تھے اور نگی باجی بھی خوب ہیں' آنکھوں کے اشارے سے ہی بتا دیتیں کہ پیچھے کوئی کھڑا ہے مگر پھر وہ میرے چہرے پر اڑتی ہوائیاں دیکھ کر لطف کیسے لیتیں۔" اسے آج نگی باجی پر بھی غصہ آرہا تھا۔

اور آج کا تو دن ہی خراب تھا۔ رات تایا جان کے ساتھ جب وہ گھر لوٹی تھی تو سر درد کے ساتھ بدن کا جوڑ جوڑ دکھ بھی رہا تھا۔ اس وقت تو طبیعت خرابی کو اس نے تھکاوٹ پر محمول کر دیا تھا لیکن آج جیسے جیسے دن چڑھتا گیا' طبیعت مزید بگڑتی گئی۔ دوپہر تک ٹھیک ٹھاک قسم کا بخار چڑھ چکا تھا۔ وہ سارا وقت کمرے میں ہی لیٹی رہی۔

تائی جان نے اندر آکر پوچھنے کی زحمت بھی نہ کی کہ آخر آج وہ کمرے میں کیوں بند ہے۔ دوپہر کے کھانے کے وقت انہوں نے ذرا کی ذرا کمرے میں جھانکا تھا۔

"تم کھانا کھا لینا ماہا! میں ذرا پارلر تک جا رہی ہوں۔"

"تائی جان! میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔" وہ ٹشو سے ناک پونچھتے ہوئے اٹھ بیٹھی تھی۔

"اچھا پھر نواب سے کہہ کر اپنے لیے کھچڑی وغیرہ بنوا لینا۔ ابھی تو وہ کچن میں ہی ہے۔ ایک دفعہ اپنے کوارٹر چلا گیا تو بار بار بلوانے پر بھی نہیں آئے گا۔ کم بخت دوپہر کے کھانے کے بعد لمبی تان کر سوتا ہے۔" تائی جان اسے آگاہ کر کے چلی گئی تھیں۔ ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ کہیں طبیعت زیادہ تو خراب نہیں یا پھر یہ کہ کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟ ان کی بے مروتی پر اس کی خراب طبیعت مزید مکدر ہو گئی تھی۔ کتنی دیر تک یونہی بستر پر لیٹی رہی، ماما شدت سے یاد آ رہی تھیں۔ اس کی طبیعت ذرا سی بھی خراب ہوتی تو کتنا پریشان ہو جاتی تھیں وہ اور ماہا بھی ان سے خوب ہی ناز نخرے اٹھواتی لیکن آج ناز نخرے اٹھانے کے لیے کوئی نہ تھا۔ ناچار خود ہی کچن تک جانا پڑا۔ نواب کچن سمیٹ کر جا ہی رہا تھا اسے دیکھ کر رک گیا۔

"کچھ چاہیے ماہا بی بی؟"

"ہاں پلیز نواب! تمہارے پاس کوئی سردرد یا بخار کی ٹیبلٹ ہو گی یا تمہیں پتا ہو کہ تائی جان میڈیسن کہاں رکھتی ہیں، میں خود دیکھ لوں گی۔ بخار تیز ہوتا جا رہا ہے۔"

"بخار ہو رہا ہے تو ڈاکٹر کے پاس چلی چلیں۔ آپ کہیں تو رکشہ ٹیکسی لا دوں؟ میں آپ کے ساتھ چل پڑتا ہوں۔" نواب کے کہنے پر اس کی آنکھیں بلاوجہ ہی ڈبڈبا گئیں۔

"تھینک یو نواب! بس تم کوئی ٹیبلٹ لا دو۔ شام کو نگی باجی کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤں گی۔" اس نے آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے کہا تھا۔ نواب سر ہلا کر کچن سے نکل گیا تھا۔ ذرا دیر بعد اس نے دو ٹیبلٹ ماہا کو لا دی تھیں پھر اسی نے دودھ گرم کر کے ڈبل روٹی کے دو سلائس ماہا کے سامنے رکھے۔

"خالی پیٹ دوا لینا ٹھیک نہیں ہے بی بی!"

"تھینک یو نواب! تم واقعی بہت اچھے ہو۔" اس نے تشکر کے جذبے سے مغلوب ہو کر کہا تو وہ جھینپ کر مسکرا دیا۔

نواب کی دی ہوئی گولی نے جادوئی اثر دکھایا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کا بخار اتر گیا تھا۔ "مطلب اب سہیل بھائی کی بارات میں شریک ہو سکوں گی۔"

ذرا دیر پہلے طبیعت خرابی کی وجہ سے اس نے آج کا فنکشن اٹینڈ نہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا مگر طبیعت سنبھلی تو ملتوی شدہ ارادہ پھر بحال ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

کس شان سے سہیل بھائی کی بارات روانہ ہوئی تھی۔ تایا جان، تائی جان، نگی باجی اور وہ خود، بلکہ وہ بھی شاید زبردستی کی مہمان تھی۔ سہیل بھائی اپنے دوستوں کے ساتھ الگ گاڑی میں، باقی باراتیوں کو ڈائریکٹ میرج ہال میں پہنچنے کی ہی ہدایت تھی۔

آج بھی نگی باجی ہی اسے ساتھ لیے پھر رہی تھیں۔ بہت سے رشتہ دار ایسے تھے جو مہندی کے فنکشن میں نہ آئے تھے۔ تایا جان اور پاپا کے کزنز، ان کی بیگمات۔ جب نگی باجی نے ماہا کا ان سے تعارف کروایا تو کتنے اچھے طریقے سے ملے تھے سب لوگ بلکہ ایک انکل نے تو جذباتی انداز میں کتنی دیر تک اس کے سر پر ہاتھ رکھے رکھا۔

"تمہارے پاپا اور میں جوانی میں بہترین دوست تھے۔ بہت جلدی چلے گئے اس دنیا سے جانے میں۔" ماہا کو ان کی آواز بھیگی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"تمہیں دیکھ کر اسے بعد بہت شدت سے یاد آ رہا ہے ماہا! تم ہو بہو عکس ہو میرے دوست کا۔" وہ شاید پاپا کے بہت اچھے دوست تھے۔

ماہا کو ان سے مل کر اچھا لگا تھا لیکن دل میں کہیں افسوس کا احساس بھی جاگا تھا۔ ایک دوست کو اس کی شکل دیکھ کر اپنے بچھڑے ہوئے دوست کی یاد آ گئی تھی لیکن سگے تایا کو مرحوم بھائی کی نشانی سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ بہرحال آج کی تقریب میں آ کر اسے

اچھا لگا تھا۔ بہت سے لوگ ایسے ملے جن سے پاپا کے حوالے سے تعارف ہوا تھا۔ بہت سوں نے ماما کا حال احوال دریافت کیا تھا، اس سے مدحت کا فون نمبر لیا تھا۔ وہ نگی باجی کی مشکور تھی، جنہوں نے دور دور کے ان ددھیالی رشتہ داروں سے ماہا کو بطور خاص ملوایا تھا لیکن تائی جان سے ان دونوں کا ساتھ زیادہ دیر تک برداشت نہ ہو پایا تھا۔

"نگی! تم کہاں ادھر سے ادھر گھومتی پھر رہی ہو۔ ایک یہ ہی کزن نہیں ہے تمہاری، تمہارے ماموں اور خالہ کی بیٹیاں بھی بلا رہی ہیں تمہیں۔" انہوں نے بغیر کسی لگی لپٹی کے نگی باجی کو ٹوکا تھا۔ ماہا کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ ان کے طرز تخاطب پر خود نگی باجی کے چہرے پر ناگواری کے شدید تاثرات نمودار ہوئے تھے۔

"امی! آپ..." وہ جانے انہیں کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ ماہا نے ان کا ہاتھ دبا کر انہیں کچھ بولنے سے روکا۔

"آپ جائیں نگی باجی! تقریب انجوائے کریں۔ پھر پھر کر میری تو ٹانگوں میں درد ہو گیا ہے، میں یہاں بیٹھی ہوں۔" اس نے انہیں لجاجت سے مخاطب کیا۔ وہ ہر گز نہ چاہتی تھی کہ آج کے فنکشن میں اس کی وجہ سے بدمزگی ہو۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم بیٹھو میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں تمہارے پاس۔" انہیں بھی شاید موقع کی نزاکت کا احساس تھا، سو ماں سے الجھنے کی خواہش دل میں دباتے ہوئے ان کے ساتھ چلی گئی تھیں۔

ماہا اپنی نشست سنبھالے لوگوں کا جائزہ لینے میں مشغول ہو گئی۔ ذرا سی دیر میں وہ اس مشغلے سے اکتا گئی تھی۔ سر میں دوبارہ درد ہونے لگا تھا۔ اسے خیال ہی نہ رہا کہ آنے سے پہلے نواب سے ایک گولی اور لے کر کھا لیتی۔ شاید بخار دوبارہ چڑھ رہا تھا۔

نگی باجی کو دوبارہ اس کی طرف آنے کا موقع نہ ملا تھا۔ دولہا، دلہن اسٹیج پر پہنچ چکے تھے اور اب رسموں کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ وہ بار بار اسٹیج کی طرف دھیان لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شازمہ بھابھی آج کیسی لگ رہی تھیں، ان کا لہنگا کیسا تھا، کیا آج وہ شہزادی لگ رہی تھیں یا کل کی طرح پٹر پٹر بول رہی تھیں۔ لیکن کیا کرتی ماہا! اس شدید سر کے درد کا جو کسی طرف دھیان لگنے ہی نہیں دے رہا تھا، پھر بیٹھے بیٹھے اس پر کپکپی سی طاری ہونے لگی۔

"میری توبہ ماما! جو میں آئندہ آپ کے بغیر کہیں گئی۔" ماما پھر شدت سے یاد آنے لگی تھیں لیکن میز پر سر ٹکا کر آنسو بہانے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔

"آؤ ماہا! سہیل بھائی اور شازمہ کے ساتھ دو چار تصویریں بنوا لو۔" نگی باجی کی مہربان آواز پر اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"کیا ہوا ماہا؟" اس کے آنسو دیکھ کر وہ بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔

"سوری یار! میں تمہیں واقعی کمپنی نہیں دے پا رہی، کیا کروں امی کو..." وہ شرمندہ شرمندہ سی جانے کیا وضاحت دے رہی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں نگی باجی! دراصل میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا تھا۔

"کیا ہوا؟" انہوں نے تشویش سے دریافت کیا۔

"شاید بخار ہے۔" اس نے بتایا۔ نگی باجی نے اس کا ماتھا چھوا تھا، پھر ان کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"شاید نہیں یقیناً بخار ہے۔ مائی گاڈ! تمہارا ماتھا تپ رہا ہے بری طرح۔"

"صبح بھی بخار ہو گیا تھا نگی باجی! پھر نواب سے گولی لے کر کھائی تھی۔ اس وقت تو اتر گیا تھا۔ پہلے پتا ہوتا کہ دوبارہ چڑھ جائے گا تو ایک گولی اور کھا لیتی۔"

"نواب تو ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہے نا، تم کتنی احمق ہو ماہا! صبح سے طبیعت خراب تھی تو کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جا سکتی تھیں۔" نگی باجی خفا ہوئی تھیں۔

"چلی جاتی نگی باجی! اگر کوئی لے کر جانے والا ہوتا تو۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"بے وقوف لڑکی! تم مجھے ہی ایک فون کر دیتیں۔" ان کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی۔ اپنی ماں کی بے مروتی اور

بے حسی کا نہیں مجبوری کا اظہار تھا۔

"آپ جائیں نگی باجی! اتنی بھی طبیعت خراب نہیں ہو رہی۔ صبح آپ کے ساتھ کسی ڈاکٹر کے چلی جاؤں گی۔"

ماما خود شرمندہ ہو گئی تھی۔ اس کی طبیعت خرابی میں نگی باجی کا کیا قصور تھا' جو وہ ان سے شکوہ کر بیٹھی۔ ضرورت سے زیادہ زود رنج ہو رہی تھی وہ اور نگی باجی نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ ان کی پرسوچ نگاہیں گرد و پیش کا جائزہ لینے لگیں۔ اس وقت ماما کو کس کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس بھیجا جا سکتا ہے۔ رسموں کا سلسلہ تو ابھی بہت دیر تک جاری رہنا تھا۔ آخر ان کی نگاہیں ایک میز پر پہنچ کر ٹھہر گئی تھیں۔

"ایک منٹ ماما! میں ابھی آئی۔" وہ کہہ کر چلی گئی تھیں۔ اس نے سر دوبارہ میز پر گرا لیا۔ سر کا درد اب برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔

"اٹھو ماما! شاباش ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔" ذرا دیر بعد نگی باجی نے پاس آ کر پکارا تھا۔

"اس ٹائم کون سا ڈاکٹر۔" اس نے کہتے ہوئے سر اٹھایا اور پھر آدھی بات منہ میں ہی رہ گئی۔

"میں گھر جا کر کوئی پین کلر لے لوں گی نگی باجی! ڈاکٹر کو صبح دکھا دوں گی۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"دماغ خراب ہے تمہارا۔ اتنا تیز بخار ہے' اٹھو فوراً۔" انہوں نے ڈپٹا تھا۔ اس کے چہرے پر چھایا تذبذب کم نہ ہوا تھا۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا نگین کہ محترمہ کو مجھ پر خاص اعتبار نہیں۔ ہرگز میرے ساتھ جانے پر راضی نہیں ہوں گی۔"

"میں چلتی ہوں۔" اس سے پیشتر کہ سعد صاحب کو مزید طنز کا موقع ملتا' وہ اٹھ گئی تھی۔ شکر تھا کہ اس کے بعد سعد نے طنز کا کوئی مزید تیر نہیں چلایا تھا۔ مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے ہوئے وہ کسی کلینک کی عمارت تلاش کرتا رہا۔ اکثر کلینک بند پڑے تھے۔ آخر ایک کلینک کی بتیاں جلتی دکھائی دیں تو سعد نے گاڑی روک دی۔ ادھیڑ عمر ڈاکٹر ایک بابے کے معائنے میں مصروف تھا۔ نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ سعد نے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام ہاں بھئی برخوردار کیا مسئلہ ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے بابے کو نسخہ تھماتے ہوئے سعد کو مخاطب کیا۔

"میرے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ڈاکٹر صاحب! ان کو تیز بخار ہو رہا ہے۔" سعد نے ماما کو اشارہ کیا تھا کہ وہ بابے کے خالی کیے ہوئے اسٹول پر جا کر بیٹھ جائے۔ وہ چپ چاپ ڈاکٹر کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر نے ہنکارا بھرتے ہوئے اس کی کلائی تھامی۔

"میاں بار بار اتنا تیز بخار چڑھنا' صحیح علامت نہیں۔ میں نے تم سے پچھلی بار بھی کہا تھا کہ جو ٹیسٹ لکھ کر دیے ہیں' وہ کرواؤ۔ بار بار اتنا تیز بخار چڑھنا کسی اندرونی انفیکشن کو ظاہر کرتا ہے۔ دوا سے وقتی طور پر تو افاقہ ہو جاتا ہے لیکن جب تک ٹیسٹ نہ۔۔۔۔۔"

"ایکسکیوزمی سر! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں آپ کے پاس پہلی بار آیا ہوں۔" سعد نے ان کی گفتگو کو بریک لگائے تھے۔ ڈاکٹر نے سر اٹھا کر سعد کو ذرا غور سے دیکھا پھر ایک نگاہ ماما پر ڈالی۔

"اچھا حیرت ہے۔ کیا کریں بھئی عمر کے ساتھ یادداشت پر بھی اثر پڑتا ہے۔ پھر دن میں سیکڑوں لوگ آتے ہیں' مغالطہ ہو گیا ہو گا۔"

"جی سر مغالطہ ہی ہوا ہو گا اور یہ محترمہ مجھ پر ویسے بھی بہت شک کرتی ہیں۔ اب یہ سمجھیں گی کہ میں نے انہیں چھپ چھپا کر شادی بھی کر رکھی ہے۔" سعد نے مسکراہٹ دباتے ہوئے ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔ ڈاکٹر صاحب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

"ہاں بھئی' بیویاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ہماری بیگم صاحبہ کو اب تک ہم پر اعتبار نہیں۔ دن میں دسیوں دفعہ کلینک پر فون کرتی ہیں اور جب جی چاہتا ہے چھاپہ بھی مار دیتی ہیں۔"

بوڑھا ڈاکٹر ضرورت سے زیادہ ہنسوڑ اور خوش مزاج تھا لیکن اس بار سعد بھی صحیح معنوں میں گڑبڑا گیا تھا۔ ماما پر نگاہ ڈالی تو سمجھ نہ پایا کہ اس کا چہرہ بخار کی حدت سے

تپ رہا تھا یا غصے کی شدت سے۔

"سوری سر! آپ کو پھر غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس نے ڈاکٹر کی تصحیح کرنا چاہی تھی۔

"اچھا میاں! اب تم چپ کرو۔ بعد میں دور کر دینا ساری غلط فہمیاں۔ بیٹا! آپ بتائیے اور کیا علامات ہیں' گلا تو نہیں دکھ رہا۔ کسی قسم کا نزلہ زکام' کھانسی۔" ڈاکٹر اسے چپ کروا کر ماما کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے دھیمی آواز میں اپنی کیفیات سے آگاہ کیا تھا۔

"موسمی بخار ہے۔ دوا کی ایک ہی خوراک سے بخار تو اتر جائے گا۔ پھر بھی تین دن تک دوا لینا ہے اور خیال رہے دوا دودھ کے ساتھ لینا ہے۔"

ڈاکٹر نے نسخہ ماما کو تھماتے ہوئے ہدایت بھی دی تھی۔ اس نے سر ہلا دیا۔ سعد نے والٹ کھول کر ڈاکٹر کی فیس ادا کی پھر دونوں کلینک سے باہر نکل آئے تھے۔

"اب کہاں جانا ہے' واپس میرج ہال یا پھر گھر؟" سعد نے پوچھا تھا۔

"گھر۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"اف بھئی۔ تمہارا موڈ اب تک آف ہے۔ اب اس خبطی ڈاکٹر نے جو کچھ کہا' اس میں میرا قصور کہاں سے نکلتا ہے۔ بہرحال ویری سوری۔"

وہ اس بے تکلفی سے مخاطب تھا' جیسے دونوں پرانے دوست ہوں' پھر بلاوجہ معذرت بھی کر ڈالی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے سعد بھائی اور اصل میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔" اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے اپنے چہرے کے بگڑے زاویوں کی توجیہہ پیش کی۔

"چلو اب دوا لے لی ہے نا' اللہ نے چاہا تو جلد فرق پڑ جائے گا۔"

اس نے دوستانہ انداز میں تسلی دی تھی۔ وہ دل ہی دل میں پشیمان ہوئی تھی۔ اتنے اچھے تو تھے سعد بھائی۔ اتنے اچھے بندے کے متعلق اس نے کتنے دن دل میں غلط گمان پالے رکھا۔ اتنے میں ہی سعد کا موبائل بجا تھا۔ وہ موبائل اسکرین پر جگمگاتا نام دیکھ کر مسکرایا۔

"نگی ہے۔ اپنی خیریت سے آگاہ کر دو۔" اس نے موبائل فون ماما کو تھمایا۔ نگی باجی اس کے لیے واقعی بہت پریشان تھیں' انہیں ڈھیر سارا اطمینان دلانے کے بعد اس نے فون واپس سعد کو تھمایا۔ طبیعت اگرچہ اب بھی خراب تھی مگر ذرا دیر پہلے بے بسی کی کیفیت نہ تھی۔ سب ٹھیک تھا وہ ماما سے بہت دور سہی مگر یہاں بھی اس کا خیال رکھنے کو کچھ لوگ تو موجود تھے۔

☼ ☼ ☼

سہیل بھائی کی شادی بخیر و خوبی انجام پا چکی تھی۔ گرینڈ ولیمہ کے بعد اگلی صبح دولہا' دلہن ہنی مون کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ اس کا بھی اب واپسی کا ارادہ تھا۔ وہاں مدحت اس کے بغیر بہت اداس تھیں۔ وہ خود ماں کو بہت یاد کر رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اتنے دن ان سے دور رہی تھی اب جلد از جلد ان کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔

"ایک دو دن رک جاؤ ماما! اب تو شادی سے فراغت ملی ہے۔ ابھی تو تمہیں گھمایا پھرایا بھی نہیں۔"

"کوئی بات نہیں نگی باجی! میں کوئی بچی تھوڑی ہوں' جو صرف سیر سپاٹے سے خوش ہوں۔ میں تو یہاں آپ لوگوں سے ملنے آئی تھی اور آپ سے مل کر مجھے جو خوشی ملی ہے' وہ لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ آپ کی صورت میں مجھے بڑی بہن مل گئی ہے۔" اس نے بہت محبت سے ان کے ہاتھ تھامے تھے۔

"تم خود بہت اچھی ہو ماما! سراپا محبت' سراپا خلوص اور۔۔۔" نگی باجی نے مسکرا کر بات ادھوری چھوڑی۔

"اور؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں تکا۔

"اور سراپا حسن۔" انہوں نے پیار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی تھی۔ اس بار وہ جھینپ کر مسکرا دی۔ نگی باجی بھی ہنس پڑی تھیں۔

"تو یہ طے ہوا کہ کم از کم آج تم واپس نہیں جا رہی ہو۔ ہم خوب گھومے پھریں گے' شاپنگ کریں گے' انجوائے کریں گے اور رات کو ایک شاندار ڈنر کر کے گھر لوٹیں گے۔" انہوں نے خود سے پروگرام سیٹ کر

لیا۔

"آج سعد کا بھی آف ہے" میں اس سے پوچھ کر آئی ہوں کہ کیا وہ آج کے لیے ہمارا ڈرائیور بننا پسند کرے گا۔ وہ مسکراتے ہوئے سعد سے پوچھنے چلی گئی۔ دو منٹ بعد ہی وہ واپس آ گئی۔

"ہری اپ ماما فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔ چند گھنٹوں میں پورے شہر کی سیر کروانا ہے تمہیں۔ سعد کہہ رہا ہے۔ تیار ہونے میں دیر نہیں کرنا۔" نگی باجی نے افراتفری مچائی تھی۔ اس نے بھی فوراً "سر ہلا کر حکم مان لیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اتنے میں تائی جان ادھر آ نکلی تھیں۔

"گھومنے پھرنے کا پروگرام ہے امی!" نگی نے رسانیت سے بتایا تھا۔

"کون کون جا رہا ہے۔" ان کی تفتیش کا آغاز ہوا۔

"کون کون جائے گا امی! بس میں ماما اور سعد۔ آپ نے چلنا ہے تو بتائیں؟"

"میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے۔" جانے کیوں ایک دم ان کا موڈ اتنا کیوں بگڑ گیا تھا، ماہا قطعاً نہ سمجھ پائی۔

اس کے جی میں آئی کہ نگی باجی سے کہہ دے کہ وہ پروگرام کینسل کر دیں مگر اگلے ہی پل اس نے سوچ کو جھٹک ڈالا۔ تائی جان کی ناراضی سے اب اسے کیا فرق پڑنا تھا۔ وہ یہاں صرف ایک دن کی تو مہمان تھی۔ ان کے بگڑے موڈ کی پروا کیے بغیر وہ تیار ہونے چل دی اور وہ دن اس کے اب تک یہاں گزارے گئے دنوں میں سب سے یادگار دن تھا۔

نگی باجی اور سعد کی کمپنی کو اس نے خوب انجوائے کیا تھا۔ اسے اب جا کر اندازہ ہوا تھا کہ تائی جان کے سامنے سپاٹ سا چہرہ بنائے رکھنے والا سعد کبھی ایسا نہ تھا۔ نگی باجی اور اس کی خوب دوستی تھی۔ دونوں کی سنگت میں ایک پر لطف دن گزار کر شام ڈھلے واپسی ہوئی تھی۔ صبح واپسی کا ایک پروگرام تھا۔ اس نے کمرے میں جا کر پیکنگ شروع کر دی تھی۔ اتنے میں ہی مدحت کا فون آ گیا تھا۔

"آج بہت مزا آیا ماما! ہم خوب گھومے پھرے ڈھیر ساری شاپنگ بھی کی۔" اس نے جوش سے بتایا۔

"اچھا مثلاً کیا کیا خریدا؟" انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"مجھے تو کم ہی خریدنے کا موقع ملا۔ زیادہ تر چیزیں نگی باجی اور…" اس نے ایک دم فقرہ ادھورا چھوڑا تھا۔ اگر سعد کا نام لیتی تو جانے ماما کیا سوچتیں۔ اس کے بارے میں تو وہاں پہنچ کر ہی صحیح بتایا جا سکتا تھا۔

"ہاں اور؟" مدحت پوری بات سننے کو متمنی تھیں۔

"جی ماما! میں کہہ رہی ہوں کہ مجھے زیادہ تر شاپنگ نگی باجی نے کروائی۔" اس نے بات مکمل کی حالانکہ بہت سی چیزوں کی ادائیگی سعد نے زبردستی کی تھی اور مزیدار سے ڈنر کا بل سارا بھی اس نے ہی ادا کیا تھا۔

"تم نے اپنی تائی جان وغیرہ کے لیے کچھ نہیں لیا۔" مدحت نے پوچھا تھا۔

"یہ بات تو میرے ذہن میں ہی نہیں آئی۔" وہ شرمندہ سی ہوئی۔

"اچھا میرے لیے تو ضرور کچھ لیا ہو گا۔" مدحت نے اندازہ لگایا۔

"جی ماما آپ کے لیے ایک بہت پیاری شال لی ہے ایک اسٹائلش سا ہینڈ بیگ اور…"

"بس پھر تم وہ شال اپنی تائی کو گفٹ کر دو۔" مدحت نے اس کی بات کاٹی۔

"ماما وہ شال میں نے خاص طور پر آپ کے لیے لی ہے۔" وہ ٹھنک سی گئی۔

"کچھ مینرز سیکھو ماہا! اتنے دن تم یہاں رہی ہو، بری بات ہے بیٹا! اگر کچھ خریداری کی ہے تو یہاں کے لوگوں کے لیے بھی گفٹس لینے چاہیے تھے۔"

"اوکے ماما! دے دیتی ہوں۔" اس نے برا سا منہ بنا کر فون بند کر دیا تھا پھر بادل نخواستہ شال اٹھا کر تائی جان کے کمرے کا رخ کیا۔

"تمہاری حرکتیں میری سمجھ سے باہر ہیں نگین! کیا ضرورت تھی آج سعد کے ساتھ ماہا کو سیر کروانے کی۔" تائی جان کی غضب ناک آواز اتنی بلند تھی کہ کمرے سے چند قدم دور کھڑی ماہا با آسانی سن سکتی تھی۔ اس کے قدم وہیں جم گئے تھے۔

"امی! آخر آپ کو اعتراض کس بات پر ہے؟ سعد کے ساتھ جانے پر یا ماہا کو سیر کروانے پر۔" نگی باجی کی جھنجلاتی ہوئی آواز کان میں پڑی تھی۔

"سعد کے ساتھ جانے پر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بلکہ میں تو تمہیں خود ہی کہتی ہوں کہ سعد کو زیادہ سے زیادہ کمپنی دیا کرو۔ اس کے ساتھ گھومو پھرو، ہوٹلنگ کرو، شاپنگ کرو۔ اسے اتنا وقت دو کہ اسے کسی اور کے متعلق سوچنے کا موقع ہی نہ ملے۔"

"آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں امی؟" نگی باجی کے لہجے میں حیرت کا عنصر زیادہ تھا یا تاسف کا، وہ فیصلہ نہ کر پائی تھی۔

"میں وہی کہنا چاہ رہی ہوں جو تم سمجھنا نہیں چاہ رہیں۔ اب اتنی بچی بھی نہیں ہو تم۔" انہیں بیٹی پر خوب غصہ آ رہا تھا۔

"مدحت نے کب سے سعد کو تاڑ رکھا ہے اپنی بیٹی کے لیے۔ جب بھی فون کرتی ہے سعد کے علاوہ کسی کا پوچھتی تک نہیں۔ میں نے اپنی طرف سے جھوٹ سچ ملا کر سعد کی آوارگی کے کتنے قصے سنا ڈالے مگر اتنی ڈھیٹ ہے کہ بظاہر لگتا تھا ساری باتوں پر یقین آ گیا ہے۔ صدمے سے برا حال ہو جاتا تھا۔ لیکن اب موقع آیا تو سعد پر ڈورے ڈالنے کے لیے اپنی بیٹی کو بھیج دیا۔ بیٹی بھی ماں جیسی ہے بظاہر معصوم مگر گنوں کی پوری۔ ایک تم ہو اتنے برسوں کا ساتھ ہے تمہارا اور سعد کا مگر…"

"پلیز امی! چپ کر جائیے۔" صدمے سے نگی کی آواز گھٹ کر رہ گئی تھی۔

"کیوں چپ کر جاؤں۔" تائی جان چمک کر بولی تھیں۔

"فار گاڈ سیک امی! میرے دل میں آپ کے لیے جو تھوڑی بہت محبت اور عزت بچی ہے اسے بچا رہنے دیں۔" اس نے شاید ماں کے ساتھ ہاتھ جوڑے تھے۔

"یہ تم اپنی ماں کے لیے کہہ رہی ہو۔ تھوڑی سی عزت اور محبت؟ آخر تمہارے ساتھ ایسا کیا برا کیا ہے میں نے۔ اپنی جان سے بڑھ کر چاہا ہے تمہیں۔"

"مجھے نہیں چاہیے ایسی چاہت امی! اگر میرے بس میں اختیار ہوتا کہ میں اپنے لیے کوکھ کا انتخاب خود کر سکوں تو یقین کریں وہ کوکھ ہرگز آپ کی نہ ہوتی اور نہ ہی ابو میرے باپ ہوتے۔"

"نگی تو ہوش میں تو ہے۔" تائی جان کا جلالی لہجہ سن کر باہر کھڑی ماہا کی ٹانگیں بھی کانپ گئی تھیں۔

"یتیموں کا حق غصب کر کے اپنے آشیانے کی بنیاد رکھنے کے بعد آپ لوگوں کو کبھی ضمیر کے کٹہرے میں کھڑا نہیں ہونا پڑا۔ حیرت ہے امی! کم از کم میرے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد تو آپ لوگوں کو اللہ کی پکڑ کے خوف سے اپنا طرز عمل ٹھیک کر لینا چاہیے تھا لیکن افسوس شاید آپ لوگوں کے نصیب میں ہدایت ہے ہی نہیں۔" نگی باجی ان کے جلالی لہجے سے ذرا بھی مرعوب نہ ہوئی تھیں۔

"کون سے یتیموں کا حق غصب کیا ہے ہم نے؟ غضب خدا کا اتنا بڑا بہتان لگا رہی ہو اپنے ماں باپ پر۔ یہ سب تمہارے باپ کی محنت اور سمجھ بوجھ ہے جس کی بنیاد پر یہ شاندار بزنس کھڑا ہوا ہے۔ ہم نے کسی کا حق غصب کیا ہوتا تو کیا کوئی ہمارا گریبان پکڑنے نہ آتا؟ مدحت وہاں مزے سے پروفیسری کر رہی ہے اور سعد یہاں عیش کر رہا ہے۔ مانا کہ تمہارے ابو کا کاروبار میں صرف دس فی صد شیئر تھا۔ سارا سرمایہ تمہارے دونوں چچاؤں کا تھا لیکن مغیث کے مرنے کے بعد معید کو تو اپنا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ کاروبار کیا خاک سنبھالتا۔ اس کے مرنے کے بعد تمہارے ابو نے کاروبار سنبھالا تو پتا چلا کتنا گھاٹا ہو چکا ہے۔ ساری صورت حال مدحت کو بتا دی تھی۔ اسے ہماری بات پر یقین آیا تھا تب ہی لاکھوں کے بزنس کی پلٹ کر خبر نہ لی اور سعد تو خیر اس وقت بچہ ہی تھا۔ کس چیز کی کمی تھی اسے یہاں۔ اچھا کھلایا اچھا پڑھایا۔ وہ آج جو کچھ ہے، ہماری وجہ سے ہے۔" تائی جان کے لہجے کا طنطنہ کم نہ

ہوا تھا۔

"سعد کا سسکتا ہوا بچپن میری نگاہوں کے سامنے گزرا ہے امی! اگر آج وہ کچھ بن گیا ہے تو اس میں صرف اس کی محنت اور اللہ کی عنایت شامل ہے اور یقین کریں اس کے کچھ بننے کے بعد آپ کا بدلتا رویہ مجھے آپ کے اس روپ سے زیادہ بدصورت لگتا ہے' جب آپ اسے بالکل فالتو چیز سمجھتے ہوئے کسی قابل نہ سمجھتی تھیں۔ کس مشکل حالات میں اس نے سروائیو کیا ہے۔ مجھے یہ کوئی معجزہ ہی لگتا ہے۔"

"اچھا اب زیادہ ڈائیلاگ بولنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس کے کچھ بننے یا نہ بننے سے مجھے کچھ سروکار ہے۔ تمہاری ٹانگ کے لنگ نے مجھے اس معمولی لڑکے کو اہمیت دینے پر مجبور کیا ہے۔ لیکن یہ بات جانے تمہاری عقل میں کیوں نہیں سما رہی۔ تمہیں تو گناہ' ثواب کے سارے لیکچر دینا یاد آ رہے ہیں۔" انہوں نے اپنے ازلی بیزار لہجے میں بیٹی کو مخاطب کیا تھا۔

آپ کے خیال میں وہ معمولی لڑکا مجھے اس ٹوٹی ٹانگ سمیت اپنا لے گا۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد نگی بولی تو لہجے میں بلا کی ٹھنڈک تھی۔

"اگر تم کوشش کرو تو کچھ ناممکن نہیں۔ پھر اس معمولی نقص کے علاوہ کیا کمی ہے تم میں۔ خوب صورت ہو' صاحب جائیداد ہو۔ تم سے شادی سعد کے لیے کوئی گھاٹے کا سودا نہیں ہو گی۔ تمہارے ابو کہتے ہیں' بزنس میں شیئرز کے علاوہ یہ گھر بھی تمہارے اور سعد کے نام کر دیں گے۔" تائی جان کی پلاننگ مکمل تھی۔

"ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے اسے مجھ سے شادی کی کیا ضرورت ہے امی! وہ یہ سب عدالت میں جا کر بھی حاصل کر سکتا ہے۔" نگی نے استہزائیہ انداز میں انہیں مخاطب کیا۔

"خدا کے لیے نگی! یہ سب سعد کے کانوں میں پھونک کر اسے یہ راستہ مت دکھا دینا۔ اپنے باپ کی برسوں کی بنی ساکھ اور نیک نامی کا کچھ احساس ہے تمہیں؟" نگی باجی کے منہ پھٹ انداز پر وہ اس بار کچھ خائف ہوئی تھیں۔

"میں کسی سے کچھ نہیں کہنے لگی امی! بے فکر رہیں آپ۔ بس مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ آپ کی وجہ سے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی مجھے نہیں مل پائے گی۔ سعد کے ساتھ سے بڑھ کر میرے لیے بھی کوئی اور خوش نصیبی کی بات نہیں۔ لیکن افسوس میں آپ کی بیٹی ہوں اور وہ بے شک مجھے پسند کرنے بھی لگے مگر آپ کو شدید ناپسند کرتا ہے۔ وہ مجھ سے شادی کبھی نہیں کرے گا امی! آپ کی ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ جائے گی۔"

نگی کا تھکا تھکا سا لہجہ' ماما سے مزید وہاں کھڑے رہنا ممکن نہ ہوا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی واپس پلٹ آئی۔

کتنا دکھ ہوا تھا اسے تائی جان کی باتیں سن کر۔ دنیا میں ایسے بے حس اور خود غرض لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ بے چاری نگی باجی! جانے اتنا خالص دل لے کر ایسے لوگوں کے گھر کیسے پیدا ہو گئی تھیں' جہاں دل میں تائی جان کے لیے موجود ناپسندیدگی میں اضافہ ہوا تھا' وہاں نگی باجی پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔

"اللہ آپ کے دل کی ہر خوشی پوری کرے نگی باجی۔" اس نے دل سے ان کے لیے دعا کی۔

☆ ☆ ☆

"سعد! پلیز تم ماما کو بس تک چھوڑ آؤ گے؟" اگلی صبح ناشتے کی میز پر نگی سعد سے مخاطب تھی۔ ماما نے بے اختیار انہیں دیکھا۔ اپنی ماں کے رات کے لیکچر کو بھلا کر وہ ایک بار پھر اسے سعد کے ساتھ بھیج رہی تھیں۔

"نگی باجی! تو اب مجھے رکشا یا ٹیکسی لا دے گا' میں خود چلی جاؤں گی۔" اس نے انکار کرنا چاہا تھا۔

"میرا آفس اسی سائیڈ پر ہے' میں تمہیں بس میں بٹھا کر آگے چلا جاؤں گا لیکن ناشتہ کر کے فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔ میں آفس سے زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ لیٹ ہو سکتا ہوں۔" سعد نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ تکرار کا واقعی وقت نہ تھا۔

"سعد بھائی! میں بس پانچ منٹ میں آتی ہوں۔" اس نے بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے چائے کا کپ میز پر رکھا اور تائی جان کی گھورتی نگاہوں کو نظر انداز کرتی ڈائننگ ہال سے نکل گئی اور وہ واقعی پانچ منٹ بعد ہاتھ میں بیگ اٹھائے وہاں آن موجود ہوئی۔ سعد گاڑی میں کھڑا ہوا تھا۔ دل پر جبر کرتے ہوئے اس نے تائی جان کو الوداعی سلام کرتے ہوئے ان کے آگے سر جھکایا تھا اور شاید انہیں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس سے کہیں زیادہ جبر کرنا پڑا تھا۔ نگی باجی اسے چھوڑنے پورچ تک آئی تھیں۔

"بہت یاد آؤ گی ماہا۔" نگی باجی کی آنکھوں میں چمکتی نمی نے ماہا کو بھی اداس کر دیا تھا۔

"آپ مجھ سے ملنے آئیے گا باجی! مجھ سے اور ماما سے۔" ان سے گلے ملتے ہوئے اس نے انہیں وہاں آنے کی دعوت دی تھی۔

"وعدہ نہیں کرتی' پر کوشش کروں گی۔"

"لیڈیز! آئی ایم گیٹنگ لیٹ۔" سعد نے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے جلدی مچائی۔ وہ نگی کا ہاتھ دبا کر چھوڑتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ واپسی کا سفر شروع ہو گیا تھا۔ وہ خاموشی سے باہر کے دوڑتے مناظر دیکھنے لگی۔ سعد نے گردن ترچھی کرتے ہوئے اس پر نگاہ ڈالی۔ کتنی اداس اور خاموش لگ رہی تھی وہ۔ سات' آٹھ دن پہلے والی ماہا سے یکسر مختلف۔

"لڑکی! تمہیں تو خوش ہونا چاہیے' تم واپس اپنے گھر جا رہی ہو۔" سعد سے اس باتونی لڑکی کی خاموشی مزید برداشت نہیں ہو پائی تھی۔

"میں تو اس گھر کو بھی اپنا ہی گھر سمجھ کر آئی تھی سعد بھائی۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔

"پھر کیا ہوا؟ توقعات پر پانی پھر گیا نا۔" سعد نے محظوظ ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔

"شاید یا پھر شاید نہیں۔ بس جو کچھ میں سوچ کر آئی تھی' کچھ بھی ویسا نہیں ہوا۔" اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"تم نے سوچا ہو گا تمہارے تایا' تائی تم پر ڈھیر ساری محبتیں اور شفقتیں نچھاور کریں گے۔ کسی بچپن کی طرح تمہارے خوب لاڈ اٹھائے گا۔ نگی اور تمہاری تو خیر خوب دوستی ہو گئی تھی اور مجھے تو تم نے کسی کھاتے شمار میں ہی نہ رکھا ہو گا۔ بلکہ مجھ جیسے بگڑے شخص سے تو تمہیں دور دور رہنے کی تلقین کی گئی تھی۔" سعد نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے چھیڑا تھا۔

"آپ بھی نا سعد بھائی! میری ایک بات کا پیچھا ہی پکڑ لیا' حالانکہ آپ چاہتے تو پہلی ملاقات میں ہی میری غلط فہمی دور کر سکتے تھے اور پلیز آپ ماما کو بھی غلط مت سمجھیے۔ انہیں آپ کے متعلق جتنا بدگمان کیا گیا تھا' اس کے بعد وہ مجھے ایسی ہی نصیحت کر سکتی تھیں لیکن اگر آپ یقین کریں تو میں آپ کو بتاؤں کہ میری ماما نے اپنی ہر دعا میں آپ کو یاد رکھا ہے بلکہ شاید کسی اور نے آپ کے لیے اتنی دعائیں نہیں کی ہوں گی۔ صرف آپ کا خیال تھا' جو انہیں تائی جان سے رابطہ رکھنے پر مجبور کرتا تھا ورنہ اب میں سمجھ سکتی ہوں کہ وہ مجھے یہاں کیوں نہیں بھیجنا چاہتی تھیں۔ ان لوگوں کے ساتھ اتنے برس گزارنے کے بعد وہ ان کی عادتوں سے بخوبی آگاہ ہوں گی لیکن انہوں نے کبھی مجھے میرے تایا' تائی سے بدگمان کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اب بھی ان کی یہ ہی خواہش ہو گی کہ میرے ذہن میں اپنے رشتے داروں کے متعلق جو خاکہ ہے وہ قائم رہے۔" اس نے سنجیدگی سے اظہار خیال کیا تھا۔

"تمہاری باتوں پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ماہا! لیکن میں حیران ہوں کہ وہ خاتون جنہیں تم نے تائی جان کہہ کر مخاطب کیا' میری کردار کشی سے آخر کیا مقصد حاصل کرنا چاہتی تھیں۔"

سعد کے کہنے پر ماہا نے نگاہیں چرا لیں۔ تائی جان کے مقصد سے لاعلم ہی رہتا تو بہتر تھا لیکن تائی جان کی شخصیت کو نکال باہر کیا جاتا تو ان کا آئیڈیا تو شاندار تھا۔ کل ان کی باتیں سننے کے بعد اس نے کتنی ہی بار دونوں

کی چوڑی کا تصور کیا تھا اور خیالوں ہی خیالوں میں مسکرا کر اس کے بھی کر دیا تھا اب بھی تکی باجی یاد آئیں تو ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"تکی باجی کتنی اچھی ہیں نا سعد بھائی! لگتا ہی نہیں کہ وہ تائی جان کی بیٹی ہیں۔"

"لڑکی! تمہارے اور میرے خیالات کتنے ملتے ہیں۔" سعد ہنس پڑا تھا۔ وہ بھی مسکرا دی۔

"لیجیے باتوں ہی باتوں میں سفر گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا۔" سعد نے گاڑی کو بریک لگائے تھے۔

"سعد بھائی! آپ میرا بیگ ویٹنگ روم میں پہنچا کر چلے جائیں۔ آپ آفس سے لیٹ ہو رہے ہیں۔"

"اطلاع دینے کا شکریہ۔" سعد نے اسے گھورا تھا۔ کوچ چلنے میں ابھی تھوڑا سا وقت تھا۔ سعد اتنی دیر اس کے پاس رکا رہا تھا۔

"آپ بہت اچھے ہیں سعد بھائی۔" کوچ چلنے لگی تو اس نے ممنون ہو کر اسے پکارا۔

"یہ بات جا کر مدحت چچی کو بتا دینا۔"

"ماما کو میری بات پر مشکل سے یقین آئے گا۔ آپ ان سے خود ملنے آیئے گا نا۔" اس نے کہا۔ سعد محض مسکرا دیا تھا نہ اقرار نہ انکار اور کوچ چل پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

کتنی دیر تک وہ ماما سے لپٹی رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ ماں سے اتنی دور رہی تھی۔ مدحت نے بھی دیر تک اسے سینے سے چمٹائے رکھا پھر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر پیشانی چومی تھی۔ اس انداز میں وہ بہت کم پیار کرتی تھیں۔

"آئی لو یو ماما۔" اس نے بھی ان کے ہاتھ چوم لیے تھے۔

"گریٹ بھئی! آج اندازہ ہوا کہ آپ دونوں ماں بیٹی میں کتنی محبت ہے ورنہ تو اس کٹ کھنی کو ہمیشہ آپ سے ڈانٹ کھاتے ہی دیکھا تھا۔" ولید لقمہ دیتے ہوئے بولا۔ وہ ابھی اس کے ساتھ ہی لوٹی تھی۔

"ماما کی ڈانٹ بھی میرے بھلے کے لیے ہی ہوتی ہے۔" وہ ماں کو محبت سے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ ولید کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں۔

"پھوپھو! آپ نے اسے جلدی واپس بلوا لیا ایک ہفتے میں ہی اتنی سمجھ دار ہو گئی ہے۔ دس بارہ دن مزید رہتی تو بالکل عقل مند بن کر لوٹتی۔"

"میں فی الحال تمہارے منہ نہیں لگ رہی ماما! آپ یہ بتایئے کیا پکایا ہے۔ بھوک سے برا حال ہو رہا ہے۔"

"ماہا! بھائی ہے تمہارا ایسے بات کرتے ہیں؟" مدحت نے اسے ڈانٹا تھا۔

"مت ڈانٹیں پھوپھو! مجھے یقین آگیا کہ لڑکی بدلی نہیں وہی ہے پرانی والی۔" ولید ہنسا تھا۔

"رکو ولید! کھانا کھا کر جانا۔" اسے واپس مڑتا دیکھ کر مدحت نے پکارا۔

"بالکل بھوک نہیں پھوپھو! اور ویسے بھی کل یونیورسٹی میں ایک اسائنمنٹ جمع کروانے کی آخری تاریخ ہے۔ کام ادھورا چھوڑ کر محترمہ کو لینے گیا تھا اب جا کر اسائنمنٹ پوری کروں گا۔"

"میں بھی شام کو آؤں گی مامی سے ملنے۔ زارا بھابھی گھر پر ہی ہیں نا میکے تو نہیں گئی ہوئیں۔" اس نے پیچھے سے ہانک لگا کر پوچھا تھا۔

"امی سے ملنے کا تو بہانا ہے۔ اصل میں تمہیں اپنے بھتیجے کی یاد ستا رہی ہوگی۔ گھر ہی ہیں زارا بھابھی۔" ولید مسکراتے ہوئے چلا گیا تھا۔ زارا بھابھی ماموں کے سب سے بڑے بیٹے فرہاد بھائی کی بیوی تھیں۔ ان کے سوا اس گھر میں بس مامی جان تھیں۔

"چلو تم ہاتھ منہ دھو لو میں کھانا لگواتی ہوں۔" مدحت نے اسے مخاطب کیا۔

"یس مام۔" وہ تابع داری سے کہتے ہوئے فریش ہونے چل پڑی تھی۔

"اور سناؤ خوب انجوائے کیا اپنے تایا کے گھر برسوں بعد اتنے کزنز سے ملاقات ہوئی ہوگی۔ کیسے لگے سب لوگ حنی دلہن کیسی تھی۔" زارا بھابھی نے اپنی عادت کے مطابق ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے تھے۔

"کٹلس بہت مزے کے ہیں بھابھی! ایک اور لے لوں۔" اس نے چٹخارا بھرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تمہارے لیے ہی بنائے ہیں۔" انہوں نے خفا ہوتے ہوئے اکٹھے دو کٹلس اس کی پلیٹ میں ڈال دیے تھے۔

"ویسے اتنے تھوڑے سے دنوں میں ہی تم کچھ دبلی ہو گئی ہو۔ کیا تایا، تائی نے خیال نہیں رکھا۔" زارا بھابھی کی لاکھ اچھی عادتیں سہی مگر ان میں عورتوں کی طرح ٹوہ لینے والی مخصوص عادت کبھی کبھار کوفت میں مبتلا کر دیتی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں بھابھی! وہاں سب لوگوں نے میرا بہت خیال رکھا۔ دراصل مجھے بہت تیز بخار ہو گیا تھا۔ شاید اسی لیے آپ کو کمزور لگ رہی ہوں۔" اس نے اعتراف کرتے ہوئے ماما کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ ناراضی سے اسے تک رہی تھیں۔ اس نے اب تک انہیں نہیں بتایا تھا کہ وہ وہاں جا کر بیمار پڑ گئی تھی۔

"بس رہنے دو بیٹا! جیسے تمہاری ماں نے اتنے سالوں بلاوجہ ان کا بیر رکھا وہی کام اب تم کر رہی ہو ورنہ کیسے ہیں وہ لوگ کیا ہم جانتے نہیں؟ ہم تو اس حق میں بھی نہیں تھے کہ تم وہاں جاؤ لیکن تم نے اپنی ماں سے ضد منوالی۔" صفیہ مامی اتنا اچانک بولی تھیں کہ وہ کچھ لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گئی۔

"تمہارے ماموں مرحوم کہتے ہی رہے کہ اپنا حق چھوڑنا بزدلی ہے لیکن تمہاری ماں کی منطق ہی نرالی تھی حالانکہ جس دولت پر تمہارے تایا، تائی عیش کر رہے ہیں اس میں ان کا رتی برابر بھی حصہ نہیں۔ اللہ نے دونوں بھائیوں کو زندگی اتنی مختصر دی کہ اپنی محنت کا پھل نہ کھا سکے لیکن ستم ظریفی دیکھو کہ اولاد کے لیے بھی جو چھوڑ کر گئے اس پر بھی بڑے بھائی صاحب نے قبضہ جما لیا۔"

"چھوڑیں بھابھی! آپ بھی کیا ذکر لے بیٹھیں۔" ماما نے آہستگی سے انہیں ٹوکا۔

"ہاں بس ہمیشہ یہ کہہ کر ہی تم ہماری زبان بند کروا دیتی ہو۔" ممانی خفا ہوئی تھیں۔ ان کے خلوص پر نہ مدحت کو شبہ تھا نہ ماہا کو لیکن وہ جانتی تھی ماما کو اس ذکر سے تکلیف ہوتی ہے۔ جب ہی اس نے موضوع بدلا تھا۔

"آپ کا شہزادہ عالم اور کتنی دیر تک سوئے گا۔ مجھ سے مزید انتظار نہیں ہو رہا میں اسے جگا رہی ہوں۔" اس نے کاٹ میں سوئے احمد کو گدگدی کی تھی۔

"میں کچن میں جا رہی ہوں۔ اٹھ کر رویا تو تمہیں ہی سنبھالنا پڑے گا۔" زارا بھابھی نے مسکراتے ہوئے وارننگ دی۔

"بے فکر ہو کر جائیں۔ اول تو آپ کا بیٹا روئے گا نہیں اتنے دنوں بعد اپنی پھوپھو کو دیکھے گا، خوب خوش ہو گا اور اگر رو بھی پڑا تو میں سنبھال لوں گی اور اگر زیادہ ہی رو پڑا تو اس کی دو 'دادیاں' بیٹھی ہیں نا یہاں، سنبھال لیں گی۔"

"چالاکی اس لڑکی پر ختم ہوتی ہے۔" کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ولید نے اس پر فقرہ چست کیا تھا۔

"ہاں تم پر شروع ہوتی ہے اور مجھ پر ختم۔" وہ جوابی وار کرنے سے کب چوکتی تھی۔

"بس اب دونوں اپنی چونچیں لڑانا شروع کر دیں گے۔" صفیہ مامی مسکرائی تھیں۔

"نہیں لڑائیں گی امی! اتنے دنوں بعد تو یہ آئی ہے۔ ایک دن کا تو لحاظ بنتا ہے نا۔" ولید ان کے پاس بیٹھتے ہوئے مسکرا کر بولا تھا۔

"بہت مہربانی آپ کی۔ میرا بھی آپ سے الجھنے کا کوئی موڈ نہیں۔ آج صرف احمد کے ساتھ کھیلنے آئی ہوں۔" اس نے احمد کو دوبارہ گدگدایا تھا۔ گہری نیند میں سویا احمد پہلے تو کسمسایا پھر پٹ سے آنکھیں کھول کر اپنے اوپر جھکی ماہا کو دیکھا اس کے بعد ایکدم حلق پھاڑ کر رو دیا تھا۔

"دیکھا بچہ بے چارا ڈر گیا تمہیں دیکھ کر۔" ولید کو خوب مزہ آیا تھا۔

"امی! آپ ولید کے بچے کو چپ کروائیں۔"

"پہلے تم تو فرہاد بھائی کے بچے کو چپ کرواؤ۔"

"یہ تو ابھی چپ ہو جائے گا ایک منٹ میں۔" وہ اسے گود میں لے کر باہر ٹیرس پر چلی گئی اور واقعی چند منٹوں میں ہی اس نے احمد کو چپ کروا لیا تھا۔ مدحت اور صفیہ مسکرا کر پھر باتوں میں لگ گئیں۔ ولید چند منٹوں تک دونوں خواتین کے پاس بیٹھا پھر وہ بھی ٹیرس پر چلا گیا تھا۔ ماہا سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں جو مزا آتا تھا وہ ماں اور پھوپھو کے پاس بیٹھ کر کہاں مل سکتا تھا۔

"تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ وہاں تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔" رات کو وہ مدحت کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی جب انہوں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پیار سے پوچھا تھا۔

"آپ نے بھی تو مجھے بہت کچھ نہیں بتایا ماما!" وہ آنکھیں کھول کر مسکرائی۔

"میں نے تم سے کیا چھپایا ماہا۔" مدحت حیران ہوئی تھیں۔

"آپ نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ میرے تایا، تائی کی فطرت کیسی ہے۔ انہوں نے ہمارے اور مغیث چاچو کے بزنس اور جائیداد پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔"

"میرے نزدیک ان باتوں کی کوئی اہمیت ہوتی تو میں تم سے ذکر بھی کرتی۔" مدحت سنجیدہ ہوئی تھیں۔

"اگر آپ مجھے تایا جان اور تائی جان کی نیچر کے متعلق ہی تھوڑا بہت بتا دیتیں تو میں اتنا ہرٹ تو نہ ہوتی۔ کتنے ارمانوں سے میں ان لوگوں کی محبت میں دوڑی دوڑی گئی اور انہیں مرحوم بھائی کی بیٹی کے سر پر ہاتھ تک رکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔" تایا جان کی بے مروتی اور بیگانگی یاد کر کے اس کی آنکھیں پھر ڈبڈبا گئی تھیں۔

"میں تمہیں ان لوگوں سے بدگمان نہیں کرنا چاہتی تھی ماہا! میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کبھی تم ان لوگوں کے پاس جانے کی ضد کرو گی۔ جیسے بھی ہیں وہ تمہارے پاپا کے بھائی ہیں۔ میں تمہارے ذہن میں ان کا امیج اچھا ہی رکھنا چاہتی تھی اور سچ پوچھو تو مجھے ان سے کوئی ایسا خاص گلہ ہے بھی نہیں۔ تمہارے پاپا کی جدائی کا صدمہ سہنے کے بعد یہ دولت، جائیداد، پراپرٹی میرے لیے بالکل بے حیثیت چیزیں تھیں۔ اس وقت مجھے مادی سہاروں سے زیادہ جذباتی سہارے کی ضرورت تھی۔ میں اگر وہاں رہتی تب بھی تمہارے تایا آہستہ آہستہ مجھے میرے ہر حق سے محروم کر دیتے۔ اپنی ہی چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے سخت جدوجہد کرنا پڑتی۔ میرے اندر نہ تو کورٹ کچہری جانے کا حوصلہ تھا نہ ان لوگوں سے دشمنی پالنے کی ہمت۔ میں نے اپنے اور تمہارے لیے جو مناسب سمجھا وہی راستہ اختیار کیا۔ تمہیں باپ کی شفقت دینا میرے اختیار میں نہیں تھا لیکن تمہیں بھرپور اور مکمل زندگی دینے کی میں نے ہر پل کوشش کی ہے۔ تمہارے ماموں کے شدید اصرار اور ناراضی کے باوجود میں نے ان کے ساتھ رہنے کے بجائے الگ رہنے کو اسی لیے ترجیح دی کہ زندگی کے کسی موڑ پر تم کسی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو جاؤ لیکن اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہارے پاپا کی جائیداد میں حصہ پانے کے لیے مجھے تگ و دو کرنا چاہیے تھی تو شاید میں اپنی کوشش میں ناکام ثابت ہوئی ہوں۔"

"آپ دنیا کی سب سے گریٹ ماما ہیں۔ آئی لو یو اینڈ آئی ایم پراؤڈ آف یو۔" وہ ان سے لپٹتے ہوئے بولی۔

"اچھا گریٹ ماما کی گریٹ بیٹی! میرے سوال کا جواب تم پر اب بھی ادھار ہے۔ تمہاری طبیعت وہاں پر خراب ہو گئی تھی اور تم نے مجھ سے ذکر تک نہیں کیا۔" مدحت نے پیار سے اسے خود سے الگ کیا۔

"میری طبیعت وہاں خراب ہوئی تھی ماما اور آپ کو بتا دیتی تو آپ کی طبیعت یہاں پر خراب ہو جاتی۔ ذرا سا بخار ہو گیا تھا۔ سعد بھائی مجھے ڈاکٹر کے لے گئے تھے۔ اگلے دن تک بھلی چنگی تھی میں۔"

"تم سعد کے ساتھ ڈاکٹر کے گئی تھیں؟" مدحت نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"افوہ ماما! اب ڈانٹنے نہ لگ جائیے گا کہ میں نے ان سے دور رہنے کی آپ کی نصیحت چٹکیوں میں اڑا دی۔ سعد بھائی بہت نائس بندے ہیں۔ تائی جان نے ان کے متعلق سراسر غلط بیانی سے کام لیا۔ وہ آپ کو ان سے بدگمان کرنا چاہتی تھیں۔ اس گھر میں جہاں تائی جی جیسی پر خلوص ہستی رہتی ہے وہیں سعد بھائی جیسے اچھے بندے بھی موجود ہیں۔ وہ ہرگز بھی بگڑے ہوئے شخص نہیں ہیں۔ کاش آپ انہیں دیکھ پاتیں ویسے میں انہیں یہاں آنے کی دعوت دے کر تو آئی ہوں، ہو سکتا ہے کبھی وہ آپ سے ملنے آ ہی جائیں۔" ماہا نے بتایا۔ مدحت بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ گویا بڑی بھابھی نے اتنے برسوں ان سے جھوٹ بولا تھا۔

"آپ کو افسوس ہوا ماما کہ تائی جان نے آپ سے غلط بیانی کیوں کی۔" ماہا پوچھ رہی تھی۔

"مجھے خوشی ہے ماہا کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ سعد حالات کے جبر کا شکار ہو کر بگڑ نہیں گیا۔" ان کے سینے پر دھرا غیر محسوس سا بوجھ ہٹ گیا تھا۔

ماہا سو گئی تھی مگر نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ برسوں پہلے کے مناظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے تھے، جب وہ رخصت ہو کر "مجیب ہاؤس" آئی تھیں۔ تین سال کا گول مٹول بچہ جس سے نجانے کیوں انہیں پہلی نظر میں ہی بہت انسیت ہو گئی تھی۔ ہنس مکھ اور پرکشش سی سلیمہ بھابھی جنہوں نے کبھی محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ ان کی جٹھانی ہیں ہمیشہ بہنوں والا برتاؤ رکھا۔ شفیق سے مغیث بھائی جنہوں نے حقیقتاً "بڑے بھائیوں والا" مان دیا لیکن دونوں میاں بیوی بہت مختصر زندگی لکھوا کر لائے تھے۔ ایک کار ایکسیڈنٹ میں دونوں لقمہ اجل کا شکار بن گئے۔

سات برس کا سعد ماں اور باپ دونوں کی شفقت سے محروم ہو گیا تھا۔ بڑے بھائی اور بھابھی کی زندگی پر تو یہ حادثہ اتنا اثر انداز نہیں ہوا تھا لیکن معید سے یہ صدمہ سہا نہ جا رہا تھا۔ مدحت کبھی شوہر کو تسلی دیتیں تو کبھی سعد کو آغوش میں لے کر سسکنے لگ جاتیں۔ ہنستے کھیلتے گھر کو جانے کس کی نظر لگ گئی تھی۔ صرف دو برس کی ماہا تھی، جس کی قلقاریاں گھر میں گونجتی تھیں۔

سعد کی طبیعت میں عجیب ضدی پن آ گیا تھا۔ صرف مدحت تھیں جو اس کی کیفیت کو سمجھتی تھیں۔ بڑی بھابھی تو ویسے ہی اس بدتمیز بچے سے خار کھاتی تھیں۔ مدحت اور معید سعد کو یتیمی کے احساس سے چھٹکارا دلا کر اپنی شفقت کے سائے میں پروان چڑھانا چاہتے تھے لیکن معید نے خود زندگی کی بازی ہارنے میں بہت جلدی کر دی۔ شاید بھائی بھاوج کی حادثاتی موت کا اثر لے کر ان کا دل اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ معمولی سا اٹیک بھی نہ سہار پائے۔

ماہا کو بھی سعد کی طرح سات سال کی عمر میں یتیمی سہنا پڑ گئی۔ مدحت کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ عدت کے بعد ان کے بھائی نے انہیں ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ شدید ڈپریشن میں مبتلا مدحت کو بھی یہی مناسب لگا۔ انہیں بزنس یا پراپرٹی سے زیادہ اپنی بچی کا مستقبل اور اس کی خوشیاں زیادہ عزیز تھیں۔ وہ ماہا کے لیے کسی کی آنکھوں میں نخوت یا بیزاری برداشت نہ کر سکتی تھیں اور مجیب ہاؤس میں جو مکین بچ گئے تھے، وہ ان کے ظرف سے بخوبی آگاہ تھیں، سو بھائی کے ساتھ واپس آ گئیں۔

تیرہ برس کا سعد جس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ چچا کے بعد عزیز از جان چچی بھی اچانک اسے تنہا چھوڑ جائیں گی۔ اس نے انہیں روکنا چاہا تھا۔ مدحت بے بسی سے اسے دیکھتی رہ گئیں، دبے الفاظ میں مجیب بھائی سے سعد کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی مگر وہ بات سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئے۔

مدحت جانتی تھیں، انہیں سعد سے زیادہ سعد کی جائیداد میں دلچسپی ہے مگر وہ خود بھی تو اس پر کوئی حق نہ رکھتی تھیں۔ مجبوراً اس ناراض لڑکے کو جس نے وارننگ دے رکھی تھی کہ اگر وہ چلی گئیں تو وہ ساری عمر ان سے بات نہیں کرے گا زبردستی گلے لگا کر بھینچ کر پیار کرنے کے بعد انہوں نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔

شروع شروع میں وہ بار بار مجیب ہاؤس فون کر کے سعد سے بات کرنے کی کوشش کرتیں مگر وہ ضد کا پکا تھا

کبھی ٹیلی فون لائن پر آکر نہ دیا۔ مجبوراً "بڑی بھابھی سے ہی اس کی خیریت پوچھنے پر اکتفا کرنے لگیں۔ چند مہینوں میں تھوڑا بہت منافع بھیجنے کے بعد مجیب بھائی نے بزنس دیوالیہ ہونے کا اعلان کردیا۔

آفاق بھائی ماہا کا حق لینے کے لیے قانونی راستہ اختیار کرنے پر زور دیتے تھے لیکن انہوں نے خاندانی رنجشیں پالنے سے گریز کیا۔ مقامی گرلز کالج میں لیکچرر شپ ملنے کے بعد وہ بہت قانع ہو گئی تھیں۔ بنا کسی کا احسان لیے وہ اپنی بیٹی کی پرورش کر سکتی تھیں۔ اب ان کے جینے کا واحد مقصد ان کی بیٹی ہی تھی۔ مجیب ہاؤس سے اب ان کا تعلق محض اتنا رہ گیا تھا کہ دو چار مہینوں میں ٹیلی فونک رابطے کے ذریعے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرلی جاتی۔

زندگی اپنی رفتار سے آگے بڑھنے لگی۔ ہاں کبھی کبھار ایک ناراض لڑکا شدت سے یاد آتا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ پھر مجیب ہاؤس فون کرتیں' جہاں حسب معمول جٹھانی سے ہی واسطہ پڑتا۔ بیزار کن لہجے میں وہ سعد کی خیریت سے آگاہ کردیتیں۔ تمکین کے ایکسیڈنٹ کے بعد انہوں نے پہلی بار مجیب ہاؤس جانے کے بارے میں سوچا تھا لیکن ان دنوں ماہا کے پیپرز ہو رہے تھے۔ وہ فوری طور پر نہ جاسکیں۔ بعد میں بڑی بھابھی کا بیزار لہجہ ہی سننے کو ملا۔

"تم کیا کرو گی آکر' میری بچی کے نصیب میں جو تھا' وہ ہو کر رہا۔"

ان کا اشارہ تمکین کے ٹانگ کے نقص کی جانب تھا۔ مدحت کو تمکین کے ساتھ بیتنے والے حادثے نے حقیقتاً دکھی کیا تھا۔ وہ پیاری سی بچی' جس نے نہ تو شکل و صورت میں اپنے ماں باپ کا عکس چرایا تھا نہ عادتوں میں۔ بچپن میں بھی وہ بہت تمیزدار' مہذب اور حساس بچی تھی لیکن بڑی بھابھی کے روکھے پھیکے رویے کے بعد مجیب ہاؤس جاکر تمکین کی دلجوئی کرنے کا کوئی جواز باقی نہ بچا تھا۔ اب ان کا شوہر مجیب ہاؤس رابطہ کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ خلوص کا جواب ہمیشہ سرد مہری سے دیا جاتا لیکن انہوں نے ماہا کے سامنے کبھی اس کے تایا کے گھرانے کی برائی نہ کی تھی۔ وہ اس کے معصوم ذہن کو پراگندہ نہیں کرنا چاہتی تھیں لیکن پھر حیران کن طور پر بڑی بھابھی کے ان کے پاس فون آنے لگے تھے۔ ہر بار ان کے پاس ایک ہی موضوع ہوتا۔

"سعد بگڑ گیا ہے۔ غلط دوستوں کی صحبت میں پڑ گیا ہے۔ بہت آوارہ ہو گیا ہے۔"

ہر بار وہ اسی قسم کے دکھڑے روتی تھیں۔ ان کی باتیں سن کر مدحت کا دل دکھ سے بھر جاتا۔ سعد کے بگڑنے کا ذمہ دار وہ خود کو بھی قرار دیتی تھیں۔ انہوں نے صرف ماہا کے بارے میں سوچا۔ اس بچے کو حالات کے دھارے پر چھوڑ کر وہ اپنی بچی کے بہتر مستقبل کی خاطر یہاں آن بسی تھیں۔ کبھی سلیمہ بھابھی اور مغیث بھائی کے چہرے نگاہوں کے سامنے گھومتے تو کبھی خیالوں ہی خیالوں میں معید کی شکوہ کناں نگاہیں خود پر مرکوز پاتیں۔

انہوں نے سعد کو ہمیشہ اپنا بیٹا سمجھا تھا اور جیٹھ جٹھانی کے انتقال کے بعد وہ اس کے لیے کتنا حساس ہو گئی تھیں۔ ہر بار بڑی بھابھی کے منہ سے سعد کے بارے میں سن کر وہ نئے سرے سے احساس جرم تلے جلا ہو جاتیں۔ لیکن سعد کے لیے دعائے خیر کرنے کے علاوہ ان کے بس میں کچھ نہیں تھا اور اب ماہا نے بتایا کہ سعد کے متعلق اس کی تائی غلط بیانی کرتی رہی ہیں۔ انہیں ایسا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ دماغ وجہ سمجھنے سے قاصر تھا مگر دل میں عجیب سا اطمینان بھی اترتا چلا گیا تھا۔ انہوں نے ایک نگاہ سوتی ہوئی ماہا پر ڈالی اور پھر اس کے پہلو میں لیٹ کر خود بھی سونے کی کوشش کرنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

ماہا کی یونیورسٹی لائف شروع ہو گئی تھی۔ پڑھائی پہلے سے کہیں زیادہ مشکل تھی۔ گھر آکر بھی زیادہ وقت کتابوں میں سر کھپاتے ہی گزرتا۔ کبھی آرام کرنے کو جی چاہتا تو ذرا دیر کے لیے ماموں کے گھر چلی جاتی۔ گھر کون سا دور دور تھے۔ ایک ہی کالونی میں گھر تھے۔ جب تک ماموں زندہ تھے' شام میں لازمی بہن اور بھانجی کے پاس چکر لگاتے۔ موسم کے تیور خراب ہوتے تو رات بھی ان کے پاس رک جاتے۔

پانچ سال پہلے ماموں کا انتقال ہو گیا تھا مگر اب وہی روٹین ان کے بیٹوں نے اپنالی تھی۔ فجر کی نماز پڑھ کر صبح کی واک کرنے کے بعد فرہاد بھائی پھوپھو کے گھر کی گھنٹی بجا دیتے۔ کبھی رک کر صرف حال احوال دریافت کیا' کبھی چائے کا کپ تو کبھی مدحت انہیں زبردستی ناشتہ کروا کر بھیجتیں۔

صفیہ مامی بھی روز شام وقت نکال کر آجاتی تھیں۔ کبھی زاہرا بھابھی بھی ان کے ہمراہ ہوتیں۔ رہا ولید تو اس کے تو دن میں بھی کئی چکر لگتے۔ بجلی کا بل جمع کروانا ہو' بازار سے سودا سلف لانا ہو' پلمبر کو بلوانا ہو یا مدحت سے فرمائش کرکے کوئی پکوان پکوانا ہو۔ وہ مدحت کا لاڈلا بھتیجا تھا۔ جب بھی اسے فرصت ملتی۔ آدھمکتا تھا۔ ماہا اور اس کی دوستی بھی خوب تھی مگر دونوں کے درمیان ہلکی پھلکی نوک جھونک بھی چلتی رہتی تھی۔ آج کل تو خیر ماہا کے پاس اس سے الجھنے کا وقت بھی نہ تھا۔ وہ بہت ذہین اسٹوڈنٹ تھی۔ اس بار بھی اپنا ریکارڈ برقرار رکھنا چاہتی تھی سو ساری مصروفیات چھوڑ کر صرف پڑھائی میں غرق رہتی تھی اور جس دن وہ پہلے سمسٹر کا آخری پیپر دے کر گھر آئی تو گھر میں داخل ہوتے کے ساتھ ہی اعلان کردیا۔

"ماما! آج میں جی بھر کر سوؤں گی' پلیز مجھے جگایئے گا مت۔" مدحت نے مسکرا کر گردن ہلا دی۔ جانتی تھیں وہ سونے کی کتنی رسیا ہے اور کئی راتوں کے رت جگے کے بعد بھرپور نیند لینا اس کا حق تھا۔ شام ڈھلے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ بالوں کو کیچر سے سمیٹتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکلی' مدحت کچن میں تھیں۔

"اب کچھ دن ماما کو بالکل ریسٹ دوں گی' شام کا کھانا خود بنایا کروں گی۔"

اس نے وہی عہد دل میں دہرایا' جو کئی بار پہلے بھی خود سے کرچکی تھی لیکن جس پر عمل کی نوبت کم ہی آئی تھی۔ اتنے میں ہی دروازے پر بیل ہوئی۔ "نانو ہی کی گھنٹی کون اور بجا سکتا ہے۔" وہ دل میں سوچتی ہوئی دروازہ کھولنے چل پڑی تھی۔ ذرا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا' ایک دراز قد شخص کی جھلک دکھائی دی۔

"کس سے ملنا ہے۔" اس نے دروازے کی اوٹ سے ہی پوچھا۔

"تم پہلی بار مجھے نہیں پہچان پائی تھیں چلو' اس وقت میں نے تمہیں مارجن دے دیا تھا کہ برسوں بعد مجھے دیکھا ہے لیکن اس بار بھی مجھ سے شناخت مانگی تو سچ مچ ناراض ہو جاؤں گا۔" متبسم لہجہ' ماہا ایک دم گیٹ کی اوٹ سے باہر آگئی۔

"سعد بھائی آپ؟" اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کبھی اسے اپنے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑا پائے گی۔

"اندر آنے کا راستہ مل سکتا ہے؟" اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے پوچھا۔

"آیئے نا پلیز۔" وہ جھینپ کر پیچھے ہٹی تھی۔ سعد اس کے پیچھے اندر داخل ہوا۔

"آپ یقین ہی نہیں کرسکتے کہ اتنا اچانک آپ کو اپنے سامنے دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔" وہ اسے لیے ڈرائنگ روم میں آگئی تھی۔

"میں یقین کرسکتا ہوں ماہا۔" وہ مسکرایا تھا۔

"کون ہے ماہا؟" اتنے میں مدحت بھی کچن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے باہر نکلیں۔

"خود اندازہ لگائیں کہ کون آیا ہے۔" اس نے کھنکتی ہوئی آواز میں ماں کو مخاطب کیا۔ مدحت اندر آئی تھیں' سعد نے انہیں سلام کیا۔ چند لمحے لگے تھے انہیں اس کے نقوش کھوجنے میں۔

"سعد!" ان کے لبوں نے بے آواز سی جنبش کی۔

"امیزنگ۔ ماما کا حافظہ تو زبردست ہے۔" ماہا چہکی تھی لیکن مدحت نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ وہ چپ چاپ سعد کو تک رہی تھیں' جب ماہا نے انہیں بتایا تھا کہ سعد بھائی بہت ڈیسنٹ اور ڈیشنگ شخص ہیں تو کس شدت سے ان کا دل چاہا تھا کہ وہ کبھی

طرح اسے دیکھ پائیں لیکن وہ دل کی خواہش دل میں دبائے رکھنے پر مجبور تھیں۔ انہوں نے اس پر ہر طرح کا حق کھو دیا تھا لیکن آج وہ ان کے سامنے کھڑا تھا۔ ہو بہو مغیث بھائی کا عکس 'بانکا' سجیلا' جوان۔ بچھڑے ہوؤں کی یاد اس شدت سے حملہ آور ہوئی کہ وہ اپنے آنسو نہ روک پائیں۔

سعد نے انہیں اپنے بازو کے حلقے میں لے کر چپ کروانا چاہا تھا مگر وہ اس لمبے چوڑے بندے کے شانے سے سر لگائے روئے جا رہی تھیں۔ ماما بھی پاس حیران پریشان کھڑی تھی' اسے ماں سے اس جذباتی ردعمل کی توقع نہ تھی۔

"تم کیا کھڑے کھڑے دلچسپی سے یہ سب ملاحظہ کر رہی ہو' جاؤ مدحت چچی کے لیے پانی لے کر آؤ۔" سعد نے اسے گھورا تھا' وہ جیسے ہڑبڑا کر چونکی پھر سر ہلا کر تیزی سے مڑی تھی اور جتنی دیر میں وہ پانی لے کر آئی' مطلع صاف ہو چکا تھا۔ مدحت نے اپنے آپ کو کمپوز کر لیا تھا۔ سعد بھی صوفے پر ریلیکس انداز میں بیٹھا تھا۔

"آپ نے اچانک آ کر سرپرائز دیا سعد بھائی! آنے سے پہلے فون ہی کر دیا ہوتا۔"

"کیوں تمہیں یہ سرپرائز اچھا نہیں لگا۔" سعد مسکرایا تھا۔

"یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے سعد بھائی! ظاہر ہے' بہت اچھا لگا۔" وہ واقعی اس کی آمد پر بہت خوش تھی۔

"آپ نگی باجی کو بھی ساتھ لے آتے نا' پھر کتنا مزا آتا۔ ہم خوب گھومتے پھرتے انجوائے کرتے۔"

"یہ بات تم اپنی نگی باجی سے خود پوچھ لینا' میں نے آتے وقت بھی اس سے ساتھ چلنے کا کہا تھا۔" سعد نے بتایا تھا۔

"اچھا تو یہ بات ہے' پھر تو میں ان سے فون پر خوب لڑائی کروں گی۔" اسے نگی باجی پر غصہ آیا تھا۔

"لڑائی بعد میں لینا۔ پہلے میرے کھانے کا انتظام کرو۔ تو اب آج کل کیوں گیا ہوا ہے۔ جب تمہاری تائی جان کے ہاتھ کا کھانا ملتا ہے تو کبھی ... کی بیگم کچھ اتنا سید ھا کر کر رکھ دیتی ہے۔ اتنے دنوں سے پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملا۔" وہ بے تکلفی سے بولا تھا۔

"میں نے آج کوفتہ کڑھی بنائی ہے۔ بچپن میں تو تم شوق سے کھاتے تھے۔ کچھ اور کھانے کا دل کر رہا ہو تو بتاؤ۔ ابھی بنا دیتی ہوں۔" مدحت نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"میرا دل صرف آپ کو دیکھنے اور آپ سے باتیں کرنے کو چاہ رہا ہے مدحت چچی! میں مذاق کر رہا تھا' اتنی خاص بھوک نہیں' آپ کو میرے لیے قطعی کوئی اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس آپ میرے پاس بیٹھی رہیں۔"

وہ کچن جانے کے لیے اٹھ رہی تھیں کہ سعد نے انہیں دوبارہ ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"جی ماما! آپ اطمینان سے بیٹھ کر سعد بھائی سے باتیں کریں۔ میں جلدی سے روٹیاں ڈال کر کھانا لگاتی ہوں۔"

"آج کا دن میرے لیے واقعی بہت خاص ہے۔ میری بیٹی خود روٹی پکانے کا کہہ رہی ہے۔" مدحت بشاشت سے مسکراتے ہوئے بولی تھیں۔

ماما نے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔ وہ آج بہت خوش اور مطمئن تھیں۔ اس کا اندازہ ان کا چہرہ دیکھ کر لگایا جا سکتا تھا۔

"آپ کے مہمان بھی تو بہت خاص ہیں ماما۔" اس نے مسکراتے ہوئے کچن کا رخ کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کو اس نے نگی کو فون کر کے خفگی کا اظہار کیا تھا' جواب میں وہ ہنستے ہوئے اسے سنتی رہیں۔

"اس لوٹی ٹانگ کے ساتھ سفر کرنا میرے لیے اتنا آسان نہیں ہے ماما۔" جب اس نے شکوے شکایات کی پٹاری بند کی تو انہوں نے عذر تراشا تھا۔

"آپ کی کوئی ٹوٹی ٹانگ نہیں ہے' معمولی سا لنگ ہے' جس کو آپ نے سر پر سوار کر رکھا ہے۔ کتنا اچھا موقع تھا' آپ بھی سعد بھائی کے ساتھ آ جاتیں' لیکن ہم سے ملنے کو آپ کا دل کرتا تو آتیں نا' بس میں بھی ابھی آپ سے ملنے نہیں آؤں گی۔" اس کی ناراضی کسی طور کم نہ ہو رہی تھی۔

"میری شادی پر بھی نہیں آؤ گی۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"سچ نگی باجی! آپ کی شادی ہو رہی ہے؟" وہ ناراضگی بھول بھال کر چیخی۔

"دھیرج ماما' دھیرج' اتنا ایکسائٹڈ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔" وہ ہنسی تھیں۔

"مطلب؟" اس نے وضاحت چاہی۔

"مطلب یہ کہ ابھی بہت سے حل طلب مسئلے سلجھانا باقی ہیں ماما۔"

"کیسے مسئلے نگی باجی!" وہ ان کا مسئلہ کچھ کچھ جان چکی تھی مگر ان کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔

"سب سے بڑا مسئلہ تو تمہاری تائی جان ہیں' وہ کہتے ہیں نا میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی لیکن ہمارے کیس میں تمہاری تائی جان قاضی کا کردار ادا کر رہی ہیں اور فی الحال ان کا کردار اتنا مضبوط ہے کہ ہماری محبت کی بیل محبت ہونے کے باوجود منڈھے نہیں چڑھ رہی۔"

نگی باجی نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔ ان کا اشارہ کس جانب تھا وہ بخوبی سمجھ گئی تھی وہ محبت کرنے والے دل صرف اس لیے ایک نہ ہو سکتے تھے کہ درمیان میں تائی جان کا وجود ظالم سماج بن کر کھڑا تھا۔ انوکھا ظالم سماج جو خود دل و جان سے یہ شادی کروانا چاہتا تھا' لیکن سعد کو ان سے کتنی شدید قسم کی چڑ تھی اس بات کا اندازہ وہ وہاں گزارے گئے چند دنوں میں بخوبی لگا چکی تھی۔

نگی باجی سے محبت کرنے کے باوجود سعد ان کی محبت کو پذیرائی اسی لیے نہیں بخش رہا تھا کہ وہ تائی جان کی بیٹی تھیں حالانکہ دونوں کے درمیان غضب کی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ نگی باجی کی آنکھیں سعد کو دیکھ کر چمکنے لگتی تھیں اور سعد بھی ان کی کوئی بات نہ ٹالتا تھا۔ دونوں کی دلچسپیاں مشترک تھیں' مشاغل یکساں تھے۔ مکمل ذہنی ہم آہنگی' بے مثال دوستی مگر پھر بھی دونوں کے ایک ہونے میں رکاوٹ تھی۔

"انسان محبت میں محبوب کی بڑی سے بڑی خطا معاف کر سکتا ہے تو محبوب کی ماں کے ماضی کے ناروا رویے کو کیوں نہیں بھلا سکتا۔ میں سعد بھائی کو سمجھاؤں گی نگی باجی کہ صرف تائی جان کی ضد میں اپنے دل کی خوشی سے منہ نہ موڑیں۔"

اس نے دل ہی دل میں نگی باجی کو مخاطب کرتے ہوئے سعد سے اس موضوع پر بات کرنے کا مصمم ارادہ کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

صفیہ ماسی نے سعد کو رات کے کھانے پر مدعو کر لیا تھا' جب کہ اس کا پروگرام آج سعد کے ساتھ سیر سپاٹے کا تھا۔ ایک دن بعد اس نے واپس چلے جانا تھا اور وہ ابھی تک سعد سے نگی باجی کے بارے میں بات نہ کر پائی تھی۔ مدحت نے سعد کی وجہ سے کالج سے دو دن کی چھٹی لے لی تھی۔ اسے اکیلے میں اس سے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ اب بھی مدحت اور سعد پرانے البمز کھولے پرانی باتیں اور قصے دہرا رہے تھے کہ زارا بھابھی کا فون آ گیا۔

"کھانا تیار ہے' بس تم لوگ پہنچ جاؤ اب۔ پلاؤ کی بھاپ نکل گئی تو مزا نہیں رہے گا۔"

"کیا کچھ بنایا ہے زارا بھابھی؟" اس نے ندیدے پن سے پوچھا۔

"مٹن پلاؤ' چکن ہانڈی' کباب' کوفتے اور کھیر۔" زارا بھابھی نے بتایا تھا۔

"زبردست' ہم بس پہنچ رہے ہیں زارا بھابھی۔" اس کے منہ میں پانی آ گیا تھا۔ بھوک بھی تو زوروں کی لگ رہی تھی۔

دوپہر کو مدحت نے سعد کی فرمائش پر کھانا بنایا تھا اور سعد صاحب نے فرمائش بھی کی تو بگھارے بینگن کی اور بینگن تو ماما کے حلق سے نیچے نہ اترتے تھے۔ اس

وقت تو مروت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مدحت اور سعد کا ساتھ دیتے ہوئے چند نوالے کھا لیے تھے مگر اب پیٹ میں چوہوں کی دوڑ جاری تھی۔ زارا بھابھی کا فون سن کر اس نے لاؤنج میں جھانکا۔

"زارا بھابھی کا فون آیا ہے ماما وہ کہہ رہی ہیں کھانا تیار ہے اور تم لوگ ابھی تک پہنچے نہیں۔"

"واقعی دیر ہو گئی ہے۔ یوں عین کھانے کے وقت جانا اچھا نہیں لگتا۔" مدحت نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تھی۔

"میں بس فریش ہو کر چینج کر لوں پھر چلتے ہیں۔" سعد اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا مطلب ہے سعد بھائی ابھی آپ نے چینج بھی کرنا ہے۔ بس دو قدم کے فاصلے پر ماموں کا گھر ہے۔"

"لڑکی! تو اس casual (عام) حلیے میں ہی چلا جاؤں۔" سعد نے اسے گھورا وہ اس وقت ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔

"تو پھر کیا ہوا سعد بھائی! آپ نے کون سا کسی بر دکھوے کے لیے جانا ہے' ایسے ہی شاندار لگ رہے ہیں۔"

"ماہا! اتنی بحث کیوں کرتی ہو۔ سعد سے پوچھ کر اس کے کپڑے پریس کر دو۔" مدحت ایک دم اس پر خفا ہو گئی تھیں۔ سعد نے بڑی مشکلوں سے ہنسی ضبط کی تھی۔

"آپ نے میری ماما پر پورا پورا قبضہ جما لیا ہے سعد بھائی! جب سے آپ آئے ہیں' لگتا ہی نہیں کہ یہ میری بھی ماما ہیں۔ دیں کپڑے میں پریس کر دوں۔"

وہ منہ بسورتے ہوئے کہتی لاؤنج سے باہر نکلی۔ پیچھے مدحت اور سعد ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے تھے۔

☼ ☼ ☼

زارا بھابھی کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔ انہوں نے نہایت مزیدار اور پر تکلف ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ ولید کے علاوہ سب ہی موجود تھے۔ اس کے کسی دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا' وہ اس کی عیادت کے لیے گیا ہوا تھا۔ ڈنر کے بعد سعد اور فرہاد بھائی باہمی دلچسپی کے موضوعات پر گفتگو کرنے لگے تھے' صفیہ مامی' مدحت کو لے کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئیں جبکہ وہ زارا بھابھی کے ساتھ مل کر کچن سمیٹنے لگی۔

"احمد سو رہا ہے' کچن میں سمیٹ لوں گی۔ تم سب سے پوچھ کر ان کی فرمائش کے مطابق چائے' کافی بنا کر سرو کر دو۔" زارا بھابھی کھانا بے شک لاجواب پکاتی تھیں لیکن انہیں چائے' کافی بنانے سے چڑ تھی سو یہ مشکل کام اس کے سپرد کر دیا اور سب سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی سب کی پسند سے وہ بخوبی آگاہ تھی' سو ایک ٹرے میں فرہاد بھائی کی گرین ٹی اور سعد کی کافی کا مگ سجا کر انہیں دے آئی۔

پھر صفیہ مامی اور ماما کی چائے بنا کر انہیں دینے چل پڑی لیکن صفیہ مامی کے بیڈ روم سے آتی ماما کی آواز نے ایک دم سے اس کے قدم جکڑ لیے تھے۔

"جب اس نے ماہا کے لیے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو یقین مانیں صفیہ بھابھی! خوشی کے مارے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔"

"ہائیں! میرے لیے کس نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔" وہ حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگی۔ فطری تجسس نے غیر اخلاقی راہ اپنانے پر مجبور کر دیا۔ یہاں کسی کے آنے کا فی الحال کوئی چانس نہ تھا' سو اطمینان سے دروازے سے کان لگا کر ساری بات سن سکتی تھی۔

"سچ بتاؤں مدحت! میں جب کل تمہاری طرف آئی تھی اور تم نے سعد سے میرا تعارف کروایا تو میرے ذہن میں بھی پہلی بات یہ ہی آئی تھی۔ کیسا بانکا جوان ہے۔ اپنی ماہا کے ساتھ خوب جچے گا پھر ایسی سلجھی ہوئی شخصیت۔ میں تو کسی بندے سے دس منٹ بات کر لوں تو اس کے مزاج کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ تمہاری خوش قسمتی کہ ایسے نیک بخت بچے نے ماہا کے لیے دست سوال دراز کیا ہے۔" صفیہ مامی نے جیسے اس کی سماعتوں پر بم گرایا تھا۔ چائے کی ٹرے اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچی تھی۔

"صحیح کہہ رہی ہیں بھابھی آپ' لیکن فی الحال سعد نے یہ سب ماہا کو بتانے سے منع کیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ماہا کو سکون سے اپنا ماسٹرز مکمل کرنے دیں بلکہ ہنس رہا تھا کہ ماہا ابھی تھوڑی سی بے وقوف اور امیچور ہے' جانے اس خبر پر کیا ری ایکشن دے۔ میں چاہتا تو آپ سے یہ بات کچھ ٹھہر کر بھی کر سکتا تھا لیکن پھر مجھے یہ خدشہ ستایا کہ اس دوران آپ ماہا کے لیے کسی اور کا نہ سوچ لیں۔"

مدحت خوشی سے چور لہجے میں انہیں سعد کے فرمودات سے آگاہ کر رہی تھیں' مگر اس میں مزید سننے کی تاب نہ تھی۔ ٹرے لیے پلٹی تھی کہ مدحت نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ جلدی سے بولی۔ تبھی انہیں یہ خدشہ ستا رہا ہو گا کہ کہیں اس نے کچھ سن تو نہیں لیا۔

"یہ لیجیے گرم گرم چائے۔" اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ دل کے اندرونی تاثرات چہرے پر نہ آنے پائیں اور اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئی۔

مدحت اور صفیہ نے مطمئن سا ہو کر گفتگو کا کوئی اور موضوع چھیڑ دیا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد ان کے پاس بیٹھی رہی پھر اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہو گیا تھا۔ نگی باجی کلیہ قصور کہ وہ تائی جان کی بیٹی ہیں۔ اب اتنا بھی برا نہیں تھا کہ سعد ان کی محبت سے منکر ہو جائے اور اس پر مستزاد یہ کہ مدحت سے اس کا رشتہ بھی مانگ لیا۔

"سعد بھائی آپ آخری بندے تھے جن سے میں اس بات کی توقع کر سکتی تھی۔"

حیرت اور صدمے سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ جانے ان کے اس عمل کے پیچھے اس کی کیا سوچ کارفرما تھی۔ کہ مدحت سے اس کی بے پایاں محبت کا اظہار تھا' جنہیں وہ اپنی ماں کی جگہ قرار دیتا تھا۔ ان کی بیٹی سے شادی کر کے وہ ان کے شانوں پر دھرا بوجھ ہٹانا چاہتا تھا۔ بچپن کی ان عنایات کا بدلہ جو مدحت اس پر کر چکی تھیں یا وہ صرف اور صرف تائی جان سے بدلہ لینا چاہتا تھا' جب ہی اس نے اسی "مجبور" اور "بے وقوف لڑکی" کا انتخاب کیا۔ تائی جان کی پلاننگ سمجھ سکتی تھی کہ وہ سعد کو نگی کے لیے محفوظ کرنا چاہتی تھیں' اسی لیے مدحت کو مسلسل سعد کے متعلق بدگمان کرتی رہیں تو یہ بات سعد کی سمجھ میں کیوں نہ آئی ہو گی اور وہ ان کا یہ خدشہ درست ثابت کر کے ان سے انتقام لینے چلا تھا۔ سعد کے دماغ میں کیا تھا' وہ نہیں جانتی تھی مگر سعد کے دل میں کون تھا' وہ بخوبی جانتی تھی۔

"میں ایسا کیا کروں کی باجی کہ سعد بھائی اپنی فضول خواہش ترک کر کے اپنے دل کی آواز پر کان دھریں۔" اس نے بے بسی سے سوچا تھا مگر فی الحال دماغ اس کی کسی قسم کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔

☼ ☼ ☼

سعد کی آج واپسی تھی۔ وہ صبح ناشتے کے بعد واپسی کے لیے نکل رہا تھا مگر مدحت نے زبردستی لنچ تک روک لیا تھا اب وہ اس کے لیے زبردست سا لنچ تیار کر رہی تھیں۔ ماہا نے مارے باندھے کچن کے دو چار کاموں میں ان کا ہاتھ بٹایا تھا پھر لاؤنج میں آ کر ٹی وی کھول کر بیٹھ گئی۔ سعد ظہر کی نماز پڑھنے قریبی مسجد تک گیا تھا۔ اتنے میں دروازے پر بیل ہوئی تھی۔ گھنٹی بجانے کے انداز سے ہی اس نے پہچان لیا تھا کہ ولید آیا ہے اور دروازہ کھولنے پر اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ سامنے ولید کھڑا دانت نکوس رہا تھا۔

"کیا ہوا دماغ پر گرمی تو نہیں چڑھ گئی' بلاوجہ مسکرا رہے ہو۔" ماہا نے اسے گھورا تھا۔

"خیر مسکرانے کی تو بڑی ٹھوس وجہ ہے میرے پاس۔" وہ ہنستے ہوئے اندر چلا آیا تھا۔

"یہ بتاؤ تمہارے گھر ایک الو آیا ہوا ہے' کہیں اس کی واپسی تو نہیں ہو گئی۔" اس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"سعد بھائی نماز پڑھنے گئے ہیں۔ کھانے کے بعد

جائیں گے۔" وہ سمجھ گئی تھی کہ ولید کا اشارہ کس طرف ہے۔

"شکر ہے وہ ابھی نہیں گئے۔ ان سے ملنے کا بہت اشتیاق ہو رہا ہے مجھے۔"

"کس خوشی میں۔" اس نے اسے گھورا۔

"بس ویسے ہی بڑی تعریفیں سنی ہیں محترم کی۔ بقول زارا بھابھی ایسی شاندار پرسنالٹی والا بندہ کم کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ میں نے سوچا میں بھی دیکھ لوں، کہیں بعد میں حسرت ہی نہ رہ جائے۔"

ولید کی معنی خیز سی ہنسی نے ماہا کو ساری بات سمجھا دی تھی۔ یقیناً" زارا بھابھی کے پیٹ میں سعد کے پروپوزل والی بات نہ رہ پائی ہو گی۔ انہوں نے یہ بات ولید کے سامنے اگل دی ہو گی لیکن ساتھ اسے قسم بھی دی ہو گی کہ وہ ماہا کے سامنے یہ ذکر نہ چھیڑے۔ زارا بھابھی کی عادت سے وہ بخوبی آگاہ تھی۔ باوجود شدید غصے کے اسے ہنسی آ گئی۔

"ابھی دو منٹ پہلے تم مجھے بلاوجہ مسکرانے پر ٹوک رہی تھیں، اب خود بغیر کسی بات کے ہنس رہی ہو، خیریت تو ہے۔" ولید نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مسکرانے کی تو خیر بڑی ٹھوس وجہ ہے میرے پاس۔" اس نے ولید کا فقرہ اسی کو لوٹا تھا۔

"مگر یعنی تم جانتی ہو کہ۔" ولید کا فقرہ ادھورا رہ گیا تھا۔ سعد اندر داخل ہو رہا تھا۔ ایک دم سے ماہا کے زرخیز ذہن میں کوندا سا لپکا تھا۔

"لو آ گئے سعد بھائی! جن سے ملنے کا تمہیں اتنا اشتیاق ہو رہا تھا۔" اس نے ولید کو مخاطب کیا۔ ولید اسے نظر بھر کر گھورنے پر ہی اکتفا کر پایا تھا، پھر اٹھ کر سعد سے ہاتھ ملایا۔

"آپ؟" سعد نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے تعارف چاہا۔

میں تعارف کرواتی ہوں سعد بھائی! یہ ولید ہے، میرا کزن، دوست اور۔" وہ بات کرتے کرتے رکی تھی۔

"اور؟" سعد نے مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔

"اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے سعد بھائی اگر یہ تھوڑا سا سیریس ہو جائے۔"

"میرا مطلب ہے کہ یہ جتنا سیریس میرے ساتھ ہے اپنی اسٹڈی اور کیریئر کے ساتھ بھی اتنا سیریس ہو جائے۔" اس نے اطمینان سے بات مکمل کی تھی۔

ولید کے حواسوں پر تو جیسے کسی نے ایٹم بم چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہکا بکا ماہا کی شکل دیکھنے لگا۔

"پلیز ولید! اپنی چونچ بند رکھنا۔" اس نے ایک ترچھی نگاہ ولید پر ڈال کر سعد کی جانب دیکھا جو واضح طور پر یہ خبر سن کر چونکا تھا۔

"اب دیکھیں فائنل سمسٹر سر پر ہیں مگر انہیں دوستیاں نبھانے سے ہی فرصت نہیں۔ مجھے ڈر ہے اگر ان کی یہ غیر سنجیدگی برقرار رہی تو ماما میرے متعلق سنجیدگی سے کچھ اور ہی سوچنے پر مجبور نہ ہو جائیں۔" وہ اس مزے سے سعد کے سامنے اظہار خیال کر رہی تھی جیسے سعد اس کی پکی سہیلی ہو۔

"بہت خوشی ہوئی ولید آپ سے مل کر۔ کل آپ کے گھر ڈنر پر گئے تھے، وہاں آپ کا تذکرہ سنا تھا، مدحت چچی کے منہ سے بھی آپ کے متعلق سنا تھا۔ چلو جانے سے پہلے ملاقات بھی ہو گئی۔"

اگر ماہا غضب کی اداکارہ تھی تو سعد بھی کم نہیں تھا، بہت مہارت سے اپنے تاثرات چھپا کر خوش دلی سے ولید سے مل رہا تھا۔ صرف ولید تھا جو اب تک ماہا کے کیے گئے انکشاف سے نہ سنبھلا تھا۔ اتنے میں ہی سعد کے موبائل کی ٹون بجی تھی۔ "ایکسکیوز می" وہ معذرت کر کے اور اپنے کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

"تم کیا چیز ہو ماہا۔" ولید دانت کچکچاتے ہوئے ماہا کی طرف پلٹا تھا۔

"سعد بھائی کے سامنے خاموش رہنے کا شکریہ۔" وہ مسکرائی تھی۔

"تم نے اپنے دودھ شریک بھائی کو اپنا منگیتر بنا ڈالا۔ غضب خدا کا ماہا! تمہارا تو ایمان بھی خطرے میں پڑ گیا۔ کلمہ پڑھو فوراً۔"

ولید کے کہنے پر ایک لمحے کو تو وہ خود بھی سٹپٹائی تھی، زیر لب کلمہ بھی پڑھ لیا۔ ولید حقیقتاً" اس کا رضاعی بھائی تھا، جب ماہا دو مہینے کی تھی تو مدحت میکے رہنے آئی تھیں اور فوڈ پوائزننگ کی وجہ سے انہیں دو دن کے لیے ہاسپٹلائز ہونا پڑا تھا، تب مجبوراً "صفیہ کو (جن کی گود میں ڈیڑھ برس کا ولید تھا) ماہا کو دودھ پلانا پڑا تھا کہ وہ فیڈر کو منہ ہی نہ لگاتی تھی۔ صفیہ مامی کا یہ تعلق آج تک نہ گیا تھا ورنہ شاید ماہا ہی ان کی دوسری بہو بننے کا اعزاز حاصل کرتی۔

"اگر مدحت پھوپھو کو پتا چلے کہ تم نے سعد کے سامنے کیا بکواس کی ہے تو وہ تمہارا گلا دبا دیں گی۔ تم جانتی ہو۔ وہ تمہارے اور سعد کے بارے میں کیا سوچے بیٹھی ہیں۔" ولید کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اس بے وقوف لڑکی کی کس طرح سے عقل ٹھکانے لگائے۔

"میں جانتی ہوں ولید۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچے بیٹھی ہیں، اس لیے مجھے یہ طرز عمل اپنانا پڑا۔" اس کے اطمینان میں ہنوز فرق نہ آیا تھا۔

"بے وقوف ہو تم ماہا! ایسا شاندار بندہ خود اپنے ہاتھوں سے گنوا رہی ہو۔ ہم سب مل کر بھی کوشش کریں تو تمہارے لیے ایسا شخص نہیں ڈھونڈ سکتے تھے۔" ولید کا افسوس کسی طور کم نہ ہو رہا تھا۔

"تم لوگ میرے لیے اس سے کچھ کم شاندار بندہ بھی ڈھونڈو گے تو مجھے کچھ ملال نہ ہو گا۔ یہ شاندار بندہ کسی اور کا نصیب ہے ولید۔" وہ صرف سوچ ہی پائی تھی کہ سعد فون سن کر واپس آ گیا تھا۔

"ولید! تم تھوڑی دیر سعد بھائی کو کمپنی دو۔ میں دیکھتی ہوں، کچن میں ماما کو کتنی دیر ہے۔ تم بھی کھانا کھا کر جانا۔"

اس نے ولید کو مخاطب کیا تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے ایک بار پھر چپ رہنے کی التجا کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سعد کو واپس گئے کتنے ہی دن ہو گئے تھے وہ منتظر تھی کہ کب سعد مدحت کو معذرت کا فون کرتا ہے اپنی جلد بازی میں اس نے ماہا کے لیے دست سوال بلند کیا حالانکہ اس کی اور نگی کی پرانی کمٹمنٹ تھی لیکن اس کا انتظار، انتظار ہی رہا۔ مدحت کو فون ضرور کرتا لیکن کبھی بھی اس سے بات کرنے کے بعد مدحت کے چہرے پر تفکرات کے سائے نمودار نہ ہوتے بلکہ ہر بار وہ ماہا کو پہلے سے زیادہ مطمئن اور آسودہ لگتیں۔

ماہا کی جھنجلاہٹ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ "میں ماما کو سب کچھ بتا دوں گی۔ ماما ہرگز بھی اتنی ظالم نہیں کہ ساری بات جان کر بھی سعد کا پروپوزل قبول کر لیں۔" وہ دل میں ارادہ باندھتی مگر زندگی میں پہلی بار مدحت اتنی مطمئن اور خوش لگتیں کہ ماہا کی ان سے بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی۔

"چلو ماما کون سا مجھے ابھی سعد بھائی کے سنگ رخصت کرنے لگی ہیں۔ کسی مناسب وقت پر ماما کو بتا دوں گی سب۔"

اس نے یہ مشکل کام آئندہ پر ٹال دیا اور ساری توجہ پڑھائی کی جانب مبذول کر دی کہ انہی سوچوں کے تانے بانے میں الجھتے ہوئے پڑھائی کا بہت حرج ہو چکا تھا اور سیکنڈ سمسٹر سر پر تھا۔ وہ سب کچھ بھلا کر پڑھائی میں جت گئی تھی۔ کتنے ہی دن اس طرح گزر گئے تھے پھر ایک شام فون پر نگی باجی کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"یونیورسٹی سے چھٹیاں لے لو، اچھے اچھے کپڑے سلوا لو۔ تمہیں عنقریب میری شادی میں آنا ہے اور ہاں اس بار مدحت چچی کو بھی ساتھ لانا ہے۔"

"آپ کی شادی؟ سچ نگی باجی۔" وہ چیخ ہی تو پڑی۔

"بالکل سچ۔" وہ فون پر بھی نگی باجی کا مسکراتا لہجہ محسوس کر سکتی تھی۔

"بہت بہت مبارک ہو نگی باجی۔" اس کے سر سے جیسے منوں ٹنوں کے حساب سے دھرا وزن سرک گیا تھا۔

"ویسے وہ کیسے مانے نگی باجی! پچھلی بار آپ کچھ بتا تو رہی تھیں کہ کوئی مسئلہ ہے۔" اس نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"وہ کون تمہارے ہونے والے بہنوئی؟" نگی نے

لطف لیتے ہوئے پوچھا۔ "ارے وہ تو ہمیشہ سے مانے ہوئے تھے۔ مسئلہ صرف امی کا تھا لیکن سہیل بھائی اور ابو بیچ میں پڑے، بس پھر سب کچھ سیٹ ہو گیا۔" نگی نے اطمینان سے بتایا تھا۔

"بہت اچھی بات ہے۔" وہ بھی دل ہی دل میں مسکرائی۔ جانتی تھی سعد نگی باجی کی طرف کیسے پلٹا۔ بہرحال اب سب کچھ سیٹ ہو گیا تھا۔ اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

"بس تم لوگ تیاری پکڑو۔ دو چار دن میں باقاعدہ دعوت نامہ بھی مل جائے گا بلکہ ہو سکتا ہے امی خود ہی مدحت چچی کو فون کریں۔ تم لوگوں نے ضرور آنا ہے۔"

"ضرور آئیں گے نگی باجی۔" اس نے مسکراتے ہوئے فون رکھ دیا۔ جو کام اتنا مشکل لگ رہا تھا وہ اتنی آسانی سے ہو جائے گا اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ہاں ماما کو اس خبر پر ضرور دھچکا لگے گا۔ اسے سعد کی کم ہمتی پر غصہ بھی آیا۔ کم از کم ماما کو تو اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔ چلو خیر ہے، میں امی کو سمجھا دوں گی، میری کون سی عمر نکلے جا رہی ہے جو امی یہ خبر ملنے پر سر پکڑ کر بیٹھ جائیں گی۔ اس نے خود کو تسلی دی اور ایک ہفتے بعد کی بات تھی۔ وہ یونیورسٹی سے لوٹی تو مدحت نے اسے ایک کارڈ تھمایا تھا۔

"نگی کی شادی کا کارڈ آیا ہے۔ پندرہ دن بعد شادی ہے۔ تب تک تو تمہارے پیپرز بھی ختم ہو جائیں گے پھر تو چھٹیاں ہی ہوں گی تمہاری۔ میں بھی کل ہی چھٹیوں کے لیے اپلائی کر دیتی ہوں۔ سہیل کی شادی میں تو نہ جا سکی تھی لیکن نگی کی شادی میں تو جانا چاہیے۔ ابھی تمہاری تائی کا بھی فون آیا تھا؟ بہت اصرار سے ہم دونوں کو بلا رہی تھیں۔"

"تائی جان کی دلی مراد پوری ہو گئی ہے ماما! ظاہر ہے اب انہیں آپ سے یا مجھ سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے اسی لیے فراخدلی سے دعوت بھی دے رہی ہیں۔" وہ خود کو سوچنے سے باز نہ رکھ پائی تھی لیکن اصل حیرت اسے مدحت کے رویے پر ہو رہی تھی۔ "یقیناً سعد نے ماما کو اعتماد میں لے لیا ہو گا۔" ان کے اطمینان سے اس نے یہی نتیجہ اخذ کیا لیکن جیسے ہی کارڈ کھول کر عبارت پر نگاہ دوڑائی چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ لگا۔

"یہ عباد الرحمن کون ہیں نگی باجی۔" جیسے ہی مدحت ادھر ادھر ہوئیں اس نے نگی باجی کو فون کھڑکا دیا تھا۔

"تمیز سے لڑکی! اپنے ہونے والے بہنوئی کا کس مزے سے نام لے رہی ہو۔" نگی نے اسے ہنستے ہوئے ٹوکا۔

"ہونے والا بہنوئی یعنی۔" وہ ہکلائی تھی۔

"بہن کا میاں بہنوئی ہی ہوا نا۔ چلو تم جیجا جی کہنا چاہو تو کہہ لینا۔ اگرچہ مجھے یہ لفظ اتنا پسند نہیں۔" نگی نے اسے رعایت دی تھی۔

"لیکن نگی باجی آپ تو کہہ رہی تھیں کہ۔" اسے سمجھ نہ آیا کہ اسے کیسے اپنا مافی الضمیر سمجھائے۔

"یار! میں نے تمہیں تفصیل سے بات بتائی ہی کب تھی۔ ہماری لو اسٹوری میں اتنے پیچ و خم آئے ہیں کہ مجھے تو دھڑکا ہی لگا رہتا تھا کہ یہ محبت اپنے انجام کو پہنچنے کی بجائے راستے میں ہی ٹائیں ٹائیں فش ہو جائے گی۔ امی مان کر ہی نہیں دے رہی تھیں۔ بہت مشکل سے اور سہیل بھائی کی مدد سے امی کو راضی کیا ہے۔ ویسے میں جتنا مرضی لڑتی جھگڑتی، لیکن ان کی مرضی کے بغیر اس گھر سے رخصت ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ جیسی بھی ہیں، ہیں تو میری ماں نا۔" نگی جانے کیا کیا کہہ رہی تھی اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔

"تم آ رہی ہو نا۔ تمہیں سب کچھ بتاؤں گی۔ آؤ گے نا تم لوگ؟" انہوں نے بہت محبت اور مان سے پوچھا تھا۔

"آئیں گے نگی باجی۔" اس نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں یاد دہانی کروائی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اس بار بھی بس ٹرمینل پر سعد ہی لینے آیا تھا لیکن اس بار وہ اکیلی نہیں تھی مدحت بھی اس کے ہمراہ تھیں۔ نگین کی شادی تو شاید بہانہ تھی، مدحت سعد کی وجہ سے ہی یہاں آنے پر رضامند ہوئی تھیں۔ اب بھی سعد شگفتگی سے مسکراتے ہوئے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے مدحت سے محو گفتگو تھا۔

"کیا ہوا ملیحہ! اتنی خاموش کیوں ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" بہت دیر سے خاموش بیٹھی ملیحہ کو وہ مخاطب کرنے سے خود کو روک نہ پایا وہ جو اپنے ہی دھیان میں بیٹھی تھی یکدم چونک گئی۔

"ٹھیک ہوں بس ذرا سفر کی تھکن ہے۔" اس نے دھیمے سے لہجے میں عذر تراشا۔

"چلو گھر جا کر خوب ریسٹ کرنا۔"

"آپ جا کہاں رہے ہیں۔" اس نے ایک دم غور کیا تھا گاڑی کسی انجان راستے پر رواں دواں تھی۔

"گھر جا رہے ہیں اور کہاں۔" وہ مسکرایا۔

"لیکن یہ راستہ تو گھر کی طرف نہیں جاتا۔"

"میرے گھر کی طرف تو یہی راستہ جاتا ہے۔"

"سعد کو کمپنی کی طرف سے فرنشڈ اپارٹمنٹ ملا ہے۔ کچھ دنوں پہلے ہی یہ وہاں شفٹ ہو گیا ہے۔" مدحت نے بیٹی کی الجھن رفع کی تھی۔

"شفٹ ہونے کو تو بہت پہلے بھی ہو سکتا تھا چچی! بس نگین کی ناراضی کے خیال سے رکا رہا لیکن اب جب اس گھر سے میرا واحد خیر خواہ بھی رخصت ہو رہا ہے تو میرے وہاں کا کوئی جواز نہیں بنتا۔" سعد نے مدحت کو مخاطب کیا۔

"لیکن مجھے تو نگی باجی کے پاس جانا ہے۔" اس نے سعد کی بات تقریباً کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

"مدحت چچی کو گھر چھوڑ دوں پھر تمہیں نگی کے پاس چھوڑ آؤں گا۔" سعد نے اس کے بدتمیز لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے رسانیت سے کہا تھا۔

"شام کو آرام سے چلیں گے۔ ظاہر ہے ان کی شادی میں آئے ہیں وہاں جانا ہی ہے۔"

مدحت نے اسے تنبیہی نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا تھا۔ وہ آگے سے کچھ نہ بولی۔ اپنی دلی کیفیات وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ بس جلد از جلد نگی باجی سے ملنا چاہتی تھی لیکن ان سے ملنے کے لیے ابھی کچھ انتظار باقی تھا۔ اس نے تھک ہار کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

☆ ☆ ☆

سعد کے ساتھ ڈھلتی ہوئی شام کے وقت وہ "حبیب ہاؤس" پہنچے تھے۔ خلاف توقع تائی جان بہت اچھی طرح ملیں بلکہ سہیل بھائی کی شادی کے برعکس کچھ گھبرائی ہوئی اور بوکھلائی ہوئی بھی لگیں۔ شاید بیٹی کی شادی کا معاملہ تھا اور شادی بہت اچانک طے پائی تھی۔

"عباد کی دونوں بہنیں امریکہ سے آئی ہوئی ہیں۔ اسی مہینے ان کی واپسی ہے۔ بس اسی لیے افراتفری میں شادی کی تاریخ رکھنا پڑ گئی۔ جب سے ڈیٹ فکس ہوئی ہے میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں۔ لڑکے بھائی کا تو تمہیں پتا ہے، پیسے ہاتھ پر رکھ کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ سہیل کی شادی میں بھی یہی ہوا تھا لیکن بھئی جب تو بیٹے کی شادی تھی اور پیسہ ہاتھ میں ہو تو بری تو کھڑے پاؤں بھی تیار کی جا سکتی ہے مگر جہیز میں صرف کپڑے لتے تھوڑی ہوتے ہیں، سو طرح کی چیزیں اکٹھی کرنا ہیں حالانکہ عباد کے گھر والے بار بار منع کر رہے ہیں کہ انہیں کچھ نہیں چاہیے لیکن میری تو اکلوتی بیٹی کی شادی ہے، میں تو سارے ارمان پورے کروں گی۔"

تائی جان کو اب بھی ان کا حال احوال لینے سے کوئی غرض نہ تھی۔ وہ اپنی ہی کہے جا رہی تھیں۔ شاید دھیان سے ان کی باتیں سن بھی نہ رہی تھیں۔ وہ پیاسی نگاہوں سے اس گھر کے در و دیوار کو دیکھ رہی تھیں۔ کتنی یادیں جڑی تھیں ان کی اس گھر سے۔ بے شک گھر میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں پھر بھی یہاں آنے کے بعد ان کے دل کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ ملیحہ نے ایک نگاہ ان کے چہرے پر ڈالی، وہ ان کی ذہنی کیفیت سمجھ سکتی تھی۔ تائی جان کو البتہ ان کی ذہنی کیفیت سے کوئی سروکار نہ تھا۔

"لاکھوں میں ایک ہے میری بچی۔ کیا ہے جو پاس

میں ذرا سا نقص ہے۔ لیکن تم عباد الرحمٰن کو دیکھو گے تو جی جل کر خاک ہو جائے گا کم از کم دس سال تو بڑا ہے نگی سے اور اتنے واجبی سے نقوش۔ مجھے تو صرف نگی کی خود سری کی وجہ سے یہ دن دیکھنا پڑا ہے۔ اگر نگی کا دماغ نہ ہوتا تو جب عباد الرحمٰن کی بہنیں رشتہ مانگنے آئیں تھیں تب ہی کھری کھری سنا کر واپس بھیج دیتی۔ میری تو راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں کہ شادی والے دن لوگوں کی نگاہوں کا سامنا کیسے کروں گی۔ بی بی صاحبہ تو مزے سے رخصت ہو جائیں گی لوگوں کی طنزیہ باتیں تو مجھے ہی سننا پڑیں گی نا!"

"شکل و صورت اچھی بری ہونے سے کیا ہوتا ہے بھابھی! باطن پر نگاہ ڈالنا چاہیے۔" مدحت نے انہیں رسانیت سے سمجھانا چاہا تھا۔

"ارے اب ایسی دور بین جیسی نگاہ کہاں سے لائیں ہم ہمیں تو شکل و صورت ہی نظر آتی ہے۔ ایسا پکا رنگ ہے نگی کے دولہا کا کہ ہماری تو سات نسلوں میں کوئی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا تھا لیکن دیکھ لینا اس نگی کم بخت کے بچے کیسے کالے پیلے پیدا ہوں گے۔" ان کا ملال کسی طور کم نہ ہو رہا تھا۔ انہیں سمجھانا ہی فضول تھا سو مدحت بھی چپ چاپ ان کی سنے گئیں۔

"پہلے پتا ہوتا تو نگی کی بچی کی جاب چھڑوا دیتی۔ لوگوں کی زبانیں کون پکڑے گا۔ ہر کوئی یہ ہی کہے گا نہ منہ دیکھا نہ متھا فقط دولت پر ریجھ کر امیر کبیر باس کو پھانسا ہے نگی نے۔ اب میں کس کس کو بتاؤں گی کہ دونوں کی وہ مل گئی تھی کیا کہتے ہیں اسے مینٹل کیمسٹری۔" تائی جان کے انداز پر ماہا کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آ گئی۔

"چلو تم لوگ وقت سے آ گئے۔ مجھے کچھ سہارا ہو جائے گا۔ نگی کی شاپنگ ادھوری پڑی ہے۔ ماہا کے ساتھ مل کر مکمل کر لے گی میرے تو جوڑوں میں اتنا شدید درد ہے کہ چلنا پھرنا محال ہے۔"

"شازمہ بھابھی بھی تو ہیں۔" نگی باجی کے ساتھ شاپنگ کرنے پر قطعی اعتراض نہ تھا پھر بھی وہ کہے بنا نہ رہ پائی۔

"تمہاری شازمہ بھابھی کب اتنی اچھی ہیں کہ ہمارے کسی کام میں ہاتھ بٹائیں۔ ہم نے بھی بیچاری کے نخرے۔ تو لگتا ہے کوئی انوکھا بچہ پیدا کر رہی ہے بیڈ ریسٹ کے نام پر سارا دن بستر پر پڑی اینٹھتی رہتی ہے۔ اب پتا تھا کہ شادی کا گھر ہے کچھ کام دام کروانا پڑے گا تو اس کی ماں میکے لے گئی۔ ماں کی ہی شہہ ہے ساری۔ مجھے پہلے پتا ہوتا کہ اتنی بگڑی ہوئی لڑکی ثابت ہو گی تو کبھی بہو نہ بناتی۔"

تائی جان نے دل جلے انداز میں کہا۔ ماہا کے دل میں تھوڑی سی ٹھنڈک پڑی تھی۔ وہ یقیناً "ایسی ہی بہو کی مستحق تھیں۔ کوئی بے چاری سی لڑکی ان کی بہو بنتی تو انہوں نے اس کا ناک میں دم کر دینا تھا۔

"نگی باجی اب بھی آفس جاتی ہیں کیا۔" تائی جان شازمہ بھابھی کے متعلق مزید دکھڑے رو رہی تھیں کہ ماہا نے تنگ آ کر پوچھ ہی لیا۔

"ارے نہیں۔ آفس تو چھڑوا دیا اس کا۔ اب تو اپنی دوستوں کو کارڈ بانٹنے گئی ہے۔ آدھا شہر تو دوست ہے اس کا۔" انہوں نے بیزاری سے جواب دیا تھا۔

تھوڑی دیر میں نگی باجی کی واپسی بھی ہو گئی۔ انہیں دیکھ کر وہ بے تحاشا خوش ہوئی [illegible]۔ مدحت نے انہیں گلے لگا کر ڈھیروں دعاؤں سے نوازا تھا۔ ماہا نے ان کے چہرے پر [illegible] نہیں وہ کوئی سمجھوتا تو کرنے نہیں [illegible] لیکن ان کے چہرے کی چمک ماہا کے خیال کی نفی کر رہی تھی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد مدحت نے واپسی کی اجازت چاہی تھی۔

"لو یہ کیا بات ہوئی اب تم لوگوں نے یہاں ہی رہنا ہے۔ سو طرح کے صلاح مشورے کرنے ہیں مجھے تم سے۔ اپنی عقل تو میری ماؤف ہوئی پڑی ہے اور ماہا نگی کی شاپنگ مکمل کروائے گی۔" تائی جان اپنی غرض کے تحت انہیں روکنا چاہ رہی تھیں۔

"ہم کل پھر آ جائیں گے بھابھی۔" مدحت کا یہاں رکنے کا موڈ نہ تھا۔

"میں نگی باجی کے پاس ہی ٹھہروں گی۔" ماہا نے ماں کو آگاہ کیا۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔ چلیں مدحت چچی پھر ہم تو چلیں۔"

اس سے پہلے مدحت اسے کچھ کہتیں سعد نے فوراً "اس کا فیصلہ تسلیم کر لیا تھا اور مدحت کو اس کے یہاں رکنے پر تو کیا اعتراض ہونا تھا مگر اس کے انداز پر انہیں خوب ہی غصہ آ رہا تھا۔ وہ اس پر ایک خفگی بھری نگاہ ڈالتے ہوئے اٹھ گئی تھیں۔ ماہا نے نگاہیں چرا لیں۔

اور لگ رہا تھا وقت آج ٹھہر سا گیا ہے۔ بہت دیر بعد جب نگی باجی اور اسے تنہائی میسر آئی تو وہ اپنے ذہن میں کلبلاتا سوال ان سے پوچھے بنا نہ رہ پائی۔

"آپ خوش تو ہیں نا باجی۔"

"میں بہت خوش ہوں ماہا! عباد بہت نائس شخص ہیں۔ اتنی مشکلوں سے ہماری شادی ارینج ہوئی ہے کہ مجھے تو اب تک یقین ہی نہیں آتا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی تھیں۔

"تائی جان تو بہت خفا ہیں آپ سے۔ انہیں آپ کی چوائس بالکل پسند نہیں آئی۔" اس نے انہیں جتایا تھا۔

"امی صرف ظاہر دیکھتی ہیں ماہا! عباد کی خوب صورت سوچوں تک ان کی رسائی ہی نہیں۔ امی کو عباد کے لیے منانا میرے لیے دنیا کا سب سے مشکل کام ثابت ہوا۔ دنیا بھر کی ماؤں کی طرح ان کی خواہش تھی کہ ان کا داماد لاکھوں میں ایک ہو اور یقین کرو امی کے طرز عمل پر مجھے ان سے لاکھ اختلاف سہی مگر مجھے خوشی بھی تھی کہ وہ صرف میری ماں بن کر سوچ رہی ہیں۔ امی کو عباد کی دولت 'جائیداد' کاروبار سے کوئی غرض نہیں تھی لیکن بہرحال پاپا اور سہیل بھائی تو اسی لیے راضی ہوئے ہیں اور انہوں نے ہی امی کو منایا۔"

"تو عباد بھائی آپ کے باس تھے۔ آپ نے کبھی مجھے ان کے متعلق بتایا ہی نہیں۔" اس نے شکوہ کیا تھا۔

"مجھے اپنی لو اسٹوری منطقی انجام تک پہنچنے کی امید ہی نہ تھی۔ ورنہ کبھی یار لگتی تو تمہیں بتاتی نا!"

"آپ نے مجھے جب بھی فون کیا یہی کہا کہ سارا مسئلہ تمہاری تائی جان کا ہے اور میں سمجھی کہ تائی جان کی وجہ سے سعد بھائی آپ سے شادی پر رضامند نہیں ہو رہے۔"

"سعد کا کیا ذکر یہاں؟" نگی حیران ہوئی۔

"میں تو یہ ہی سمجھتی رہی نا نگی باجی کہ آپ اور سعد بھائی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔" اس نے اپنی بے وقوفی کا اعتراف کیا۔

"سعد میرا بچپن کا دوست ہے ماہا! ایک دوسرے کو ناپسند کرنے کی ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں لیکن تم نے اس پسندیدگی کو غلط معنی کیوں کر پہنائے۔" نگی کی حیرت کم نہ ہو رہی تھی۔

"میں نے خود آپ کی اور تائی جان کی باتیں سنی تھیں۔ تائی جان سے آپ نے خود کہا تھا کہ سعد بھائی کا ساتھ آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے جو تائی جان کی وجہ سے آپ کو نہیں مل سکتی۔" وہ اتنی الجھی ہوئی تھی کہ نگی کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔

"او گاڈ! پتا نہیں تم نے کب امی اور میری باتیں سن لیں 'یہ سچ ہے ماہا کہ امی میرے ٹانگ کے نقص کی وجہ سے پریشان تھیں اور میرے لیے سعد انہیں ہر لحاظ سے پرفیکٹ لگتا تھا اور میری معذوری کے بعد ہی انہوں نے سعد کو توجہ دینا شروع کی تھی لیکن ان کی یہ خود غرضی میرا جی جلا کر خاک کر دیتی تھی۔ سعد کے ساتھ ماضی میں کیے گئے ناروا سلوک پر انہیں شرمندہ کرنے کی خاطر میں نے کوئی ایسی بات کر دی ہو گی لیکن اگر مجھے پتا ہوتا کہ میری لاپروائی سے کی ہوئی بات کو تم چھپ کر سنو گی اور سن کر اتنا سیریس ہو گی تو میں بولنے سے پہلے سو دفعہ سوچتی۔ بغیر کسی تحقیق کے تم نے کتنی جلد ایک غلط نتیجہ اخذ کر لیا۔"

نگی باجی نے اسے گھرکا تھا جبکہ اس کے پاس بولنے کو کچھ نہ بچا تھا۔ نگی کتنی دیر تک اسے غور سے دیکھتی رہی پھر مسکرا کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"میں تم سے دور تو نہیں تھی نا مجھ سے فون کر کے

وضاحت مانگ لیتیں۔ اتنے دن فضول میں خود بھی پریشان رہی اور اس شریف بندے کو بھی ٹینشن میں مبتلا کیے رکھا۔" اس نے جھجکتے سے سر اٹھا کر آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔

"یعنی آپ جانتی ہیں؟" حیرت کے مارے اس کے الفاظ بھی گم ہو گئے۔

"جی جناب میں جانتی ہوں سب کچھ۔" نگی نے پیار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی تھی۔

"سعد بے چارہ اپنے مستقبل کے بارے میں صحیح پریشان ہے تم جیسی جذباتی جلد باز اور احمق لڑکی کے ساتھ آخر کیسے گزارا ہوگا اس کا۔" نگی اس بار اسے چھیڑ رہی تھی۔

"اگر وہ اپنے مستقبل کے بارے میں اتنے ہی پریشان ہیں تو انہیں کس حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ ماما سے میرے بارے میں بات کریں۔" وہ خفا ہوئی تھی۔

"یہ بہت اچھا سوال ہے۔" نگی اس کے انداز پر ہنس پڑی تھی۔

"اس کا جواب یہ ہے ماہا ڈیئر کہ محبت میں انسان عقل پر سے اختیار کھو بیٹھتا ہے اور اس کیفیت میں اس سے ایسے بے وقوفانہ فیصلے سرزد ہو جاتے ہیں۔" نگی شرارت کے موڈ میں تھی۔

"پلیز نگی باجی میں سیریس ہوں۔" وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

"میں بھی سیریس ہوں جان اور سچ یہی ہے کہ سعد تم سے محبت کرنے لگا ہے۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا سچ اور اس سچائی کو تسلیم کر کے اس نے جو فیصلہ کن قدم اٹھایا ہے وہ اس کی زندگی کا سب سے بروقت اور خوب صورت فیصلہ ہے۔" نگی کے کہنے پر وہ ششدر رہ گئی تھی۔ کتنی دیر تک اسے بے یقین نگاہوں سے تکتی رہی۔

"آپ کو کس نے کہا کہ سعد بھائی مجھے پسند کرتے ہیں۔" اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ محبت کا لفظ زبان پر لاتے ہوئے عجیب جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔

"مجھ سے کسی نے نہیں کہا تھا ماہا حتیٰ کہ سعد نے بھی نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسے یاد کروانے والی تو میں ہی تھی کہ وہ تمہاری محبت میں گرفتار ہو گیا ہے اور اس نے شروع شروع میں یہ بات ہنس کر ٹال دی تھی کہ اسے اپنی دلی کیفیت کا خود بھی اندازہ نہ تھا لیکن تم خود ہی بتاؤ جب کوئی ہر وقت کسی کے خیال میں گم رہے۔ کسی کی بے وقوفیوں کو یاد کر کے لب آپ ہی آپ مسکرانے لگیں اور ہر وقت زبان پر اسی کا تذکرہ رہے تو یہ علامات کسی چیز کی نشان دہی کرتی ہیں۔"

"میں نے ایسی کون سی بے وقوفیاں کی تھیں جنہیں وہ یاد کر کے ہنستے تھے۔" اس نے ذرا سا برا مان کر پوچھا۔

"پہلی ملاقات میں سعد کو سہیل سمجھ کر تم نہیں لڑائی تھیں کیا؟" نگی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ وہ چپ رہی۔

"اسے چائے کا کپ پیش کرنے بھی شاید تم ہی گئی تھیں۔"

"جی نہیں میں انہیں چائے دینے ہرگز نہیں گئی تھی۔ میں سمجھی تھی کہ تایا جان۔" نگی کے چہرے پر پھیلتی محظوظ مسکراہٹ دیکھ کر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"اور بے چارہ تمہیں [illegible] خبطی ڈاکٹر کے پاس بھی لے گیا تھا اور جب ڈاکٹر نے تمہیں مسز سعد سمجھا تو تمہارے چہرے پر [illegible] خوفناک تاثرات ابھرے تھے کہ سعد [illegible] بھی بوکھلا گیا تھا۔"

"یعنی انہوں نے آپ کو ایک ایک بات بتائی۔" اس نے [illegible] ہوئے پوچھا۔

"نہ صرف ایک ایک بات بتائی بلکہ ایک بار نہیں کئی بار بتائی۔ تب ہی مجھے شک ہوا کہ سعد صاحب کے دل کے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے۔ جب سعد سے پوچھا تو اس نے فوری طور پر تو تردید کر ڈالی۔ دراصل اسے خود کو یقین نہ آ رہا تھا کہ اسے اپنے سے آٹھ برس چھوٹی ایک بے وقوف سی لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ آخر کار اسے دل کی بات پر کان دھرنے پڑے تھے پھر اسے یہ دھڑکا لگ گیا کہ ماہا صاحبہ کے حقوق کوئی اور اپنے نام محفوظ نہ کروا لے۔ ظاہر ہے ایسی پیاری لڑکی پر کسی کی بھی نگاہ ٹھہر سکتی ہے۔ اسی لیے اس نے پہلی فرصت میں مدحت چچی کے پاس جا کر تمہارا ہاتھ مانگ لیا۔" نگی نے بہت مزے لے لے کے ساری تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔

"حیرت ہے نگی باجی! میں آپ کی باتوں کو جھٹلا نہیں رہی لیکن سعد بھائی کے کسی انداز سے [illegible] ان کے دلی جذبات کا اندازہ لگا نہیں پائی۔" اس نے گہرا سانس اندر کھینچا تھا۔

"سعد جیسے ڈیسنٹ شخص سے تم کیا توقع کرتی ہو وہ تمہیں محبت بھری نگاہوں سے تکتے ہوئے تمہارا ہاتھ پکڑ کر تم سے [illegible] محبت کے ڈائیلاگ بولے گا۔" نگی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"آپ چاہیں تو مذاق اڑا لیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ میرا [illegible] ہو چکا ہے۔" اس کے انداز میں [illegible] در آئی تھی۔

"میں تمہاری ذہنی کیفیت سمجھ سکتی ہوں ماہا! لیکن یقین کرو آہستہ آہستہ تمہارا دل اپنے اور سعد کے رشتے کی حقیقت کو تسلیم کر لے گا بلکہ پھر اس کے دھڑکنے کا انداز بھی بدل جائے گا۔ سعد کی یکطرفہ محبت ہرگز بھی یکطرفہ نہیں رہے گی وہ بہت پیارا شخص ہے ماہا! سچ محبت کے قابل۔" نگی نے اسے یقین دلایا تھا۔

"میں نے آج تک بہت سیدھی سادی زندگی گزاری ہے نگی باجی! محبت وجت کے بارے میں تو کبھی خوابوں میں بھی نہیں سوچا۔ میں نے اپنی زندگی کے ہر فیصلے کا اختیار اپنی ماما کو دے رکھا تھا۔ چاہے وہ کسی راہ چلتے سے بھی میری شادی کرتیں تو میں خوشی خوشی کر لیتی۔ سعد بھائی کی صورت میں انہوں نے یقیناً میرے لیے بہترین انتخاب کیا اور اب جب مجھے پتا چل چکا ہے کہ ان کی اور آپ کی کوئی کمٹمنٹ نہیں تھی تو مجھے ان کے اس فیصلے پر بھی کوئی اعتراض نہیں لیکن۔" اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

"لیکن کیا؟" نگی نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے پوچھا اس پیاری سی لڑکی میں یقیناً کوئی ایسی بات تھی کہ تھوڑے سے عرصے میں ہی اس سے دل کا گہرا رشتہ جڑ گیا تھا۔

"لیکن یہ کہ اپنے عبادالرحمن کا بائیو ڈیٹا بھی تو بتائیں اب پتا چلا کہ آپ بھاگ بھاگ کر آفس کیوں جاتی تھیں اور تو اور سہیل بھائی کی شادی میں بھی چھٹیاں نہیں لیں۔ ہم سے کہتی تھیں میرا باس بہت کھڑوس ہے اور باس صاحب تو آپ پر فریفتہ تھے۔ آپ تو بڑی تیز نکلیں نگی باجی۔"

اس نے انہیں چھیڑا تھا۔ اتنی دیر سے ان سے اپنا معاملہ ہی ڈسکس کیے جا رہی تھی اب کچھ ان سے ان کے بارے میں بھی تو بات کرنا تھی۔

"عباد کے متعلق بتاؤں؟ اچھا پھر تو یہ ساری رات جاگنے والی بات ہے پہلے ایک ایک کپ کافی کا ہو جائے پھر تسلی سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

نگی کا رت جگے کا پروگرام تھا۔ وہ خوش دلی سے کہتی کافی بنانے چل دی تھی اور نیند تو خود اس کی آنکھوں سے بھی کوسوں دور تھی۔ کیسے عجیب عجیب انکشاف کیے تھے نگی نے۔ دل اب یقین کرنے پر تیار لگتا تھا مگر کیا جاتا اس حماقت کا جو وہ کر چکی تھی۔ ولید کے متعلق سعد کی غلط فہمی کیسے دور کی جاتی۔ نگی باجی سے مدد لی جا سکتی تھی لیکن وہ اپنی نئی زندگی کے نئے سفر کی شروعات کر رہی تھیں ان کے سوچنے کو اور بہت سی باتیں اور کرنے کو بہتیرے کام تھے۔ اب جو کچھ کرنا تھا اسے خود ہی کرنا تھا مگر کیسے کرنا تھا؟ یہ بات فی الحال سمجھ سے باہر تھی۔ بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج نگی باجی کی مہندی تھی۔ وہ اس وقت اسٹیج پر اپنے سسرالیوں کے نرغے میں تھیں۔ ماہا ایک کونے میں بیٹھی مسکراتے لبوں سے انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ زرد سوٹ میں پھولوں کا زیور پہنے نگی باجی کتنی پیاری لگ رہی تھیں۔ یہ سوٹ ماہا نے خود ان کے لیے

ڈیزائن کیا تھا اور سب نے ہی تعریف کی تھی۔ آج کتنے دنوں بعد اسے فراغت نصیب ہوئی تھی ورنہ کبھی بازاروں کے چکر لگ رہے ہوتے تو کبھی نگی باجی کو پارلر لے کر جانا ہوتا۔ ان کے جہیز کے کپڑے سیٹ کر کے سوٹ کیس تیار کیے۔ غرض کاموں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جس کا آج اختتام ہوا تھا۔ حیرت انگیز طور پر تائی جان ہر آئے گئے کے سامنے اس کی تعریف کر رہی تھیں۔ خیر ان کی تعریف سے اسے کیا سروکار ہوتا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا نگی باجی کی محبت میں کیا بلکہ ایک وہ ہی کیا سعد بھی شادی کے انتظامات میں صرف اسی لیے پیش پیش رہا تھا کہ نگی اور اس کی بے لوث اور پرخلوص دوستی تھی ورنہ تائی جان سے اسے کتنی شدید قسم کی چڑ تھی۔ یہ بات ماہا سے ڈھکی چھپی تو نہ تھی اور آج کتنے دنوں بعد اسے سعد نظر آیا تھا۔ ایش گرے ٹو پیس سوٹ میں اس کا دراز قد و جسیم سراپا تقریب میں سب سے نمایاں نظر آ رہا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے ماہا اس کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھی حالانکہ مجیب ہاؤس کے اس کے صبح شام چکر لگتے تھے لیکن اس کا سامنا کرنے کے خیال سے ہی ماہا کو عجیب سی جھجک ہونے لگتی۔

ماہا کو ہرگز اندازہ نہ تھا کہ یہ احساس کہ کوئی آپ کو پسند کرتا ہے "آپ پر اتنا حاوی بھی ہو سکتا ہے کہ آپ شعوری یا لاشعوری طور پر ہر وقت اسی کو سوچے جاتے ہیں شاید اس کے دل کی سلیٹ بالکل صاف تھی۔ نگی باجی نے صحیح کہا تھا کہ جب تم اس حقیقت کو تسلیم کر لو گی تو تمہارے دل کے دھڑکنے کا انداز بدل جائے گا سو وہ بدل چکا تھا لیکن ایک حماقت جو وہ کر چکی تھی اس کا ازالہ باقی تھا اگرچہ ابھی تک اس کی کوئی صورت نظر نہ آ رہی تھی۔ فی الحال وہ ساری سوچیں پس پشت ڈالتے ہوئے نگی باجی کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ ایک دن بعد انہوں نے پرائی ہو جانا تھا۔

"اللہ آپ کو بہت سی خوشیاں دکھائے نگی باجی۔" اس نے دل کی گہرائیوں سے ان کے لیے دعا کی تھی۔

"تو گویا آج آپ اپنی [illegible] کہیں گھر بھول آئی ہیں۔" اچانک کوئی پیچھے سے قریب آ کر بولا تھا۔ ماہا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"السلام علیکم سعد بھائی۔" وہ منمنا کر سلام ہی کر پائی۔

"مجھے یاد نہیں پڑتا میں نے تمہیں کسی قسم کا ادھار دیا ہوا ہے۔ کیوں چھپتی پھر رہی ہو مجھ سے۔" اس نے سلام کا جواب دینے کے بعد مسکرا کر دریافت کیا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں سعد بھائی! بس اتفاق ایسا ہوتا تھا کہ جب آپ گھر آتے تو میں کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوتی تھی۔" وہ نگاہیں چراتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی دل کی دھڑکن جانے کیوں قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔

"یہ اتفاق بہت طویل ہو گیا تھا۔ خیر چھوڑو اور سناؤ تمہاری پڑھائی وغیرہ کیسی جا رہی ہے۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا تھا۔

"پڑھائی فٹ ہے سعد بھائی! لیکن کلاس میں میری جی پی تیسرے نمبر پر ہے۔" اس کا اعتماد بھی قدرے بحال ہوا تھا۔

"گڈ اور وہ ولید صاحب وہ کچھ سیریس ہوئے [illegible] میں یا ابھی تک اسی طرح غیر سنجیدہ ہیں۔" سعد کا جملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ ماہا چاہتے ہوئے بھی کچھ بول نہ پائی یعنی سعد کچھ بھولا نہ تھا اور ظاہر ہے یہ بات بھلانے والی تھی بھی نہیں۔

"ایک [illegible] سعد بھائی! آپ برا نہ مانیں تو میں کچھ دیر کے لیے نگی باجی کے پاس چلی جاؤں؟ سب لوگوں نے انہیں مہندی لگا دی ہے۔ بس میں ہی رہ گئی ہوں۔" وہ ایک دم اٹھ گئی تھی۔ سعد کی متبسم نگاہوں نے دور تک اور دیر تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

✿ ✿ ✿

"ڈیسنٹ سے عباد بھائی اسے تو بہت اچھے لگے تھے۔ رنگت بے شک سانولی تھی لیکن پرسنالٹی کا رکھ رکھاؤ، بولنے کا انداز سب انہیں انتہائی مہذب انسان ثابت کر رہے تھے۔ دلہن بنی نگی باجی پر بھی

ٹوٹ کر روپ چڑھا تھا لیکن تائی جان کی آنکھیں آج خشک ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ اب بھی وہ مدحت اور ماہا کے پاس بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔

"ابھی رخصتی میں کچھ وقت ہے بھابھی! آپ ابھی سے ہی ہمت ہار رہی ہیں۔" مدحت نے انہیں حوصلہ دیا تھا۔ پاس بیٹھی دو چار رشتہ دار خواتین نے [illegible] تائید کی تھی۔

"نکاح تو ہو چکا۔ میری بچی تو پرائی ہو گئی [illegible]" وہ مدحت سے ہمت کر رونے لگیں۔ [illegible] پہلی بار ان سے دلی ہمدردی محسوس ہوئی [illegible] وقت صرف ایک ماں تھیں جن کی اکلوتی بیٹی کچھ دیر میں رخصت ہونے والی تھی۔

"تائی جان [illegible] آپ حوصلہ کریں نگی باجی کو دیکھیں۔ انہوں نے بھی تو خود کو کمپوز کر رکھا ہے۔ آپ کی حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو جائیں گی۔ انہوں نے زندگی کے نئے سفر کا آغاز کیا ہے انہیں آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔" اس نے انہیں سمجھانا چاہا تھا۔

"بہت سمجھ دار ہے تمہاری بیٹی مدحت! اس نے نگی کی بہن ہونے کا حق ادا کر دیا۔" بیٹی کی جدائی کے خیال نے ان کے دل کو زیادہ ہی گداز کر دیا تھا ورنہ وہ اور کسی کا احسان مانیں یہ کب ممکن تھا۔

"اور یہ سعد! سچ کہوں تو یہ بھی ہیرا لڑکا ہے ماشاءاللہ دونوں کی چاند سورج کی جوڑی ہو گی۔ اللہ تمہیں دونوں کو خوشیاں دکھائے۔"

سعد ان سے کچھ پوچھنے قریب آیا تھا کہ انہوں نے اچانک دھماکا کر ڈالا سعد کے لبوں پر تو مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی ماہا البتہ بری طرح سٹپٹائی تھی جو بات اس سے [illegible] چھپائی جا رہی تھی وہ یوں سب کے سامنے عیاں ہو گئی تھی مدحت خاموش کھڑی رہیں۔ جٹھانی سے یہ بھی نہ کہہ سکیں کہ ابھی سعد کے متعلق انہوں نے مسلسل اور متواتر گمراہ کن خبریں پہنچائی ہیں۔ کسی کی یادداشت اتنی بھی کمزور ہو سکتی ہے؟ ذرا جو ان کے چہرے پر شرمندگی یا ندامت ہو۔

مدحت صرف سوچ ہی پائی تھیں کہ پچھلی باتوں کو دہرانے کا اب کیا حاصل تھا۔

"بہت ٹائم ہو گیا بھابھی! بس اب رخصتی کی رسم ہو جانے دیں۔" آئینے میں نگی کی مند قریب آئی تھی۔ تائی جان نے آنسو پونچھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا اور تھوڑی دیر بعد نگی عباد کی سنگت میں رخصت ہو گئی تھی۔

ماہا ماں کے کندھے پر سر ٹکائے آنسو بہانے میں مشغول تھی جب سعد نے آ کر پکارا۔

"چلنے کا کیا پروگرام ہے مدحت چچی!"

ماہا ٹشو سے ناک پونچھتی ماں سے الگ ہوئی۔

"ہاں بس چلتے ہیں۔ اٹھو ماہا۔" مدحت نے اسے مخاطب کیا اس نے سر ہلا دیا۔ نگی باجی رخصت ہو کر جا چکی تھیں۔ تائی جان کے گھر جا کر اب کیا کرنا تھا سعد نے ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈالی۔ چھوٹی سی ناک رگڑ رگڑ کر سرخ کر ڈالی تھی۔

"یہ لڑکی ہر روپ میں اتنی دلکش کیوں لگتی ہے۔" مدحت چچی چونکہ پاس کھڑی تھیں اس لیے اسے نگاہ چرانا پڑ گئی۔

✿ ✿ ✿

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی لیکن نیند ماہا کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے ایک نظر اپنے برابر میں سوئی ہوئی مدحت پر ڈالی وہ اتنی تھکی ہوئی تھیں کہ تقریب سے واپسی پر چینج کرنے کے بعد فوراً ہی گہری نیند میں کھو گئی تھیں۔ تھکن سے تو ماہا کا بھی برا حال ہو رہا تھا لیکن اعصاب پرسکون ہوتے تو نیند آتی نا۔ یہ بیڈ روم سعد کا تھا جبکہ ان کی وجہ سے سعد کو اپنا ڈیرا لاؤنج میں جمانا پڑا تھا۔

وہ کروٹوں پر کروٹیں بدل کر تھک گئی تھی۔ بیڈ روم میں سعد کے مخصوص کلون کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ یہاں موجود نہ ہوتے ہوئے بھی ماہا کو اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ جب نیند آ کر ہی نہ دی تو وہ تنگ آ کر اٹھ گئی۔ کچن میں جا کر چائے بنانے کا سوچا

نیند چاہیے نہ آئی ہو جبل دماغ تو قدرے فریش ہو جاتا۔

وہ مدحت پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے دبے پاؤں اٹھی۔ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ لاؤنج میں زیرو پاور کے بلب کی ملگجی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سعد کشن سر کے نیچے رکھے کارپٹ پر سو رہا تھا۔

"بے چارے سعد بھائی!" ہماری وجہ سے بے آرام ہوئے۔" اسے افسوس ہوا تھا۔

صوفوں کے پیچھے سے چکر کاٹ کر دبے پاؤں چلتی وہ کچن میں آئی تھی۔ سوئچ بورڈ پر ہاتھ مارا' ایگزاسٹ فین چل پڑا تھا۔ سناٹے میں اس کی آواز کچھ زیادہ ہی زور کی لگی۔ اس نے بوکھلا کر سوئچ بورڈ پر دوبارہ ہاتھ مارا۔ کچن روشن ہوا تو ایگزاسٹ فین کا بٹن آف کیا۔

کیتلی ڈھونڈنے کے لیے کیبنٹس کا جائزہ لیا۔ بہت مشکل سے برتنوں کے ڈھیر میں سے کھٹر پٹر کی آوازوں کے بعد کیتلی برآمد ہوئی تھی اور اتنے میں ہی پاؤں پر سے کوئی چیز گزری تھی۔ بے ساختہ چیخ کا تو گلا گھونٹ لیا تھا مگر سانس چین ہاتھ سے چھوٹنے سے نہ روک پائی۔ موٹا سا چوہا تھا' جو کچن کے فرش پر پھدک کر بھاگا تھا۔

"مائی گاڈ!" یہ چوہا اس کے پاؤں پر سے گزرا تھا۔

اسے سوچ کر نئے سرے سے جھرجھری آگئی تھی اتنے میں باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ماہا اندازہ لگا سکتی تھی کہ کون آرہا ہے۔

جس وقت سعد کچن میں داخل ہوا وہ عادی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔ خاموشی سے ایک کپ چائے بنانا دنیا کا اتنا مشکل کام ثابت ہوگا' اسے پہلے سے اندازہ ہوتا تو وہیں بستر پر پڑی کروٹیں بدلتی صبح کر دیتی مگر کمرے سے باہر نکلنے کا ہرگز نہ سوچتی۔ سعد نے جھک کر اس کے قدموں میں گری کیتلی اٹھائی۔ سنک کی ٹونٹی چلا کر پانی سے کھنگالی پھر ذرا سا پانی ڈالتے ہوئے چولہے پر چڑھا دی۔ وہ خاموشی سے اسے سارا کام کرتے ہوئے دیکھتی رہی کھولتے ہوئے پانی میں چینی پتی ڈال کر اس نے آنچ ذرا سی دھیمی کی پھر موقع واردات پر پکڑے ملزم کی طرح سر جھکائے کھڑی ماہا کو مسکرا کر دیکھا۔

"بیٹھ جاؤ۔ چائے بننے میں دو چار منٹ تو لگیں گے ہی۔"

"سوری سعد بھائی! آپ میری وجہ سے ڈسٹرب ہوئے۔" اس نے مری مری سی آواز میں معذرت کی۔

"آپ کی وجہ سے ڈسٹرب ہوئے تو ایک عرصہ ہو گیا ماہا بی بی۔" اس نے مسکراتے ہوئے اس کے لیے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پیچھے کھسکائی۔ وہ شرمندہ شرمندہ سی بیٹھ گئی تھی۔

"آپ جا کر سو جائیں۔ میں دودھ ڈال کر چائے پی لوں گی۔"

"اکٹھی دو کپ چائے پی لو گی؟" سعد نے حیرت سے پوچھا۔ اس نے ناسمجھی سے سر اٹھا کر سعد کو دیکھا۔

"میں نے اپنی بھی بنائی ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔

"آپ اچھے بھلے سو رہے تھے' ناحق آپ کو [illegible] ہوئی۔" وہ شرمندگی کے احساس سے [illegible]

"اوکے' اوکے۔ اب اتنا شرمندہ ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ جب مستقبل میں یہی کچھ کرنا ہے تو ابھی سے کیوں نہیں۔" سعد کے لاپروا سے انداز پر اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا یعنی اب بھی وہ مستقبل اس کے ساتھ گزارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"بہت بچی اور میری خواہش تو یہ تھی کہ جب تک تمہاری پڑھائی مکمل نہیں ہوتی' تمہیں اس بات سے لاعلم رکھا جائے لیکن کیا کیا جائے ان خاتون کا جنہیں تم تائی جان کہتی ہو' انہوں نے سب کے سامنے یہ ذکر چھیڑ ڈالا حالانکہ ..."

"مجھے یہ بات بہت پہلے سے پتا ہے سعد بھائی۔" اس نے آہستگی سے اس کی بات کاٹی۔ اپنی حماقت کا ازالہ کرنے کا جو موقع اللہ نے فراہم کیا تھا' وہ اسے ضائع نہ کرنا چاہتی تھی۔

"جب آپ ہمارے گھر آئے تھے' مجھے جب ہی یہ بات پتا چل گئی تھی سعد بھائی لیکن اس وقت میں سمجھتی تھی کہ نگی باجی اور آپ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اس لیے میں نے آپ سے ولید والا جھوٹ بولا حالانکہ ولید میرا ..."

"حالانکہ ولید تمہارا رضاعی بھائی ہے۔" سعد نے اطمینان سے اس کی بات مکمل کی۔ وہ اس بار چاہ کر بھی کچھ نہ بول پائی' صرف حیرت سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"اتفاق سے اس روز پھپھو پرانے البمز دیکھ رہے تھے۔ تمہارے اور ولید کی بچپن کی تصویریں دکھاتے ہوئے پھپھو نے برسبیل تذکرہ یہ بات بھی بتائی۔ تم اور بے چارا ولید جو تمہارے منہ سے اپنی منگنی کا سن کر ہکا بکا رہ گیا تھا' تمہارے کمرے سے نکلنے کے چار سیکنڈ بعد اس نے اس منگنی کی پرزور انداز میں تردید کر دی تھی۔" سعد نے مسکراتے ہوئے انکشاف کیا تھا اور ولید کی اس دغابازی پر ماہا کو قطعاً کوئی افسوس نہ ہوا تھا۔

"بس اتنی سی بات کی وجہ سے تم پریشان تھیں۔ ہو گئی پریشانی ختم۔" اس نے دوستانہ انداز میں پوچھا اور ماہا کے سر سے واقعی جیسے بھاری بوجھ ہٹ گیا تھا۔

"آپ بہت اچھے ہیں سعد بھائی۔" اس نے سادگی سے اعتراف کر ڈالا۔

"میں اچھا تو واقعی ہوں مگر بھائی ہرگز نہیں۔" سعد نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی' ماہا اس بار جھینپ کر ہنس پڑی تھی۔

"ویسے جس سادگی اور بے ساختگی سے تم میری تعریف کرتی ہو' کبھی مجھے بھی اپنی تعریف کرنے کا کوئی موقع دے دیا کرو۔ تمہیں پہلے ہی شکوہ ہے کہ میرے کسی انداز سے ظاہر نہیں ہوتا کہ میں تمہاری محبت میں گرفتار ہوں۔" سعد نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا تھا۔

"یعنی نگی باجی کے پیٹ میں بھی کوئی بات ٹھہر ہی نہیں سکتی۔ سب آپ سے تو میں پوچھ لوں گی نگی باجی۔" اس نے اپنے دھڑ دھڑ کرتے دل کو سنبھالتے ہوئے ارادہ کیا تھا۔

"تمہیں پتا ہے' آج تم رائل بلیو سوٹ میں اتنی پیاری لگ رہی تھیں کہ میں سوچ رہا تھا' نکاح خواں صاحب تو موجود ہیں ہی' انہیں ایک نکاح اور پڑھانے کی زحمت نہ دے دوں۔"

"سعد بھائی! قہوہ ابل رہا ہے۔" اس نے بوکھلا کر چولہے کی طرف اشارہ کیا اور نگی باجی کہتی تھیں "سعد جیسے ڈیسنٹ شخص سے تم کیا توقع کرتی ہو کہ وہ تمہارا ہاتھ پکڑ کر رومانٹک ڈائیلاگ بولے؟ بس ہاتھ پکڑنے کی کسر ہی رہ گئی تھی۔ ماہا کے کان کی لویں سرخ پڑ گئی تھیں۔ سعد نے مسکراتے ہوئے دودھ نکالنے کے لیے فریج کھولا۔ چند لمحوں تک فریج کا جائزہ لینے کے بعد اس نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے فریج بند کیا۔

"دودھ نہیں ہے۔" اس نے جیسے اطلاع دی۔

"بس پھر بغیر دودھ کا قہوہ آپ ہی پئیں' وہ بھی دو کپ۔"

ماہا کو موقع ملنے کی دیر تھی۔ کہنے کے ساتھ ہی وہ جھپاک سے کچن سے نکل گئی۔ پیچھے کھڑا سعد کتنی دیر تک ہنستا رہا تھا۔ زندگی میں اب تک کتنی محرومیاں سہنے کے بعد قدرت کی طرف سے ان کا کیسا ازالہ ہوا تھا۔

اس سادہ سی لڑکی کی سنگت میں زندگی بہت مزے میں گزرنا تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا اور چولہا بند کر دیا۔

نبیلہ ابر راجہ

تتلی کے رنگ اتر گئے

سرتاپا کالی عبایا میں چھپا جسم' چہرے اور سر کے بالوں کو ہم رنگ اسکارف میں ڈھانپے اور اس میں جھانکتی دو آنکھیں' بہت سوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی تھیں۔ عجیب سا حسن تھا مومنہ وقار کی پرکشش آنکھوں میں۔ مومنہ وقار کی سیاہ گھور نشیلی آنکھوں کے سحر سے تیمور گردیزی بھی نہیں بچ سکا تھا۔

مومنہ وقار مائیکرو بیالوجی میں ایم ایس سی کرنے آئی تھی۔ اس سے پہلے وہ دبئی میں اپنے والدین اور بھائی' بھابھی کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ان کی فیملی پاکستان شفٹ ہو گئی تھی۔ اس کے چار ماہ بعد مومنہ وقار نے یہاں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا۔ دو ماہ سے زیادہ ہو گئے تھے مومنہ وقار کی دوستی چند لڑکیوں سے ہی ہو پائی تھی۔ لڑکوں سے وہ ضرورت کے تحت ہی بات کرتی تھی۔ ہاں اپنے اساتذہ میں وہ کافی مقبول ہو گئی تھی۔

اس کی وجہ مومنہ کی ذہانت اور اپنی پڑھائی سے متعلق گہرا مطالعہ تھا۔ وہ دوٹوک بات کرتی اور دلائل دیتی' ٹھہر ٹھہر کے بات کرنے کے اسٹائل' کالے کالے عبایا و اسکارف اور سب سے بڑھ کر اپنی نشیلی آنکھوں کی وجہ سے بہت جلد مشہور ہو گئی تھی۔ لڑکیوں میں وجہ مقبولیت اس کا حد سے زیادہ شرعی پردے کی پابندی کرنا تھا۔ لڑکے تو لڑکے دو ماہ میں لڑکیاں بھی نہیں جان پا سکی تھیں کہ عبایا کے اندر چھپے نسوانی سراپے میں کیا کچھ ہے کیونکہ عبایا اور اسکارف یونیورسٹی کی حدود میں قدم رکھنے کے بعد بھی اس کے جسم کا حصہ بنا رہتا۔

تیمور گردیزی کی کزن مومنہ وقار کی کلاس فیلو تھی' سو اس کا اپنی کزن کے ڈیپارٹمنٹ میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ تیمور کی کزن رابعہ' مومنہ کی بہت تعریفیں کرتی' وہ ایسی ہے' وہ یوں ہے' تیمور گردیزی کے دل میں تجسس نے سر ابھارا کہ دیکھیں تو سہی وہ کیسی ہے۔ اسی جستجو میں اس نے مومنہ وقار سے حال احوال پوچھ لیا۔

بے نیازی سی بے نیازی تھی۔ تیمور گردیزی کی مردانہ انا کو زبردست ٹھیس لگی۔ اس کی شخصیت نظر انداز کرنے کے قابل تو نہیں تھی۔ اسے ضد سی ہو چلی تھی' اس نے مومنہ وقار کو دوستی کی آفر کر دی۔ جواباً اس نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہا۔

"میں مرد اور عورت میں دوستی کے رشتے کی قائل نہیں ہوں۔"

"کیوں اس میں برائی کیا ہے؟" تیمور چیخ گیا۔

"کیونکہ عورت اور مرد میں دوستی ہو ہی نہیں سکتی۔ اپنی غرض اور ہوس کو مرد نے دوستی کا نام دے رکھا ہے' سوری میں ان فضول رشتوں کی قائل نہیں ہوں۔"

مومنہ وقار تیمور کو جواب دے کر چلتی بنی' پر اسے آگ کے جلتے الاؤ میں دھکیل گئی۔ "میں تمہیں دوستی کر کے دکھاؤں گا' تمہارے نظریات خود تمہارا مذاق اڑائیں گے۔" ضد تیمور کی رگ رگ میں رچی بسی تھی سو وہ کیسے ہار مان لیتا' رابعہ کے پیچھے پڑ گیا کہ کسی طرح مومنہ سے میری دوستی کروا دو۔ اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے' مر کے بھی آپ سے دوستی نہیں کرے گی۔ تیمور نے مومنہ کا سیل نمبر مانگا' رابعہ نے کہا کہ وہ فون استعمال ہی نہیں کرتی۔

اب پتا نہیں وہ جھوٹ بول رہی تھی کہ سچ' مگر تیمور نے کہا تھا کہ وہ مومنہ کو پسند کرنے لگا ہے۔ بس اب سارا مسئلہ مومنہ کو یقین دلانے کا ہے اور اس کے لیے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ رابعہ کو ترس سا آ گیا' اس کا یہ کزن بہت ضدی اور انا پسند تھا۔ ہار ماننا تو جیسے اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ تب ہی تو رابعہ نے تھک ہار کر بتایا تھا کہ مومنہ انٹرنیٹ استعمال کرتی ہے۔ باقی کا کام تیمور کے لیے آسان تھا' رابطے کا ایک ذریعہ مل گیا تھا۔ مومنہ کی آئی ڈی اس نے معلوم کر لی تھی۔ اسے صرف یہ معلومات درکار تھیں کہ مومنہ وقار کتنے پانی میں ہے۔

پہلے دن وہ آن لائن آیا تو مومنہ وقار بھی آن لائن تھی۔ اس نے ہلکی پھلکی سی گپ شپ کے بعد ایڈ کرنے کی درخواست کی۔ مومنہ نے کہا ٹھیک ہے۔ جواباً اس نے تھینکیو کہا۔ تیمور روز آن لائن آتا' اور مومنہ سے بھی یہی کہتا۔

چار دن ہو گئے تیمور اسے گپ شپ کرتے ہوئے مگر ابھی تک اسے کوئی خاص معلومات نہیں ملی تھیں۔ چار دن کے بعد اس نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ مومنہ وقار عام لڑکیوں سے بالکل مختلف ہے۔

☼ ☼ ☼

"مومنہ! آپ مجھ سے دوستی کریں گی؟" تیمور گردیزی جو "مون لائٹ" کے نام سے چیٹ کر رہا تھا' جلدی جلدی لکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔" جواباً مومنہ نے لکھا۔

"کیوں؟" تیمور کے ہاتھ تیزی سے کی بورڈ پہ چل رہے تھے۔

"اس لیے کہ لڑکے لڑکی میں اللہ نے فطری کشش رکھی ہے۔ دوستی کا رشتہ کسی اور رشتے میں بدل جاتا ہے۔" مومنہ کا جواب اس نے مانیٹر پہ پڑھ لیا مگر وہ اتنی جلدی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔

"تو آپ جس رشتے کی قائل ہیں' وہ بنا لیں۔"



تیمور نے بہادری کی حد پار کرلی تھی۔

"میں تو مضبوط رشتوں کی قائل ہوں۔ یہ لڑکے لڑکی کی آج کل کی محبتیں، میں ان پہ یقین نہیں کرتی۔"

"میں آپ کو یقین دلا کے رہوں گا۔" مومنہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔

عجیب سرپھرا شخص تھا۔ روز ایک ہی تکرار کرتا ہے 'دوستی کرلو' اور وہ روز ہی انکار کرتی۔ ویسے ایک بات تھی "مون لائٹ" کو بات کرنے کا فن آتا تھا۔ مومنہ دلچسپی محسوس کرنے لگی تھی۔

وہ ادب و احترام اور شائستگی کے طور طریقوں سے آگاہ تھا۔ اس نے کبھی اخلاق سے گری ہوئی بات نہیں کی تھی۔ نہ کبھی اخلاقی حدود کو پار کرنے والا کوئی سوال کیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ روز آن لائن ہوجاتی تھی۔

پھر ایک دن تیمور نے اس سے محبت کے بارے میں پوچھ لیا۔

"آپ نے کبھی کسی سے محبت کی۔ آپ کا محبت کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

جواباً اس نے لکھا کہ "میں آج کل کی محبت کے بارے میں یقین نہیں رکھتی اس لیے رائے بھی نہیں دیتی۔"

"پھر بھی محبت ہوتی تو ہے۔" تیمور نے اصرار کیا۔

"ہوتی ہوگی مگر مجھے یقین نہیں ہے۔" جواباً اس نے بے نیازی سے لکھا تو وہ تلملا کر رہ گیا۔ اتنے دن ہوگئے تھے چیٹ کرتے ہوئے، پر معاملہ وہیں کا وہیں تھا۔ تیمور کے حساب سے بہت ٹائم ضائع ہو رہا تھا اور مومنہ نخرے بہت کررہی تھی۔ (اس کے خیال میں)

اس دن تیمور نے اسے پہلی بار وائس چیٹ کے لیے کہا اور مزے کی بات تھی کہ مومنہ نے ہاں بھی بھرلی۔ حیرت کی زیادتی سے وہ [illegible] تھا۔ مومنہ سلام کے بعد ہیلو ہیلو کررہی [illegible] فوراً ہی اس کا اعتماد لوٹ آیا۔ بہت بھرپور طریقے سے اس نے بات کی۔ اپنے دلائل کا جوش و خروش سے دفاع کیا، پر مومنہ کم نہیں تھی اس کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔

"مجھے آپ کو آن لائن دیکھنا ہے۔ ویب کیمرہ آن کریں۔" تیمور کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔

"میں مکمل پردہ کرتی ہوں اس لیے آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے۔"

"اگر آپ پردہ کرتی ہیں تو پھر مجھ سے بات کیوں کررہی ہیں۔ میں اگر نامحرم ہوں تو میری آواز بھی نامحرم ہے۔" تیمور نے تاک کر وار کیا۔ مومنہ ادھر ہی سن سی ہوگئی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"لیکن آج آپ کو بتاؤں کہ میں آپ کو ان ہی باتوں کی وجہ سے پسند کرنے لگا ہوں۔ کوئی لڑکی میرے دل میں آج سے پہلے جگہ نہیں بنا پائی تھی لیکن آپ میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو میں اپنی شریک حیات میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایک لڑکی کو آپ ہی کی طرح ہونا چاہیے تاکہ کسی کو غلط بات کی جرأت نہ ہو۔ مجھے یہ کہنے میں آج کوئی شرم نہیں آرہی ہے کہ میں آپ سے ہار گیا ہوں۔ میں آپ کو ہرانے چلا تھا مگر خود ہار گیا ہوں۔"

مومنہ سحرزدہ سی ہو کے سن رہی تھی۔ [illegible] وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ تیمور کا ایک ایک لفظ سچائی میں ڈوبا ہوا لگ رہا تھا۔

اس رات مومنہ کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ اسے جانے کیوں [illegible] اچھا لگ رہا تھا۔ ایک اجنبی نے اس کے لیے سوچوں کے [illegible] دروازے کھول دیے تھے۔

تیمور آف لائن ہوا تو آنے والی کامیابی کے احساس سے [illegible] اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ مومنہ کی خاموشی [illegible] کا پتا دے رہی تھی۔

اس لیے تو اگلے دن وہ خاصا بے باک تھا اپنے رویے سے۔

"مجھے آپ کو دیکھنا ہے، کیم آن کریں یا پھر اپنی تصویریں شیئر کریں۔" تیمور کا انداز حکمیہ تھا۔ تب مومنہ میکانکی انداز میں اسے اپنی تصویریں دکھانے لگی۔

یہ وہی مومنہ وقار تھی، جسے اس بات پہ ناز تھا کہ

جوانی کی حدود میں قدم رکھنے کے بعد اسے کسی نامحرم نے نہیں دیکھا ہے۔ جو اس بات پہ کڑھتی تھی کہ لڑکیاں مردوں کی باتوں میں "فوراً" آجاتی ہیں۔ مرد کے دو محبت بھرے بولوں سے پگھل جاتی ہیں اور پھر سب کچھ ہار جاتی ہیں۔ اپنے ان خیالات کا اظہار اس نے تیمور گردیزی کے سامنے بھی کتنی ہی بار کیا تھا کہ میں ان بے وقوف لڑکیوں جیسی نہیں ہوں جو مردوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آجاتی ہیں۔ [illegible] مضبوط ہوں اور جب تیمور بار بار اسے دیکھنے کی ضد کرتا وہ سختی سے انکار کردیتی کہ مجھے دیکھنے کا حق صرف میرے شوہر کو ہے، میں آپ کو کیوں بتاؤں کہ میں کیسی ہوں میرے بال کیسے ہیں، میری آنکھیں کیسی ہیں یہ صرف میرے شوہر کی امانت ہے اور میں اسے ہی بتاؤں گی کہ میں کیسی ہوں۔

اور آج وہ ہی مومنہ وقار، تیمور گردیزی کو اپنی تصویروں کے ذریعے سب کچھ دکھا رہی تھی۔ تیمور نے دیکھ لیا تھا کہ نقاب کے اندر کیا کچھ ہے۔ لیکن ابھی اس کی جیت مکمل نہیں ہوئی تھی، ابھی بہت کچھ باقی تھا۔

مومنہ وقار کی آئی ڈی جب اس کے پاس آئی تھی تو اس نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کے تقریباً سب دوستوں کو بتایا تھا اور بڑے وثوق سے دعویٰ کیا تھا کہ وہ انہیں جیت کر دکھائے گا اور اب تو وہ اپنی جیت کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مومنہ مجھے آپ سے محبت ہوگئی ہے۔"

تیمور کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ اس کا دل پگھلنے لگا۔ دھیرے دھیرے وہ اپنے سارے ہتھیار پھینک چکی تھی۔ اسے محبت ہوگئی تھی۔ اکیس سالہ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ کورے کنوارے جذبات میں ہلچل مچی تھی۔ اسے لمبی راتوں میں جاگنا اچھا لگنے لگا تھا۔ تیمور اس کی تمام سوچوں پہ قابض ہوچکا تھا۔

وہ خواب دیکھنے لگی تھی۔ زندگی کی مسافت میں تیمور کا ساتھ پانے کی آرزو پلنے لگی تھی۔ جذبات کے طوفان کا منہ زور ریلا اسے بہائے جا رہا تھا۔ تیمور آہستہ آہستہ اس سے ہر بات منواتا جا رہا تھا، یہاں تک کہ اس سے اظہار محبت تک کروالیا۔

اب اس نے کہا تھا کہ میں تمہیں ویب کیم میں آن لائن دیکھنا چاہتا ہوں۔ مومنہ نے اس کی یہ فرمائش بھی پوری کردی۔ کیمرا آن تھا۔ مومنہ نے پہلے تیمور کے کہنے پہ سر سے دوپٹہ اتارا، پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پورے کمرے میں ادھر ادھر گئی۔ تیمور نے ہر ہر زاویے سے اپنا آپ دکھانے کو کہا۔ مومنہ نے ویسے ہی کیا۔

ادھر دوسری طرف چیٹ روم میں تیمور کے ساتھ ساتھ تیمور کے یونیورسٹی فیلوز بھی یہ سب دیکھ رہے تھے کہ یہ وہی مومنہ وقار ہے جو یونیورسٹی میں مکمل پردے کے ساتھ آتی ہے۔ اب وہ بے پردہ تھی۔ وہ سب اسے ایک ایک زاویے سے ازبر کرچکے تھے۔ تیمور نے اپنے ساتھ ساتھ ان کی تفریح کا بھی بھرپور سامان کیا تھا۔ اب بس تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کا وقت آگیا تھا۔

تیمور ملنے پہ اصرار کررہا تھا، وہ بڑے آرام سے مان گئی تھی۔

تیمور نے ہوٹل میں بلایا تھا۔ مومنہ ڈرائیور کے ساتھ اپنی سہیلی کی طرف آئی تھی۔ ڈرائیور اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا، وہاں سے وہ خود ہی ہوٹل پہنچی تھی۔

تیمور بے چینی سے انتظار کررہا تھا۔

مومنہ کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ مون لائٹ کے نام سے چیٹ کرنے والا راجہ کا کزن تیمور ہوگا۔ جو اسے دوستی کی آفر کرچکا تھا اور مومنہ نے نخوت سے یہ آفر مسترد کردی تھی۔ وہی شخص اب اس کے سامنے بیٹھا فاتحانہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"مس مومنہ! آخرکار میں جیت گیا، میں ہمیشہ سے جیتتا آیا ہوں، اس بار کیسے ہار جاتا۔ مجھے آپ کا یہ غرور اچھا لگا تھا۔ بس اسے توڑنا چاہتا تھا اور دیکھ لیں میں

نے توڑ دیا۔۔۔ آپ کا غرور۔۔۔ آج کے بعد امید ہے کہ آپ بھی بھی اپنے پرانے خیالات کی پیروی نہیں کریں گی کہ آپ پردہ کرتی ہیں' کسی نامحرم سے دوستی کی قائل نہیں ہیں' آپ کردار کے لحاظ سے بہت مضبوط ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ آپ یہ سب کرکے کسی اور کو تو بے وقوف بنا سکتی ہیں مجھے بالکل بھی نہیں' آپ بھی وہی عام سی لڑکی ہیں کمزور اور بودی۔

کہاں گیا آپ کا پردہ کہ مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔

کہاں ہے آپ کا دعویٰ کہ میں نامحرموں سے بات نہیں کرتی۔ آپ میرے سامنے بیٹھی ہیں گھر والوں کو بغیر بتائے مجھ سے ملنے آئی ہیں۔۔۔ میں ایک اجنبی ہی تو ہوں آپ کے لیے' پھر آپ نے یہ سب کیوں کیا۔ ایک اجنبی کی خاطر ایک نامحرم کی خاطر گھر والوں کے علم میں لائے بغیر ملنے آئی ہیں۔ آپ تو بہت مضبوط تھیں' پھر اتنی کمزور کیسے ہو گئیں۔۔۔ آپ کا اصل چہرہ تو میں اپنے فرینڈز کو بھی دکھا چکا ہوں۔" تیمور کا ایک ایک لفظ زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

"میں اب چلتا ہوں' اور بہت خوش ہوں کہ آپ جیسی لڑکی کو شکست دی ہے ویسے آپ سے دوستی کرکے بہت مزا آیا' بائے بائے۔"

وہ نہ جانے کس طرح خود کو سمیٹ کر گھر پہنچی تھی۔ ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اب مزید ضبط کا یارا نہیں تھا۔ آئینہ اس کے سامنے تھا۔ اس نے ایک ایک کرکے عبایا اور اسکارف اتار کر پرے پھینکا۔

"آپ بھی وہ ہی ایک عام سی لڑکی ہیں بودی اور کمزور۔ کہاں گیا وہ آپ کا پردہ۔ کہاں ہے وہ آپ کا دعویٰ کہ مجھے کسی نامحرم نے نہیں دیکھا' آپ کسی نامحرم سے بات نہیں کرتیں گھر والوں کو بغیر بتائے مجھ سے ملنے آئی ہیں۔ آپ تو بہت مضبوط تھیں آپ کا اصل چہرہ تو میں اپنے فرینڈز کو بھی دکھا چکا ہوں آپ سے دوستی کرکے بہت مزا آیا۔"

تیمور کا ایک ایک لفظ سماعتوں میں زہر بن کر اترتا رہا تھا۔ آئینہ اس پہ ہنس رہا تھا اور جانے کیسے آنسوؤں کا سیل رواں مومنہ وقار کی آنکھوں سے امڈ پڑا تھا۔ اسے لگ رہا تھا اس کا دل پھٹ کر کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا۔

چلو کچھ دیر ہنستے ہیں
محبت پر
عنایت پر
کہ بے بنیاد باتیں ہیں
سبھی رشتے
سبھی ناتے
ضرورت کی ہیں ایجادیں
کہیں کوئی نہیں مرتا
کسی کے واسطے جاناں
کہ سب ہے پھیر لفظوں کا
ہے سارا کھیل حرفوں کا
نہ ہے محبوب کوئی بھی
سبھی جملے کستے ہیں
چلو کچھ دیر ہنستے ہیں

☆ ☆ ☆

مومنہ اپنی نادانی پر جتنا بھی ماتم کرتی کم تھا اس نے تیمور کو خود موقع دیا تھا آگے بڑھنے کا۔ اسے نامحرم بھی کہتی رہی اور آگے بڑھنے کے' بے تکلف ہونے کے راستے بھی دکھاتی رہی۔ وہ اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی تو اس کی اتنی ہمت ہی نہیں ہوتی۔

وہ خود کو مضبوط کردار ظاہر کرتی رہی مگر مضبوط رہ نہیں سکی وہ دعویٰ تو کرتی رہی مگر اپنے دعووں پہ قائم نہ رہ سکی۔ اسی وجہ سے تیمور نے اسے مکمل شکست دی تھی۔

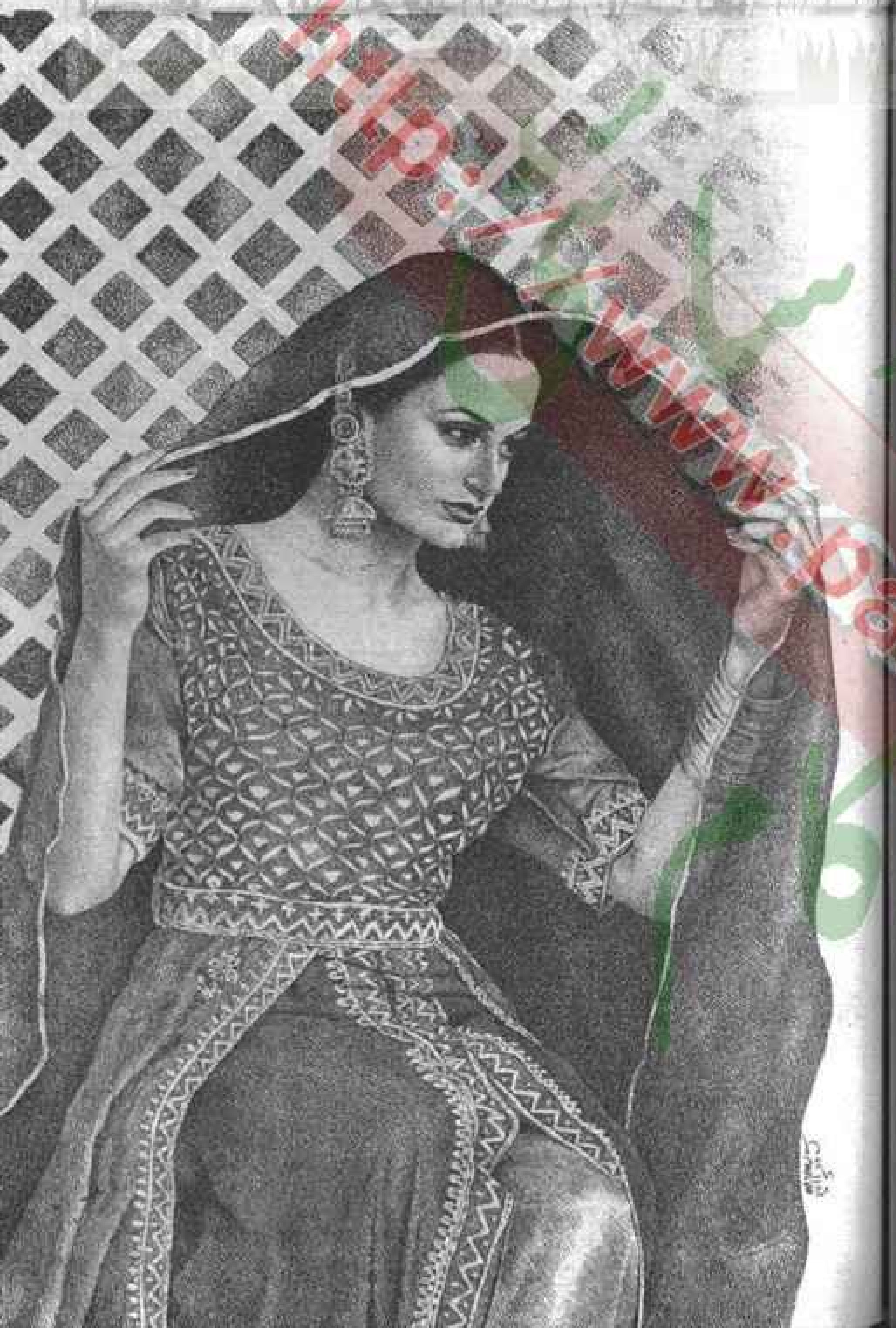
مومنہ کی ہار مکمل تھی۔

اور۔۔۔

تیمور کی جیت۔

اس کے بعد مومنہ وقار کو کسی نے یونیورسٹی کی حدود میں نہیں دیکھا۔

☆



سندس جبیں

قافلے راہ بھول جاتے ہیں

"اریبہ۔ اِدھر ہو بھئی؟"

وہ جو رٹا مارنے میں مگن تھی۔ یک دم چونکی۔

"جی لالہ!" اس نے کتاب ایک طرف پھینکی اور تیزی سے باہر بھاگی۔ طویل راہداری عبور کرتے ہی اسے منصور مل گیا۔

"کدھر ہیں سب؟" وہ خاصا جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا۔

"آپ کو کوئی کام ہے تو مجھے بتائیں۔"

"اچھا! پھر کھانا لگاؤ۔ فیصل آیا ہے۔ مجھے آواز دے دینا۔" وہ حکم جاری کر کے واپس مڑ گیا۔

اریبہ طویل سانس لیتی کچن کی طرف مڑ گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے کھانا لگایا اور ڈرائنگ روم کے دروازے کے قریب آ کر ہلکے سے پکاری۔

"لالہ! میں نے کھانا لگا دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" منصور کی بھاری آواز ابھری۔

وہ شکر ادا کرتی واپس آ گئی مگر پڑھنے کا سارا موڈ غارت ہو چکا تھا۔ بی اے میں نیا نیا ایڈمیشن لیا تھا۔ اگرچہ کالج ان کے علاقے سے پون گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا اور اس کے مزید پڑھنے پر "ملک ہاؤس" میں کوئی اتنا خاص آمادہ بھی نہیں تھا مگر بھلا ہو منصور لالہ کا جو سب کے سامنے ڈٹ گئے تھے۔

مکمل ناول



اس نے طویل سانس لے کر آنکھیں بند کیں۔ رائٹنگ ٹیبل سیٹ کی الماری سے اپنا شب خوابی کا لباس نکال کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد اس نے بالوں میں برش کیا اور لائٹ آف کرنے کے لیے آگے بڑھی اور پھر ہر بار کی طرح اس بار بھی اس کی نظر داہنی دیوار پر لگی اس پینٹنگ پر ٹھہر گئی۔ اس تصویر میں منظر کشی بہت عجیب سی تھی ماحول کسی قدر پراسرار اور ایک بے نام سا خوف! اریبہ کی نظر جب بھی اس پر پڑتی تھی وہ ایک سرد لہر خود میں دوڑتی محسوس کرتی۔

اسے یاد تھا کہ جب گھر کو نئے سرے سے سیٹ کیا گیا تھا تو یہ پینٹنگ کہیں سے "تحفتاً" آئی تھی۔

شومئی قسمت کہ وہ اریبہ کے کمرے میں سجادی گئی۔

"تصویر میں وسیع و عریض صحرا دکھایا گیا تھا جس پر کالی سیاہ رات نے اپنا بسیرا کر رکھا تھا' چاند پوری آب و تاب سے روشن تھا اور چاندنی میں صحرا کی ریت چمک رہی تھی۔ چمکتی ہوئی اس ریت کے میدان کے عین وسط میں ایک گھڑسوار تھا جو اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا رہا تھا' گھوڑے کے اگلے پیر اوپر کو اٹھے ہوئے تھے' گھڑ سوار کا لباس بھی سیاہ تھا اور مستزاد اس نے اپنا چہرہ بھی سیاہ ڈھاٹے سے ڈھکا ہوا تھا جو کہ تصویر کی کشش اور خوف میں اضافے کا سبب بن رہا تھا۔ بہت مدھم سے الفاظ میں نیچے

"Going to revange" (انتقام کے لیے روانہ)

درج تھا۔

اس وقت بھی وہ عجیب سی کیفیات کا شکار ہو کر لائٹ آف کر کے بستر پر آگئی۔ پتا نہیں وہ گھڑسوار کون سا بدلہ لینے کہاں جارہا تھا۔ سوچتے سوچتے وہ کب نیند کی وادی میں اتری اسے خبر ہی نہ ہوسکی۔

☼ ☼ ☼

سیاہ تارکول کی سڑک پر برق رفتاری سے دوڑتی ہوئی بی ایم ڈبلیو نے اپنا رخ کچی سڑک کی طرف موڑا تو ٹائر ایک لمحے کو زور سے چرچرائے پھر انجن غرایا اور گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی حویلی کی طرف بڑھنے لگی۔ شام کا دھندلکا ہر سو چھا رہا تھا۔ کچے رستے دو رویہ لگے بڑے بڑے سفیدے اور شیشم کے درخت خاموش اور ساکت کھڑے تھے۔ ماحول اس وقت صرف پرندوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ سائے لمبے ہوتے ہوئے بتدریج سمٹ رہے تھے۔ آخر کار گاڑی سرخ و سیاہ امتزاج سے مزین ماربل سے بنی حویلی کے سامنے رک گئی۔ چوکیداروں نے تیزی سے گیٹ کے پٹ وا کیے۔ گاڑی سیاہ بجری کی روش پر چلتی ہوئی پورٹیکو کی طرف بڑھ گئی۔ نثار نے تیزی سے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

"سلام شاہ سائیں!" اس نے ادب سے سلام کیا۔

سیاہ شلوار قمیص میں ملبوس کندھوں پر اجرک اوڑھے "شاہ فیصل" نے جواباً" صرف سرہلانے پر اکتفا کیا۔ اس کے قدم تیزی سے مردان خانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نثار کے قدم اس کا ساتھ دینے کی کوشش میں ہانپ رہے تھے۔

"حویلی میں سب خیریت ہے؟" اس نے اپنے مخصوص بارعب اور گرجدار لہجے میں پوچھا۔

"جی سائیں! سب خیریت ہے۔"

"شاہ فیصل کدھر ہے؟" اس نے اگلا سوال داغا۔

نثار ایک لمحے کو گڑبڑایا۔

"وہ... وہ سائیں! ابھی دوست سے ملنے گئے ہیں۔" اس نے رک رک کر کہا۔

شاہ فیصل کے برق رفتار قدم تھم گئے۔ اس کی پیشانی پر ایک شکن آگئی۔

"تم نے اسے میرے آنے کے بارے میں بتایا تھا؟"

"جی سائیں!" نثار نے نظریں جھکالیں۔

"میرا پیغام دیا تھا؟"

"جی سائیں!"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" اس نے طویل سانس لے کر قدم زنان خانے کی طرف موڑ لیے۔

نثار جان بچ جانے پر شکر ادا کر کے واپس مڑ گیا۔

بی بی جان کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے جیب سے موبائل نکال کر شاہ فیصل کا نمبر ملایا تھا۔ دوسری بیل پر فون اٹھالیا گیا۔

"ہاں سائیں! کدھر ہو؟ ہم تو تمہارا انتظار کر رہے تھے حویلی میں' پتا چلا' تمہارے لیے اپنے ویر (بھائی) سے اہم اپنے جگری ہیں اسی لیے تو ایک ماہ بعد ملنے کی بے تابی صرف اپنے متروں (دوستوں) سے ملنے کی ہم سے نہیں۔" اس کے لہجے میں تحکم بھرے لہجے میں طنز کی آمیزش صاف نظر آرہی تھی۔

"نن... نہ سائیں!"

"اب کیا فائدہ؟ جرأت تو تم نے دے دیا کہ تمہارے لیے کون اہم ہیں؟" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"ہم... ہم پر ذرا..."

"ہم سب سمجھتے ہیں رشتوں اور دوستوں کا مقام ہمیں مت سکھاؤ۔ تم حویلی آجاؤ' باقی بات پھر کریں گے۔" اس نے فون بند کردیا۔

اس کی چمکدار سیاہ آنکھیں سلگ رہی تھیں۔

"اس کے بار بار سرزنش کرنے کے باوجود بھی شاہ فیصل اور منصور ملک کی دوستی بڑھتی گئی تھی۔ ملک خاندان سے ان کے تعلقات کچھ خاص بہتر نہ تھے مگر کوئی دشمنی بھی نہیں تھی محض ایک لاتعلقی تھی جو بڑی طرح دونوں خاندانوں کے درمیان حائل تھی۔ شاہ فیصل اور منصور ملک کی بڑھتی ہوئی دوستی میں اگرچہ کسی کو کوئی نقصان نظر نہ آتا تھا مگر شاہ فیصل کی بات رد کرنے کی ہمت کس میں تھی؟ اس نے صاف لفظوں میں شاہ فیصل کو منصور ملک سے تعلقات ختم کرنے کو کہا تھا مگر شاہ فیصل نے صریحاً" اسے نظر انداز کر کے اپنی "حکم عدولی" کی سزا کو گویا مزید سخت کرلیا تھا۔

بی بی جان کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے اور ہونٹ سختی سے آپس میں پیوست تھے۔

☼ ☼ ☼

نامعلوم منزل کو چلے جانے والے اور سیب کے باغات کے درمیان بنے رستے پر تیزی سے دوڑتی گھوڑا گاڑی میں سے ایک وجود نے جست لگائی۔ ادھر ادھر دیکھا اور سیدھا مالٹے کے درختوں کے جھنڈ میں گھستا چلا گیا۔ اس کے آشنا انداز اسے یہاں کا رہائشی ظاہر کرتے تھے۔ وہ درختوں کے درمیان جگہ بناتا تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک جگہ رک کر اس نے چوکنا انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ جیب میں کسی چیز کی موجودگی کا یقین کیا اور اپنے لیے ایک مناسب مورچہ تلاش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کی نگاہیں ایک قدرے نیچے کو جھکے اور پھیلے ہوئے درخت پر جاکر رک گئیں۔ اسے یقین تھا وہ دونوں یہیں آئیں گے۔

اس نے اپنی پوزیشن سیٹ کی اور عقابی نگاہ سے چاروں طرف کا جائزہ لیا' پھر اپنے کان کچے رستے کی طرف لگا دیے جہاں سے جیپ کی آواز قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ جوں جوں آواز قریب آتی جا رہی تھی اس کے اعصاب مزید تنتے جا رہے تھے۔ دل کی دھڑکن بھی بڑھی ہوئی سی لگ رہی تھی اور آخر کار وہ جیپ اس کے قریب سے گزر کر قدرے آگے جا کر ترچھی ہوئی اور پھر رک گئی۔

☆ ☆ ☆

"منصور! یار کدھر ہو تم؟"

"شاہ سائیں! میں اپنے گیٹ پر پلکیں بچھائے آپ کا منتظر ہوں۔" منصور نے ہنستے ہوئے لہجے میں طنز کیا۔

جواباً "فیصل نے ایک بلند و بانگ قہقہہ لگایا۔

"فکر مت کرو بابا! ہم تمہاری طرف آ رہے ہیں بلکہ جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔ ہم اپنی رعایا کی صدا خالی نہیں جانے دیتے بابا!" فیصل نے ہنسی روکتے ہوئے خالص وڈیرے کے سے انداز میں کہا۔

"مہربانی سائیں! آپ تشریف کا ٹوکرا لے ہی آئیں ورنہ......" منصور نے دھمکاتے ہوئے فون بند کیا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

دونوں کا آج شام شکار کا پروگرام تھا۔ فیصل کو اسے پک کرنا تھا' جب ہی منصور پچھلے آدھے گھنٹے سے انتظار کر رہا تھا' مگر فیصل کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ کئی بار تو اس کا دل چاہا کہ وہ اپنی گاڑی لے کر نکل جائے' پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ اسی کشمکش کے دوران فیصل کی کال آ گئی۔ کچھ دیر بعد گیٹ پر جیپ کی آواز سنائی دی' وہ تیزی سے باہر کی طرف بڑھا۔ فیصل دروازہ کھول کر نیچے اتر چکا تھا۔ منصور بڑھ کر اس سے بغلگیر ہو گیا' پھر مسکراتے ہوئے پیچھے ہٹا۔

"خیریت! آج بڑی خوشبوئیں اڑ رہی ہیں جناب سے۔"

"کچھ نہیں یار! ایسے ہی دل چاہا تھا۔" فیصل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بھئی دل ہے' کبھی بھی چاہ سکتا ہے اور کچھ بھی چاہ سکتا ہے۔ اب چلیں؟" منصور نے کہا۔

دونوں جیپ کی طرف بڑھ گئے۔ ان کی جیپ تیزی سے کچے رستے پر دھول اڑاتی سیبوں اور مالٹوں کے درختوں کو چیرتی آگے بڑھ رہی تھی۔

تب ہی نہ جانے کیا ہوا۔ جیپ ایک جھٹکے سے رک گئی۔

فیصل نے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی' پھر دروازے کھول کر دونوں نیچے اتر آئے۔ فیصل جیپ کا بونٹ کھول کر دیکھنے لگا۔ تب ہی گولی چلنے کی آواز پر منصور نے چونک کر دیکھا۔ ارد گرد کوئی نظر نہیں آیا تو اس نے اپنا ریوالور بے ساختہ نکال لیا اور فائر کیا لیکن گولی نہیں چلی۔

"مجھے لگتا ہے اس کے ٹریگر میں کوئی مسئلہ ہے۔" منصور نے ریوالور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابھی چیک کر لیتے ہیں۔" فیصل اس کے ہاتھ سے ریوالور لے کر دیکھنے لگا۔

"اب اسے چلا کر دیکھو۔" منصور نے آسمان کی طرف اس کا رخ کر کے ٹریگر دبایا' مگر بے سود۔ منصور ریوالور دیکھ رہا تھا اور پھر ہاتھ سیدھا کیا ہی تھا کہ ایک دم فائر کی آواز گونجی۔ فیصل کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا' اس کے سینے سے خون کا فوارہ سا پھوٹا تھا۔ منصور نے بے یقینی سے دیکھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ فیصل کا وجود لرزا اور پھر پوری قوت سے نیچے میں جا گرا اور ساکت ہو گیا۔ اس کا بے جان وجود پل دو پل میں خاک کے ڈھیر میں مل گیا تھا۔

درختوں پر پھڑپھڑاتے پرندے زور و شور سے چیخ رہے تھے۔ منصور پھٹی پھٹی نگاہوں سے فیصل کو دیکھ رہا تھا جس کی ساکت آنکھوں میں حیرت گویا جم کر رہ گئی تھی۔ خوف نے پوری شدت سے اس پر حملہ کیا۔

"میں نے...... میں نے...... نہیں مارا......"

وہ پلٹ کر پوری طاقت اور وحشت سے بھاگا تھا۔

سیبوں اور مالٹوں کے درختوں کے عین وسط میں کھڑی جیپ اور اس کے ساتھ پڑی فیصل کی لاش کے بالکل ساتھ وہ ریوالور گرا پڑا تھا جس پر منصور کی انگلیوں کے نشان بہت واضح تھے۔ فضا میں مالٹوں کی خوشبو کے ساتھ ایک بو بھی پھیل رہی تھی اور وہ تھی موت کی بو' جو کہ فیصل کے خوشبودار وجود سے اٹھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

شاہ محمود کے دو بیٹے تھے۔ "شاہ فضل" اور "شاہ فیصل"۔ ان کا شمار گاؤں کے وڈیروں میں کیا جاتا تھا۔ شاہ محمود پنچایت کے سربراہ تھے اور اپنی انصاف پسندی کی بنا پر پورے گاؤں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی اپنی زمینیں اور باغات تھے۔ لاہور میں تین فیکٹریاں بھی چل رہی تھیں۔ "شاہ فضل" نے ایگری کلچر میں ماسٹرز کیا تھا۔ اس کی ذات کی سب سے نمایاں مخالفت تھی اس کا غرور۔

چلتا تو یوں جیسے سلطنت فتح کرلے گا۔ بولتا تو یوں جیسے اس کے سامنے اس کی حقیر ترین رعایا کھڑی ہو۔ دیکھتا تو یوں جیسے آنکھوں سے روح کھینچ لے گا۔ اس کی شخصیت کو اگر دو لفظوں میں بیان کیا جا سکتا تو شاید یہی تھا۔ "مجسم غرور۔" اس کا غصہ اتنا سخت اور تیز تھا کہ بعض دفعہ تو شاہ محمود بھی گھبرا جاتے تھے۔

اس کے بعد "شاہ فیصل" تھا۔ ایم بی اے پارٹ ون کا اسٹوڈنٹ' بلا کا شریر' بذلہ سنج اور زندہ دل۔ اکڑ تو جیسے اسے چھو کر نہیں گزری تھی۔ صحیح معنوں میں وہ "شاہ فضل" کی الٹ تھا۔

"فیروز ملک" کا شمار بھی علاقے کی بااثر شخصیات میں کیا جاتا تھا مگر وہ گاؤں کے اندرونی معاملات سے ہمیشہ لاتعلق اور بے خبر رہے تھے۔ ان کے دو ہی بچے تھے "منصور ملک" اور "اریبہ ملک" منصور ان کے ساتھ لاہور والی فیکٹری میں ہوتا تھا جبکہ اریبہ نے اے میں نیا نیا ایڈمیشن لیا تھا۔ انیس سالہ اریبہ میں جیسے منصور کی جان تھی۔ وہ بہن سے بے تحاشا پیار کرتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہی تھا کہ اس نے سب سے پہلے باپ سے جھگڑ کر اسے آگے ایڈمیشن دلوایا تھا' گھر میں کوئی راضی نہ تھا۔ ان کی فیملی میں لڑکیوں کو اتنا آگے پڑھانے کا رواج ہی نہیں تھا مگر منصور سب کے آگے ڈٹ گیا تھا اور یوں اس وقت وہ تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔

☆ ☆ ☆

پورے علاقے میں ایک طوفان سا آیا ہوا تھا اور وہ تھا "شاہ فیصل" کی موت کا طوفان' جس نے حویلی کی بنیادیں ہلا ڈالی تھیں' شاہ فضل تو بپھرا شیر بنا ہوا تھا۔ اس کا بس چلتا تو منصور ملک سمیت اس کے پورے خاندان کو آگ لگا ڈالتا مگر یہ شاہ محمود کی کمال قوت برداشت تھی جس نے ابھی تک اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز نہ ہونے دیا تھا۔ آج شاہ فیصل کی موت کو تیسرا دن تھا۔ پنچایت بیٹھ چکی تھی۔ تمام ثبوت اور گواہیاں منصور ملک کے خلاف تھیں' یقیناً وہ سزا کا مستحق ٹھہرتا مگر تب...... جب وہ موجود ہوتا۔ وہ اسی دن اسی وقت فرار ہو چکا تھا۔ تاحال اس کا نام و نشان نہیں ملا تھا۔ "شاہ فضل" کے آدمی پاگل کتوں کی مانند ہر طرف اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے مگر وہ ہنوز لاپتا تھا۔ ایک اندازہ یہ بھی لگایا جا رہا تھا کہ لازماً وہ علاقہ غیر کی طرف نکل گیا تھا۔

حویلی کے مردان خانے میں اس وقت گرما گرم بحث چھڑی ہوئی تھی۔ تمام سرکردہ افراد موجود تھے۔ پنچایت کا فیصلہ سنایا جا چکا تھا۔

"یہ ناممکن ہے بابا سائیں!" شاہ فضل کی دھاڑ گونجی تھی۔

"خون کو ٹھنڈا رکھو سائیں! یہ فیصلہ ہو چکا ہے اور یاد رکھو ایسے کتنے ہی معاملات کے فیصلے ہم نے بھی ایسے ہی سنائے تھے۔" بابا سائیں کا لہجہ پرسکون تھا۔

"آپ کا مطلب ہے میں اپنے بھائی کے خون کی قیمت لے لوں۔ بے غیرت بن جاؤں؟" وہ پاگل ہونے کو تھا۔

"دوسرا راستہ زیادہ بہتر ہے' تم فیروز ملک کی بیٹی سے

نکاح کرلو۔" اس کے چچا شاہ فرقان نے کہا۔

"دیکھو فیصل بیٹا! مجرم فرار ہوچکا ہے۔ اس لیے فیصلہ یہی کیا گیا کہ خون بہا کی رقم یا لڑکی۔ آگے جو تم مناسب سمجھو۔" اس بار اسے سمجھانے والے ماموں فراز تھے۔

"میرے فیصل کا خون اتنا ارزاں نہیں کہ میں اس کی قیمت لوں؟" وہ غرایا تھا۔ آنکھوں میں پھیلی سرخی اس کے رت جگوں اور غضب کی غماز تھی۔

"ہاں۔ لڑکی پر سمجھوتہ ہوسکتا ہے۔" وہ لب بھینچتے ہوئے بولا۔

سب نے ایک نامعلوم سی تسکین بھری سانس لی۔ تاہم اب ایک نئی بحث چھڑ چکی تھی۔

دوسری طرف "ملک ہاؤس" پر بھی ایک قیامت ٹوٹی ہوئی تھی۔ فیروز ملک کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ وہ پنچایت کا فیصلہ سن کر آگئے تھے مگر جانے کیوں انہیں یقین تھا کہ وہ رقم کا مطالبہ ہرگز نہیں کریں گے۔ وہ شاہ محمود کے خاندان کو جانتے تھے۔ ان کی غیرت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ رقم قطعاً" قبول نہ کریں۔ ویسے بھی ان کے پاس دولت کی کمی نہ تھی۔ جیسے ہی فیروز ملک دوسری طرف سوچتے ان کے دل کی نازک رگیں ٹوٹنے لگتیں۔ کیونکہ اس طرف ان کی اکلوتی نازوں پلی بیٹی اریجہ تھی "ملک ہاؤس" میں داخل ہوکر انہوں نے کس حوصلے سے سب کو پنچایت کا فیصلہ سنایا تھا مگر پھر جیسے ضبط کی حد ختم ہوگئی تھی۔ وہ ڈھے سے گئے اور فرزانہ ملک تو جیسے ساکت سی ہوچکی تھیں۔

"میری بچی کا کیا قصور ہے ملک صاحب؟" وہ روتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

فیروز نہ چاہتے ہوئے بھی نظریں چرا گئے۔ اگلی صبح ان کے شکوک صحیح ثابت ہوگئے تھے۔ حویلی سے فیصلہ آچکا تھا۔

اسی شام اریجہ ملک کو شاہ فیصل کے نکاح میں دے دیا گیا۔ اریجہ نے چھوٹے سے بیگ میں اپنے چار جوڑے رکھے۔ ایک ساکت اور ضبط سے بھری نگاہ

اپنی کتابوں پر ڈالی تھی جن میں سے کچھ پر تو اس نے ابھی اپنا نام تک نہ لکھا تھا پھر اس کی نظر دیوار پر لگی اس تصویر پر پڑی۔ اس نے اسے دیوار سے اتارا اور اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔

رخصت کرتے ہوئے اس کی ماں نے کہا تھا کہ وہ سمجھ لے اس نے اپنی زندگی بھائی کے اوپر صدقہ کردی۔

☼ ☼ ☼

آج اسے حویلی میں آئے دوسرا دن تھا۔ اس نے ابھی تک شاہ فیصل کو نہیں دیکھا تھا۔ آج ملازمین کی پھرتیاں اور حویلی میں ہونے والی ہلچل بتا رہی تھی کہ وہ واپس آرہا تھا۔

حویلی میں سب کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا تو بہت برا بھی نہیں تھا۔ بی بی جان نے اس سے مختصر سی بات کی تھی اور اسے کمرے میں جانے کو کہا تھا۔ وہ سہ پہر کے کھانے کے بعد جب شام کی تیاری ہونے لگی تو وہ خاموشی سے بی بی جان کے پاس آبیٹھی جو زیر لب تسبیح پر کچھ پڑھ رہی تھیں۔

"فیصل پہنچ چکا ہے۔" انہوں نے اسے بتایا۔

ایک نامعلوم سرد لہر اس کے اندر دوڑ گئی تھی۔ وہ کتنا غصیلا اور تند خو تھا، شاید اتنا بتانا ہی کافی ہے سب سے سنا تھا یا شاید اس سے بھی زیادہ وہ جان گئی تھی کہ وہ شاہ فیصل سے بے حد پیار کرتا تھا، جان چھڑکتا تھا اس پر اور اب کیا کرے گا وہ اس کے ساتھ؟

"تم کچن میں جاکر دیکھو کھانا تیار ہے۔" بی بی جان نے اسے اس کی سوچوں سے نکالا۔

وہ سر جھٹک کر اٹھی اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔

سب انتظام دیکھ کر واپس آتے ہوئے وہ یکدم رک سی گئی۔ اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ بی بی جان کی آواز کے ساتھ ایک مردانہ آواز، جو یقیناً "شاہ فیصل کی تھی۔ بھاری، بارعب، پر تاثر" اریجہ کو اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا محسوس ہوا۔

وہ تیزی سے واپس مڑ گئی۔ بھاگتے ہوئے اپنے

کمرے کی طرف آکر اس نے اندر داخل ہوکر دروازہ بند کرلیا تھا۔

پھر ملازمہ اسے کھانا دینے آئی مگر اس نے انکار کردیا، اس کی بھوک پیاس یک لخت ختم ہوچکی تھی۔ شام کے تھال میں رات کے سکے گرنے لگے۔ آوازیں بتدریج مدھم ہوتی گئیں اور روشنیاں گل۔ جب ہلکی سی دستک کی آواز پر وہ اچھل پڑی۔ بڑھ کر دروازہ کھولا تو ندرت کھڑی تھی۔

"چھوٹی بی بی! آپ کو شاہ سائیں نے بلایا ہے۔" اریجہ نے ہراساں ہوکر اس کی شکل دیکھی۔

"کون نے ... کن نے ... شاہ سائیں نے؟" اریجہ نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔ ندرت نے حیران ہوکر اسے دیکھا۔

"فیصل سائیں نے بی بی!" اس نے تصحیح کی۔

اریجہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"کہاں بلایا ہے؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"اپنے کمرے میں۔ آئیں میں آپ کو چھوڑ آؤں۔" اریجہ نے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ بمشکل اپنی گرم شال کو اپنے گرد لپیٹا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔

ندرت اسے مردان خانے میں لے آئی۔ پھر ایک منقش دروازے کے سامنے رک گئی۔ ہلکا سا بجایا اور دھیمی مگر مؤدب آواز میں بولی۔

"سائیں! میں چھوٹی بی بی کے ساتھ ہوں۔"

"آجاؤ۔" اس کی بھاری گمبھیر آواز گونجی۔

ندرت نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئی۔ اریجہ اس کے پیچھے تھی۔ کمرہ کیا تھا پورا شیش محل تھا۔ اتنا خوب صورت، اتنا ویل فرنشڈ۔ اریجہ دنگ سی تھی۔

"کوئی خدمت سائیں؟" ندرت نے پوچھا۔

"نہیں تم جاؤ۔" اس نے حکم دیا۔

ندرت خاموشی سے مڑ گئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور پھر بند ہوگیا۔

اریجہ بمشکل لرزتی ٹانگوں کا بوجھ سنبھالے نظریں

زمین پر جمائے کھڑی تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ ابھی گر جائے گی۔

سامنے صوفے کے کنارے پر نیم دراز وہ بڑے سکون سے اس کے چہرے کے اڑتے رنگوں کو ملاحظہ کر رہا تھا۔ سیاہ گرم شال اور سرخ پلین لینن کے سوٹ میں وہ دمک رہی تھی۔ اس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں وحشت اور خوف تھا۔ چہرے سے وہ اپنی عمر سے بہت کم لگ رہی تھی۔ شاہ فیصل کی نجانے کون سی حس کو تسکین پہنچی تھی۔ اس کی نظریں اریجہ کے سراپے پر جم کر رہ گئی تھیں اور نظروں کی تپش سے وہ کچھ اور زرد ہوگئی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس کی سرد آواز گونجی۔

"اریجہ۔" وہ بمشکل حلق سے آواز نکال کر بولی۔

"کیا کرتی ہو؟" اگلا سوال ہوا۔ اریجہ کو لگا وہ کسی تفتیشی افسر کے سامنے کھڑی ہو۔

"پڑھتی ہوں۔" اس نے کہا پھر یک لخت اپنے غلط جواب کا ادراک ہوا۔ "پڑھتی تھی۔" اس نے فوراً" کہا۔

شاہ فیصل نے قدرے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"کیا پڑھتی تھیں؟"

"بی اے میں ایڈمیشن لیا تھا۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے۔

"کب؟"

"ایک ماہ پہلے۔" اس کی ٹانگیں تھک چکی تھیں۔ اس کا دل چاہا کاش وہ وہاں سے بھاگ سکتی۔

"ماں باپ تو تمہارے بڑے خود غرض نکلے۔ بیٹے کے بدلے تمہیں پیش کردیا۔" اس نے حقارت سے کہا۔

اریجہ کے سینے میں ایک انی سی گڑ گئی۔ اس کا دل چاہا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ اس بات کا تو اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموش کھڑی آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی۔

"یہاں آؤ۔" اس نے حکم دیا۔

اریبہ کے قدموں سے زمین سرک گئی تھی۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس کے سامنے تھا۔ اپنی پوری شان و شوکت اور جاہ و جلال کے ساتھ۔ سیاہ شلوار سوٹ میں آستینیں کہنیوں تک موڑے، ٹانگوں پر لحاف ڈالے، چمک دار سیاہ آنکھیں اور کھڑی ناک، گھنی مونچھوں تلے عنابی لب باہم بھینچے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں نے جیسے اسے پتھر کر دیا تھا۔ وہ کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں چلتی بیڈ کی طرف بڑھنے لگی۔

"اتنا تو تم جانتی ہو گی کہ خون بہا میں آنے والی عورتوں کو کیا حیثیت دی جاتی ہے؟" اس نے سفاکی سے کہا۔

"جی نہیں۔" اس نے ہمت کر کے کہا۔

"جان جاؤ گی۔" وہ تلخی سے ہنسا تھا۔

"مجھے نہیں پتا بی بی جان نے تمہیں اس حویلی میں کیا حیثیت دی ہے مگر یہاں تمہاری حیثیت وہ ہو گی جو میں متعین کروں گا۔" وہ رعونت سے بولا تھا۔

اریبہ کا سانس جیسے سینے میں ہی اٹک گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ بالکل اس کی قسمت کی طرح۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ چادر اتر گئی، دیا و بڑھتا جا رہا تھا۔ اریبہ کا جی چاہ رہا تھا وہ زور زور سے روئے، ماں کو پکارے، اس کی گھٹی گھٹی سسکیاں اور دبی دبی چیخیں شاہ فضل کو کتنی تسکین پہنچا رہی تھیں، وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ وحشی تھا اور اس کی وحشت اور بربریت سہتے ہوئے وہ ادھ موئی سی ہو رہی تھی۔ وہ اس سے اتنی گندی زبان بول رہا تھا کہ اریبہ کا دل چاہا کاش وہ اپنے کان بند کر سکتی۔ روتے گڑگڑاتے ہوئے اس نے کتنی بار اس سے رحم کی بھیک مانگی تھی۔

"رحم شاہ سائیں۔ رحم۔" وہ مر رہی تھی، جواباً الٹے ہاتھ کا ایک بھرپور طمانچہ اس کے گال پر پڑا تھا۔ اریبہ نے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ گھلتا ہوا محسوس کیا تھا۔

"تیرے بھائی نے کیا تھا؟" وہ غرایا تھا بالکل کسی بھوکے بھیڑیے کی مانند۔

وہ چیخ اٹھی تھی کہ بات اب برداشت اور ضبط کی حد سے نکل چکی تھی اور اس کی ہذیانی چیخیں سن کر جیسے وہ اور بھی درندگی پر اتر آیا تھا۔ درد کی آخری حد کو چھوتے ہوئے اس نے کب حواس گنوائے، اسے خبر نہ ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

آؤ جانچ لیتے ہیں
درد کے ترازو پر
کس کا غم کہاں تک ہے؟
شدتیں کہاں تک ہیں
کچھ عزیز لوگوں سے
پوچھنا تو پڑتا ہے
آج کل محبت کی
قیمتیں کہاں تک ہیں؟

اس کی آنکھ پتا نہیں کون سے احساس سے کھلی تھی۔ چند لمحے وہ بے حس و حرکت چھت کو گھورتی رہی، پھر حواس بیدار ہوتے ہی اسے بے پناہ گھٹن کا احساس ہوا تھا۔ اس نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی۔ وہ اس کے پاس ہی تو تھا۔ یوں کہ وہ اس کے دائیں بازو اور دائیں ٹانگ کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ اس میں سانس مزید رکنے لگی۔ یکلخت رات کے مناظر اس کے ذہن کے پردے پر لہرائے، خوف کی ایک سرد لہر تھی جو اس کو پسینے میں نہلا گئی۔

"یا اللہ! میں زندہ ہوں۔ ابھی تک۔ کیوں ہوں میں زندہ۔ کیا اتنی حقارت، اتنی ذلت سہنے کا حوصلہ تھا مجھ میں۔ کیا میرے اعصاب اتنے مضبوط ہیں؟ یا پھر۔۔۔؟ وہ سب جو اس شخص نے میرے ساتھ کیا ہے، کیسے سہہ لیا میں نے؟ وہ سب گالیاں جو اس نے مجھے دی ہیں۔ کیسے سن لیں میں نے؟ میں مر کیوں نہ گئی۔ اتنی وحشت، ایسی درندگی کیسے جھیل گئی ہوں میں؟ کیا میں اتنی حوصلہ مند ہوں؟" وہ حیران تھی، بے حد حیران۔

اتنی تذلیل اور ایسی بے بسی!
اتنی سفاکی اور جنون!

اسے اپنے گرد لپٹا اس کا بازو کسی ناگ کی مانند لگا تھا۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ ہر ہر عضو میں بھر جانے والی اذیت اس کی رگ جاں کو توڑ رہی تھی۔ کتنے بے آواز آنسو اس کے گالوں سے بہتے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

سچ کہا تھا شاہ فضل نے۔ حیثیت کا تعین حقیقتاً ہو چکا تھا۔ کیا حیثیت دی گئی تھی اسے۔ شاہ فضل نے ایک رات میں ہی عملاً "اسے" رولے سے اسے سمجھا دیا تھا۔

"میرے باہر جنگل جلتا
اور میرے اندر آگ
آگ نکالوں
سب جل جائے
آگ چھپاؤں
خود جل جاؤں"

☼ ☼ ☼

کتنے ڈھیر سارے دن بیت گئے۔ اریبہ کو یاد نہیں تھا۔ اس نے دنوں کا حساب رکھنا چھوڑ دیا تھا یا شاید اس قید خانے میں وقت کے شمار کا تصور ہی نہ تھا۔ زندگی عین اس انداز میں بسر ہو رہی تھی، جس طرح شاہ فضل چاہتا تھا۔

اس کی حیثیت کا تعین ہونے کے بعد وہ تمام مراعات سے بھی مستثنیٰ قرار دے دی گئی تھی۔ اس وقت وہ بالکل اسی انداز میں رہ رہی تھی جیسے دیگر خادمائیں رہتی تھیں۔ ان سب کی طرح وہ صبح پانچ بجے اٹھ جاتی۔ کچن کا سارا کام اس کے ذمہ تھا۔ وہ برتن صاف کرتی، دودھ ابالتی، آٹا گوندھتی اور بوقت ضرورت سبزی وغیرہ کاٹ لیتی تھی۔ سالن بنانا ندرت کی ذمہ داری تھی۔

اس کے علاوہ شاہ فضل کی ساری ذمہ داری بھی اسی پر تھی۔ وہ ملازماؤں کے ساتھ ہی کھاتی پیتی تھی یا پھر جو شاہ فضل کا بچا کھچا ہوتا۔ بالکل عام بیگ۔ کسی حد تک بد مزہ، صبح کپڑے، کچن کی صفائی۔ سارا دن گدھوں کی طرح مشقت کرنے کے بعد اس کے پاس یہ حق بھی نہ تھا کہ وہ دو گھڑی لیٹ کر کمر سیدھی کر سکے۔ اسے رات کے کھانے کے برتن صاف کرنے ہوتے تھے اور اس کے ساتھ کچن بھی صاف کرنا ہوتا تھا۔ سونے کے لیے اسے بہرحال شاہ فضل کے کمرے میں جانا ہوتا تھا۔ یہ شاہ فضل کا حکم تھا جس سے سرتابی کی اسے مجال نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

"شاہ سائیں! کھانا۔" اس نے بڑی سی ٹرے ٹیبل پر رکھی اور مدھم آواز میں کہا۔

وہ کمپیوٹر پر کوئی کام کر رہا تھا۔

"جاؤ۔" اس نے سر اٹھائے بغیر حکم دیا۔

وہ خاموشی سے چلتی باہر آ گئی۔ کچن میں آ کر اس نے وہ ڈھیر برتن دھونے شروع کر دیے جن سے سارا سنک بھرا ہوا تھا۔ مسلسل کام کر کر کے اس کی کمر دکھ رہی تھی اور ٹانگیں جیسے بے جان ہو رہی تھیں مگر وہ بے حس بنی کام میں لگی رہی۔ احساسات جگا کر کیا ہی کیا تھا۔ زندگی صرف درد و غم سے عبارت رہ گئی تھی۔ بے حسی نے اسے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ رات کا تیسرا پہر شروع ہو رہا تھا۔

وہ کام ختم کر کے باہر نکلنے کو تھی۔ اس کی نظر شاہ فضل کے کمرے سے واپس لائی گئی ٹرے پر پڑی، اس کی پلیٹ میں بچے ہوئے چاول موجود تھے۔ اسے ایک دم احساس ہوا، اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ پیٹ میں جیسے آگ سی لگی ہوئی تھی۔ وہ بے اختیار پلیٹ تھام کر نیچے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔ اسی وقت قدموں کی چاپ ابھری اور اس کے ساتھ ہی شاہ فضل کی صورت دروازے کے فریم میں دکھائی دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"حکم سائیں!" اس نے نظریں جھکا کر کہا، اب زندگی صرف ان ہی دو لفظوں پر محیط ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ آگے بڑھ کر کچن میں پڑی ٹیبل کے گرد رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے حکم دیا۔ وہ خاموشی سے اس کے پیروں میں بیٹھ گئی۔

"کھانا کھاؤ۔" اگلا حکم ہوا۔ اریجہ کے ہاتھ میکانکی انداز میں پلیٹ کی طرف بڑھ گئے مگر جانے کیوں ہر نوالہ حلق میں اٹک رہا تھا۔ آنسوؤں کا گولہ سا حلق میں پھنسا ہوا تھا شاید۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بڑے کروفر سے یوں بیٹھا تھا کہ اس کا دایاں پاؤں بالکل اریجہ کے چہرے کے قریب تھا۔ اگر وہ ذرا سی حرکت کرتا تو لازما" اس کا پیر اس کے منہ پر جا لگتا۔ تذلیل کے احساس سے اریجہ کا چہرہ زرد سا ہو رہا تھا۔ جانے کیوں وہ اس غیر انسانی سلوک کی عادی نہیں ہو پا رہی تھی۔ صرف چند نوالے لینے کے بعد اس نے ہاتھ روک لیا۔ خاموشی سے اٹھی' پلیٹ سنک پر دھری' پانی پیا اور ہاتھ دھونے لگی۔

"چائے بناؤ۔" اس کی سرد آواز گونجی تھی۔

وہ خاموشی سے کوکنگ رینج کی طرف بڑھ گئی۔

چائے بناتے ہوئے اسے یاد آیا' نجانے کتنے دن بیت چکے تھے اسے اس نعمت سے لطف اندوز ہوئے' وہ چائے کی دیوانی تھی مگر یہاں تو دو وقت کھانا کھانا بھی ٹھیک سے یاد نہ رہتا تھا۔

چائے مگ میں انڈیل کر اس نے مگ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ مسلسل اس پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ وہ اندر ہی اندر لرز اٹھی۔ نجانے اب کون سی سزا سنائی جانے والی تھی۔

دو منٹ میں اس نے چائے ختم کر لی تھی' مگ اسے تھما کر وہ اٹھ گیا' اریجہ نے خاموشی سے اسے جاتے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اس نے کپ دھو کر اسٹینڈ پر رکھا اور اس کے پیچھے چل پڑی۔ وہ اس کی خواب گاہ میں داخل ہوئی تو قدم وہیں تھم کے ہو رہے تھے۔ وہ لباس تبدیل کر کے بیڈ پر جھول رہا تھا۔

"تمہیں لگتا ہے تم مظلوم ہو' تمہارے ساتھ ظلم ہو رہا ہے؟" اس کی بھاری پر تحکم آواز میں سوال تھا۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا' اسے مشکل میں ڈالنے والے سوالات کرتا تھا۔

اریجہ نے اپنی لرزتی ٹانگوں پر بمشکل قابو پایا اور قدرے مستحکم لہجے میں بولی۔

"سچ تو یہی ہے۔"

"خوب' تمہاری یہی بات اچھی ہے۔ تم کم بولتی ہو مگر خوب بولتی ہو۔" اس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ وہ غیر محسوس انداز میں سہم سی گئی۔

"تمہارے اس ذلیل بھائی کا پتا نہیں چل رہا۔ میرے آدمی چاروں طرف اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ قوی خیال یہی ہے کہ وہ علاقہ غیر کی طرف نکل گیا ہے' مگر۔۔۔ وہ بچ نہیں پائے گا۔ جب تک اس کے ٹکڑے کر کے "ملک ہاؤس" میں نہیں بھجواؤں گا' سکون نہیں آئے گا۔" اس کے لہجے میں خون آشام درندے کی سی پھنکار تھی۔ ضبط کرتے کرتے بھی اریجہ کی آنکھوں سے کئی آنسو ڈھلک گئے۔

"رو کیوں رہی ہو؟" وہ مزید غضب ناک ہوا تھا۔

"آپ مجھے کس جرم کی سزا دے رہے ہیں؟" وہ جیسے سراپا سوال بن گئی تھی۔

"تم خود کو بے قصور سمجھتی ہو؟" وہ دھاڑا۔ وہ لرز اٹھی مگر مضبوطی سے کھڑی رہی۔ ۔۔۔ تو وہ جیسے سارے حساب ۔۔۔ بیٹھی تھی' وہ کیوں بے دلت ۔۔۔ بے قصور ۔۔۔

"منصور ملک نے میرے بھائی کو قتل کروا ڈالا اور تم ۔۔۔ لگتا ہے تم بے قصور ہو؟" وہ اس کا بازو دبوچے غرایا تھا۔

"میں نے تو نہیں کہا تھا منصور لالہ سے کہ وہ ۔۔۔" ابھی بات اس کے منہ میں ہی تھی کہ جب شاہ فضل کا ہاتھ برق رفتاری سے اس کے گال پر پڑا۔ وہ درد کی شدت سے چلا اٹھی۔

"تم۔۔۔ تم۔۔۔ تمہاری اتنی جرأت کہ میرے سامنے بلند آواز میں بولو؟ میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔ تم۔۔۔" وہ جنونی ہو کر اس پر جھپٹا اور اسے ٹھوکروں پہ رکھ لیا' وہ بلند آواز میں چیخ رہی تھی۔ اس کے پیروں کی پے در پے پڑنے والی ضربات نے اسے ادھ موا سا کر دیا تھا۔ وہ رو رہی تھی' معافیاں مانگ رہی تھی مگر وہ جیسے ہر صدا سے ناآشنا ہو چکا تھا۔

"ماریں' مجھے جان سے مار ڈالیں۔ مجھے مارنے سے اگر آپ کا بھائی واپس آسکتا ہے تو میری جان بھی لے لیں۔" وہ بلند آواز سے روتے ہوئے بولی تو وہ ایک دم رک گیا۔ چند لمحے اسے سرخ آنکھوں سے گھورتا رہا' پھر اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ وہ درد کی شدت سے بلبلا اٹھی۔

"تمہیں مارنے سے میرا بھائی تو واپس نہیں آئے گا مگر میرے سینے میں لگی آگ پر چند چھینٹے ضرور پڑیں گے۔" وہ سفاکی سے بولا۔

میرے لیے یہ سانسیں بھی
اتنی مشکل کیوں ہیں؟
میری آنکھوں کے آگے
اتنی دیواریں کیوں ہیں؟
میرے پیروں میں اتنی
زنجیریں کیوں ہیں؟
میرے ماتھے پر ایسی
تقدیریں کیوں ہیں؟

وہ جانتی تھی' اس کے لیے کوئی راہ فرار نہیں تھی۔ خوشی سے یا ناخوشی سے' بہر کیف اسے اس برزخ میں جلنا تھا' اس کے لیے کوئی روزن نہ تھا' اس کے لیے کوئی ہمدرد یا مسیحا نہیں آئے گا' اسے یہ یقین کر لینا چاہیے۔ حویلی کے دیگر افراد یکسر بے پروا ہو چکے تھے۔ بی بی جان سمیت اور اگر اسے اس طرح ہی زندہ رہنا تھا' اتنی ہی تذلیل و حقارت کے ہمراہ تو وہ زبان چلا کر اپنی سزا کو سخت کیوں کر رہی تھی۔ کیوں چپ چاپ سولی پر نہیں چڑھ جاتی کہ جب مقدر یہی تھا۔ اسے یاد تھا۔ اس نے کبھی "ملک ہاؤس" میں کچن کا کوئی کام نہ کیا تھا' اس کی ضرورت ہی پیش نہ آئی تھی' آگے پیچھے ملازمین کی فوج ہوتی تھی اور آج تقدیر نے اس سے کیسی دغابازی کی تھی۔ وہ حالات کے اس رخ پر گنگ سی تھی۔ وہ تو بابا کی پری تھی جسے کبھی کسی نے پھولوں کی چھڑی سے بھی نہ چھوا تھا۔ آج وہ شخص جو کہنے کو اس کا شرعی شوہر تھا' اس کے سر کا سائیں تھا' کیسے جانوروں کی طرح پیٹتا تھا اسے' معمولی معمولی سی غلطیوں پر وہ اس کی کھال ادھیڑ ڈالتا تھا۔ وہ کیوں اپنی زندگی کو اتنا مشکل بنا رہی تھی؟ زندگی آسان بھی ہو سکتی تھی اگر وہ خاموشی کی عادت ڈال لیتی۔ اس رات فرش پر زخموں سے بھرے وجود کے ساتھ اس نے سوچا اور ایک پختہ فیصلہ کر لیا۔

☆ ☆ ☆

دن رات ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ سورج طلوع اور غروب ہو جاتا' اریجہ کی زندگی ان چیزوں سے ماورا ہو چکی تھی۔ اس کے لیے دن اور رات سب ایک جیسے تاریک تھے۔ کبھی کبھی اسے لگتا وہ تصویر اس کی زندگی کی بالکل حقیقی منظر کشی کر رہی تھی۔ وہ بھی تو ایسے ہی ایک سیاہ صحرا میں پھنس گئی تھی' پیاس سے نڈھال ہو چکی تھی اور کیسی تھی یہ پیاس؟ رشتوں کی پیاس' محبتوں کی پیاس؟ جس کی طلب کی شدت سے اس کی زبان باہر نکل آئی تھی' اس کے پیچھے وہ گھڑ سوار بھی ویسا ہی تھا جیسا شاہ فضل تھا' انتقام میں اندھا' پاگل' نفرت کا زہر اس کے اندر اٹھ رہا تھا۔

تذلیل' بے حسی اور بے التفاتی نے اس کے وجود کی ساری شادابی کو نچوڑ ڈالا تھا۔ رنگت میں زردیاں گھنڈ گئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد گہرے ہوتے حلقے اور پپڑی زدہ ہونٹ' وہ اریجہ کا سایہ معلوم ہوتی تھی۔

اس وقت وہ اور ندرت دونوں کچن میں شام کا کھانا بنا رہی تھیں۔

"ندرت!"

"جی اریجہ بی بی!" وہ ادب سے بولی۔

"یہ اتنی ساری عورتیں بی بی جان کے پاس روز کیوں آتی ہیں؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"دعا کے لیے۔" ندرت نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"بیگم سائیں کی دعا بڑی قبول ہوتی ہے جی۔" ندرت نے عقیدت سے کہا۔

"اچھا... میں بھی ان سے ایک دعا کے لیے کہوں؟" وہ کچھ جھجک کر بولی۔

"کیوں نہیں بی بی؟ آپ کا تو حق ہے۔"

"حق؟ اونہہ!" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس نے باہر دیکھا بڑا سا صحن اب خالی ہو رہا تھا۔ بھیڑ بتدریج چھٹتی جا رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی بی بی جان کے پاس آ بیٹھی۔ بڑی عقیدت سے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"میرے لیے بھی ایک دعا کیجیے بی بی جان!" اس نے نم آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ دھرا اور کہا۔

"بول بیٹی!"

"میرے لیے دعا کیجیے بی بی جان! کہ اللہ تعالیٰ میری سانسیں مختصر کر دے۔ اب اور جینے کی خواہش نہیں رہی۔" اس کی بند آنکھوں سے دو آنسو بہہ نکلے۔

بی بی جان کو جھٹکا سا لگا۔

"ایسے نہیں کہتے بیٹی! زندگی تو رب کی نعمت ہے۔" انہوں نے اسے پیار سے جھڑکا۔

"بی بی جان! جب نعمت بوجھ لگنے لگے تو اس کا نہ ہونا ہی بہتر ہے۔" وہ کرب ناک لہجے میں بولی تھی۔

ندرت حیرت سے پیچھے کھڑی سب سن رہی تھی۔ وہ اٹھی اور چلتی ہوئی واپس کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اس بات سے بے خبر کہ ندرت خاموشی سے مردان خانے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ معمول کے کام نبٹا کر مردان خانے کی طرف بڑھ گئی۔ دن کی مشقت اختتام پذیر ہو چکی تو کیا ہوا رات کی تو باقی تھی۔ بس زندگی اب بے حد مشکل کا نام ہی تو رہ گئی تھی۔

وہ اندر داخل ہوئی تو وہ فون پر کسی سے محو گفتگو تھا۔ اریجہ خاموشی سے واش روم کی سمت بڑھ گئی۔ جب لوٹی تو اس کے بدن پر سفید نائٹی تھی۔ لبوں پر بے حد چمک دار سرخ لپ اسٹک تھی اور بال شانوں کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔

یہ اس کا حکم تھا جس کی اسے ہر حال میں تعمیل کرنا تھی۔

وہ بستر پر دراز ہو چکا تھا۔ اریجہ جھک کر اس کے پیروں پر لحاف پھیلانے لگی پھر پائنتی والی سائیڈ پر بیٹھ کر اس کے پیر دبانے لگی۔ یہ تو روز کا معمول تھا۔ سر جھکے ہونے کے باوجود بھی وہ شاہ فضل کی خود پر جمی نگاہ محسوس کر سکتی تھی۔ اس کی ہتھیلیاں بھیگنے لگیں۔

"آج بی بی جان سے کیا بات ہوئی تمہاری؟" اس کی بھاری سرد آواز اریجہ کو پسینے میں نہلا گئی۔

اس کا رنگ اتنی تیزی سے زرد پڑا کہ شاہ فضل کو لگا جیسے اس پر زرد رنگ کا پینٹ کر دیا گیا ہو۔ کچھ کہنے کی کوشش میں اس کے لب کپکپائے پھر باہم پیوست ہو گئے۔ اس نے سہمی ہوئی ہراساں نگاہ اٹھا کر ایک نظر شاہ فضل کو دیکھا اور پھر فوراً سر جھکا لیا۔

"کیا پوچھ رہا ہوں میں؟" اس کا لہجہ مزید سخت ہوا تھا۔ وہ ساری جان سے لرز گئی تھی۔

"وہ... وہ ندرت نے بتایا تھا کہ بی بی جان کی دعا بہت قبول ہوتی ہے... میں نے ان سے کہا کہ وہ میرے لیے بھی دعا کریں۔"

وہ رکی۔ آگے ہمت ختم ہو چکی تھی۔ اس نے قدرے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیسی دعا؟"

"یہی... یہی کہ..." وہ پھر رکی مگر بتانا لازم تھا۔ "وہ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری سانسیں مختصر کر دے۔" اس نے ہمت کر کے کہہ تو دیا تھا مگر اب دم سادھے اس کے رد عمل کی منتظر تھی۔

"بس اتنی سی خواہش ہے تمہاری؟" وہ حیرت سے بولا اور ہاتھ بڑھا کر اسے نزدیک کر لیا۔

"یہ خواہش تو تمہاری میں بھی پوری کر سکتا ہوں۔ دعاؤں سے زیادہ عمل پر یقین رکھتا ہوں میں۔" اس کا ہاتھ اس کی گردن پر رینگنے لگا۔ اریجہ کی سانس رکنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے پانی نکلنے لگا مگر وہ بے حس و حرکت رہی۔

"تمہاری ایک چیز بہت اچھی ہے، تمہاری فرماں برداری۔ مجھے یقین ہے میں اگر تمہیں ابھی مار ڈالوں تو تم مزاحمت نہیں کرو گی۔ ہے نا؟" وہ یقین چاہ رہا تھا۔

"جی سائیں!" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ اس کا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

"مجھے ایک بات کی خوشی ہے اریجہ! کہ تم اپنی زبان بہت کم استعمال کرتی ہو اور یہ تمہارے حق میں ایک پلس پوائنٹ بن جاتا ہے۔ جب تم حویلی آئی تھیں تو کافی بد تمیز تھیں۔ اب تو کافی کچھ سیکھ چکی ہو۔" دھیمے رنگ سے اس کے دل کو چوکے لگا رہا تھا۔

وہ لب کچلتے ہوئے آنسو روکنے کی کوشش کرتی ہلکان ہونے لگی۔

"اتنا ڈرتی کیوں ہو مجھ سے؟" ایک بار پھر ایک مشکل سوال کا پھندا اس کے لیے تیار تھا۔

"کچھ پوچھا ہے میں نے تم سے؟" اس نے کہتے ہوئے اریجہ کو مزید اپنے قریب کر لیا۔

"ایسا... نہیں۔" اس کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

شاہ فضل نے لحاف اوپر کھینچا تو وہ مکمل طور پر لحاف میں چھپ گئی پھر پتا نہیں کیا ہوا وہ اس کے فراخ سینے میں منہ چھپا کر شدتوں سے رو پڑی۔

"مت رویا کرو اتنا!" اس کا موڈ خراب ہوا تھا۔

اریجہ کی سسکیاں فوراً مدھم پڑی تھیں۔ خود پر قابو پاتے ہوئے وہ سونے کی کوشش کرنے لگی مگر نیند کہاں؟؟؟

"اریجہ!" اس نے پکارا۔

"جی" وہ مدھم سا بولی۔

لحاف کھسکا کر شاہ فضل نے اس کا چہرہ دیکھا۔ رونے کے باعث آنکھیں متورم اور ناک سرخ ہو رہی تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"کچھ نہیں سو جاؤ۔" اب کی بار اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

اگلی صبح بہت چمکدار اور نکھری ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے کمرے سے نکل آئی۔ لان میں جانے کی اجازت نہیں تھی اس لیے وہ جالی کے دروازے کے پاس آ بیٹھی، حالانکہ اسے بند کمروں سے ہمیشہ وحشت ہوتی تھی۔ وہ تو "ملک ہاؤس" میں ہمیشہ اپنے کمرے کی کھڑکی کھلی رکھتی تھی۔ اسی وقت ندرت اپنے آنچل میں ڈھیروں پھول سمیٹے اندر آئی۔ اسے یوں بیٹھا دیکھ کر چونک گئی۔

"کیا بات ہے بی بی! آپ ایسے کیوں بیٹھی ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ ویسے ہی۔" وہ اٹھ گئی۔

"تم مجھے اتنے احترام سے مت بلایا کرو ندرت! میری حیثیت تو تم سے بھی گئی گزری ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں بی بی!" ندرت حیران رہ گئی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" وہ واپس پلٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

آج شاہ فضل کو لاہور جانا تھا۔ اسے اس کو تیار ہونے میں مدد دینا تھی۔ وہ واپس مردان خانے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ کمرے میں آئی تو وہ ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے اس کا شانہ ہلایا۔

"شاہ سائیں! اٹھ جائیں۔ آپ کو لاہور جانا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ وہ تھوڑا سا کسمسایا پھر آنکھیں کھول دیں۔

"کپڑے نکال دو میرے۔" وہ لحاف پرے کرتا اٹھ بیٹھا۔

"جی! کیا پہنیں گے؟" وہ لحاف سمیٹتے ہوئے بولی۔

"شلوار سوٹ نکال دو۔" وہ واش روم کی سمت بڑھتے ہوئے بولا۔

اریبہ سرہلاتی ہوئی الماری کی سمت بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ کریم کلر کے شلوار سوٹ میں ملبوس براؤن واسکٹ پہنے لوٹا تو بالکل روایتی جاگیردار لگ رہا تھا۔ بے پناہ وجیہہ و شکیل' سیاہ لیے بال ماتھے پر بکھرائے وہ واقعی غضب ڈھا رہا تھا' اریبہ چند پل اسے یک ٹک دیکھتی رہی' یہ سوچے بغیر کہ وہ بلا کا زیرک تھا' کیسے محسوس نہ کرتا' فوراً "پلٹا" اسے اپنی طرف محویت سے دیکھتا پا کر بڑے جان دار انداز میں مسکرایا۔

"بس' ہار بیٹھی ہو دل۔" وہ تمسخر سے ہنسا۔

اریبہ کے سینے میں جیسے کسی نے زہر آلود خنجر پیوست کر دیا۔ اس کا رنگ پہلے زرد ہوا پھر سرخ' وہ خاموشی سے جھک کر گیلا تولیہ اٹھانے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتی' بازو اس کی گرفت میں آ گیا۔

"جواب نہیں دیا تم نے میری بات کا؟" اس کے لہجے میں محظوظ ہونے والی کیفیت تھی۔ دروازے پہ دستک کی آواز سن کر اس نے اریبہ کا بازو چھوڑ دیا۔

اریبہ نے بے دردی سے ہونٹ کاٹے۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور ندرت اندر آ گئی۔

"سلام سائیں! صبح بخیر۔" اس نے کلیوں کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر سائیڈ ٹیبل پر رکھے اور واپس مڑ گئی۔

"ناشتہ کریں گے؟" اریبہ نے موقع غنیمت دیکھ کر بات بدلی۔

"نہیں' چائے لے آؤ۔" وہ بھی مڑ کر بال بنانے لگا۔ اریبہ شکر کرتی باہر نکل آئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چائے لے آئی' وہ دائیں ہاتھ سے مگ تھامے صوفے پر بیٹھ کر بائیں ہاتھ سے موبائل پر کوئی نمبر ملانے لگا۔ اریبہ نے اس کے موزے نکالے اور زمین پر بیٹھ کر جوتے پہنانے لگی۔

"تمہارے والد صاحب کا فون آیا تھا۔" شاہ فیصل نے جیسے اس کے سر پر بم پھوڑا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

"تم بات کرنا چاہو تو کر سکتی ہو۔ میری طرف سے کوئی دباؤ نہیں ہے۔" اس نے موبائل اریبہ کی طرف بڑھایا۔ وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔

"نہ۔۔۔ نہ۔۔۔ نہیں۔ مجھے نہیں کرنی بات۔ مجھے ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا جنہوں نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے اپنی بیٹی کو داؤ پر لگا دیا۔" اس کا نفس بے ترتیب تھا اور بڑی بڑی غلافی آنکھیں یک لخت آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں۔

شاہ فیصل نے لاپروائی سے شانے جھٹکے اور موبائل جیب میں ڈال کر اٹھ گیا۔

"فی امان اللہ۔" اریبہ نے آہستگی سے کہا۔ شاہ فیصل کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ بے اختیار پلٹا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اریبہ کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

پھر آہستگی سے اس سے الگ ہو گئی۔ شاہ فیصل کے ہاتھ نے نرمی سے اس کے گال کو تھپتھپایا اور وہ واپس مڑ گیا۔

وہ ساکت و صامت سی کھڑی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ شاہ فیصل تھا' اتنا نرم' اتنا مہربان؟ اس نے بے یقینی سے اپنے گال کو چھوا جو ابھی تک اس کے ہاتھ کے لمس سے دہک رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اریبہ معمول کے مطابق رات کے کھانے کے بعد کچن صاف کر رہی تھی جب اس نے ندرت کو اندر آتے دیکھا۔

"تم یہاں اس وقت؟ کیا بات ہے؟" اریبہ نے حیرانی سے پوچھا' رات کے بارہ بج رہے تھے۔

ندرت نے اضطراری انداز میں انگلیاں چٹخائیں اور پریشانی سے اسے دیکھا تھا۔

"کیا بات ہے ندرت؟" وہ الجھ گئی۔

"وہ' اریبہ بی بی! آج فیصل سائیں کا جنم دن ہے۔" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے بتایا۔ اریبہ کو جھٹکا سا لگا۔

"کیا؟ شاہ سائیں کدھر ہیں؟" اس نے فوراً پوچھا۔

"وہ' میں نے نا' ابھی ابھی انہیں فیصل سائیں کے کمرے میں جاتے دیکھا ہے۔ آپ سے مجھے کہنا تھا کہ آپ خاموشی سے اپنے کمرے میں ہی سو جائیں۔ مردانے میں مت جائیے گا۔" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ازراہ ہمدردی کہا۔

"کیوں؟"

"وہ جی' انہیں آپ کو دیکھ کر پھر غصہ آ جائے گا۔" اس نے سمجھایا۔ اریبہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ہنسے یا روئے۔ کون سے غصے کی بات کر رہی تھی وہ؟

وہ غصہ' وہ طیش اور وہ اشتعال جسے جھیلتے ہوئے وہ اتنی سخت جان ہو گئی تھی کہ اسے خود حیرانی ہوتی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے [illegible] اور پلٹ کر سنک میں ہاتھ دھونے لگی۔ ندرت مطمئن ہو کر واپس مڑ گئی۔

اس کے جانے کے بعد اریبہ نے ایک طائرانہ نظر کچن پر ڈالی اور لائٹ آف کر کے دروازہ بند کرتی باہر نکل آئی۔

اس کے قدم مردانے کی سمت بڑھ رہے تھے۔ اس نے شاہ فیصل کے کمرے' جو اس نے ہمیشہ بند ہی دیکھا تھا' کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی شاہ فیصل کھڑا تھا۔ دروازے کی طرف اس کی پشت تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ مڑا اور اریبہ نے دیکھا اس کے ہاتھ میں فوٹو فریم تھا۔ غالباً' نہیں یقیناً اس میں شاہ فیصل کی تصویر تھی۔

اریبہ نے شاہ فیصل کا چہرہ دیکھا اور لرز گئی۔ کتنا درد تھا اس چہرے پر' کتنا کرب! یوں جیسے کائنات کی ہر اذیت' روئے زمین کا ہر دکھ اور سات سمندروں کی پیاس اس کے چہرے پر سمٹ آئی تھی۔ اس کی چمک دار آنکھیں کتنی کرب آمیز محرومی سے آویزاں تھیں۔ اس کی مغرور کھڑی ناک پہ کتنی بے بسی تھی۔ اتنا محروم اور اتنا پر وحشت چہرہ! اریبہ کو لگا یہ چہرہ اس کا اپنا تھا۔ بالکل ایسا ہی تو تھا اس کا چہرہ! محرومیوں کی دھوپ میں اٹا' رشتوں کی پیاس میں بھٹکا ہوا۔

آہ!

ہم اپنے دلوں کو
اپنی اپنی شیشیوں میں
اتنی زور سے بھر لیں
کہ شیشیوں میں پھوٹنے والا کرب
شیشیوں میں کم ہو کر رہ جائے

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور اس کے مقابل آ کر ٹھہر گئی۔

"کیوں آئی ہو یہاں؟ میری آگ کو بھڑکانے یا میرے احساس زیاں کا اندازہ لگانے کے لیے؟" وہ بہت ٹوٹے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"آج فیصل کا جنم دن ہے اگر۔۔۔ اگر وہ ہوتا تو آج وہ بائیس سال کا ہو جاتا۔" اس کا لہجہ کتنا خالی تھا۔

"آپ بہت پیار کرتے تھے ان سے؟" وہ پتا نہیں کیوں پوچھ بیٹھی تھی۔

"ہاں۔ بہت پیار کرتا تھا میں اس سے۔۔۔ یہ دیکھو' دیکھو۔ اس کمرے میں ہر چیز میری پسند کی ہے۔ وہ میری پسند کو اولیت دیتا تھا۔ ہمیشہ جب حویلی آتا تو کہتا۔

"لالہ! آپ اب شادی کر لیں۔" اور میں ہر بار ہنس دیتا۔ میں کہتا۔

تم اپنا ایم بی اے پورا کر لو۔ پھر اکٹھے ہی کر لیں گے۔

اور وہ فوراً بدک جاتا۔ "میں۔۔۔ میری کیوں؟" اور میں کہتا۔

"ارے بھئی! مجھے تمہارے بغیر کام کرنے کی عادت نہیں ہے نا! اور شادی کے لیے مورل سپورٹ تو مجھے تم ہی سے ملے گی' جب مجھے پتا چلے گا کہ قربان گاہ میں صرف میں ہی نہیں' تم بھی ہو۔"

وہ آگے سے بس ہنستا جاتا اور میں' جو کبھی بلند آواز میں ہنسنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے آنے پر یہ حویلی میرے قہقہوں سے گونجا کرتی تھی۔ یہ دیکھو۔" شاہ فیصل نے ہاتھ میں پکڑی تصویر اسے دکھائی۔

اریجہ نے مضمحل نظروں سے دیکھا۔ مسکراتے ہوئے دو چہرے اس کے سامنے تھے۔

"شاہ فضل اور شاہ فیصل۔"

وہ تصویر سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کر الماری کی سمت بڑھ گیا۔ اس نے دونوں پٹ کھول دیے۔ اندر آج بھی اس کے کپڑے اسی طرح سجے تھے۔ شرٹس، جینز، ٹائیاں، قیمتی پیس، شلوار کرتے، اجرکیں اور جیکٹیں۔

"یہ سب اس نے میرے ساتھ جا کر خریدے تھے۔"

اس نے تھکے ہوئے انداز میں پٹ بند کر دیے۔ اور ان سے پشت ٹکا دی۔

"ہر صبح میں انتظار کرتا ہوں کہ میرے سیل پر کال آئے گی اور وہ ہنستے ہوئے کہے گا۔"

"لالہ! آپ بہت یاد آرہے ہیں۔ آپ میرے پاس آجائیں۔"

اور میں اسے ڈانٹ دوں گا اور کہوں گا۔ "تم خود آجاؤ میں بہت مصروف ہوں۔"

لیکن ہر صبح، ہر شام اور ہر رات میرا دل صرف انتظار ہی کرتا رہتا ہے اور میرا فون۔۔۔ اس پر کوئی بیل نہیں بجتی۔ حالانکہ رنگ ٹون اس نے خود سیٹ کی تھی۔ کہتا تھا۔ "تھوڑے سے ماڈرن ہو جائیں۔"

"اب وہ نہیں آئے گا۔ اب تو صرف میں اس کے پاس جاؤں گا۔" اس نے نچلا لب دانتوں سے کچل ڈالا۔

"مگر یہ انتظار۔۔۔ ختم نہیں ہوتا۔ بہت روکا تھا میں نے اسے۔ بہت سمجھایا تھا کہ وہ منصور ملک سے دوستی ختم کر دے مگر وہ مانا ہی نہیں۔ وہ تو میری ہر بات مانتا تھا، حکم سمجھ کر۔ جو میں کہتا اس پر کرنا لازم ہو جاتا۔ مگر پتا نہیں منصور ملک کے معاملے میں اس نے میری بات کیوں نہ مانی؟

کیا دشمنی تھی اسے میرے فیصل سے؟ کیوں اس نے ایسا کیا؟ کیوں اس نے میرے وجود کا ٹکڑا چھین لیا مجھ سے؟ کیوں ادھورا کر دیا مجھے؟ کیا بگاڑا تھا میرے فیصل نے اس کا؟"

اس کے لہجے میں ٹوٹی کرچیوں کی سی چبھن تھی۔

"میرا دل چاہتا ہے کہیں سے ایک بار منصور میرے سامنے آجائے اور میں اس سے پوچھوں کہ مجھے فیصل کی وہ غلطی تو بتا دے جس کی پاداش میں اس نے اتنے بے رحمانہ طریقے سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

اس کی آنکھوں کی سرخی بتدریج گہری ہونے لگی تھی۔

اریجہ کو لگا وہ ابھی رو دے گا۔

"آج میرے سیل پہ اس کے کتنے ہی دوستوں کی کالز آئی تھیں۔ وہ سب اس کی سالگرہ منا رہے تھے اس کے نہ ہونے کے باوجود۔ کوئی میرے دکھ کا تو مداوا کرے۔ وہ مجھے نظر کیوں نہیں آتا۔ میں کسی بھٹکی ہوئی روح کی مانند اس حویلی میں چکراتا رہتا ہوں۔ یہ حویلی، یہ گاؤں، یہ کھیت کھلیان، ہر جگہ اس امید پر کہ مجھے کہیں تو دکھائی دے گا۔ اس کی ہنسی میں ایک بار پھر سن سکوں گا، مگر میرا انتظار، انتظار ہی رہ جاتا ہے۔"

اس کی گردن جیسے غم کے بوجھ سے بھاری ہو کر سینے پہ گر گئی۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں کارپٹ پہ بیٹھ گیا۔

"ایک بار نفسیات کے پروفیسر نے ہیومن ایڈکشن کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم جب زندگی میں کسی اور شخص کے ساتھ کے عادی ہو جاتے ہیں تو یہ شخص نشے کی طرح ہماری طلب بن جاتا ہے۔ یہ شخص ہماری زندگی سے نکل جاتا ہے، ہمیں چھوڑ دیتا ہے اور ہم سے بہت دور چلا جاتا ہے تو ہم اذیت و درد کے ناقابل بیان تجربے سے گزرتے ہیں۔

"یہ اذیت مجھے مستقبل کی طرف نہیں بڑھنے دیتی۔ مجھے اندر سے کاٹتی رہتی ہے، بالکل کسی ننگے ہوئے بلیڈ کی طرح۔۔۔ اور یہ اذیت مجھے ایک جنونی

کیفیت میں دھکیل دیتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں ہر چیز تہس نہس کر دوں۔ میں۔۔۔ میں تمہیں دیکھتا ہوں تو تمہارے چہرے میں مجھے منصور کا چہرہ نظر آتا ہے۔ وہ قاتل چہرہ جسے یاد کر کے میرا خون کھول اٹھتا ہے اور میں خود پر سے اختیار کھو دیتا ہوں۔ تمہیں اذیت دینے کی خواہش ہوتی ہے پھر میں یہ بھی بھول جاتا ہوں کہ تم اریجہ ہو منصور ملک نہیں ہو۔

لیکن سکون پھر بھی نہیں ملتا۔ شاید وہ کبھی نہیں مل سکے گا۔ یہ ذہنی خلفشار شاید مجھے پاگل کر کے چھوڑے گا۔" اس نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

"تم چلی جاؤ یہاں سے۔۔۔ میں آج تمہیں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس سے پہلے کہ میں ایک بار پھر خود پر سے اختیار کھو دوں، تم جاؤ، جاؤ۔" وہ بلند آواز میں دھاڑا تھا۔ اریجہ نے ہراساں ہو کر اسے دیکھا اور اضطراری انداز میں واپس مڑی اور بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے مضبوطی سے دروازہ بند کیا اور بیڈ پر گر گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پھیرے تو اسے احساس ہوا کہ اس کے چہرے سے آگ کی لپیٹیں اٹھ رہی تھیں۔

"تم ٹھیک کہتے ہو شاہ فضل! تم حقیقتاً" وہ نہیں ہو۔ جو میرے لیے ہو۔ تم صرف انتقام میں اندھے ہو رہے ہو، تمہیں ایک نہ ایک دن اپنی غلطی کا احساس ضرور ہو گا، لیکن اریجہ ملک اس وقت تک شاید زندہ نہ رہے۔۔۔۔

منصور لالہ! یہ آپ نے کیا کر دیا ہے۔ آپ کو شاید احساس ہی نہیں کہ آپ نے اس حویلی کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کر دیا ہے۔"

پہلی بار اسے منصور ملک سے شکایت ہوئی تھی۔ وہ اس کے خلاف سوچ رہی تھی اور پہلی بار اسے شاہ فضل حق پر نظر آرہا تھا۔

وہ بھی لاشعوری طور پر اسی "ہیومن ایڈکشن" کا شکار ہو رہی تھی۔

ہمارے صبر کو نیزے کی صورت
خون کے دل میں گڑتا آگیا ہے

✡ ✡ ✡

دسمبر کی اولین صبح بے حد خنک اور برفیلی تھی۔ حویلی میں جیسے اس سردی کا کوئی اثر ہی نہ تھا۔ تقریباً سب ہی ملازمین اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ اریجہ بھی اس ٹھٹھرتی ہوئی سردی میں کچن میں مصروف تھی۔ شاہ فضل کے لیے ناشتہ بناتے ہوئے اسے سردی کے باعث جھرجھریاں سی آرہی تھیں۔ اس نے بڑا سا چائے کا مگ رکھا اور ٹرے لرزتے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے باہر کی سمت بڑھ گئی۔ مردانے کی سمت بڑھتے ہوئے اس نے اپنے سرد ہاتھوں میں پکڑی ٹرے کو بمشکل تھاما ہوا تھا ورنہ اسے یوں لگ رہا تھا کہ ٹرے اب لڑھکی کہ تب۔

وہ شاہ فضل کے کمرے سے کچھ ہی دور تھی جب اچانک پتا نہیں کیا ہوا، وہ سامنے سے آتے شاہ محمود کو دیکھ ہی نہیں پائی۔ ایک زور دار ٹکراؤ کے نتیجے میں سب کچھ تہس نہس ہو گیا۔

اریجہ کے حلق سے ایک اذیت بھری چیخ نکلی۔ گرم چائے نے اس کے پیر جلا ڈالے تھے۔ کچھ چائے شاہ محمود کے کپڑوں کو بھی داغ دار کر گئی۔ وہ بے اختیار دھاڑ اٹھے۔

"تم۔۔۔ بے وقوف۔ اندھی ہو گئی؟ دیکھ کر نہیں چل سکتیں؟" ان کا ہاتھ بے اختیار اٹھ گیا تھا۔

وہ زرد رنگت لیے لرز رہی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنے پیر میں چبھی ہوئی وہ کرچی نکال سکتی جو اسے بے حد تکلیف دے رہی تھی۔

شاہ محمود کی دھاڑ سے پورا مردان خانہ گونج رہا تھا۔

"منحوس! میرا بیٹا کھا گیا تمہارے بھائی نے۔ اب تم کیا چاہتی ہو، مجھے مت دکھاؤ اپنی شکل۔ جی چاہتا ہے گولی مار دوں تمہیں۔۔۔ ذلیل۔۔۔ دور ہو جاؤ میری

نظروں سے۔" وہ اپنی بھڑاس نکال رہے تھے۔

اسی وقت شاہ فضل کے کمرے کا دروازہ کھلا' وہ تیزی سے باہر آیا۔ گیلے بال ماتھے پہ بکھرائے' وہ غالباً نہایت عجلت میں باتھ روم سے باہر نکلا تھا۔

"کیا بات ہے بابا سائیں؟" اس نے معاملے کی نوعیت سمجھ لینے کے باوجود استفسار ضروری سمجھا تھا۔

"اسے چلنے کی تمیز سکھاؤ۔" وہ سرد لہجے میں کہتے دوبارہ اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے۔ یقیناً لباس تبدیل کرنے کے خیال سے۔

شاہ فضل نے اریجہ کو دیکھا۔ خطرناک حد تک زرد رنگت لیے لرزتے وجود کے ساتھ وہ آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں نڈھال سی ہو رہی تھی۔ اس نے اریجہ کا بازو پکڑا اور اسے کمرے میں لے گیا۔ وہ کسی بے جان گڑیا کی طرح کھنچی چلی گئی۔ اسے اندر لا کر صوفے پہ بٹھایا اور خود دراز کھول کر اس کے پیروں پہ لگانے کے لیے مرہم ڈھونڈنے لگا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد وہ مطلوبہ مرہم نکال کر اس کے پاس آ گیا۔

اور... اور پھر اس صدی کا سب سے حیرت انگیز واقعہ ہوا تھا۔ وہ اس کے پیروں کے نزدیک جھک کر بیٹھ گیا۔ اس نے انگلی کی پور سے مرہم لگانا شروع کی۔ جیسے ہی اس کے ہاتھ نے اریجہ کا پیر چھوا اریجہ کے تن مردہ میں جیسے جان سی پڑ گئی۔ اس نے بے ساختہ سسکی سی بھری اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ بنا کوئی ردعمل ظاہر کیے اپنا کام کرتا رہا۔ مرہم لگانے کے بعد ٹشو سے ہاتھ صاف کیے اور اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"اریجہ! ادھر دیکھو۔" اس نے ہاتھ اریجہ کے شانوں پہ دراز کر کے اسے قریب کر لیا۔

"کیا ہوا تھا؟ بتاؤ مجھے۔" اس کا لہجہ نرم تھا۔

"وہ... میں نے... میں نے جان بوجھ کر نہیں گرایا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ پتا نہیں کیسے میرے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔" وہ روتے ہوئے اسے یقین دلا رہی تھی۔

شاہ فضل نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

"پھر؟"

"چائے ان پر گر گئی۔ جس پر انہیں غصہ آ گیا۔ سچ... میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔" اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

شاہ فضل نے دائیں ہاتھ سے اس کا چہرہ اوپر کیا جو آنسوؤں سے تر بتر تھا اور پھر یک لخت چونکا۔ اس کی نظر اریجہ کے گال پر جم گئی۔ عضلات کھنچ گئے اور بھنوؤں کے بیچ ایک شکن آ گئی۔

"انہوں نے ہاتھ اٹھایا تم پر؟" اس کے لہجے سے ہی ظاہر تھا کہ اسے کس قدر ناگوار گزرا تھا۔

اریجہ نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ شاہ فضل کے لب بھنچ گئے۔ اس نے اریجہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور بیڈ تک لے گیا۔

"لیٹ جاؤ۔ تم ٹھیک نہیں ہو۔" اس نے حکم دیا مگر اتنے نرم لہجے میں؟ اریجہ دنگ سی لیٹ گئی۔ وہ اس پر سرخ شنیل کا لحاف برابر کر کے اٹھا اور سینٹرل ہیٹر آن کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے ندرت کو بلا کر دودھ اور ابلے ہوئے انڈے لانے کا کہا۔ "فوراً" کی تعمیل کی گئی تھی۔ اس نے انڈے اور گلاس اس کی طرف بڑھایا' وہ کھانے لگی' پھر دودھ پکڑایا۔ اس نے گھونٹ گھونٹ دودھ پیا اور گلاس واپس ٹرے میں دھر دیا۔ ندرت ٹرے اٹھائی اور شاہ فضل کی طرف مڑی۔

"آپ کے لیے ناشتہ لاؤں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ ابھی نہیں۔" اس نے کہا۔

وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد شاہ فضل نے دروازہ کا بولٹ چڑھایا اور اس کے پاس آ گیا۔ اریجہ کے پیروں پہ لگی مرہم جذب ہو چکی تھی۔

"تم تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ۔ میں یہیں ہوں۔" وہ اس کے قریب نیم دراز ہو گیا۔

اریجہ نے بے بسی سے اسے دیکھا اور پلکیں موند لیں۔ ایک ایک کر کے کتنے ہی آنسو بے اختیار گرتے چلے گئے تھے۔

"کیا بات ہے؟" وہ الجھا تھا۔

"میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" اس نے جھوٹ بولا۔

وہ یہ نہ کہہ سکی کہ "شاہ فضل! اتنا نرم رویہ... اتنی توجہ اور اتنی کیئر نہ دو مجھے۔ میں تو تمہارے ظلم و زیادتی کی عادی ہو چکی ہوں۔ اب یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو گی۔"

شاہ فضل خاموشی سے اسے تکتا رہا۔ اس کے دل و دماغ کے درمیان ایک جنگ سی چھڑی تھی۔ "کیا یہ مظلوم لڑکی اس قابل ہے شاہ فضل! کہ تم کچھ دیر کے لیے ہی سہی اسے اپنے ہاتھوں کی نرمی بخش دو۔ کیا یہ بے گناہ لڑکی اس قابل نہیں؟ تمہاری وحشتوں کے چراغ اپنے لہو سے جلانے والی یہ لڑکی جسے تم ہر گھڑی روندتے ہو' اس قابل نہیں؟" کوئی اس کے اندر بولا تھا۔

وہ ہار گیا۔

اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور اس کی پیشانی پہ دھر دیا۔ اریجہ کی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔ اس کی نظروں سے ملیں اور جھک گئیں۔ وہ نرم ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا سر دبانے لگا۔

اریجہ کے اندر رم جھم سی ہونے لگی تھی۔ ایک لذت آمیز سکون اس کی رگ رگ میں سرایت کر گیا۔ وہ کب نیند کی وادی میں اتر گئی' پتا ہی نہ چل سکا۔

☼ ☼ ☼

"میں ایک بات سوچ رہی ہوں ندرت!" اس نے رات کے کھانے کے لیے تیز تیز چاول چنتے ہوئے ندرت سے کہا۔

وہ جو بڑے دھیان سے سالن پر کٹا دھنیا چھڑک رہی تھی' چونکی۔

"کیا بات؟"

"کیا...؟" وہ رک سی گئی۔ "کیا شاہ سائیں شروع سے ہی اتنے غصے والے ہیں؟" اس کے سوال میں اتنی سادگی اور چہرے پہ ایسی معصومیت تھی کہ ندرت کو پیار آ گیا۔

"نہیں اریجہ بی بی! وہ بس کچھ سنجیدہ مزاج تھے مگر اتنے غصے والے واقعی نہیں تھے مگر جب سے فیصل سائیں گئے ہیں تو کسی نے انہیں مسکراتے نہیں دیکھا۔ ہنسنا تو جیسے بھول گئے ہیں۔ بڑی بیگم سائیں بہت روتی ہیں۔ کہتی ہیں میری قسمت میں میرے بچوں کی خوشی تھی ہی نہیں۔ ایک کے لیے تو صبر کر لوں کہ اس کی زندگی ہی اتنی تھی مگر اس کا کیا کروں جو جیتا جاگتا آنکھوں کے سامنے ہے مگر اس طرح کہ لاشے کا سا گمان ہوتا ہے۔ نہ خود سکون میں ہے اور نہ وہ معصوم بچی جس کو مفت میں بیٹھے بٹھائے عذاب بھگتنا پڑ گیا۔"

اریجہ چاول چن چکی تھی' جب ہی سنک میں دھونے کے لیے مڑ گئی۔ کچن میں خاموشی تھی۔ ندرت سالن کو دم لگا کر باہر جا چکی تھی۔ وہ بڑے مگن سے انداز میں ہاتھ چاولوں میں ڈبوئے ہوئے چپ چاپ کھڑی کر رہی تھی کہ بے خیالی میں دوپٹہ سر سے کھسک کر کندھوں پر ڈھلک آیا تھا۔ اس نے چاول دھو کر باؤل شیلف پر دھرا تھا جب اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سن کر مڑی اور حیران رہ گئی۔

اس کے عین سامنے شاہ فضل کھڑا تھا۔

وہ قدم قدم چلتا اس کے سامنے آ گیا۔ اریجہ دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔ یک لخت شاہ فضل نے ہاتھ آگے بڑھائے' وہ جھجک کر پیچھے ہونے لگی تھی کہ اس نے اریجہ کا ڈھلکا آنچل اٹھا کر اس کے سر پہ ڈال دیا۔

"چادر عورت کی عزت ہوتی ہے اریجہ! اپنی عزت کی حفاظت کرنا سیکھو۔" اس کا لہجہ مدھم تھا۔

وہ ساکت سی اسے دیکھتی رہی۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں بلکہ چلا گیا۔

وہ ایک دم سے جیسے حواسوں میں لوٹ آئی اور پھر سے پھر اس نے اس ناقابل بیان خوشی کو محسوس کرنے کی کوشش کی جو اس کے اندر پھیل رہی تھی۔ یہ احساس کتنا جاں فزا تھا کہ شاہ فضل کو اس کا احساس

تھا۔ وہ اسے اپنی عزت مانتا تھا لہٰذا سے فرق پڑتا تھا۔
اس نے کھڑکی سے لان کے پودوں اور پتوں پر چمکتی دھوپ کو دیکھا اور اسے اپنا دل بھی ان ہی کی طرح چمکتا دمکتا لگا تھا۔
پتا نہیں یہ سب کیا تھا شاید کسی نئے جذبے کا نقطہ آغاز یا شاید کسی نئی کہانی کا عنوان؟

☼ ☼ ☼

وہ آج گھر پر ہی تھا۔ صبح سے ہی وہ اس کے معمولات کا گہری نگاہ سے جائزہ لے رہا تھا۔ صبح کا ناشتہ بنانے کے بعد وہ ملازماؤں کے ساتھ صفائی ستھرائی میں لگ گئی۔ دوپہر ہوئی تو کھانے کی تیاری شروع کردی۔ اس دوران وہ ایک آدھ بار کمرے میں بھی آئی تھی۔ چپ چاپ دبے پاؤں، وہ لائٹ آف کیے پڑا ہوا تھا، شاید وہ یہی سمجھی کہ وہ سو رہا ہے جب ہی تو یوں کریبپائی سے چلتی اندر آئی تھی۔
جب وہ دوپہر کا کھانا لے کر اندر آئی تو اس کے ساتھ شاہ محمود کو بیٹھا دیکھ کر جھجک سی گئی۔ اس نے ٹرے سائیڈ ٹیبل پہ دھری۔
"ادھر آؤ لڑکی۔" ان کی پر تحکم آواز گونجی۔
وہ سہم سی گئی۔
"کیسی بے حس اور ذلیل لڑکی ہو تم؟ تمہیں احساس ہے کہ میرا بچہ صبح سے اس کمرے میں پڑا ہے۔ تم نے نہ پوچھنا گوارا کیا، نہ جانا؟" وہ سخت لہجے میں بازپرس کررہے تھے۔
اس نے ہراساں ہو کر شاہ فضل کی صورت دیکھی۔
"میں سمجھی آپ سو رہے ہیں۔"
"تم اپنی سمجھ اپنے پاس رکھو اور آنکھیں کھول کر دیکھا کرو۔" انہوں نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ فضل نے ان کی بات اچکی۔
"اریبہ! تم جاؤ اور میرے لیے چائے لے کر آؤ اور ساتھ میں سردرد کی ٹیبلٹ بھی۔" شاہ فضل کو جیسے اس لیے اس پہ ترس آگیا تھا۔
"فضل! اسے اتنا سر پہ مت چڑھاؤ۔ اور تم واپس جاؤ اور اس کا سر دباؤ۔ کیا ضرورت ہے فضول دوائیاں لینے کی۔" وہ جیسے بھڑک سے اٹھے تھے۔
"بابا سائیں! رہنے دیجیے، سب ٹھیک ہے۔" اس نے اکتا کر ہاتھ اٹھایا تھا، پھر لحاف سائیڈ پہ کرتا اٹھا، اریبہ نے فوراً سلیپر ڈھونڈ کر اس کے آگے رکھے۔
"میں چینج کرنے جارہا ہوں، تم چائے بنا کر لاؤ۔" وہ کہتا ہوا ڈریسنگ روم کی سمت بڑھ گیا۔
اریبہ کشمکش و پیچ میں کھڑی تھی۔ شاہ محمود تنے ہوئے چہرے کے ساتھ اٹھے اور زور سے اجرک جھاڑ کر بازو پہ جھٹکی اور اسے قہر آلود نگاہ سے نواز کر باہر نکل گئے۔
ان کے جانے کے بعد اریبہ نے ایک طویل پرسکون سانس لیا اور کچن کی طرف نکل گئی۔ جب وہ چائے بنا کر لوٹی تو فضل گیلے بال لیے کف چڑھا رہا تھا۔
اریبہ نے دیکھا سیاہ شلوار قمیص اس کے دراز قد اور سرخ و سفید رنگت پہ خوب جچ رہا تھا۔ اس کی چوڑی ہتھیلی بڑے لاپروا انداز میں کف کو الٹ رہی تھی بالکل ویسے جیسے لاپروائی سے وہ زندہ وجود کو الٹ پلٹ دیا کرتا تھا۔ اس کے دل کو [illegible] تھا۔ ہتھیلیوں میں نمی اترنے لگی تھی۔ [illegible] جائزہ مکمل؟" وہ اس کی چوری [illegible] سکون سے اسے بے سکون کر گیا۔
شرمندگی کے احساس سے اریبہ کا چہرہ تپ اٹھا۔ اس نے نظریں جھکالیں۔
پھر وہاں سے کھانے کی ٹرے اٹھائی اور مڑی۔
"کہاں جارہی ہو؟" چائے کا کپ اٹھا کر اس نے پوچھا۔
"میں یہ واپس رکھ آؤں۔" اس نے اتنی آہستگی سے کہا کہ وہ بمشکل سن پایا۔
"یہاں بیٹھو اور کھانا کھاؤ۔" اس نے قطعیت سے کہا۔ اشارہ بیڈ کی طرف تھا۔ وہ عجیب مشکل میں پھنس گئی۔
"تم سے کہہ رہا ہوں میں۔" اس نے قدرے بلند آواز میں جتایا۔

وہ گڑبڑا کر بیٹھ گئی، پھر بے بسی سے سامنے سجی نعمتوں کو دیکھا اور چھوٹی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول ڈال کر ہاتھ سے نوالے لینے لگی۔ شاہ فضل کی نگاہ بڑی گہرائی سے اس کا تجزیہ کررہی تھی۔
جب تک اس نے چائے ختم کی تب تک وہ بھی چاول ختم کرچکی تھی۔ اس نے ٹرے اٹھائی اور اٹھنے لگی۔ شاہ فضل کو اس پل وہ بہت تھکی تھکی، پژمردہ اور اداس سی لگی تھی۔
"لائٹ آف کردوں؟" اس نے پوچھا۔
"نہیں۔ تم یہ سب چیزیں رکھ کر واپس آؤ۔" فضل نے کہا۔
اریبہ خاموشی سے پلٹ گئی۔ شاہ فضل کی نگاہ نے دروازے تک اس کا پیچھا کیا۔
اسے اس پل وہ "اریبہ ملک" یاد آئی جسے اس نے نکاح کے وقت پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ حیا رحمت ممولی سانچے میں ڈھلا وجود اور چہرے پر موجود ملاحت بھری معصومیت۔
آج یہ کون سی "اریبہ شاہ" تھی زرد رنگت، بجھی آنکھیں لیے جن میں اب صرف کرب تھا۔ اس نوخیز کلی کا سارا وجود بستا ہوا تھا۔ وہ بیک وقت اس سے نفرت بھی کررہا تھا اور اس پر ترس بھی کھا رہا تھا۔ وہ جیسے خود کو ہی سمجھ نہ پا رہا تھا۔
وہ اس کی مستقل مزاجی اور صبر پہ حیران تھا۔ وہ ابتدائی دنوں میں ضرور آگے سے بولی تھی مگر بعد ازاں اس نے گویا لبوں پر مہر لگالی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اب شاہ فضل کا رویہ اس کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ تبدیلی صرف خیالات میں آئی رویوں میں نہیں۔ وہ اس کشمکش اور جھنجلاہٹ کو چھپا نہیں سکا تھا۔
اور اسی شام جب اس نے اپنے کپڑے استری نہ ہونے پر اسے بلند آواز میں گالی دی تھی اور اسے تھپڑ مارا تھا تو وہ کیسے پتھرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھی اور اس پل شاہ فضل کو بے حد خوف محسوس ہوا تھا اس کے صبر سے، اس کی ان بے تاثر نگاہوں سے۔

رات کے کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے ندرت نے ہمدردی دکھانے کی کوشش کی تھی مگر اریبہ نے اسے وہیں ٹوک دیا۔
"اللہ آپ کو بڑا اجر دے گا اس صبر کا بی بی!" وہ خوشی سے اسے دیکھتی رہی۔
"نہیں۔ تم غلط کہہ رہی ہو ندرت! یہ صبر میں اپنی خوشی سے نہیں کررہی، یہ میری مجبوری ہے اور اس کا کوئی اجر نہیں۔" اس کا لہجہ کرب میں ڈوبا ہوا تھا مگر بہت ٹھہراؤ آگیا تھا اس میں۔
باہر کھڑے شاہ فضل کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔ وہ لب کچلتا واپس پلٹ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں
دل کے نازک خانوں میں چبھتی رہیں
سورج اندھے کنویں میں
پڑا روتا رہا
پھول خاک میں اٹے رہے
رنگوں کا حسین قافلہ
دن دہاڑے لٹتا رہا
شہر آرزو پہ خون
دھبوں کی صورت بکھرتا رہا

وہ بڑی دیر سے کارپٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔ سر کے نیچے کشن دھرے، بنا کسی کمبل، کسی چادر کے، ایک بازو آنکھوں پہ دھرے، اس کی آنکھوں سے مسلسل سیل رواں بہہ رہا تھا۔
آج صبح سے ہی اس کی طبیعت کچھ اپ سیٹ سی تھی۔ کچن میں کام کرتے ہوئے بار بار اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر خود کو سنبھالنے کی بارہا کوشش کرتی رہی، آخر چکرا کر گر پڑی۔ بی بی جان کو پتا چلا تو انہوں نے گاؤں کے اسپتال سے ڈاکٹر کو بلالیا۔ انہوں نے ابتدائی چیک اپ کے بعد بی بی جان کو بتایا تھا۔
"شی از پریگننٹ۔" اریبہ کا رنگ فق ہوگیا۔

"میرا مطلب ہے بیبی امید سے ہے اور میرا خیال ہے یہ اس کی فرسٹ پریگننسی ہے۔ خیر آپ اس کا خیال رکھیں بلکہ اس کے شوہر کو بلائیں' یہ کافی کمزور ہے۔ اگر اس کی ڈائٹ پر مکمل توجہ نہ دی گئی تو مر بھی سکتی ہے۔" ڈاکٹر ثمرین نے تفصیل سے انہیں بتایا۔

بی بی جان ہکا بکا سی بیٹھی تھیں۔

اریجہ گم صم سی پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر ثمرین کو اس پر پیار آگیا۔ انہوں نے اس کا گال تھپتھپایا۔

"کم آن لٹل گرل! ناؤ چیئر اپ' شوہر کہاں ہے تمہارا' میں اسی سے بات کروں گی' بی بی جان! یہ مجھے آپ کی ملازمہ لگتی ہے؟" ڈاکٹر ثمرین نے اس کے حلیے سے بالکل ٹھیک ہی قیاس کیا تھا۔

"ان کے میاں ادھر نہیں ہیں جی۔" ندرت نے جلدی سے کہا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ اریجہ کے پاس آبیٹھیں، مگر وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔

بی بی جان! ششدر سی اسے جاتا دیکھتی رہیں پھر ندرت کو اس کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا۔ ندرت اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔

"اریجہ بی بی! آپ خوش نہیں ہیں؟" ندرت نے پوچھا تو وہ چونک کر مڑی۔

"خوش کیسے ہوتے ہیں' یہ تو بھول چکی ہوں۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں بی بی!" ندرت نے حیران ہو کر کہا۔

وہ ایک دم جیسے ہوش میں آگئی۔ چند لمحے ہراساں نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر بے ساختہ اس کے شانے سے لگ کر بلند آواز میں رونے لگی۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے ندرت! میں کیا کروں؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ شاہ سائیں میرے ٹکڑے کر دیں گے۔" وہ ہذیانی انداز میں بول رہی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ شاہ سائیں تو خوش ہوں گے۔" ندرت نے حیرانی سے کہا۔

"وہ خوش نہیں ہوں گے۔ اولاد صرف خاندانی عورت سے پیدا کی جاتی ہے اور میں... ؟ یہ تو تم بھی جانتی ہو نا ندرت! کہ خون بہا میں آنے والی عورتوں کو صرف گھروں میں جگہ دی جاتی ہے ان سے اولاد پیدا نہیں کی جاتی۔" وہ پھنکار رہی تھی۔

"انہوں نے آپ کو بیوی کا درجہ دیا ہے تو اولاد ہوگی ہے نا۔" ندرت نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"اپنی ضرورت کے تحت۔" وہ تلخی سے بولی۔

ندرت خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔

اس وقت سے لے کر اب تک وہ مسلسل اس کمرے میں بند تھی۔ آنسو تھے کہ تھمنے میں نہ آرہے تھے۔ دروازہ کھلا اور کوئی اندر آگیا' اس کے ساتھ ہی خوشبو کا ایک جھونکا سا پھیل گیا۔ دروازہ بند ہوا اور قدموں کی چاپ صوفے کے قریب جا کر رک گئی۔ وہ سر اٹھائے بغیر بھی جانتی تھی کہ وہ شاہ فضل تھا' وہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑی رہی۔ یہ جانے بغیر کہ مقابل نے اس کی بھنچی ہوئی مٹھیوں کو فوراً "نوٹ" کیا تھا۔

"اریجہ!" اس نے پکارا۔

وہ اسی طرح پڑی رہی۔ وہ آہستگی سے اٹھا اور چلتا ہوا اس کے قریب آکر گھٹنوں کے بل جھک کر بیٹھ گیا' پھر اس کے چہرے سے بازو ہٹایا' وہ اٹھ بیٹھی۔

"یہ کیا حالت بنائی ہوئی ہے تم نے؟" اس کا لہجہ سخت ہوا تھا۔ اریجہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا' آنکھیں بھی شدت گریہ سے سرخ تھیں اور ہونٹ سوجے ہوئے تھے۔ وہ خاموشی سے ہونٹ کاٹتی رہی۔

"کیا پوچھ رہا ہوں میں؟" اس نے سختی سے اس کا شانہ جھنجوڑا۔ اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

"ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ آپ کے علم میں نہ ہو' یوں انجان بننے کا مقصد؟" اس کی آواز بلند نہیں تھی مگر لہجہ ضرور تھا۔ وہ حیران ہوا۔

"مجھے اپنا بچہ چاہیے۔" اس نے ایک ہی جملے میں

باور کروا دیا تھا کہ وہ اتنا بے خبر نہیں تھا۔

"مگر مجھے نہیں چاہیے۔" وہ سارے خدشات' سارے خوف بالائے طاق رکھتے ہوئے پھٹ پڑی۔

وہ دنگ رہ گیا' مگر اگلے لمحے اس کا ہاتھ اٹھا اور پوری قوت سے اریجہ کے بائیں گال پر پڑا۔

"بکواس بند کرو۔ تم سے تمہاری مرضی کون پوچھ رہا ہے؟" وہ اس کے بال مٹھی میں جکڑے غرایا۔

اتنا عرصہ دل میں دبا لاوا اچٹ پڑا' وہ غصے کی شدت سے پاگل سی ہو گئی۔ اس نے بے اختیار شاہ فضل کی قمیص کا کالر دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔

"بچے کی بات تو بعد میں آئے گی پہلے میری حیثیت کا تعین تو کر دیں' کیا ہوں میں آپ کے نزدیک جس کی ماں کا درجہ ابھی تک متعین نہیں ہو سکا' اس کی اولاد کی کیا حیثیت ہوگی۔ بیٹا ہوگا تو آپ جیسا جو عورت کو ذلیل چیز سمجھے گا اور بیٹی ہوگی تو میرے جیسی جو دن بھر مشقت کی چکی میں پسے گی اور رات کے خوف سے اپنے مرنے کی دعائیں مانگے گی۔ نہیں چاہیے مجھے ایسی اولاد۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ آپ میرے ٹکڑے کر دیں۔ مار ڈالیں مجھے۔ جان لے لیں میری۔"

وہ بولتے بولتے ہانپ گئی اور بے دم ہو کر اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

میری گواہی آدھی ہے تو
میرا جرم بھی آدھا ہوگا
میرا حصہ آدھا ہے تو
میری سزا بھی آدھی ہوگی

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہ کارپٹ کے بجائے بیڈ پر تھی۔

اس نے کروٹ لی تو دیکھا فضل شاہ' اس کے بالکل ساتھ ہی نیم دراز تھا' اس کے ہاتھوں میں سلگتا ہوا سگریٹ تھا۔ وہ اس کی طرف مطلق متوجہ نہ تھا' خاموشی سے سامنے دیوار پر نظریں جمائے دھواں اڑا رہا تھا۔

"تمہاری ساری باتیں ٹھیک ہیں اریجہ!" اس کی مدھم مگر بھاری آواز اریجہ کو ساکت کر گئی۔

"بابا سائیں کا کہنا ہے کہ مجھے باقاعدہ طور پر ایک بڑا سا ولیمہ دینا چاہیے' تاکہ سب جان لیں کہ تم شاہ فضل کی بیوی ہو۔"

اریجہ حق دق سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم حویلی کا وارث پیدا کرنے جا رہی ہو اور یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"سنو! مجھے بیٹا چاہیے۔" اس کی تحکمانہ سرگوشی گونجی تھی۔

اریجہ کے دل میں ٹھک سے ایک تیر پیوست ہوا تھا۔

"تو گویا یہ مہربانی اور نوازش بیٹے کے لیے ہے۔"

☼ ☼ ☼

اگلی صبح بہت سی تبدیلیاں لے کر آئی تھی۔

اریجہ نے حیرت سے اپنے سامنے پڑی خوش رنگ غذاؤں اور پھلوں کے ڈھیر کو دیکھا۔

"بی بی جان! مجھے کچھ نہیں کھانا۔ اللہ کے واسطے مجھے مجبور نہ کریں۔" وہ ازحد اذیت سے بولی۔

بی بی جان نے اس کے زردیاں کھنڈے چہرے کو دیکھا۔

"ایسا نہ کرو بچی! پہلے میں مجبور تھی۔ تم نے فضل کا غصہ نہیں دیکھا' ہم نے دیکھا ہے۔ وہ تو شاید تمہیں اسی دن قتل کر ڈالتا' جب لے کر آیا تھا (نکاح کے دن) مگر یہ تو اس کے بابا کا کمال تھا کہ انہوں نے اسے لاہور بھیج دیا سمجھا بجھا کر بلکہ زبردستی کر کے' تاکہ اس کا غصہ تھوڑا ٹھنڈا ہو جائے۔ اب وہ نرم ہوا ہے تو تم کیوں خود کو مصیبت میں ڈالنا چاہتی ہو؟" وہ اسے پیار سے سمجھانے لگیں۔

اریجہ کو پورے سیاق و سباق کے ساتھ وہ پہلی رات یاد آگئی جب ایک مرد نے جو کہنے کو اس کا شوہر تھا' جی بھر کے اس کے وجود کو اپنی درندگی کا نشانہ بنایا تھا

اور جو کہنے کو اس کی سہاگ رات تھی، آج بھی اس وقت کی یاد اریجہ کو رلا گئی۔
"بی بی جان! مجھے عادت نہیں رہی۔ کیوں آپ میرے ساتھ زبردستی کر رہی ہیں۔ میں نہیں کھا سکوں گی۔ سب الٹ دوں گی۔ فائدہ؟"
"اپنا نہیں تو اپنے ساتھ جڑی اس دوسری جان کا ہی کچھ خیال کرلو۔" وہ اسے احساس دلانے لگیں۔
اریجہ نے اذیت سے لب کچلے اور بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں پر قابو پا کر انہیں دیکھا۔
"بی بی جان! اگر بیٹی ہوئی تو پھر۔۔۔؟"
بی بی جان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔
"ایسا نہ کہو، اچھی بات منہ سے نکالو۔"
"مجھے یہ سب آسائشات اس لیے دی جارہی ہیں کہ میں اس حویلی کا وارث پیدا کرنے والی ہوں اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر میری اس حویلی میں کیا حیثیت ہوگی؟ ایک پھٹے پرانے ورق جیسی۔ اسی لیے میں کہہ رہی ہوں مجھے ان عیاشیوں کا عادی نہ بنائیں۔"
انہیں حیرت ہوئی۔ وہ تو اسے نادان سمجھتی تھیں مگر اس نے تو بہت دور کی سوچی تھی۔
"مگر یہ تمہارے لیے ضروری ہے۔" وہ جیسے عاجز سی ہو کر بولی تھیں۔
"ضروری نہیں ہے بی بی جان! بہت سی عورتیں اس حالت میں ہوتی ہیں تو سارے کام بھی کرتی ہیں۔ محنت مزدوری بھی کرتی ہیں۔ انہیں بھی تو دو وقت کا کھانا بمشکل نصیب ہوتا ہے۔ وہ کیوں ضرورت محسوس نہیں کرتیں ان سب چیزوں کی؟ کیونکہ وہ عادی نہیں ہوتیں۔ میں بھی نہیں ہوں۔" وہ سفاکی سے اپنا تجزیہ کر رہی تھی۔
بی بی جان خفا سی ہو کر اٹھ گئیں اور جا کر شاہ فضل کو بھیج دیا تھا۔ وہ جو مردانے میں بہت ضروری امور پر گفتگو کر رہا تھا، اس بے جا مداخلت پر جھنجھلاتا ہوا اندر آیا۔
"کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟ کیوں نہیں مان رہیں تم بی بی جان کی بات؟" وہ اس کا بازو دبوچے ہوئے غرایا۔
وہ آنسو جو اریجہ نے بمشکل روکے ہوئے تھے شدتوں سے بہہ نکلے۔
"میں نہیں کھا سکتی یہ سب، مجھے عادت نہیں رہی۔ مجھے تو ان چیزوں کا ذائقہ بھی بھول گیا ہے۔ شاہ سائیں! آپ بی بی جان سے کہیں کہ وہ مجھے مجبور نہ کریں۔" وہ شدتوں سے رو پڑی تھی۔
وہ ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑ کر واپس مڑ گیا۔ جاتے جاتے بی بی جان سے کہہ گیا۔
"آپ اسے مجبور نہ کریں۔ جب اس کا دل چاہے گا کھالے گی۔" وہ سپاٹ لہجے میں کہتا واپس مردان خانے کی طرف بڑھ گیا۔
اریجہ سوچوں میں گم تھی۔ نئی زندگی کی خبر نے اس میں کوئی امنگ بیدار نہیں کی تھی۔ آج اسے منصور لالہ بہت یاد آرہے تھے۔ "کاش لالہ یہ سب نہ کرتے، انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ وہ تو اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ انہوں نے ایک بار بھی پیچھے رہ جانے والوں کے لیے نہ سوچا۔" کمرے میں بی بی جان کی اچانک آمد سے وہ چونک اٹھی۔ اس نے بیٹھتے ہوئے بی بی جان کے لیے بیڈ پر جگہ بنائی۔ اس نے دیکھا ان کے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے ہاتھ میں موبائل تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گئیں۔
"تم بہت صبر والی ہو، میری بیٹی! بہت حوصلہ ہے تم میں۔ اپنی ماں سے بات کرلو، وہ تمہارے لیے بہت پریشان ہے۔"
اریجہ نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں اس کے لیے بہت پیار تھا۔ وہ اسی شفقت بھرے لہجے میں گویا ہوئیں۔
"تمہاری ماں کا فون آیا تھا۔ بہت رو رہی تھی۔ وہ ابھی دوبارہ فون کرے گی۔ تم اس سے بات کرلینا۔"
انہوں نے ہاتھ میں پکڑا موبائل اس کے پاس ہی بیڈ پر رکھ دیا اور کھڑی ہو گئیں۔ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔ وہ موبائل دیکھنے لگی۔ اچانک موبائل بج اٹھا۔ وہ بجتے

ہوئے موبائل کو خالی خالی نظروں سے تکنے لگی۔ اسے موبائل کی گھنٹی کی آواز میں ایک تڑپ محسوس ہوئی۔ اسے لگا جیسے یہ موبائل کی گھنٹی نہیں، اس کی ماں کی پکار ہے، جو اس کے لیے تڑپ رہی ہے۔ ماں کے بلکتے ہوئے چہرے کا خیال آتے ہی اس نے فوراً موبائل اٹھا لیا۔
"ہیلو!" اس کی آواز بمشکل نکلی۔
"اریجہ! میری گڑیا! کیسی ہو؟"
دوسری طرف کی آواز سن کر وہ تڑپ اٹھی۔
"منصور لالا! آ۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ کیسے ہیں؟ کہاں ہیں؟ دیکھیں، آپ کی گڑیا کے ساتھ کیا ہو گیا۔" وہ بری طرح بلک اٹھی۔
"اریجہ، میری گڑیا! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑ سکتا ہے۔ میں نے سوچا تھا، کچھ دنوں بعد جب یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو میں واپس آکر ثابت کروں گا کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ میری گڑیا! میں بے گناہ ہوں۔ میرا یقین کرو، میں نے قتل نہیں کیا۔ میں اپنے دوست کو کیسے قتل کر سکتا ہوں۔ لیکن اب مزید نہیں۔ اب میں تمہاری زندگی برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں کچھ دن علاقہ غیر میں رہا، پھر کینیڈا چلا گیا تھا اور اب واپس آرہا ہوں۔" منصور ملک کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی مگر لہجہ بہت ٹھوس تھا۔
منصور کی بات سنتے ہی وہ تڑپ اٹھی۔
"نہیں لالہ نہیں۔۔۔ میرے ساتھ تو جو ہونا تھا۔۔۔ ہو چکا۔۔۔ اب آپ واپس نہ آئیں۔۔۔ فضل شاہ آپ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔۔۔ میرے ساتھ جو ہوا، میں نے برداشت کرلیا، لیکن آپ کو کچھ ہو، یہ میں برداشت نہیں کرپاؤں گی۔ میں اپنی جان دے دوں گی لالہ! میں نے یہ سارے ستم اس لیے برداشت کیے کہ آپ سلامت رہیں۔ اب آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے، جس سے۔۔۔ آپ میری زندگی چاہتے ہیں تو ایسا سوچیں بھی نہیں۔ مجھ سے وعدہ کریں۔ آپ ایسا نہیں کریں گے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ منصور ملک کا دل کٹ کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔
بہن کی اس محبت نے اسے مزید پشیمانیوں کے سمندر میں دھکیل دیا تھا۔ کاش وہ ہمت سے کام لیتا، پولیس کے سامنے پیش ہوتا تو یوں اس کی بہن قربان نہ ہوتی۔ اس نے یہ کب چاہا تھا۔ جرم بے گناہی کی سزا وہ خود بھی بھگت رہا تھا اور اس کی بہن بھی۔
اریجہ فون بند کرکے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بلک اٹھی۔ ایک طرف یہ خوشی تھی کہ بھائی زندہ سلامت تھا تو دوسری طرف یہ دکھ اسے کاٹ رہا تھا کہ وہ اپنے پیارے بھائی کو دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

یہ راکھ راکھ رتیں اپنی رات کی قسمت
تم اپنی نیند بچھاؤ، تم اپنے خواب چنو!
بکھرتی ڈوبتی نبضوں پہ دھیان کیا دینا
تم اپنے دل میں دھڑکتے ہوئے حروف سنو!!

ایک شان دار جشن تھا، ایک شان دار رات تھی، حویلی کا بڑا سا لان لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ گڑیا کی طرح ہی اسٹیج پر جلوہ افروز تھی۔ تقریب رات گئے تک جاری رہی تھی۔ اختتام پر ندرت اسے شاہ فضل کے کمرا میں چھوڑ گئی تھی۔
دل متضاد کیفیات کا شکار ہو رہا تھا۔ شاہ فضل نے اسے بیوی کا درجہ دے دیا تھا لیکن یہ اس کی وہی روایتی جاگیردارانہ سوچ کا نتیجہ تھا۔
وہ کس طرح یہ برداشت کرسکتا تھا کہ اس کا بچہ کسی ایسی عورت سے جنم لے جسے اس نے اپنے ملازمین سے بھی بدتر درجہ دیا ہوا تھا۔ اس کے لیے تو ضروری تھا کہ اس کی حیثیت مستحکم ہوتی۔ اس کی بیوی کو سارا گاؤں جان لیتا جس کے لیے ولیمہ ناگزیر تھا۔
وہ جانتی تھی کہ یہ سب آسائشات صرف بچے کی پیدائش تک تھیں، اسی لیے وہ انہیں قبول کرنے، اپنانے اور ان کا عادی ہونے سے ہچکچا رہی تھی اور تب

زور سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر بھی وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ وہ اندر آیا اور واش روم کی سمت بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور بولا۔

"اریبہ! اس بھاری لباس میں کیسے سوؤ گی؟" وہ نرم ہاتھ سے اس کا گال تھپک رہا تھا۔

وہ خاموشی سے اٹھ گئی۔ زیورات اتارے، میک اپ صاف کیا۔ نائٹی نکالی اور واش روم کی سمت بڑھ گئی۔ جب وہ لوٹی، وہ فون پر کسی سے محو گفتگو تھا۔

"عباس! میں نہیں آسکتا اتنی ایمرجنسی میں۔ بات کیا ہے۔" وہ خاصا جھلایا ہوا تھا۔ اچانک اس کا چہرہ یکدم تن سا گیا۔

"ہاں، میرے پاس ہی ہے۔ ہاں دونوں چیزیں۔" اس کے چہرے پر عجیب سا کرب چھلکا تھا۔

"صبح نکلتا ہوں آنے کے لیے۔ ابھی تو بالکل نہیں بہت تھکا ہوا ہوں۔" اس نے کہا۔

پھر فون بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"یہاں آؤ۔" اس نے معمول کا حکم دیا تھا۔

اریبہ خاموشی سے چلتی اس کے بعد برابر آن بیٹھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اریبہ کو تھام لیا۔

"مجھے... آپ سے کچھ... بات کرنا ہے۔" اریبہ نے اس کی جنونی پیش قدمی پر بند باندھنا چاہا۔ جواباً "شاہ فضل نے اسے جن نظروں سے دیکھا" اس کا دل چاہا ڈوب کر مر جائے۔ اس نے بے ساختہ آنکھیں بھینچ لیں۔ دو بے تاب آنسو فوراً "چھلک اٹھے تھے۔

کبھی دیکھو غور سے دیکھو
میرے آنسوؤں پہ بھی نیل ہیں
انہیں کس نے مارا ہے سوچ تو!
کبھی سن سکوت کی سسکیاں!

☼ ☼ ☼

اگلے دن وہ لاہور روانہ ہو گیا، اریبہ نے اسے کافی پریشان اور الجھا ہوا دیکھا تھا مگر پوچھنے کی ہمت نہ پڑی

تھی۔ وہ اس وقت پولیس اسٹیشن میں موجود تھا۔ ایس پی عباس نے بغور اس کے بارعب اور وجیہہ چہرے کا جائزہ لیا اور قدرے آگے کو جھک آیا۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ قتل منصور ملک نے کیا ہے؟" اس نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔ شاہ فضل نے ناگواری سے عباس کو دیکھا اور قدرے اشتعال سے کہا۔

"ثبوت تمہارے سامنے پڑے ہیں، کس بات پر شک ہے تمہیں؟" اس نے ٹیبل پر پڑے منصور ملک کے ریوالور اور پوسٹ مارٹم سے ملنے والی اس اکلوتی گولی کی طرف اشارہ کیا۔

عباس نے زور سے ٹیبل پر ہاتھ مارا۔

"یہی تو، یہی تو بنیادی غلطی ہے ہماری۔ ہم اندھا دھند مجرم کو ڈھونڈنے لگ گئے ہیں مگر اس بات پر غور کرنے کی قطعی زحمت نہیں کی کہ وہ مجرم ہے بھی یا نہیں۔ یہ دیکھیں۔ روسی ساختہ بریٹا ہے جبکہ پوسٹ مارٹم کے بعد ملنے والی گولی اعشاریہ بتیس بور کی ہے۔" انہوں نے پر یقین لہجے میں کہا۔

شاہ فضل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"پولیس سے زیادہ اسلحہ کی پہچان کسی [illegible] ہوتی۔ قتل منصور نے نہیں کیا بلکہ اس [illegible] کوئی گولی چلی ہی نہیں۔ اگر منصور ملک شاہ [illegible] مارنا چاہتا تھا تو پھر یہ خراب پسٹل [illegible] لے کر آیا تھا؟" "خراب..." شاہ فضل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"جی خراب یہ دیکھیں [illegible] صحیح کام نہیں کر رہا ہے۔ یہ دیکھیں [illegible] ٹریگر کام نہیں کرتا۔" اس نے چلا کر دکھایا اور بات آگے بڑھائی۔

"اگر منصور ملک نے یہ قتل کیا بھی ہے تو وہ یہ خالی ریوالور وہاں کیوں پھینک گیا، جس پر اس کے فنگر پرنٹس بھی تھے جبکہ مجرم پہلے اپنے فرار کا راستہ دیکھتا ہے پھر جرم کرتا ہے۔ کیا وہ اتنا احمق تھا کہ اپنا لائسنس یافتہ ریوالور وہاں پھینک کر چلا گیا۔ اور آخری بات۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق گولی تقریباً" تیس

گز کی دوری سے چلائی گئی تھی لیکن اس جگہ زمین پر صرف ان دونوں کے نشان ملے جیسے وہ شخص آپس میں کھڑے باتیں کر رہے ہوں۔ ہو سکتا ہے بات اس ریوالور کے حوالے سے ہی کر رہے ہوں اور اسی دوران گولی کسی اور طرف سے چلائی ہو۔ منصور خوف زدہ ہو گیا اور بدحواسی میں ریوالور وہیں پھینک کر بھاگ گیا اور یوں ہم مسلسل دو تین ماہ سے ایک غلط شخص کی تلاش میں پاگل ہو رہے ہیں جبکہ اصل مجرم آزاد پھر رہا ہے۔" عباس اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہو گیا۔

شاہ فضل پھیکا چہرہ لیے بیٹھا تھا۔ اس کی بے یقین نظریں عباس پر جمی تھیں۔

"آپ کی کسی سے کوئی ذاتی رنجش؟ کوئی کسی قسم کی معمولی جھڑپ بھی؟" عباس نے سوال کیا۔

شاہ فضل نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پھر بھی آپ اس پر غور ضرور کریں شاہ صاحب! ممکن ہے کہ کسی نے اپنی خفیہ دشمنی نکالی ہو۔"

تب ہی اس کا ڈرائیور رشتار ایک کانسٹیبل کے ساتھ اندر آگیا۔

"سائیں! آپ سے بات کرنا ہے۔"

"بولو شتار!" وہ خود کو سنبھال کر بولا۔ لہجے کا طنطنہ قدرے دھیما پڑا ہوا تھا۔

"سائیں! حویلی سے فون آیا ہے بڑے سائیں کا۔" اس نے بتایا۔

"کوئی خاص بات؟" وہ چونکا۔

"وہ آپ سے بات کرنا چاہ رہے تھے مگر آپ کا فون شاید بند ہے۔"

"ہاں۔ ٹھیک ہے تم جاؤ، میں کر لوں گا۔" فضل نے اسے جانے کا کہا۔

کمرے میں ایک بار پھر ہولناک اور پر اسرار خاموشی چھا گئی۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

شاہ فضل نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی کنپٹی کو مسلا۔ اس کے چہرے پر شدید پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

آنکھوں کی سرخی دم بہ دم گہری ہوتی جا رہی تھی۔ یہ احساس کتنا اذیت ناک تھا کہ وہ غلطی پر تھا اور اریبہ بے قصور تھی۔ اسے اریبہ کا خیال آگیا۔

"ساری تفصیل میں آپ کے گوش گزار کر چکا ہوں شاہ صاحب! آپ پلیز محتاط رہیے۔" عباس نے اس کی پیشانی دیکھ کر مخلصانہ مشورہ دیا۔

شاہ فضل نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ کچھ دیر نہ سمجھنے والے انداز میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا، پھر تھک کر سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

"کافی منگواؤں آپ کے لیے؟" عباس نے پوچھا، پھر اس کے سر ہلانے پر انٹرکام اٹھا کر کافی کا آرڈر دینے لگا۔

☼ ☼ ☼

"اس کو کیا لگتا ہے وہ اتنی جلدی مجھ تک پہنچ جائے گا؟ ہونہہ! یہ اس کی بھول ہے۔ قیامت کے دن شاہ فیصل بھی نہیں بتا سکے گا کہ اسے کس نے قتل کیا تھا۔" وہ حقارت سے کہتے ہوئے ہنسا۔ چند لمحے دوسری طرف فون پر مخاطب عورت کی آواز سنتا رہا، پھر بھڑک اٹھا۔

"بس کر دے تو۔ تو اور تیرے ڈراوے۔ بھر بیٹھا میں ان سے۔ اللہ بس مجھے ہی دیکھ رہا ہے کیا؟ ان وڈیروں کو نہیں؟ ان کی رسیاں کیوں دراز ہیں؟" وہ تنفر سے کہہ رہا تھا۔

"او رہنے دے۔ اریبہ بی بی کی تو لگ جائے گی۔" اس نے منہ بگاڑ کر نقل اتاری۔

"مجھے نہیں لگتی کسی کی آہ واہ اور اس پر کون سا ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ کون سے پتھر توڑنے پڑ رہے ہیں اسے؟ فضل بابو کی زال (بیوی) ہے وہ۔ جس گاؤں لمبہ کھایا ہے پورے گاؤں نے کیا تکلیف ہے اسے وہاں؟" اس کی تنگ پیشانی شکنوں سے پر تھی۔

"چل بس کر مجھے نہیں چاہیے تیرا ابھاشن۔ شادی کرا لوں ایک بار تجھ سے، پھر بتاؤں گا۔" اس نے فون بند کرتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ چند لمحے

کمرٹا کچھ سوچتا رہا پھر سر جھٹک کر بی ایم ڈبلیو کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

کافی کے مگ سے اٹھتی بھاپ فضا میں عجیب عجیب سے ہیولے بناتی اڑ رہی تھی۔ ایس پی عباس نے شاہ فضل کا چہرہ جانچا پھر بالکل سپاٹ پا کر نظر پھیر لی۔

"آپ کو کسی پہ شک ہے؟" عباس نے قدرے آگے کو جھکتے ہوئے کہا۔

"یقین سے کہا نہیں جا سکتا۔ چھوٹے موٹے جھگڑے تو چلتے ہی رہتے ہیں مگر وہ بہت نچلے درجے کے لوگ ہیں۔ اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے۔ یہ یقیناً" کسی منجھے ہوئے کھلاڑی کا کام ہے جس نے چویشن کو اتنی مہارت سے استعمال کیا کہ ہم مسلسل دو ماہ سے بے وقوف بن رہے ہیں۔" اس نے تفصیل سے بتایا۔

عباس نے دیکھا بولتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک خالی پن اور آنکھوں میں سکوت طاری تھا۔

"کیا آپ کے ذہن میں ایک بھی نام نہیں؟" عباس الجھا۔

شاہ فضل نے لب بھینچتے ہوئے سر نفی میں ہلا دیا۔

"پھر اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ آپ اپنی سیکورٹی بڑھا لیجیے۔ یہ خفیہ دشمن آپ کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس صورت میں تو خطرہ مزید بڑھ جائے گا جبکہ ہم اس کا مقصد نہیں جانتے' نہ ہمیں اس کی ڈیمانڈ کا اندازہ ہے' نہ اس کے ٹارگٹ کا۔"

وہ سر ہلا کے اٹھ گیا۔

"ایک آخری بات شاہ صاحب! اپنے ارد گرد خصوصی نظر رکھیے' تاریخ گواہ ہے' پیٹھ میں چھرا گھونپنے والے اکثر اپنے ہی ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کے ساتھ بھی کوئی ایسی کالی بھیڑ ہو جو بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا ہو۔"

عباس کے لہجے سے حقیقی فکر مندی جھلک رہی تھی۔

"مجھے اعتراف ہے عباس! اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جولیس سیزر کو قتل کرنے کے لیے اٹھنے والا سب سے پہلا ہاتھ اس کے سب سے عزیز ترین دوست بروٹس کا ہی تھا۔" وہ ہلکے سے مسکرایا اگرچہ اس کی مسکراہٹ بہت پھیکی تھی۔ اور باہر نکل گیا۔

نثار نے اسے دیکھ کر ادب سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اس کے بیٹھتے ہی گاڑی تیزی سے چل پڑی۔

"کہاں چلوں سائیں؟" اس نے گردن موڑ کر پوچھا۔

"ماڈل ٹاؤن چلو۔" اس نے لاہور میں موجود اپنے گھر کا کہا۔

"حویلی نہیں جائیں گے؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کچھ پتا چلا سائیں؟" اس کے لہجے میں تجسس اور کھوج تھا۔

"نہیں۔" اس نے ایک لفظی جواب دیا۔

"آپ فکر مت کریں سائیں! رب تعالیٰ نے چاہا تو مجرم ایک دن شرمناک انجام سے دوچار ہو گا۔ فیضا سائیں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔" اس نے خلوص سے کہا۔

اس پل وہ نہیں جانتا تھا کہ بعض دعائیں کتنا جلدی مستجاب ہوتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

"تم فیصلے کا اختیار اپنے ہاتھ میں مت لو فضل! تم عدل کا ترازو رب کے پاس رہنے دو۔ تم جزا و سزا کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔"

اسے یاد تھا یہ الفاظ اسے بی بی جان نے تب کہے تھے جب وہ اریبہ کو نکاح کر کے لایا تھا۔

اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور آنکھوں میں دھند سی اترنے لگی۔

"کیا کر لیا ہے میں نے اپنے ساتھ؟؟؟ کیا ہو گیا ہے مجھ سے؟"

اس نے بے بسی سے اپنے بال نوچ ڈالے۔

اس کے اندر کوئی بہت زور سے اس پر ہنسا۔

"تم تو اپنے آپ کو فرعون سمجھ بیٹھے تھے شاہ فضل! تمہیں ہمیشہ سے یہی لگتا ہے کہ تم درست ہو' تمہارے سارے فیصلے درست ہیں اور باقی ساری دنیا غلط۔ کیا جواز تھا تمہارے پاس اریبہ سے کیے جانے والے اس غیر انسانی سلوک کا؟ صرف یہ کہ وہ تمہارے بھائی کے قاتل کی بہن تھی۔ یہی اس کا جرم تھا' یہی اس کی خطا اور یہی اس کا گناہ؟ تمہیں ایک پل خیال نہیں آیا کہ وہ معصوم لڑکی بے گناہ ہے۔ ذرا سوچو! تم نے تو کبھی اس کو لڑکی سمجھ کر بھی اس سے نرمی اختیار نہ کی' اسے بیوی سمجھ کر [illegible] بلکہ تم نے تو اسے انسان سمجھ کر بھی اس سے [illegible] کیا۔" ضمیر کی عدالت بے رحمی سے اس کا محاسبہ کر رہی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کرسٹل کا گلدان آئینے پہ دے مارا۔ اس کا عکس کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا بالکل ویسے جیسے اس کی شخصیت' اس کی انا' اس کا وقار' اس کا غرور اور اس کی رعونت کے ریزے ریزے ہو گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

عجب صورت حال ہوتی جا رہی ہے
رات کے بعد رات ہوتی جا رہی ہے
وہ تو آج بھی مکمل ہے پتھر کی طرح!
ریزہ ریزہ تو میری ذات ہوتی جا رہی ہے
میں تو آج بھی تنہا ہوں کل کی طرح محسن
ساری کائنات تو اس کے ساتھ ہوتی جا رہی ہے

رات سے اسے شدید فلو ہو رہا تھا' وہ بستر میں گھسی ہوئی تھی۔ دل کو عجیب ہی بے کلی تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر اب جیسے ہڈیاں بھی دکھ رہی تھیں مگر نیند تھی کہ ہنوز آنکھوں سے روٹھی ہوئی تھی۔

"بی بی جان! شاہ سائیں کب آئیں گے؟" پتا نہیں کیوں آج وہ بی بی جان سے پوچھ بیٹھی۔ وہ ہنس پڑیں۔

"مردوں کو سو کام ہوتے ہیں بیٹی! آ جائے گا ایک دو دن میں۔" انہوں نے ہلکا سا جتایا۔

وہ خفیف سی ہو کر اٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ بیڈ پر آڑھا ترچھا دراز وجود گہری نیند میں تھا یوں کہ اس کی دائیں ٹانگ بیڈ سے نیچے لٹک رہی تھی اور بایاں بازو سینے کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس کی اس قدر گہری نیند نما بے ہوشی کا سبب غالباً "نہیں یقیناً" وہاں بکھری تین چار خالی بوتلیں تھیں جن میں موجود "مشروب" "لانا" پیٹ میں انڈیلا جا چکا تھا۔ بیڈ شیٹ پر جا بجا سلوٹیں تھیں۔ بے شمار سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے تھے اور کافی کا خالی مگ بھی لڑھکا ہوا تھا۔ قریب ہی سلور گرے چمکتا ہوا سیل فون پڑا ہوا تھا جو کہ ہر دو منٹ کے وقفے کے بعد زور و شور سے بجنا شروع ہوتا مگر اس کی مدہوشی میں کوئی خلل نہیں پڑا' وہ اسی طرح پڑا رہا۔

فون ایک بار پھر بج رہا تھا اور اس کے ساتھ اس بار زور سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ چند لمحے وہ مندی مندی آنکھوں سے دیوار کو دیکھتا رہا۔ اگلے ہی لمحے وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دھیان دروازے کی طرف گیا مگر پاس ہی بجتے فون نے اس کی توجہ کا مرکز بدل دیا۔ اس نے فون اٹھایا۔ دستک کی آواز اب رک چکی تھی۔

"ہیلو!" اس کی آواز تھکی ہوئی تھی۔

"فضل! کیا بات ہے' کدھر ہو تم؟ کل سے تمہارا نمبر ملا رہا ہوں۔ نثار کو بھی پیغام دیا تھا کہ تم سے کہے مجھے فون کرو مگر تم... آخر تم ہو کہاں؟ ایک فون بھی نہیں کر سکے تم کہاں ہو؟ میں اتنا پریشان ہوں۔"

شاہ محمود رکے بغیر اسے لتاڑ رہے تھے۔

شاہ فضل کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ ساتھ ہی ساری اذیت و درد' احساس جرم اور خوف نے یکلخت اس پر بھرپور شدت سے حملہ کر دیا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ سب چھوڑ چھاڑ کر کسی بل میں چھپ جائے۔

"خیریت بابا سائیں؟" اس کا لہجہ دھیما تھا۔

شاہ محمود بری طرح چونکے تھے۔

"ہاں۔ خیریت ہی ہے۔ کل تک اپنے کام نمٹا کر آجاؤ۔ کل بیٹھک ہے۔ کچھ اہم فیصلے لینے ہیں۔ اس میں تمہاری شرکت ضروری ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"اگر نہ آسکوں تو؟" اس نے کہتے ہوئے لب بھینچے تھے۔ ایک انی سی سینے میں گزری تھی۔

"نہیں۔ تمہیں آنا پڑے گا۔ میں نے کہا نا! تمہارا ہونا ناگزیر ہے۔" ان کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

شاہ فضل نے قدرے توقف کے بعد ہامی بھرلی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے فون بند کردیا۔ مگر ایک بار پھر اسے آنے کی تلقین کی۔ وہ فون ہاتھ میں لیے ساکت بیٹھا تھا۔

"اریبہ کا سامنا کیسے کرے گا وہ؟"

درد کی ایک لہر اس کی بائیں کنپٹی سے چلتی ہوئی سارے سر میں پھیل گئی۔ اس کے غرور اور انا پر لگنے والی یہ چوٹ بڑی کاری تھی اور چونکہ پہلی بھی تھی اس لیے اذیت کی ہر حد پار کررہی تھی۔

وہ اٹھا اور واش روم کی سمت بڑھ گیا۔ دیر تک نیم گرم پانی سے شاور لینے کے بعد اس کی طبیعت کچھ سنبھلی۔ اس نے باہر آکر بال بنائے اور کمرے کی ابتر حالت کو نظر انداز کرتا باہر کی سمت بڑھ گیا۔ نثار اسے لاؤنج میں ہی پریشانی سے ادھر ادھر ٹہلتا ہوا مل گیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس کی سمت لپکا۔

"شاہ سائیں! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا! کل سے یوں کمرہ بند کیوں ہیں؟ حویلی سے بڑے شاہ سائیں کے کتنے ہی فون آچکے ہیں۔ میں بھی صبح سے دروازہ بجا رہا ہوں۔ آپ۔۔۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" وہ پریشانی سے بولتا گیا۔

شاہ فضل نے سرد نظروں سے اسے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے نثار کا منہ بند ہوگیا۔

"گاڑی نکالو۔ ہم فیکٹری چل رہے ہیں۔"

"جو حکم سائیں!" وہ سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ فیکٹری میں چند ضروری کام نمٹا کر وہ حویلی کے لیے روانہ ہوگیا۔ ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

جس وقت اس کی گاڑی حویلی میں داخل ہوئی، رات چاروں طرف اپنے پر پھیلا چکی تھی۔ تاریکی میں بادام اور سفیدے کے درخت ساکت کھڑے تھے اور ان کی شاخیں دھند میں لپٹی ہوئی تھیں۔ یہی دھند اس کے دل پر بھی چھا رہی تھی۔ وہ دل پر ڈھیروں بوجھ سنبھالے مردان خانے کی سمت بڑھ گیا۔

اس کی آمد کی خبر سب سے پہلے ندرت کو ہوئی جس نے سرونٹ کوارٹرز کی طرف جاتے ہوئے نثار کو دیکھا تھا۔ وہ الٹے قدموں پلٹی اور اس کے کمرے تک پہنچی۔ آہستگی سے دروازہ بجایا۔

"آؤ ندرت" وہ دستک پہچان چکا تھا۔

"سلام شاہ سائیں!" اس نے ادب سے کہا۔

شاہ فضل نے چادر کندھوں سے اتار کر ایک طرف پھینکی اور اس کی طرف مڑا۔

"اریبہ کہاں ہے؟" ندرت کو اس کی آواز میں عجیب سی بات محسوس ہوئی مگر وہ اسے کوئی نام نہ دے سکی۔

"وہ بیگم سائیں کے کمرے میں ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔" اس نے جانے کا اشارہ کیا۔

"کچھ کھائیں گے آپ؟ چائے، کافی؟"

"نہیں۔"

وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

وہ صوفہ پر بیٹھ گیا۔ سائیڈ ٹیبل سے گلاس اٹھایا اور آہستہ آہستہ مشروب اس کے اندر انڈیلا۔ اس کو آخری حد تک لبریز کرکے اس نے بوتل سائیڈ پر رکھی اور ایک لمبا گھونٹ لیا پھر تیز تیز گھونٹ بھرنے لگا۔

اس وقت وہ دوسرا گلاس ختم کررہا تھا۔ جب دروازہ کھلا اور اریبہ اندر آگئی۔

"سلام شاہ سائیں!"

شاہ فضل نے سرخ نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور تب اریبہ کو ادراک ہوا کہ وہ کس شغل میں مصروف ہے۔ اسے جھٹکا لگا۔ وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھی۔

"آپ۔۔۔ یہ کب سے پینے لگے ہیں؟ میں نے آپ کو کبھی پہلے نہیں دیکھا۔" اس نے بڑے سرد لہجے میں کہا۔

اس کا لہجہ، اس کی لرزتی آواز اور آنسوؤں سے لبریز آنکھیں جیسے سارے راز عیاں کرنے پہ تلی بیٹھی تھیں۔

"تو۔۔۔؟ ثابت ہوگیا کہ مجھ میں ہر برائی موجود ہے پھر؟" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

اریبہ کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا اٹک گیا۔ وہ ایک بار پھر گلاس بھر رہا تھا۔

"اریبہ! بیٹھ جاؤ۔" اس کا لہجہ بڑا عجیب تھا۔ دھیما سلگتا ہوا۔

اریبہ خاموشی سے اس کے پیروں کے نزدیک تک گئی۔ شاہ فضل کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔

"اگر میں اس فیصلے کا اختیار تمہارے ہاتھ میں دوں کہ تم مجھے چھوڑ کر جانا چاہو تو جاسکتی ہو۔۔۔ تو تمہارا فیصلہ کیا ہوگا؟" اس کا لہجہ بڑا سپاٹ تھا۔

"یہ کیسا سوال ہے؟" وہ تڑپ کر بولی۔

"میں تمہارے جواب کا انتظار کررہا ہوں۔" اس نے کہا۔

وہ پھٹ سی پڑی۔ "آپ۔۔۔ آپ ہمیشہ مجھ سے اتنے مشکل سوال کیوں کرتے ہیں؟ آپ کو مزا آتا ہے نا مجھے مشکل میں ڈال کر۔" وہ سسک اٹھی۔

شاہ فضل نے خالی گلاس ٹیبل پر پٹخا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے برابر بٹھالیا۔ دونوں ہاتھ سختی سے اس کے شانوں پہ جمالیے۔

"میری بات کا جواب دو اریبہ! میں پاگل ہورہا ہوں۔" اس نے وحشت سے اس کے شانے جھنجھوڑ ڈالے۔

وہ زور زور سے رونے لگی۔

"میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔" وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔

"کیوں نہیں ہے تمہارے پاس جواب۔ کیا تم آزادی نہیں چاہتیں؟"

"کیا یہ بھی آپ کے انتقام کا حصہ ہے۔" آنسو پونچھ کر اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"بے وقوف لڑکی! میں تو تمہیں رہائی دے رہا ہوں۔" وہ تلخی سے ہنسا۔

"رہائی؟ آپ مجھے ہمیشہ کے لیے رہائی دے دیں، مجھے جان سے مار ڈالیں۔"

"اریبہ! تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟ تمہیں کیسے بتاؤں؟" وہ زچ ہوگیا۔

"میں سب سمجھتی ہوں۔ آپ کو مجھے اذیت دے کر خوشی ملتی ہے۔ آپ کے انتقام کے جذبہ کی تسکین ہوتی ہے آپ میری مرضی کیوں پوچھ رہے ہیں؟ مجھے فیصلہ سنائیں۔ جو آپ چاہتے ہیں۔"

وہ زچ ہوگیا۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اسے سب کچھ سچ سچ بتادے۔

اس نے دل کڑا کرکے اس کو سب بتانا شروع کردیا۔ شروع سے لے کر آخر تک بنا رُکے، بنا چھپائے اس نے اریبہ کو حرف بہ حرف بتادیا۔

وہ زرد چہرے کے ساتھ اسے دیکھتی گئی، اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دیواروں اور چھتوں کا سارا بوجھ اس پر گر رہا ہو۔ وہ بلند آواز میں رونا چاہتی تھی۔ وہ سانس لینا چاہتی تھی مگر اس کا وجود ملبے تلے دبتا جارہا تھا۔

اس نے زور سے سانس لینے کی کوشش کی مگر ناکام رہی، اس کی آنکھوں کے گرد دھندلا غبار چھانے لگا۔ شاہ فضل کے ہلتے ہونٹ بس اسے دکھائی دے رہے تھے وہ یہ ادراک کرنے میں ناکام تھی کہ وہ اب کیا کہہ رہا تھا۔

اس کا سر زور سے چکرایا، اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اگلے ہی لمحے وہ شاہ فضل کے بازوؤں میں آرہی تھی۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اریجہ اس وقت "حمید لطیف ہسپتال لاہور" کے گائنی وارڈ میں تھی۔ بی بی جان بینچ پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

وہی مخصوص ماحول' دوائیوں کی بو سے رچا بسا' پریشان چہرے لیے مریضوں کے لواحقین' تیز تیز چلتے ڈاکٹرز اور آگے پیچھے بھاگتے وارڈ بوائز اور نرسز۔

شاہ فضل کے چہرے پر جیسے چٹانی سکوت چھایا ہوا تھا۔

ڈاکٹر فیاض باہر آئے تو شاہ فضل بے چینی سے ان کی سمت بڑھا۔

"آئی ایم سوری شاہ صاحب! ہم آپ کے بے بی کو نہ بچا سکے۔"

شاہ فضل کے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ وہ ساکت سا انہیں دیکھتا رہا۔

"آپ کی مسز کو اچانک کوئی گہرا صدمہ پہنچا ہے جس کی وجہ سے ان کی یہ کنڈیشن ہوئی۔ ہم نے پوری کوشش کی مگر جو خدا کی مرضی۔" وہ اس کا شانہ تھپتھپا کر آگے بڑھ گئے۔

"آج ایک اور جرم تمہارے کھاتے میں درج ہو گیا شاہ فضل۔" کوئی اس کے اندر چلایا تھا۔

وہ تھکے ہوئے انداز میں بینچ پر گر سا گیا۔ اس کی آنکھوں میں ریت سی چبھ رہی تھی۔

"کیا ہوتا اگر میں ابھی اسے نہ بتاتا مگر میں یہ برداشت نہیں کر سکا' یہ بوجھ نہیں ڈھو سکا' سوچا اسے اتار کر پھینک دوں' جتنی جلدی ہو سکے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ اسے سہار پائے گی یا نہیں۔ کیا مجھ سے بڑھ کر کوئی خود غرض ہو سکتا ہے؟"

اسے اپنے آپ سے شرم آئی۔ بی بی جان اب نرس سے پوچھ رہی تھیں جو ان کو ان کی زبان میں بتا کر آگے چل دی۔ اس نے بی بی جان کی سسکیاں سنیں' اس کا دل چاہا خود کو شوٹ کر لے۔

وہ جھٹکے سے اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ وہ کسی کا سامنا کرنے کی کنڈیشن میں نہیں تھا' اریجہ کا تو بالکل بھی نہیں۔

☆ ☆ ☆

وہ بیڈ پر سیدھی لیٹی تھی۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی' اتنی گہری کہ اسے کسی قبر کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ اس کے نزدیک تھا' اپنی تمام تر درندگی اور سفاکی کے ساتھ۔

"میں بے قصور ہوں۔ شاہ سائیں!" وہ بند آنکھوں سے سسکی تھی۔

یک لخت اس کی گردن ایک مضبوط ہاتھ کے شکنجے میں کسی گئی' وہ بے پناہ اذیت سے تڑپی تھی' اپنے دونوں ہاتھوں کی پوری قوت سے اس کے دونوں ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہی تھی۔

وہ بلند آواز سے چیخنے لگی۔

"میں بے قصور ہوں شاہ سائیں! مجھے مت ماریں۔ مجھے چھوڑ دیں۔ مجھ پہ رحم کریں۔ آپ کو اللہ کا واسطہ۔"

اس کے اعضاء میں ایک تشنجی اکڑاؤ آنے لگا۔ اس کی سانس ٹوٹ رہی تھی' اس کے وجود کو جھٹکے سے لگنے لگے۔ یک بیک دوڑتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ دھاڑ کی آواز سے دروازہ کھولا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ ساکت اور احساس سے عاری نگاہ یک ٹک چھت کو گھور رہی تھی۔

نجانے کون اس پہ جھکا تھا' اگلے ہی لمحے اس نے دائیں ہاتھ پہ سوئی کی چبھن محسوس کی اور اس کے کچھ دیر بعد وہ دوبارہ سے غنودگی میں جا چکی تھی۔

بی بی جان گم صم سی اس کی حالت دیکھ رہی تھیں۔

پتا نہیں' اریجہ نے کون سا ڈراؤنا خواب دیکھا تھا جو وہ یوں مدہوشی کے عالم میں اس قدر تکلیف اور شدت سے چلا رہی تھی' مگر اس کے الفاظ وہ گنگ سی تھیں۔

"فضل! کیا کر بیٹھے ہو اس بچی کے ساتھ؟" وہ ہولتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

عجیب بیزار کن دنوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ حویلی واپس آ گئی تھی' مگر اب تک اس کا شاہ فضل سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ وہ سارا سارا دن کمرے میں بند رہتی۔ دوسری طرف وہ جا کر لاہور بیٹھ گیا تھا۔ آنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ بی بی جان اس کے معمولات کا

جائزہ لیتی رہتی تھیں اور اندر ہی اندر پریشان ہوتی رہتیں۔ کتنی ہی بار وہ شاہ محمود سے بات کر چکی تھیں کہ وہ فضل سے بات تو کریں کہ آخر وہ کیا چاہتا ہے۔ یہ آنکھ مچولی کا کھیل کب تک چلتا رہے گا۔

جنوری کا وسط چل رہا تھا۔ موسم بے حد سرد تھا۔ سورج ایسا ضدی تو نہیں تھا کہ چہرہ دکھانے کا روادار ہی نہ تھا اور دھند تھی کہ ایک ماں کی طرح سارا سارا دن فضا کو آغوش میں لیے رکھتی۔

وہ تیرہ جنوری کا دن تھا' سردی تمام دنوں سے بڑھ کر تھی۔

بی ایم ڈبلیو تیزی سے [illegible] دوڑ رہی تھی۔ کچھ دور جا کر وہ قبرستان کے گیٹ کے قریب رک گئی۔ دروازہ کھلا' باہر آنے والی ہستی شاہ فضل کی تھی۔ وہ ناک کی سیدھ میں چلتا مختلف قبروں کے قریب سے گزرتا شاہ فیصل کی قبر کے قریب جا کر رک گیا۔ چند لمحے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا' پھر تھکے ہوئے انداز میں نیچے بیٹھ گیا۔

"کیسے ہو فیصل؟" اس نے ہاتھ قبر پر یوں رکھا گویا وہ فیصل کا شانہ ہو۔ آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔

"مجھے پتا ہے ٹھیک ہو گے۔ مجھے دیکھو! میرے ہاتھوں سے کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ دیکھو فیصل! تمہاری محبت میں 'میں نے کتنے لوگ برباد کر ڈالے' کتنے دل اجاڑ ڈالے' وہ لڑکی... وہ میرے دل کا ناسور بن گئی ہے۔ میں کیا کر چکا ہوں اس کے ساتھ۔ وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی مگر میں اس سے معافی مانگوں گا بھی کیسے؟ مجھ میں تو اتنا حوصلہ ہی نہیں۔ تمہیں پتا ہے' نا میری ضدی اور انا پسند طبیعت کا۔ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں ہو رہا کہ میں... میں فیصلے کی غلطی کر سکتا ہوں؟؟؟ مگر میں کر چکا ہوں۔ مجھے تسلیم ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اس لڑکی کے ساتھ ہمیشہ زیادتی کی ہے۔ آج بہت حوصلہ اور ہمت کے ساتھ جا رہا ہوں اس کا فیصلہ سننے۔ میری ہمت بندھاؤ یار!" وہ کہتے ہوئے قبر سے لپٹ گیا۔

فضا میں ایک سرد سی خاموشی تھی' یکلخت کوئی الو ہمت کر کے باہر آواز میں چلایا تھا۔ کچھ دور موجود بیری کے درخت میں ہلچل سی مچ گئی' ایک دم سے ایک مردہ چڑیا نیچے گری اور فضا چڑیوں کے شور سے بھر گئی۔ وہ ساکت سا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا اور آنکھوں میں گہری دھند اترتی جا رہی تھی۔

"پتا ہے فیصل! بابا سائیں "کار مختار" کی پگ میرے سر پہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہونہہ۔ دیکھو نا کتنا بڑا مذاق ہے میرے ساتھ۔ میں تو رب کے اس فرمان کی پیروی نہیں کر سکا کہ

"عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو۔"

تو لوگوں کو کیا دوں گا؟ میرے ہاتھ میں عدل نہیں ہے۔ میں تو اپنے ساتھ انصاف نہیں کر سکا تو کسی دوسرے کے ساتھ...؟" اس نے لب دانتوں تلے دبا کر جیسے اپنا دکھ بہنے سے روکا۔

"میں نے بابا سائیں سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لیں گے تب ہی میں حویلی واپس آؤں گا۔ یہ ماں باپ کتنے مجبور ہوتے ہیں نا! آج ہی ان کا فون آیا تھا۔ کہنے لگے' آ جاؤ! مجھے مت ستاؤ۔ تمہاری ساری باتیں مان لوں گا۔" وہ چند لمحے خاموشی سے بیٹھا رہا۔

"چلتا ہوں۔" وہ اٹھ گیا۔

وہ شکستہ قدموں سے اپنی گاڑی کی سمت بڑھنے لگا۔ بالکل کسی ایسے شخص کی مانند جو اپنا سب کچھ لٹا چکا ہو۔ کچھ دیر بعد اس کی گاڑی حویلی کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

جب وہ حویلی پہنچا تو بابا سائیں کسی کام سے نکلے ہوئے تھے۔ سو بی بی جان کے کمرے کی سمت بڑھ گیا۔ وہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھیں' کتنی ہی دیر اس کا سر منہ چومتی رہیں۔ وہ خود پر ضبط کرتا رہا' ورنہ دل چاہ رہا تھا کہ یہ فراخ آغوش میں جو سب خطائیں بھلا دیا کرتی ہے اس میں چھپ کر سارے اعتراف کر لے۔

"بی بی جان! اریجہ کہاں ہے؟" کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

وہ تو جیسے بھری بیٹھی تھیں۔

"اپنے کمرے میں ہوگی اور کہاں۔ مجھے تو اس لڑکی کی سمجھ نہیں آتی فضل! مانتی ہوں کہ اس کے ساتھ غلط ہوا مگر لوگوں کے ساتھ تو اس سے بھی بڑے حادثے ہو جاتے ہیں۔ یوں سب چھوڑ چھاڑ کر تو کوئی نہیں بیٹھتا۔ میں تو ہار بیٹھی سمجھا سمجھا کر۔ دل چاہتا ہے تو کھانا کھا لیتی ہے ورنہ سارا دن پڑی رہتی ہے۔ منہ سے کچھ نہ بولنے کی تو گویا قسم کھائے بیٹھی ہے۔"

وہ بولتی جا رہی تھیں۔ وہ ان سنی کر گیا۔

"میں بہت تھک گیا ہوں بی بی جان! اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ کھانا کھانے کا موڈ نہیں میرا۔ کسی کو مت بھیجیے گا۔" وہ چادر سنبھالتا اٹھ گیا۔ اس کے قدم تیزی سے مردان خانے کی سمت بڑھ رہے تھے۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

اریجہ اس کو کھڑکی میں کھڑی نظر آئی۔ اس کی دروازے کی طرف پشت تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا اور وہیں جامد ہو گئی۔ وہ وہیں کھڑا اسے دیکھنے لگا۔ نظروں کا تصادم ہوا۔ اریجہ نے پلکیں جھکا لیں۔

وہ آہستگی سے چلتا اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"مجھے تمہارا فیصلہ چاہیے اریجہ!" اس کا لہجہ بڑا پرسکون اور ٹھنڈا تھا۔

"کیسا فیصلہ؟" اس کی آواز میں تندی اور چہرے پر سرکشی تھی۔

شاہ فضل نے جیسے اس لمحے بے پناہ ضبط کیا تھا خود پر۔

"تم جانتی ہو۔"

"نہیں۔ میں نہیں جانتی۔ آپ بتائیں۔" وہ چیلنج کرنے والے انداز میں بولی۔

"یہاں سے چلی جاؤ اریجہ!" اس کا لہجہ بڑا دھیما اور ایک التجا سمیٹے ہوئے تھا۔

اریجہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"آپ شاید بھول رہے ہیں شاہ فضل! خون بہا میں آنے والی عورتوں کو طلاق نہیں دی جاتی۔" وہ طنزیہ انداز میں یاد دہانی کروا رہی تھی۔

"میں اس روایت کو بدل دوں گا۔" اس نے یقین دلایا۔

وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ شاہ فضل نے اسے پہلی بار ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے ہموار چمکدار دانت بڑے خوبصورت تھے مگر ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔

وہ خاموشی سے اس پر نظریں جمائے اسے دیکھتا رہا۔

"میں نے آپ سے زیادہ خود غرض انسان اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ آپ کو اب لگنے لگا ہے کہ میں بے قصور ہوں؟ اوں ہوں۔ بے قصور تو میں دونوں صورتوں میں ہوں۔ جرم منصور لالہ کا تھا یا نہیں اس بحث سے بالاتر۔ چلیں مان لیتی ہوں کہ آپ کو غصہ تھا، شدید دکھ تھا اپنے بھائی کا اور اسی غم و غصے کو غلط کرنے کے لیے آپ نے ہمیشہ مجھے نشانہ بنایا۔ صرف نفسیاتی تسکین بلکہ جنسی اور جسمانی تسکین کا بھی۔ آپ کی خود غرضی کا پہلا ثبوت۔ دوسرا اب جب آپ نے اپنی اولاد کے لیے اپنے وارث کے لیے مجھے اپنے برابر جگہ دی۔ اور اب جب وہ نہیں رہا تو یہ سزا ہے میرے لیے ۔۔۔ یہ کہ میں یہاں سے چلی جاؤں؟"

وہ بالکل بدلے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔

"بس کرو اریجہ۔" اس کی برداشت جیسے ختم ہونے کو تھی۔

"آپ کیوں نہیں بس کر رہے؟ ترس نہیں آتا آپ کو مجھ پر؟" وہ [illegible] پڑی۔ زور زور سے روتے ہوئے اس نے شاہ فضل کا گریبان تھام لیا۔

"ایک [illegible] میرے بیٹے میں تاکہ آپ کو سکون مل جائے۔ مار ڈالیں مجھے۔" وہ بلک رہی تھی۔

وہ سناٹے میں رہ گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اریجہ کے شانوں پر جما دیے۔

"سزا تو تم مجھے سناؤ۔ جانتی ہو کیا کہا ہے ڈاکٹرز نے؟ یہ کہ تمہاری یہ کنڈیشن یہ ابارشن کسی شدید ذہنی جھٹکے اور ٹینشن کا نتیجہ ہے تو قصوروار میں ہوا نا! اگر میں خود پر ضبط کر لیتا تو شاید ایسا نہ ہوتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں اریجہ! چلی جاؤ مجھے چھوڑ کر۔ چلی جاؤ یہاں سے۔" اس نے ہاتھ ہٹا لیے اور دم سادھ لیا۔

فیصلے کی گھڑی آن پہنچی تھی۔

اریجہ زرد رنگت اور بھیگی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے کہ۔ میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔ تمہاری عمر ہی ابھی کیا ہے اریجہ! زندگی میں تمہیں سب مل جائے گا، خوشیاں، سکون اور کوئی بہت اچھا شخص۔ مجھ سے تمہیں کیا ملا؟ کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ جاؤ اریجہ۔ جاؤ۔" وہ تھکے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔

اریجہ کے ہاتھ جو ابھی تک اس کے گریبان پر تھے، بہت آہستگی سے پہلوؤں میں گر گئے۔

"چلی جاؤں یہاں سے؟" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

"کہاں چلی جاؤں؟ یہ تو میں بھی جانتی ہوں آپ بھی جانتے ہیں کہ حویلی کی بیٹیوں کی قسمتیں کبھی نہیں بدلتیں۔"

"لیکن اریجہ! میں یہ۔۔؟" اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"نہیں شاہ سائیں! اب اور کچھ نہیں۔ آپ اپنا ریکارڈ صاف رکھنے کے لیے اپنے آپ کو اس احساس جرم سے چھٹکارا دلانے کے لیے چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے چلی جاؤں مگر ایک بار پھر آپ خود غرضی دکھا رہے ہیں۔ کیا ضمانت ہے آپ کے پاس میری خوشیوں کی؟ میرے سکون کی؟ جو چیز آپ مجھے نہیں دے سکے، آپ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ وہ کوئی اور شخص مجھے دے پائے گا؟ کیسے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ اس معاشرے میں طلاق یافتہ عورت کی حیثیت کیا ہے؟ اور آپ یہ سوچے بیٹھے ہیں کہ کوئی اور "اچھا سا شخص" میری زندگی کی ساری کمیوں کو پورا کر دے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا میں آپ کی بے وقوفی پر ہنسوں یا رو دوں؟ میں آپ کو بتاتی ہوں شاہ سائیں کہ کیا ہوگا؟ جب اریجہ یہاں سے ٹھکرائی ہوئی عورت کا داغ لے کر جائے گی تو اس کے اپنے ماں باپ اسے بوجھ تصور کریں گے۔ وہ مجبوراً چند ماہ برداشت کریں گے پھر کسی اور کے سر لادنے کی سوچیں گے اور وہ "کوئی اور" جو کوئی بھی ہوگا، وہ تین بچوں کا باپ، دوسری شادی کا شوقین کوئی بوڑھا، دوسری تیسری بیوی کا امیدوار، کوئی اولاد کا خواہش مند، وہ ان میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے مگر وہ ہرگز نہیں ہوگا جو آپ سوچ رہے ہیں۔ اور تب کیا حیثیت ہوگی اریجہ کی؟ وہی جو یہاں ہے۔"

شاہ فضل کو لگ رہا تھا کہ اس کے وجود کے سینکڑوں ٹکڑے کر دیے گئے ہوں، ہر ٹکڑا ناقابل برداشت اذیت میں مبتلا تھا۔ وہ خود کو اس اذیت سے نجات دلانا چاہتا تھا، وہ چیخنا چاہتا تھا، وہ رونا چاہتا تھا بلند آواز میں مگر وہ کچھ نہ کر سکا، وہ بے بسی کے احساس سے چور اس کے سامنے گر پڑا۔

"دیکھو اریجہ! میں کتنا کنگال ہوں۔ میرے پاس کوئی اچھا عمل، کوئی نرم بات اور کوئی خوبصورت رات نہیں ہے جس کی بنیاد بنا کر میں تمہیں کہہ سکوں کہ تم یہ لے لو اور اس کے بدلے مجھے معاف کر دو۔ میں تو اس قابل بھی نہیں کہ تم سے معافی مانگ سکوں۔" وہ لمبا چوڑا مرد، وہ حاکم پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ وقت کا کیسا الٹ پھیر تھا۔

وہ خاموشی سے روتی رہی، جیسے کچھ نہ کہنا چاہتی ہو۔

ایک بار پھر ایک تاریک اور سیاہ رات ان کے درمیان آرہی تھی مگر گزری راتوں کی مانند اس میں تلخی نہیں تھی، ہجر نہیں تھا، اذیت نہیں تھی۔

وہ پہاڑی ندی کے دو کناروں کی مانند دور دراز تھے اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کب ملنے والے تھے؟ ملنے والے تھے بھی یا نہیں؟

☼ ☼ ☼

ثمنوں کی جو فصیل ہے

وہ اس قدر طویل ہے
غضب تو یہ ہے کہ اک نہیں
فصیل در فصیل ہے
تم اس کی ہر منڈیر پر
آرزوؤں کے جل سے
چراغ دل جلاؤ ناں
ذرا سا مسکراؤ ناں
ذرا سا مسکراؤ ناں!

زندگی ایک بار پھر اپنی ڈگر پر رواں دواں ہو گئی تھی' وہی پرانی ڈگر! وہ اسی طرح اس کے آگے پیچھے پھرتی۔ اس کے کام کرتی' اس کے پیر دباتی مگر رات ہوتے ہی وہ کسی سنڈریلا کی مانند بدل جاتی۔ خاموشی سے تکیہ اٹھاتی اور بیڈ کے دوسرے کنارے پر دراز ہو جاتی اور وہ صرف لب بھینچ کر رہ جاتا۔ وہ اس فاصلے کو پاٹنا چاہتا تھا مگر ایک چیز مانع تھی اور وہ تھا اریجہ کا گریز۔

وہ جانتا تھا وہ اس سے بچ رہی تھی' وہ اب تک بڑے ضبط اور حوصلے سے خود پہ قابو پا رہا تھا مگر کب یہ پیمانہ لبریز ہو جائے کوئی نہیں جانتا تھا۔

ان بیزار کن اور سرد مزاج دنوں میں ایک حیرت انگیز بات ندرت کے لیے نثار کا پروپوزل تھا۔ بی بی جان نے ندرت کے سرپرست کی حیثیت سے ہاں کر دی تھی۔ دونوں ہی شاہ فضل کے ملازم خاص کی حیثیت رکھتے تھے اس لیے اسے بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔

وہ پندرہ جنوری کا دن تھا۔ صبح سے ہی فضا دھند آلود تھی۔ سرد ہوا گویا ہڈیوں میں گھس رہی تھی۔ شاہ فضل معمول کے کام نمٹا کے لوٹا تو اریجہ اس کے لیے چائے لے آئی۔ اس نے تشکرانہ نظروں سے اسے دیکھا' اسے اس وقت چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔

رات جب وہ اپنے اردگرد ڈھیروں کاغذات پھیلائے بے حد مصروف تھا اور اریجہ نائٹ سوٹ بدلنے کے بعد ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بال بنا رہی تھی۔ دروازہ بجا کر ندرت اندر آئی' وہ دونوں کے لیے گرم دودھ لائی تھی۔

"السلام شاہ سائیں!" اس نے دودھ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

جواباً اس نے صرف سر ہلانے پہ اکتفا کیا۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ شاہ فضل نے آواز دی۔

"جی سائیں!" وہ بولی۔

"مجھے تم سے نثار کے بارے میں بات کرنی ہے۔" اس نے کہا۔

ندرت کا رنگ فق ہو گیا۔

"کک۔ کیا بات ہے سائیں!" وہ ہکلا گئی۔

ایک جھماکے سے اس کے دماغ میں اریجہ کی شبیہ لہرا گئی' وہ بھی تو اس سے ایسے ہی ڈرتی تھی' لیکن حیرانی کی بات تو یہ تھی آخر ندرت کیوں ڈر رہی تھی؟

"تم خوش ہو اس شادی سے؟" سنجیدگی سے پوچھا۔

"بیگم سائیں خوش ہیں' آپ خوش ہیں' میرے لیے اس سے بڑی خوشی کیا ہو گی؟" وہ آنسو چھپانے کے لیے تیز تیز پلکیں جھپکانے لگی۔

"بات ہماری خوشی کی نہیں۔ زندگی تمہیں گزارنی ہے۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔

اریجہ نے برش کرتے ہوئے استہزائیہ انداز میں اس "براڈ مائنڈڈ" انسان کو دیکھا۔

ندرت خاموشی سے کھڑی رہی۔ شاہ فضل کھوجنے والے انداز میں اس کا جائزہ لیتا رہا۔

"ٹھیک ہے جاؤ۔" اس نے جانے کی اجازت دی۔

وہ پلٹی اور [illegible] اس کے جانے کے بعد وہ اٹھا' دروازہ لاک کیا اور آتش دان کے پاس دھری ایزی چیئر پہ آ کر براجمان ہو گیا۔ جلتی لکڑیوں اور بھڑکتے شعلوں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا دل بھی تو ایسے ہی جل رہا تھا۔

اریجہ اٹھی اور دودھ کا گلاس اٹھا کر اس کے پاس چلی آئی۔

"دودھ لے لیں۔" اس نے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

"اریجہ!" اس نے بے تابی سے اس کو دیکھا۔

"جی۔" اس نے نظر جھکا لی۔

شاہ فضل نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہیں پایا۔

"رکھ دو۔ لے لوں گا۔" اس نے نظریں پھر سے آتش دان پہ جما دیں۔

اریجہ نے بنا کچھ کہے گلاس رکھا اور بینی کی سلائیڈنگ ونڈو کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

لان تاریک اور دھندلا تھا' بالکل اس کی قسمت کی طرح وہ خاموش اندھیرے میں [illegible] کھوئی رہی۔

"مطلع صاف نہیں۔ [illegible] بارش ہو گی۔" شاہ فضل کی آواز پر وہ چونکی' پتا نہیں وہ کب اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"جی [illegible]" وہ مدھم آواز میں بولی۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ کل "ملک ہاؤس" چلیں۔"

اریجہ نے حیرانی سے اسے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے اریجہ کو بولنے پہ اکسایا' وہ اتنا خاموش رہتی تھی کہ اسے بات کرنے پر مجبور کرنے کے لیے وہ کتنی ہی دیر لایعنی باتیں کرتا رہتا تھا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ آہستگی سے بولی۔

شاہ فضل کو اس کی فرماں برداری سے عجیب سی وحشت ہوئی۔

"آؤ! سو جاؤ' رات بہت ہو گئی ہے۔" وہ بیڈ کی سمت بڑھ گیا۔

وہ اس کی تقلید کرتی ہوئی بیڈ کے نزدیک آ گئی۔ وہ نیم دراز ہوا تو اس کے پیر دبانے کے لیے اس کی پائنتی بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھوں نے نرمی سے شاہ فضل کے پیروں کو چھوا تو ایک سکون اس کے اندر تک اترتا چلا گیا۔

اس نے بغور اریجہ کو دیکھا۔ وہ گلابی نائٹ سوٹ میں تھی۔ بالوں کو چھوٹے سے ہیئر بینڈ میں سمیٹے' رنگت میں زردیاں لیے ہوئے' آنکھوں کے گرد گہرے حلقے اور پپڑی زدہ ہونٹ' درد کی ایک لہر اس کے دل میں اٹھی اور سارے وجود میں پھیل گئی۔ اس نے لپک کر پیر کھینچ لیے۔

اس نے دایاں بازو موڑ کر آنکھوں پہ رکھ لیا جیسے اپنی ندامت چھپانا چاہتا ہو۔

وہ اٹھی اور اپنی مخصوص جگہ پہ جا کے دراز ہو گئی۔ کمرے میں زہرناک خاموشی تھی۔ صرف دو نفوس کے سانسوں کی آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ کچھ دیر بعد شاہ فضل نے بازو ہٹا کے اسے دیکھا' وہ اس کی طرف رخ کیے سو رہی تھی۔ ایک بازو سینے کے ساتھ لگائے اور دوسرا ہاتھ گال کے نیچے دھرے' بنا لحاف اوڑھے وہ بے خبر سو رہی تھی' اس نے لحاف اس پہ ڈالا اور روشنیاں بجھا دیں۔

"شاید جن کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا وہ اسی طرح سو جاتے ہیں' بے خبر اور مطمئن نیند اور میں؟ مجھے نیند ہی نہیں آتی' یوں لگتا ہے اب قسمت میں جاگنا ہی رہ گیا ہے۔"

وہ دل پہ ڈھیروں بوجھ سنبھالے اٹھا اور ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ ٹیرس تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا' سرد ہوا' جسم کے آر پار ہو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے ٹیرس پر رہا' رات قطرہ قطرہ بھیگ رہی تھی' وہ ہر احساس سے بے نیاز دور تاریکی میں جانے کیا کھوج رہا تھا۔

جانے کتنا وقت بیتا' وہ تھک کر اٹھا اور اندر واپس جانے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ لمحہ بھر ٹھٹک سا گیا۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی سرونٹ کوارٹر سے نکل کر لان کے خارجی حصے کی طرف جا رہا ہو' اس نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ بہت دور سے خشک پتوں پہ چلنے کی مدھم سی آواز آ رہی تھی۔ اسے ایس پی عباس کی بات یاد آ گئی۔

"پیٹھ میں چھرا گھونپنے والے اپنے ہی ہوتے ہیں' اپنے اردگرد خصوصی نظر رکھیے۔"

وہ تیزی سے واپس پلٹا اور کمرے سے اپنا ریوالور نکال لایا۔ سیاہ چادر مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹتے ہوئے اس نے سلیپر وہیں اتار دیے اور تیزی سے اس سمت بڑھنے لگا۔ اچانک بادل گرج اٹھے۔ بجلی کڑکی اور

تاریکی میں ایک پل کو روشنی سی پھیل گئی اور اس روشنی میں ایک درخت کے نیچے کھڑے وہ سائے فوراً اس کی نگاہ میں آ گئے۔

وہ احتیاط سے ان کی سمت بڑھنے لگا۔ کچھ نزدیک پہنچ کر اس نے خود کو ایک درخت کے تنے کی آڑ میں چھپایا اور سر نکال کر ماحول کا جائزہ لینا چاہا، اسی وقت ایک گھٹی گھٹی نسوانی چیخ نے اسے منجمد سا کر دیا۔ یہ آواز اس کے لیے بڑی جانی پہچانی تھی، دھوکہ کھانے کا سوال ہی نہ تھا۔

وہ ندرت کی آواز تھی۔

پھر یک لخت اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ الفاظ صاف نہیں تھے، اسے سمجھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ کچھ مزید آگے سرکا۔

"اگر تو نے منہ کھولنے کی کوشش کی تو تیرا انجام بھی اس شاہ فیصل کی طرح ہو گا۔ سمجھی تو؟" کوئی غرایا تھا۔

بجلی کڑکی اور جیسے شاہ فیصل پہ ہی آ گری۔

یہ نثار کی آواز تھی، وہ حیرت کی زیادتی سے ساکت سا کھڑا تھا۔

"تو چھپا نہیں سکے گا، یاد رکھنا۔ شاہ سائیں پولیس سے تحقیقات کرا رہے ہیں اور ایک نہ ایک دن وہ جان لیں گے کہ قاتل تو ہے۔ تو نے مارا ہے شاہ فیصل کو، یہ سچ سامنے آ کے رہے گا اور پھر تو دیکھنا نثار! تیرا کیا حشر ہو گا؟ شاہ سائیں تجھے کتوں کے آگے ڈال دیں گے۔"

غصے میں اس کی آواز اونچی ہو گئی تھی۔

"کیسے پتا چلے گا؟ کون بتائے گا انہیں؟ تم ... تو بتائے گی؟ بول؟" اس نے شاید ندرت کے بال مٹھی میں جکڑ لیے تھے۔

وہ گھٹی گھٹی آواز میں چیخنے لگی۔

"میرے بال چھوڑ ذلیل آدمی! کس بات کا بدلہ لیا تو نے چھوٹے سائیں سے؟ کیا بگاڑا تھا انہوں نے تیرا؟" تکلیف اور غصے میں اس کی آواز تیز ہو گئی۔

"جاننا چاہتی ہے نا! تو سن! شاہ فیصل نے گلزار کو راکھے (کھیتوں کی رکھوالی کرنے والے) کے ساتھ رات کو پانی لگانے بھیج دیا تھا۔ اسے ٹھنڈ لگ گئی۔ نمونیہ ہو گیا تھا اسے۔ اور تین دن ... صرف تین دن بعد وہ مر گیا۔ اس شاہ فیصل کی وجہ سے میرا بھائی مر گیا۔ یہ وڈیرے ... یہ شاہ زادے خود کو فرعون سمجھتے ہیں۔ لوگوں کو یوں سزائیں سناتے ہیں جیسے وہ ان کے زرخرید ہوں۔ یہ ... یہی ذمہ دار ہیں میرے بھائی کے مرنے کے۔ تب میں نے عہد کیا تھا کہ میں ان سے بدلہ لوں گا۔ اس شاہ فیصل کو مار ڈالوں گا تاکہ شاہ فضل کو پتا چلے کہ جب ... جب خود پہ پڑتی ہے تو کیا گزرتی ہے ... اور میں نے ایسا ہی کیا ... کوئی نہیں جانتا کہ گولی میں نے چلائی تھی اور کوئی جان بھی نہیں سکے گا مگر تو ... غلطی ہوئی مجھ سے کہ تجھ کو بتا دیا۔ یہ بھول گیا کہ عورت ایسی چیز ہے جو کبھی راز نہیں رکھ سکتی مگر اب نہیں۔ اس سے پہلے کہ تو انہیں بتائے، میں تیرا قصہ ہی پاک کر دوں گا۔" وہ سفاکی سے بولا اور ریوالور نکال لیا۔

ندرت پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اور شاہ فیصل ساکت کھڑا سب سن رہا تھا۔ اس وقت وہ خون جما دینے والی سردی سے بھی بے نیاز ہو چکا تھا۔

"تو مجھے مار ڈالے گا؟" وہ دہشت زدہ تھی۔

"ہاں! تیری صورت میں ایک مستقل خطرہ میرے ساتھ رہے گا، تو مجھے پیاری ضرور ہے مگر اپنی زندگی سے زیادہ نہیں۔" اس کا لہجہ کینگی سے بھرا ہوا تھا۔

بادل زور سے گرجے اور بارش شروع ہو گئی۔ فضا میں فائر کی آواز گونج اٹھی۔ ندرت کے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک اور دل دہلا دینے والی تھی۔

✡ ✡ ✡

کمرے کی فضا میں تین نفوس کی موجودگی کے باوجود پراسرار خاموشی تھی۔ وہ زمین پہ گری ہوئی تھی، اس کے کپڑوں پہ مٹی کے داغ تھے۔ وہ دونوں ہاتھ سر پہ رکھے مسلسل رو رہی تھی۔

"یہ رونا دھونا بند کر لڑکی! اور مجھے سچ سچ بتا یہ کھیل کب سے کھیل رہی تھی اس کے ساتھ مل کر؟" شاہ محمود کی آواز میں گرج اور آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔

لڑکی کا رونا مزید تیز ہو گیا۔

"کیا پوچھ رہا ہوں میں تجھ سے؟" وہ دھاڑے۔ وہ ہنوز روئے جا رہی تھی۔

"فضل! اس کو یہاں سے لے جاؤ ورنہ میں ... میں اس کو کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔" ان کے منہ سے تیزاب کی مانند ابلتے ہوئے الفاظ نکلے۔ لڑکی کا رنگ فق ہو گیا۔

شاہ فضل نے لب بھینچے ہوئے آگے بڑھ کر لڑکی کا بازو پکڑا اور اسے گھسیٹتے ہوئے باہر نکل گیا۔

شاہ محمود تھک کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ انہیں چند ضروری کام کرنے تھے، چند ضروری فیصلے کرنے تھے۔

"شاہ فضل کے سر پہ "کار مختار" کی پگ رکھنا تھی۔"

اور یہ ...

"نثار کی لاش کو ٹھکانے لگوانا تھا۔"

✡ ✡ ✡

وہی لوگ میرے قدموں سے زمین کھینچ رہے ہیں جو لوگ میرے قد کے برابر نہیں آتے

وہ کسی بپھرے ہوئے شیر کی مانند ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہا تھا، آنکھوں کی سرخی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ رک گیا۔ چند لمحے دہکتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا، پھر ایک دم اس پہ جھپٹ پڑا۔

تھپڑ اس کے چہرے پہ مارتے ہوئے اس نے دائیں ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔

"اگر میں فائر نہ کرتا تو وہ تمہیں ختم کر دیتا، جانتی ہو؟ بتاؤ مجھے۔ بولو کب سے جانتی تھیں تم؟" وہ غرایا تھا۔

"جب آپ لاہور گئے تھے اریحہ بی بی کو لے کر" وہ

گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

"تب کیوں نہیں بتایا؟"

"بس۔ بتانا چاہتی تھی سائیں! پر ہمت نہیں پڑتی تھی۔ وہ۔ وہ مجھے دھمکاتا تھا کہ اگر کسی کو بتایا تو بدنام کروں گا۔ سائیں۔ سائیں! میں ڈر جاتی تھی۔"

"تو۔ تو اس سے شادی کرنے چلی تھی۔" فضل نے اس کے بازو کو جھٹکا دیا۔

"سائیں! میں۔ میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ تو بیگم صاحبہ نے سائیں کے حکم پہ۔ نثار نے بیگم سائیں سے بات کی تھی شادی کے لیے۔ مجھ سے تو پوچھا ہی نہیں تھا، حکم دیا گیا تھا مجھے۔" فضل نے اس کا بازو جھٹکے سے چھوڑا۔

"شاہ سائیں! اگر آپ وہاں نہ آتے تو میں مر چکی ہوتی۔ اس وقت میں نے بڑی شدت سے اپنے رب سے دعا مانگی تھی کہ کاش! آپ کہیں سے آجائیں یا مجھے چند پل مل جائیں تاکہ میں آپ کو سب بتا سکوں۔ اور دیکھیں سائیں! اللہ تعالیٰ کتنا مہربان ہے، آپ خود بخود وہاں آگئے۔" وہ تشکر سے بکھر رہی تھی۔

کتنے بہت سے پردے ہٹ گئے آنکھوں سے۔

کتنے بہت سے راز فاش ہو گئے تھے۔

کتنی تلخ حقیقتیں سامنے آگئی تھیں۔

اگر وہ فائر نہ کرتا تو نثار ندرت کو بھی موت کے منہ میں بھیج چکا ہوتا۔

اور شاہ فیصل کے اصل قاتل کا معما بھی حل نہ ہوتا۔ منصور ہنوز مجرم رہتا اور اریجہ۔

"کل پنچایت بیٹھ رہی ہے۔ کیا بیان دو گی؟" شاہ فضل نے ٹھوس لہجے میں کہا اور ندرت نے سر جھکا لیا۔ تب ہی اریجہ وہاں آگئی۔

"نثار کی موت کے بارے میں؟" اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

ندرت خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ کمرے میں موجود خاموشی مزید پراسرار لگنے لگی۔

"اس نے میری عزت پہ ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی اور اگر آپ وہاں نہ آتے تو وہ اپنے گندے ارادوں میں کامیاب ہو جاتا۔ آپ کو دیکھ کر اس نے پستول نکال لیا۔ وہ پاگل ہو رہا تھا، اگر آپ اسے نہ مارتے تو وہ سب ختم کر دیتا۔" ندرت کا لہجہ بڑا مستحکم تھا۔

شاہ فضل حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اتنی کینگی کہاں سے لے لی تو نے؟" اس کے لبوں پہ محظوظ مسکراہٹ آگئی تھی۔

"آپ سے۔" یہ آواز ندرت کی نہیں تھی۔ وہ بے ساختہ پیچھے مڑا۔

اسے کرنٹ سا لگا۔ اسٹڈی کے درمیانی دروازے پر اریجہ بڑی دیر سے ٹیک لگائے کھڑی تھی، اس کی پوری طرح روشن آنکھیں ثبوت تھیں کہ وہ بڑی دیر سے جاگ رہی تھی اور کھڑی تھی۔

وہ آہستگی سے آگے بڑھ آئی۔

"تم جاؤ یہاں سے۔" اس نے تحکمانہ انداز میں ندرت سے کہا۔

ندرت نے شاہ فضل کی طرف دیکھا جس نے اسے آنکھ سے باہر جانے کا اشارہ کیا، وہ باہر نکل گئی۔

"واہ شاہ سائیں واہ۔" اس نے تالی بجائی۔

"سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یہاں بند کمرے میں یہ منصوبہ بندی ہو رہی ہے کہ نثار کی موت کو فطری رنگ کیسے دیا جائے اور میرے سامنے مظلوم بننے کا ناٹک کرتے ہیں آپ۔" وہ چبا چبا کر بولی تھی۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"آپ چاہتے ہیں نا کہ میں آپ کو معاف کر دوں؟ آپ کی طرف سے اگر ایسا ہے تو پھر آپ کل یہ اعلان کر دیں کہ میرا بھائی بے گناہ ہے۔ میرے بابا سے معافی مانگیں، آپ چاہتے تھے نا کہ آپ کے پاس کوئی ایسا عمل ہو جو آپ مجھے دے کر مجھ سے معافی مانگ سکیں۔ چاہتے تھے نا؟ تو جان لیجیے! آپ کا یہ عمل مجھے ہمیشہ کے لیے آپ کا کر دے گا۔" اریجہ نے پرسکون لہجے میں کہتے ہوئے داؤ کھیلا تھا۔

شاہ فضل جیسے زلزلے کی زد میں تھا۔ توڑ پھوڑ کے آثار اس کے چہرے سے عیاں تھے۔

"اور یاد رکھیے گا شاہ سائیں! جو شخص غلطی تسلیم نہیں کرتا، وہ اصلاح نہیں چاہتا۔ جب میں بے قصور ہوتے ہوئے سزا سہہ سکتی ہوں تو آپ غلط ہوتے ہوئے غلطی تسلیم کیوں نہیں کر سکتے؟"

وہ اپنی بات مکمل کر کے کسی جھونکے کی مانند باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن پنچایت کے تمام سرکردہ افراد موجود تھے۔ فیروز ملک کو بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ ایس پی عباس بھی موجود تھا۔

کارروائی شروع ہوئی۔ شاہ منصور کے مصاحب خاص نے تفصیل سے ساری حقیقت حاضرین کے گوش گزار کی۔ نثار کی موت سراسر طبعی تھی۔ اس میں کسی قسم کا تشدد یا غلطی کی جھلک دکھائی نہ دیتی تھی، اس لیے نثار کے ہاتھوں شاہ فیصل کا قتل سراسر زیادتی اور ظلم قرار دیا گیا۔

ایس پی عباس نے حقائق پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ نثار نے کس طرح موقع کا فائدہ اٹھایا اور سارا الزام منصور ملک کے سر دھر دیا گیا مگر سچ ہے کہ مجرم بے پناہ ہوشیاری کے باوجود اپنا کوئی نہ کوئی سراغ چھوڑ جاتا ہے۔ اسی طرح اس سے یہ غلطی ہوئی کہ وہ منصور ملک کے اور اپنے ریوالور میں فرق کو نظر انداز کر گیا۔

پھر ندرت کا بیان لیا گیا جو کہ حقیقت پر مبنی تھا اور اس نے بتایا کہ نثار نے اسے خود بتایا تھا کہ شاہ فیصل کو اس نے قتل کیا تھا جب اس نے نثار کو دھمکایا کہ وہ سب کچھ شاہ فضل کو بتا دے گی تو وہ اسے بھی مارنے پہ تل گیا۔ حادثاتی طور پر وہاں شاہ فضل آگیا جس نے نثار کا اعتراف اپنے کانوں سے سن لیا اور اگر اس وقت وہ نثار پر گولی نہ چلاتا تو اپنا جرم چھپانے کی خاطر نثار ندرت کو بھی موت کے گھاٹ اتار چکا ہوتا۔

آخر میں منصور ملک کو بے گناہ قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ وہ جہاں کہیں بھی روپوش ہے، باعزت واپس آجائے، اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔

دوسرا اہم فیصلہ "کار مختار" کا تھا۔ سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں شاہ فضل کے سر پر دستار رکھی گئی۔ خصوصی دعائیں مانگی گئیں۔ مبارک سلامت کا شور اٹھا تھا جب فیروز ملک نم آنکھیں لیے اس کے قریب آئے۔ وہ بے ساختہ ان سے لپٹ گیا۔

"میں اور اریجہ شام کو آپ کے ہاں آئیں گے۔" اس نے مدھم لہجے میں کہا تھا۔

اور ان کی آنکھوں کی حیرت اسے شرمندہ کر گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

ایک تھکا دینے والے بھرپور دن کے اختتام کے بعد وہ اس کے سامنے تھا۔

شاہ فضل نے آہستگی سے اسے قریب کر لیا۔

"اجازت ہے؟" اس کا مدھم لہجہ بے پناہ پیار لیے ہوئے تھا۔

اریجہ نے بے ساختگی سے مسکرا کر اسے دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"تم بہت عظیم ہو اریجہ! تم نے ناحق اتنے مظالم سہے۔ میں۔ میں بہت شرمندہ ہوں مگر۔ مگر اب میرا وعدہ ہے کہ تمہیں بے پناہ پیار دوں گا، اپنی ساری زیادتیوں کا ازالہ کروں گا۔"

اریجہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"میں نے تمہیں رلایا ہے اریجہ! مگر اب نہیں۔ اب صرف محبتیں ہی محبتیں ہوں گی۔ خوشیاں، پیار اور مسکراہٹیں۔ بس!" وہ اس کی آنکھوں کو چومنے لگا۔

اریجہ نے طمانیت سے آنکھیں موند لیں۔



سمارا علی بٹ

دل ناداں کو عشق تیرا ہے

مکمل ناول

"اماں حاجراں کا بڑا داماد وفات پا گیا تھا۔ ماجدہ، اماں ہاجراں اور ان کا بیٹا، جو شیفٹ تھا، سب چھٹی لے کر گاؤں چلے گئے تھے۔ منصور چاہتا تھا کہ ماجدہ رک جائے اکیلی شاہم کیسے سنبھالے گی کام بہت زیادہ تھے انہیں تین دن بعد لوٹنا تھا۔ مگر شاہم نے اسے بھی جانے کی اجازت دے دی۔

دن کی شروعات اس نے معمول کے مطابق ناشتہ بنانے سے کی۔ حمزہ اور عمیو کے لنچ بکس تیار کیے۔

انہیں روانہ کر کے دعا کو ناشتہ کروایا۔ منصور بھی اٹھ کے کمرے میں چلا گیا۔ دعا کھیلنے لگی تو وہ برتن دھونے لگی۔ ابھی وہ برتن دھو رہی تھی کہ منصور چلا آیا۔

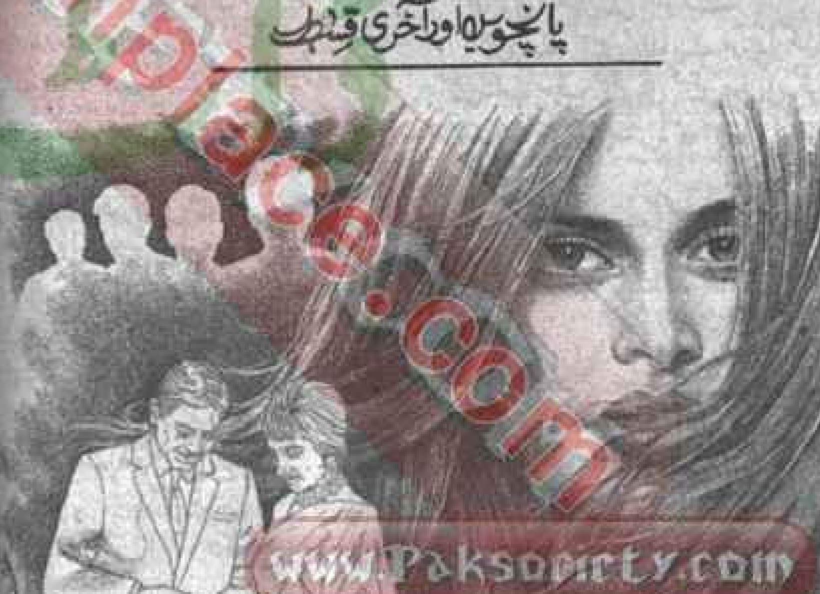
"آپ تیار نہیں ہوئے؟" اس کے خیال میں منصور آفس کی تیاری کر رہا تھا۔

"نہیں، میرا آفس جانے کا موڈ نہیں۔" وہ اس کے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔

"موڈ کو بھلا کیا ہوا؟" مسکراتے ہوئے وہ جلدی

۵

پانچویں اور آخری قسط



جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔

"اس لیے کہ مجھے لگ رہا ہے کہ تم تنہا کام نہیں کر سکو گی' میں تمہاری ہیلپ کرواؤں گا۔" وہ دھوئے ہوئے کپ اٹھا کر خشک کرنے لگا۔

"کیا کر رہے ہیں منصور! میں سب کر لوں گی۔" منصور کے اس احساس نے اس کے اندر خوشی کی لہر دوڑا دی۔

"یس۔۔۔ آئی ایگری۔۔۔ یو کین۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر؟" اس نے پلیٹ پکڑنا چاہی مگر منصور نے چھوڑی نہیں۔

"تو پھر یہ کہ تین روز کا پرابلم ہے' ہم مل بانٹ کے کریں گے ہنسی خوشی۔" اس نے خشک کیے برتن اٹھا کے اسٹینڈ میں دھرے۔

"آپ آفس سے ڈیلی آف کریں گے؟" منصور کبھی بھی چھٹی نہیں کرتا تھا۔

"آج چھٹی' باقی کے دو ہاف ڈے۔" اس نے اپنی پلاننگ بتائی۔

"کچن دھونا ہے' وہ میں خود کر لوں گی۔" برتن دھو کر اس نے نل بند کر دیا۔

"میں کمرے کا بکھیڑا سمیٹ لوں' بچے ہر چیز الٹ پلٹ کر گئے۔ باقی صفائی مل کر کریں گے۔" اس نے سارے لاؤنج کی چیزیں سمیٹی تھیں۔ تھوڑے سے کپڑے تھے اس نے مشین بھی لگا لی۔ وہ کپڑے کھنگالتی جاتی اور وہ نچوڑ کر۔۔۔ پھیلاتا جاتا۔ جینز اور اسٹین فولڈ کیے اس نے کام کرتے ہوئے اپنی شرٹ ساری بھگو لی تھی۔ بچوں کے آنے سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل دونوں نے سارے کام ختم کر کے کچن سنبھال لیا۔ وہ ایپرن باندھ کے ٹرے پہ پیاز کی کٹنگ کر رہا تھا۔ شاہم نے چائے بنائی۔ ایک کپ اس کے آگے رکھ دیا۔

"تھینک یو۔" اس کی کٹنگ بھی مکمل ہو چکی تھی۔ شاہم نے پیاز کو تلنے کے لیے آئل میں ڈال دیا اور خود چائے پینے لگی۔

"میں نے سنا ہے جو عورت کچن سنبھال سکتی ہو وہ شوہر بھی اچھی طرح سنبھال لیتی ہے۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

"بشرطیکہ شوہر آپ جیسا نہ ہو۔" اس نے دوبدو جواب دیا۔

"مجھ جیسے سے کیا مراد ہے؟" اس نے مصنوعی گھورا۔

"جو پکڑائی ہی نہ دے۔" چائے کا کپ رکھ کر وہ پیاز ہلانے لگی۔ وہ مسکرا کے رہ گیا۔

منصور اس کے ساتھ تقریباً" سارا کام کروا چکا تو شاہم نے اسے کپڑے تبدیل کرنے کے لیے زبردستی بھیجا۔ وہ چاول نکال کر صاف کرنے لگی۔ اتنے میں منصور بھی آ گیا۔

"شاہم! آئی تھنک بچوں کو ہم دونوں لینے جاتے ہیں۔" وہ کچھ زیادہ ہی موڈ میں تھا۔

"ابھی مجھے چاول پکانے ہیں۔" شاہم نے اپنی مصروفیت بتائی۔

"چاول شام میں بنا لینا' ہم آتے ہوئے روٹیاں بازار سے لے آئیں گے۔"

"اچھا۔۔۔ اوکے۔ میں چینج کر لوں۔" وہ جلدی سے رضامند ہو گئی۔

وہ دونوں' ماں باپ کو یوں اکٹھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور تمتماتے سرخ چہرے لیے باری باری ان سے لپٹ گئے۔ سارے رستے وہ دونوں کے درمیان بیٹھے چہکتے رہے۔ شاہم نے ٹیبل پر کھانا لگایا اور منصور نے انہیں چینج کروا دیا۔ وہ دونوں پہلی بار ایک دوسرے کے ساتھ خود کو مکمل اور بہت خوش محسوس کر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

شام سے چھائے بادل رات کو برسے تھے۔ شاہم کی جان بادل کا گرجنا دیکھ کر ہی نکل جاتی تھی۔ اسے گہرے بادلوں' بارش اور بجلی کی کڑک سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اسی ڈر نے اسے رات بھر تک سونے نہ دیا۔ کھڑکی' دروازے بند کیے وہ بیڈ پہ دبکی بیٹھی تھی۔ ملازمہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی ورنہ وہ اسے اپنے پاس روک لیتی۔ تیز بارش کی بوچھاڑ اور بجلی کی چمک کھڑکی سے ٹکرا رہی تھی۔ بجلی کی چمک کا کھڑکی کے شیشے سے ٹکرانا اسے مزید خوفزدہ کر رہا تھا۔ وہ بڑی ہمت کر کے سمٹے ہوئے اٹھی تاکہ پردے برابر کر سکے۔ بیڈ سے کھڑکی تک کا فاصلہ اس نے بمشکل طے کیا۔ پردہ ہاتھ میں پکڑے اس نے اپنی تسلی کے لیے باہر روش پہ سیکیورٹی گارڈ کو دیکھا جو وہاں نہیں تھا۔ روش پہ کاشف کی مرسڈیز کھڑی تھی۔

"کاشف۔۔۔" اس کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ اس نے لان میں نشن پہ لیٹے کتے کو اپنے ساتھ چمٹاتے بارش میں بھیگتے کاشف کو دیکھا۔

وہ تیزی سے پلٹی اور الماری کھول کے اس کے سب سے نچلے خانے سے چھتری نکال لی۔ صوفے پہ پڑی چادر اٹھا کر اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کے وہ باہر لان کی طرف بھاگی۔ اس کا سارا خوف زائل ہو گیا تھا۔ اسے صرف یہ یاد تھا کہ کاشف لان میں پڑا ہے۔ وہ اندھا دھند بھاگتی ہوئی اس تک پہنچی۔

"کاشف۔۔۔ کاشف۔" وہ اسے جھنجوڑنے لگی۔ کتا اس نے چھڑوا دیا' جو زبردستی اس نے پکڑ رکھا تھا۔ بارش میں بھیگنے سے کتا بھی باؤلا ہو رہا تھا۔ چھوٹتے ہی وہ دور بھاگ گیا۔

"کیا۔۔۔ ہے؟ مجھے اس سے۔۔۔ باتیں کرنا۔۔۔ ہیں۔۔۔ تم جاؤ۔۔۔"

اس نے بہت زیادہ پی رکھی تھی۔ آنکھیں بے تحاشا سرخ تھیں۔ ماہم کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ مکمل بھیگ چکا تھا۔ اس نے چھتری اس پہ کر دی۔

"اٹھو کاشف اندر چلو۔" وہ رو دینے کو تھی۔

چوکیدار باہر کیبن میں تھا۔ سیکیورٹی گارڈ اپنی ڈیوٹی سے غافل کوارٹر میں پڑا سو رہا تھا۔

"سیکیورٹی۔۔۔" اس نے زور سے آواز دی' جو بارش کے شور میں دب گئی۔

"نا۔۔۔ نہیں۔۔۔ یاہی (یہیں)۔۔۔ تکیہ لا۔۔۔ دو۔۔۔ کم۔۔۔ مجھے نیند۔۔۔ آ رہی ہے۔"

وہ رک رک کر بات کر رہا تھا۔ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

"اٹھو پلیز۔" اس نے پورا زور لگا کے اسے تھوڑا سا اوپر کیا۔

"کہاں۔۔۔ جانا ہے؟" وہ گرتے گرتے بیٹھا تھا۔

"اندر۔۔۔ بیڈ روم میں جا کے سو جانا۔"

وہ بھی بارش میں گیلی ہو گئی تھی۔ وہ اٹھ نہیں رہا تھا۔

"نہیں مجھے۔۔۔ یہیں سونا ہے۔۔۔ تم۔۔۔ تم بھی لیٹ جاؤ۔" اس نے ماہم کو بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

"نہیں۔۔۔ اٹھو۔۔۔ کاشف۔"

اب اس نے کھڑے ہو کر اس کا بازو اوپر کو کھینچا۔

"اچھا۔۔۔" وہ لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا۔

ماہم نے اس کے مان جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ اسے سہارا دے کر بڑی مشکلوں سے بیڈ روم تک لائی۔ وہ بیڈ کے وسط میں گر گیا۔ نیند سے اس کی آنکھیں بھری تھیں۔ چھتری پرے پھینک کر خود پہ سے اس نے گیلی چادر بھی اتار کر کاؤچ پہ رکھ دی اور اس کے بوٹ اتارنے لگی۔ بوٹ اتار کر ٹانگیں اوپر کیں اور اسے کندھوں سے کھینچ کر سر تکیے پہ رکھا۔ اسے یہاں تک لانے میں وہ نڈھال سی ہو کر نیچے کارپٹ پہ گر ہی گئی۔

وہ پچھلے دو ہفتوں سے ہی بڑا پراسرار سا ہو گیا تھا۔ کافی خاموش' گم صم سا اپنے آپ سے اور ارد گرد سے کافی لاپروا۔

"کاشف۔۔۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

وہ رو رہی تھی۔ اسے کاشف کی حالت پہ رونا آ رہا تھا۔ وہ اس طرح سے تو کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ اب اسے کیا ہو گیا ہے۔ وہ بہت زیادہ پینے لگا تھا۔ چین اسموکر بن گیا تھا۔ آج اس کا یوں نشے میں دھت ہو کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھنا۔ وہ جتنی بھی ڈرنک کر لیتا تھا اس کے حواس قائم رہتے تھے۔ یقیناً "کچھ غلط ہوا ہے' جو وہ ماہم سے بھی شیئر نہیں کرنا چاہتا حالانکہ اس نے دو ایک بار پوچھا بھی۔

وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر کارپٹ پہ گھٹنوں کے بل بیٹھ

کر اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ چوڑی پیشانی سے بھیگے بالوں کو انگلیوں سے سمیٹ کر رہ گیا۔ آنکھوں کے پپوٹے ہلکے ہلکے سوجے تھے۔ رنگت چند ہی دنوں میں زردی مائل ہو گئی تھی۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیشہ اپنا بہت خیال رکھا تھا۔

صبح بہت خاموشی سے طلوع ہوئی۔ اس نے گھر کے کام نبٹانے میں کافی احتیاط سے کام لیا۔ اسے کاشا کے اٹھ جانے کا خدشہ تھا۔

وہ دوپہر کے دو بجے اٹھا تھا' جب وہ کچن میں آخری مراحل میں کام نبٹا رہی تھی۔ کسمسانے کے بعد وہ بیڈ سے نیچے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے کندھوں کو جھکائے بیٹھا رہا۔ آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مسل کر وہ سستی سے اٹھا' پانی کا گلاس بھر کرتے ہوئے وہ اپنے مخصوص ریفریجریٹر کی طرف آ گیا۔ ابھی اس نے کین پکڑا ہی تھا کہ یکدم اس کی نظر اپنی شرٹ پہ چلی گئی۔ کین واپس رکھ کر وہ پلٹا۔ گلاس ٹیبل پہ دھر کر بالوں میں انگلیاں پھنسائے وہ رات کا واقعہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے کچھ کچھ یاد تھا اور یہ بھی کہ اس نے کل یہ کپڑے نہیں پہنے تھے۔ بارش کا خیال آتے ہی اس نے زور سے ماہم کو پکارا۔

"ماہم۔۔۔" دوسری پکار پہ وہ حاضر تھی۔

"جی۔۔۔ جی۔" اس کی بوکھلاہٹ بہت واضح تھی۔

"رات کیا ہوا تھا؟" اس کا لہجہ تفتیشی تھا۔

"رات بارش ہوئی تھی اور آپ بہت ڈرنک کیے ہوئے۔۔۔"

وہ آنکھوں میں نمی لیے واپس پلٹی ہی تھی کہ کاشا اس کی کلائی جکڑ لی۔

"کیوں کر رہے ہو ایسا' تم اتنے کیئرلیس تو کبھی نہیں تھے۔ رات تم نشے میں تھے۔ اگر گاڑی کسی سے ٹکرا جاتی یا پولیس تمہیں اریسٹ کر لیتی تو۔۔۔ اگر اپنا خیال نہیں رکھنا تو مجھے رکھ لینے دو' مجھے [illegible] سے غفلت قطعاً" برداشت نہیں [illegible] تم لاکھ برے سہی مگر تمہیں تکلیف میں دیکھنا میرے بس سے باہر ہے' پلیز سنبھالو خود کو۔" اس کے مقابل کھڑے یہ سب کہتے ہوئے اس کے آنسو نکل رہے تھے۔

"میرا سوٹ کیس تیار کر دو۔" اس سے نظریں چرا کے وہ بڑبڑانے جیسا بولا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"امریکہ۔۔۔ امریکہ جا رہا ہوں۔" وہ ابھی بھی نظریں چرائے ہوئے تھا۔

"امریکہ۔۔۔ تم امریکہ کیوں۔۔۔"

کاشا نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"تم کہتی ہو میں بہت برا ہوں مگر جھوٹا نہیں ہوں' آئی سویئر زندگی میں پہلی بار۔۔۔ پہلی بار سچ بولنے کی ہمت نہیں پا رہا' اینڈ آئی ریکویسٹ یو پلیز۔۔۔ پلیز کچھ نہ پوچھو' تھوڑا سا انتظار کرو اور پھر سب کلیئر ہو جائے گا۔" اس کے گالوں سے آنسو پونچھ کر اس نے ماہم کو سینے سے لگا لیا۔

☆ ☆ ☆

وہ واش روم سے ہاتھ سے ہی پانی چہرہ پونچھتا باہر نکلا۔ وہ ابھی آفس سے آیا تھا۔ رحیم خان پانی کا گلاس لیے کھڑا تھا۔

"تھینک یو رحیم۔" اس نے گلاس پکڑ لیا۔

"کاشا صاب آیا تھا۔" رحیم خان نے اطلاع دی۔

وہ پانی پیتے پیتے ٹھٹک گیا۔

"کیا کہہ رہا تھا؟"

"آپ کے لیے میسج چھوڑا ہے۔ رات دس بجے ایئرپورٹ پہنچ جائیں' وہ امریکہ جا رہے ہیں' آپ سے ملاقات ضروری ہے۔"

رحیم خان اسے سوچوں میں گھرا چھوڑ کے چلا گیا۔ کاشا نے اس سے اپنے امریکہ جانے کی خواہش کا ذکر کیا تھا' جس کے لیے وہ لیلیٰ کو سیڑھی کے طور پہ استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس بات پر ان کے درمیان تھوڑی بحث بھی ہوئی تھی۔ کاشا نے لیلیٰ سے شادی کر لی اور ماہم کا گھر بھی سیل کر دیا تب بھی غنی کے ذہن کے کسی کونے میں یہ نہیں آیا کہ وہ امریکہ چلا جائے گا۔ اس سے قبل اس نے کبھی امریکہ جانے کی خواہش کا ذکر نہیں کیا تھا' نہ ہی غنی کو بھی اتنے سالوں سے اس کی باتوں سے پردیس کی خوشبو آئی تھی۔ مگر اچانک ہی اس نے امریکہ جانے کا شوشہ چھوڑ دیا' جسے غنی نے اپنی مصروفیات میں بھلا دیا تھا۔

کاشا کی فطرت سے واقف ہونے کے باوجود وہ اس سے نہ اتنا سنجیدہ مذاق کرتا ہے' نہ ہی جھوٹ بولتا ہے۔ غنی نے اس کی وہ بات فراموش کر دی [illegible] آج رات ہمیشہ یاد رہتی یوں اچانک [illegible] ناراض یہ ملک چھوڑ کے جا رہا تھا۔ غنی [illegible] اس قدر ناراض نہیں تھا' نہ ہی وہ [illegible] اس عرصہ کو اتنا طول دینا چاہتا تھا' اس [illegible] غیر شعوری طور پہ کاشا کا انتظار رہا اور شاید ایسا ہی انتظار کاشا کو بھی رہا ہو گا۔

پورے دس بجے اس نے اپنی گاڑی اسٹینڈ پہ لگائی۔

اسے کاشا کے یوں خاموشی سے جانے پہ دکھ تھا۔ کئی بار اس نے چاہا کہ اب عین وقت پہ بھی نہ ہی جائے مگر وہ ایسا سوچ تو سکتا تھا' کرنا مشکل تھا۔ ایئرپورٹ پہ کافی گہما گہمی تھی۔ اس نے متلاشی نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں۔ اتنے رش میں ایک چہرہ تلاشنا کافی مشکل تھا۔ وہ موبائل نکال کر کاشا کو کال کرنے لگا۔

"غنی۔۔۔" بہت عرصہ بعد اس نے غنی کا نام پکارا تھا۔

"ہاں کاشا۔۔۔ میں ایئرپورٹ پہ ہوں' تم۔۔۔"

"ارائیول ڈیپارچر کی طرف آ جاؤ۔"

موبائل جیب میں رکھ کے وہ اس طرف بڑھ گیا۔ اس نے تھوڑے سے فاصلے سے ہی کاشا کو دیکھ لیا مگر پہچاننا مشکل ہے۔ اس نے داڑھی رکھ لی تھی۔ غنی نے دور سے دیکھا۔ غنی پہ نظر پڑتے ہی اس نے اپنے ساتھ لیلیٰ کو بیگ پکڑا کر جنگلے کے دوسری طرف جانے کا کہہ دیا۔

دونوں ایک دوسرے کے قریب پہنچ کر کے چند لمحے خاموش رہے۔ غنی کو سینے سے لگانے میں کاشا نے پہل کی تھی۔

"وہ نہیں آیا تھا تو۔" اس نے گلے لگتے ہی شکوہ کیا۔

"تو نے بلایا ہی کب؟ اب بھی خود آ گیا ہوں۔"

"میں نے صبر انتظار۔۔۔" وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔

"کیوں جا رہا ہے امریکہ۔ روکا تھا میں نے تجھے' تو نے میری بھی نہیں مانی' اب بھی کر لی اپنی مرضی۔" غنی بہت دکھ سے یہ سب کہہ رہا تھا۔

"تو ہمیشہ کہتا تھا کہ میں بہت لکی ہوں اور آلویز ونر بھی' بٹ یو ریئلی ڈونٹ نو یار! آئی ایم جسٹ لوزر۔۔۔ جسٹ لوزر۔"

غنی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کاشا کہہ رہا ہے۔ غنی نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ اس کا لہجہ اور انداز بہت تھکے تھکے سے تھے۔ آنکھیں ابھی بھی سرخ تھیں۔ بڑھی ہوئی شیو اور زردی مائل رنگت' آنکھوں کے نیچے سیاہی مائل سے حلقے۔ اسے کیا ہوا تھا؟ وہ اس طرح سے کیوں سوچنے لگا تھا۔

"اتنی ڈس اپائنٹ منٹ (ناامیدی) کاشا؟" وہ حیران تھا۔

"ڈس اپائنٹ منٹ نہیں' ریئلٹی آف لائف"
(ناامیدی نہیں زندگی کی حقیقت)

اس نے ذرا سا پیچھے مڑ کے جنگلے کے اس پار دیکھا۔

"ماہم کا کیا کیا؟" غنی نے بھی جنگلے کے اس پار منتظر لیلیٰ کو دیکھا۔ اسے ماہم کا خیال آ گیا۔

کاشا اس سوال پہ کسی گہری سوچ میں اتر گیا۔

"میں نے۔۔۔ اپنی زندگی میں شاید دو عورتوں سے محبت کی ہے۔ ان میں سے ایک میری ماں ہے۔۔۔ بہت سال لگے مجھے یہ confess (اعتراف) کرنے میں۔ بلیو می یار! مجھ سے وہ غلام بن کر نہیں جیا جا سکا۔ میں نے یہ ڈیسائیڈ کر لیا تھا کہ ہر برائی چھوڑ چھاڑ کے ایک صاف ستھری لائف گزاروں گا۔۔۔ بٹ ناٹ' یہاں بدقسمتی نے دوسری بار میرا دامن تھام لیا۔ وہ جو شہ رگ سے بھی نزدیک تر ہے' آئی سویئر یار! اسے بھی میری توبہ قبول نہیں۔ میں نے بھی اس سے نہیں

مانگا اسے نہیں پکارا مگر وہ۔۔۔ وہ صرف مانگنے والوں کو ہی نہیں دیتا' سب کو دیتا ہے' مگر مجھے نہیں دیا۔ ایک عورت ہی مانگی تھی نا' جس کو ہاں کیا جاتا اس کا۔۔۔ میں نے بہت کوشش کی غنی۔۔۔ تھک ہار گیا ہوں۔"

وہ بولتے بولتے تھک گیا۔ اس کا ہاتھ غنی کے کندھے پہ تھا۔ وہ کم فہمی سے اس کی گفتگو کو سمجھ رہا تھا۔ وہ دوسری عورت کون تھی؟ کاشا کیوں کر یہ سب کہہ رہا تھا۔ اس کے اندر اتنی بڑی تبدیلی کیسے آگئی اور محبت۔۔۔ محبت سے اس کا لین دین کبھی رہا ہی نہیں تھا۔

"دوسری عورت؟" اس نے استفسار کیا۔

"تم نے میرے بہت سے کام کیے ہیں' آخری وہ اور ہیں۔" اس نے غنی کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔

"یہ ماہم کو دے دینا۔" اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں سے سفید رنگ کا لفافہ نکال کر اسے تھمایا۔

"کیا ہے اس میں؟" اس نے لفافہ دیکھ کر کہا۔

"ماہم کے۔۔۔ ڈائیورس پیپرز ہیں۔ اسے کل کی ڈیٹ میں وہ گھر بھی خالی کرنا ہوگا' وہ لوگ قبضہ لینے آجائیں گے۔"

اس نے غنی سے نگاہیں چرالی تھیں۔

"کاشا۔۔۔ اتنا بڑا دھوکا۔۔۔"

ملال میں گھرے غنی کے منہ سے بس اتنا ہی نکل پایا۔

"محبوب کو منزل کے قریب لے جا کر دھوکا دیا جائے تو اس کی بے وفائی پہ بھی یقین ہو جاتا ہے اور نفرت کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اگر میں یہ سب نہ کرتا تو وہ شاید میری واپسی کی منتظر رہتی۔"

غنی ماہم کی بحث میں مزید الجھنا نہیں چاہتا تھا جبکہ طلاق کے کاغذات بھی اس کے ہاتھ میں تھے اور کاشا ملک چھوڑ کر جانے والا تھا۔ پہلے بھی ان کے مابین "عورت" ہی جھگڑے کا باعث تھی۔

"دوسرا کام۔"

"میری واپسی تک یہیں ٹھہرنا' پاکستان میں ہی میرے گھر میں' جب تک میں لوٹ نہ آؤں۔"

کاشا کی واپسی کا سن کر غنی کے چہرے پہ ہلکا سا خوشی کا تاثر ابھرا۔

اس نے کاشا کا ہاتھ تھام لیا۔

"تمہارے لیے بھی کچھ چھوڑا ہے میں نے۔ بس عادت ہے تم سے کچھ بھی نہ چھپانے کی۔ میرے کمرے میں جو میرا پرسنل لاکر ہے' اس میں ایک فائل پڑی ہے اسے پڑھ لینا۔"

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے کاشا؟"

غنی کو وہ اور اس کی معنی خیز گفتگو دونوں بہت پراسرار لگ رہے تھے۔

"ہاں ٹھیک ہے' کیا ہونا ہے مجھے۔۔۔ تم اپنا بہت سا خیال رکھنا۔" اس نے غنی کے گال پہ محبت سے ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی تھی۔

"کاش! ہم دونوں کبھی جدا نہ ہوتے۔۔۔"

"کاش! میں نے کبھی تمہاری مان لی ہوتی۔۔۔"

اس نے غنی کو دوبدو جواب دیا۔ اب وہ ایسا ہی محسوس کرتا تھا۔

کاشا نے کلائی پہ بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ امریکہ کی فلائٹ کے لیے اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔

"جب جا ہی رہا تھا' پھر گھر کیوں نہیں آئے مجھ سے ملنے۔" اناؤنسمنٹ نے غنی کے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔ بچھڑنے کا وقت آگیا تھا۔

"آجاتا تو تمہارے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔" اس نے چالاکی بتائی تھی۔ وہ اس کے پاس جا سکتا تھا' مگر وہ غنی کے سوالات سے ڈرتا تھا۔ غنی سے مباحثہ کے لیے اس کے پاس دلائل نہیں رہے تھے۔

"چلنا چاہیے۔" کاشا نے جھٹکے کے اس پار ہاتھ ہلاتی لیلیٰ کو دیکھ کر کہا۔

"اس دوسری عورت کا نام بتاتے جاؤ جس سے تمہیں محبت ہے۔" غنی کو پھر یاد آگیا تھا۔

"چھوڑو یہ۔" وہ اس ذکر کو گول کر رہا تھا۔

"وہ دوسری عورت۔۔۔ ماہم ہے کاشا؟"

غنی شاید پہلی بار اتنی جلدی گھر آگیا تک پہنچ گیا تھا' حالانکہ ماہم کی آزادی کے کاغذات اس کے ہاتھ میں مقید تھے۔

"بہت یاد آئے گا۔"

کاشا نے خاموشی سے اسے گلے سے لگا لیا۔ ایک دوسرے کے سینے سے لگے وہ دونوں بہت بے قرار تھے۔ کاشا کی آنکھوں سے آنسو نکل کر غنی کے کندھے میں جذب ہونے لگے۔ غنی بھی بہت ضبط کے باوجود رو پڑا۔

☆ ☆ ☆

ایئرپورٹ سے گھر تک کے تمام رستے وہ آنکھوں کی نمی رگڑتے آیا تھا۔ کاشا اور اس کی بول چال تین مہینے سے بند تھی۔ اس کے دل پہ کسی قسم کا بوجھ نہیں تھا۔ اب اسے اپنا دل پھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ گاڑی پورچ میں لگا کے وہ سیدھا کاشا کے بیڈروم میں آیا' اس نے سیف کا پرسنل لاکر غیر مقفل تھا۔ سامنے ہی واحد فائل کھلی پڑی تھی۔

"شیخ زید ہسپتال۔" فائل پکڑے وہ بڑبڑایا۔

کسی انہونی کا دھڑکا اسے لرزا گیا تھا۔ ہلکی کپکپاتی انگلیوں سے اسے کھولا۔

یہ کاشا کی میڈیکل رپورٹ تھی۔

"لنگ۔۔۔ کاشا۔۔۔ اے۔۔۔ ایچ آئی وی پازیٹیو۔۔۔"

اسے اپنے گرتے وجود کو سنبھالنے کے لیے سیف کا سہارا لینا پڑا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ کمرے کی بھاری چھت اس کے اوپر آگری ہے۔ اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔

کاشا نے واقعی اس سے کبھی کچھ نہیں چھپایا تھا۔

ابھی ایئرپورٹ پہ اسے کاشا کی گفتگو بہت معنی خیز اور اس کی شخصیت پراسرار لگ رہی تھی' اب اس کا راز کھلا تھا۔ اس کے جملے جو اس کے سر سے گزر گئے تھے' اب سمجھ آرہے تھے۔ اس نے خود کو بدنصیب کہا تھا' بالکل درست تھا وہ۔

وہ ڈیجرز ان کا شیدائی' خطرات کو چیلنج کرتا اور مسائل کو چٹکی سے حل کرنے والا' قدرت کے اس کڑے امتحان کے چیلنج کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ وہ آلویز ونر' بازیگر' زندگی کے اس پار بے بسی سے کھڑا تھا۔ اس نے زندگی میں جو کچھ کیا' اس کی سزا اسے کتنی بھیانک ایک ناقابل علاج بیماری کی صورت ملی تھی۔

غنی فائل دبوچے نیچے بیٹھا رو رہا تھا۔ کاشا کا دکھ اس کا اپنا تھا' جیسے کاشا کا گھر چھوڑ جانے کے بعد بھی اس کا تھا۔ وہ اور کاشا کبھی بھی ناراض نہیں ہوئے تھے۔ چند لمحے کے لیے بھی ان کی بول چال بند نہیں ہوئی تھی۔

ان سات سالوں میں کاشا کو ہر برائی میں ملوث پایا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ بھی اس کا ساتھ دینے لگا تھا۔ وہ اس کی ہر کمینگی میں برابر رہتا' مگر کاشا فاتح تھا۔ عورت ان کے مابین خاموش تنازعہ رہی تھی' مگر جھگڑے نے کبھی اتنا طول نہیں پکڑا تھا۔ وہ کاشا کے سامنے کبھی اونچا نہیں بولا تھا۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔ ملازمین کو سختی سے نصیحت تھی کہ کاشا کے کام میں تاخیر نہیں ہونا چاہیے' اسے زبان سے کہنا نہ پڑے۔ وہ بے دلی سے اس کے دلائل' وضاحتیں اور فلسفے سنتا تھا۔ وہ رات جب تک کاشا کو دیکھ نہ لیتا' اس سے بات نہ کر لیتا' اسے نیند نہیں آتی تھی۔ اس نے کاشا کو بہت سے روپ میں پایا تھا۔ وہ درندہ تھا اور فرشتہ بھی۔ وہ دونوں ہنستے مسکراتے اپنی ہی موج میں زندگی گزار رہے تھے کہ اچانک ایک عورت ان کے بیچ آگئی۔۔۔

ماہم۔۔۔ ماہم پر ہی ان کی پہلی بار گرما گرمی ہوئی تھی۔ ماہم سے لیلیٰ اور اختتام پھر ماہم۔

غنی نے کاشا سے الگ ہو کر اس کے بارے میں بہت سوچا تھا۔ خاص طور پر تب' جب اسے کاشا نے بتایا تھا کہ وہ ماہم کا گھر بیچ رہا ہے۔ وہ کاشا کے کردار کی اچھائیوں اور برائیوں کا آنکھوں دیکھا گواہ تھا۔

غنی جو بزنس کر رہا تھا' اس میں آدھے سے بھی زیادہ شیئرز کاشا کے تھے۔ اس کے پاس صرف تھوڑی سی رقم تھی۔ کاشا نے اسے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے مکمل

طور پر سپورٹ کیا تھا۔ آفس صرف غنی جاتا تھا۔ ہر بزنس ڈیل، میٹنگ، مشینری کا حساب کتاب، نفع نقصان سب غنی کے ہاتھ میں تھا۔ شروع میں غنی اسے آفس کی مسائل اور ترقی کے متعلق آگاہ کرتا تھا، تب اس نے نوٹ کیا کہ کاشا کو بزنس میں ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ وہ بولتا جاتا اور کاشا کی لاپروائی عروج پر ہوتی۔ اس نے غنی سے کبھی حساب کتاب نہیں کیا تھا۔

غنی نے ایمان داری سے اپنا فرض نبھاتے ہوئے اپنا اور کاشا کا جوائنٹ اکاؤنٹ کھلوا لیا تاکہ اسے جب ضرورت ہو، مانگنا نہ پڑے۔ وہ کبھی کبھار ہی رقم نکالتا تھا۔ غنی سارے منافع کی پھر سے انویسٹمنٹ کرتا گیا اور یوں بزنس بھی ترقی کرتا چلا گیا۔ اس نے پوری ایمانداری سے اپنی اور کاشا کی پائی پائی کا حساب رکھا تھا، جس کے مطابق کاشا 70% کا شیئر ہولڈر تھا۔

غنی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ماہم کے آٹھ، دس کروڑ کاشا کو اپنی طرف کیوں کھینچتے تھے جبکہ اس سے زیادہ کا مالک تو وہ خود تھا۔ کیا اسے پیسے کی ہوس تھی؟ اس نے تو کبھی اس کی شخصیت میں کسی قسم کا لالچ محسوس نہیں کیا تھا۔ نہ ہی کسی اور چیز کی طمع کی بو اس کے لہجے سے آئی تھی۔ وہ اپنی جیب سے لاکھوں روپے عورتوں پر خرچ کر دیتا تھا، ہزاروں فقیروں اور ضرورت مندوں کو دے دیتا تھا۔ اس کا اکاؤنٹ امریکن ڈالر سے بھرا پڑا تھا۔ اسے ماہم کے پیسے کی قطعاً "ضرورت نہیں تھی۔ ضرورت تو شاید ماہم کی بھی نہیں تھی۔

پھر لیلیٰ کی ڈرامائی انٹری۔۔۔ امریکہ کی خواہش۔ لیلیٰ کے آنے سے پہلے تک اس نے کبھی امریکہ کا نام نہیں لیا تھا۔ وہ ٹی وی دیکھتے ہوئے گوروں کو منہ بھر بھر کے گالیاں دیتا تھا۔ اپنے ملک سے محبت نہیں تھی مگر اپنے ملک کی آزادی سے محبت تھی۔ وہ آزاد [illegible] اونچی اڑان بھرنے والا تھا۔ وہ لیلیٰ کی مدد لیے بغیر بھی امریکہ جا سکتا تھا مگر اس نے یہ سب کیوں کیا تھا؟ وہ ہر کام بہت سوچ سمجھ کر کرتا تھا۔

ان تمام سوالوں کے جواب صرف کاشا ہی دے سکتا تھا۔ غنی صرف سوچ سکتا تھا۔ رات بہت گزر چکی تھی۔ وہ کارپٹ سے اٹھ کر بیڈ پہ آ گیا۔ اسے اپنے بستر کے علاوہ کہیں نیند نہیں آتی تھی مگر یہ رات اسے کاشا کے بستر پر ہی سو کر گزارنا تھی۔

✡ ✡ ✡

ماہم طلاق کے کاغذات تھامے بے یقینی اور حیرت سے ششدر کھڑی تھی۔ لٹنے کا صدمہ بہت جان لیوا ہوتا ہے، وہ بھی اس صدمے سے گزر رہی تھی۔ وہ اتنی آسانی سے کیونکر یقین کر لیتی کہ کاشا بلاوجہ ہی یوں اسے طلاق دے گیا ہے۔

کل دوپہر کے بعد اس نے کاشا کا سوٹ کیس تیار کر دیا تھا۔ وہ اتنا خاموش، سنجیدہ اور گم صم تھا کہ ماہم اس سے کوئی سوال کر ہی نہ پائی۔ حتیٰ کہ اس نے یہ بھی نہ پوچھا کہ واپس کب آئیں گے۔

کاشا نے کہا تھا۔ "سب کلیئر ہو جائے گا۔"

کلیئر کس انداز میں ہوا تھا۔ اس کے کسی بھی [illegible] سے یہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ انتہائی قدم اٹھانے والا ہے۔ اس نے جاتے ہوئے پورچ میں گاڑی میں بیٹھنے سے قبل ماہم کو ساتھ لگا کر اس کی پیشانی پہ بڑی نرمی سے بوسہ دیا تھا۔ پہلی بار اس کی [illegible] کی نرمی سے ماہم کی آنکھوں میں نمی [illegible]۔ وہ شخص رات سے ہی اس کی قربت [illegible]۔ اس نے [illegible] ہر شکایت کو دور کر دیا تھا۔ اس کی ہر تلخی [illegible] لیا تھا۔ وہ اف بھی کیے بغیر اس کے [illegible] چلی گئی۔ اس کی بے اعتنائی سہ کر بھی اسے محبت دی۔ اس کی محبت میں اپنا بسا بسایا گھر، شوہر اور بچے چھوڑے۔ خاندان کی عزت داؤ پر لگا دی۔ وہ اسے اپنے قدموں کی دھول کر گیا تھا۔ وہ اسے کس کے آسرے پہ چھوڑ گیا تھا۔ اس کا سب کچھ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس کے پاس واپسی کا کوئی رستہ، کوئی رشتہ نہیں بچا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی وہ اس پہ یہ ظلم ڈھا گیا۔

"جلدی نکل جانا یہاں سے ماہم اور لوگ کچھ ہی دیر میں قبضہ لینے آ جائیں گے۔"

غنی نے اس کے نام کے ساتھ بھابھی کا لفظ ہٹا دیا تھا۔ وہ اپنی بے بسی پہ رو رہی تھی۔ غنی کو اس کے رونے میں کوئی دلچسپی نہ تھی نہ ہی ترس آ رہا تھا۔ اسے کاشا کے ماہم کے متعلق کہے الفاظ یاد آ گئے۔

"ماہم بری عورت ہے۔"

کاشا کی بیماری اور دوری کا دکھ، وہ جس دور سے گزرے تھے، اس کا آغاز اسی عورت نے کیا تھا۔ غنی کا سارا غصہ اس کے لیے [illegible] کا رونا بھی اسے زہر لگ رہا تھا۔ اسے ٹھکرا کر اس کے پاس کوئی پناہ گاہ نہیں تھی مگر اسے کیا! وہ اس سے ذرا سی بھی ہمدردی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کاشا نے جتنا اس سے کہا تھا اس نے کر دیا تھا۔ وہ واپس جا رہا تھا۔ اسے اب ماہم کے پاس مزید نہیں ٹھہرنا تھا۔

"پلیز! کوئی میری مدد کرے۔ پلیز۔"

وہ دلدوز انداز میں چیخنے لگی تھی۔ وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ غنی نے مڑ کر دیکھا۔ اس کا رونا کسی بھی نرم دل انسان کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ بری ضرور تھی، مگر اس وقت لاوارث، بے یار و مددگار تھی۔

غنی چند لمحے سوچتا رہا پھر طیش میں اس کی طرف بڑھا۔

"اٹھو۔۔۔ چلو میرے ساتھ، میں پہنچاتا ہوں تمہیں اصل ٹھکانے پہ۔ میں کرتا ہوں بندوبست۔"

وہ اسے بازو سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتا ہوا باہر لے جانے لگا۔

✡ ✡ ✡

"شاہم۔۔۔ شاہم! چھوڑو سارے کام اور ادھر آؤ۔"

وہ کچن میں شیف کے ساتھ شام کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی جب منصور چلا آیا۔ وہ شاپنگ کرنے گیا ہوا تھا۔ اسے اپنے لیے خریداری کرنا تھی۔ اس نے شاید شاہم کے لیے بھی کچھ خریدا تھا۔

"ایک منٹ منصور میں آ رہی ہوں۔"

"تو۔۔۔ شیف کر لے گا۔ تم ابھی میرے ساتھ آؤ۔" اس نے شاہم کی کلائی پکڑ لی۔

"اچھا بابا۔۔۔ اور ظفر! سیخ کچھ ہلکی کر دو، میں آتی ہوں۔" وہ اسے ہدایت کر کے منصور کے ساتھ آ گئی۔

"کیا ہے منصور؟" اس نے کچن سے نکل کر پوچھا۔

"دیکھو گی تو پتا چلے گا۔" وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔

کمرے میں آ کے وہ ٹھٹک گئی۔ بیڈ پہ چار، پانچ خوب صورت سی ساڑھیاں پڑی تھیں۔

"یہ سب کس لیے؟" اس نے خوشی اور اشتیاق سے سب دیکھا۔

"تمہارے لیے! اگر کسی اور کے لیے لاؤں بھی تو تمہیں ہی برا لگے گا۔"

خوشی سے چہکتے لہجے میں شرارت تھی۔

"اچھا۔۔۔ یہ جو پنک والی ساڑھی ہے، یہ ابھی پہن کے دکھاؤ۔" اس نے پنک کلر اٹھا لیا۔

"مگر منصور۔۔۔ میں نے کبھی ساڑھی نہیں باندھی، میں کیسے۔۔۔" وہ تذبذب میں تھی۔ اس نے ساڑھی صرف دوسروں کو پہنے دیکھا تھا۔

"میں تمہیں اس جینز، شرٹ اور کرتے میں دیکھ دیکھ کے تھک گیا ہوں، لگتا ہی نہیں کہ تم میری ہو، تھوڑا چینج کرو اور جہاں تک ساڑھی باندھنے کا مسئلہ ہے، وہ میں حل کر دیتا ہوں، کیا خیال ہے؟"

اس نے شرارت سے آفر دی تھی۔

منصور کی نظروں اور الفاظ سے وہ محجوب سی ہو گئی۔

"اب اتنی بھی اناڑی نہیں ہوں۔" نروس ہوتے ہوئے اس نے ساڑھی اٹھا لی۔

منصور نے پہلی بار اپنی پسند سے اس کے لیے شاپنگ کی تھی، وہ اسے قطعاً انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اب تو اس کا موڈ بھی بہت خوشگوار رہنے لگا تھا۔ وہ اس پر اور بچوں پر توجہ بھی دیتا تھا۔

"اور اگر میں گر گئی منصور۔" وہ جاتے جاتے رکی۔

"کوئی بات نہیں، میں تھام لوں گا۔"

اس کے قریب ہو کر اس نے شاہم کو اپنی نظروں

میں مقید کیا۔ وہ سرخ چہرہ لیے رخ موڑ کے ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

باہر کسی انجانی گاڑی کے ہارن دینے پر چوکیدار نے گیٹ سے باہر جا کر تھوڑا جھک کر آنے والے سے شناخت مانگنا چاہی۔ مگر وہ ڈرائیور کی ساتھ والی سیٹ پہ ماہم کو دیکھ کر حیرت سے چپ رہ گیا۔ وہ غنی سے کوئی سوال نہ کر سکا۔ چوکیدار وہی پرانا تھا' ماہم کو وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ اس گھر کے مالک سے اسے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اس عورت کے لیے گیٹ کھولا جائے کہ نہیں۔

گیٹ کھلنے پر غنی گاڑی اندر لے آیا۔ ماہم نے خائف ہوتے اس گھر اور غنی کو دیکھا۔ سارے رستے غنی کے تاثرات اتنے پتھریلے رہے تھے کہ وہ اس سے کچھ پوچھ نہ سکی کہ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ پھر اس کے پاس کون سا کوئی ٹھکانہ تھا۔ وہ کسی بھی محفوظ جگہ پر لے جاتا مگر یہاں نہیں' جہاں وہ لے آیا تھا۔

"یہی تمہاری اصل اور محفوظ پناہ گاہ ہے' اس کے مکینوں کے دل' بہت وسیع ہیں" "تم جیسی" کو کسی نہ کسی کونے کھدرے میں جگہ مل ہی جائے گی۔ اترو نیچے۔"

غنی نے "تم جیسی" بہت چبا کر کہا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا جبکہ وہ ساکت تھی۔ زندگی نے اسے کس مقام پر لا پہنچایا تھا۔ غنی نے بازو آگے کر کے اس کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔

اس کے منجمد وجود میں لرزش ہوئی۔

اس کے اترتے ہی اس نے گاڑی تیزی سے موڑ لی۔

✲ ✲ ✲

"منصور!" وہ بہت گھبرائی سی تھی۔

منصور ایک جھٹکے سے صوفے سے اٹھا۔ اس نے چمکتی توصیفی نگاہوں سے شاہم کا خود جائزہ لیا۔ گلابی رنگ اس کا پسندیدہ تھا اور شاہم پر بہت سج رہا تھا۔

"دیکھو دیکھو نا پریٹی وومن۔" وہ شرارت سے گنگنایا۔ شاہم مزید جھینپ گئی۔

"تم سچ میں بہت زبردست لگ رہی ہو' مائی ڈریم گرل۔" منصور اپنی ملائمت اور لگاوٹ سے اس کی تعریف کر رہا تھا۔ خوشی اس کے بھی انگ انگ سے پھوٹنے لگی۔

"آپ کی پسند بھی لاجواب ہے منصور!" اس کا اشارہ ساڑھی کی طرف تھا۔

"اچھا جی۔"

منصور نے اس کے کندھے کے گرد بازو لپیٹ کر اسے ساتھ لگا لیا۔ شاہم اس اچانک التفات کے لیے تیار نہیں تھی۔ منصور کی قربت اسے سن کر رہی تھی۔

"صاحب جی۔ صاحب جی وہ باہر۔"

حواس باختہ سی ماجدہ دستک دیے بغیر داخل ہوئی تھی۔ شاہم اس سے بھی زیادہ پھرتی سے منصور سے الگ ہوئی۔

"کیا ہے ماجدہ؟"

"وہ صاحب ابھی باہر آئیں جلدی سے۔" اس نے اڑتے ہوئے تاثرات کے ساتھ صرف اتنا ہی کہا اور باہر پلٹ گئی۔

"منصور۔" وہ ایک قدم آگے بڑھا تھا کہ شاہم نے بازو پکڑ لیا۔

"پلیز نا ہرت جائیں۔"

اس کا لاشعور یک دم کھٹکنے لگا تھا۔ منصور نے شاہم کی بدلتی رنگت کو دیکھا۔

"ڈونٹ وری یار' آؤ تم بھی میرے ساتھ۔" منصور نے اس کا سرد ہوتا ہاتھ تھام لیا۔

بیرونی دروازے کے اس پار ماہم تھی یا قیامت' سارے ملازمین کو اطلاع مل چکی تھی۔ سب ارد گرد کھڑے تھے اور ان کے بیچ متورم چہرہ اور اجاڑ حلیہ لیے ماہم سینے تک سر جھکائے تھی۔

شاہم نے رکتی سانسوں سے منصور کو اور منصور نے شاہم کو دیکھا۔ اس نے منصور کے ہاتھ پہ دباؤ بڑھا دیا۔

✲ ✲ ✲

"اٹھو کاشا بیڈ ٹی تیار ہے۔"

چائے کی ٹرالی بیڈ روم کے وسط میں کھڑی کر کے وہ کاشا کی طرف آگئی۔ جو اوندھے منہ لحاف میں دبکا پڑا تھا۔

"اے کاشا اٹھو۔" اس نے زور سے اسے جھنجوڑا۔

"ڈیلی بکواس کرتا ہوں' مجھے مت جگایا کرو۔ پتا نہیں تمہیں نیند بھی آتی ہے کہ نہیں' سویرے سویرے نازل ہو جاتی ہو۔"

اس پہ ابھی بھی نیند کا خمار تھا۔

"صبح جلدی اٹھنا اچھی بات ہے اور ابھی تو ساڑھے نو بجے ہیں۔" وہ دھم سے اس کے بیڈ پہ گری۔

"جو بھی ہے' نہیں اٹھا جاتا مجھ سے۔" وہ کسمسا کے رہ گیا۔

"تمہیں ڈاکٹر نے ایڈوائز کی تھی ڈیلی ایکسرسائز کی۔ تم نے ایک دن بھی عمل نہیں کیا۔" اس نے کمبل اس کے منہ سے کھینچا۔

"ہوں۔ نہیں ہوتی۔"

"میڈیسن لی تھی رات کو؟" اس نے بیڈ کراؤن پہ پڑی اس کی میڈیسن دیکھی۔

"ہوں۔" وہ ہلکی غنودگی میں تھا۔

اب اس نے سارا کمبل کھینچ دیا تھا۔

"سو اسٹوپڈ لیلی۔" وہ بے دلی سے اٹھ گیا۔

وہ اسے دھکاتا سلیپر پیروں میں اڑس کے واش روم میں چلا گیا۔ لیلی چائے بنانے لگی اس کے چائے تیار کرنے تک وہ بھی باہر آ گیا۔

"میرے بغیر چائے تمہارے حلق سے نہیں اترتی۔" منہ ہاتھ دھو کے وہ کافی ہشاش ہو گیا تھا۔

"نہیں۔ آج تم میرے ساتھ باہر نکلو گے' جب سے آئے ہو اپارٹمنٹ میں ہی بند ہو۔" اس نے اپنی پلاننگ جتائی۔

وہ صوفے پہ اس کے پاس آ بیٹھا اور اس سے چائے کا کپ پکڑ لیا۔

"نہیں' میں نہیں جاؤں گا۔" اس نے کپ منہ کو لگا لیا۔

"ہاؤ' نہیں۔ وہ آؤٹ شوگر۔" اس کے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا تھا۔

"یہ ضروری ہے۔"

"مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب۔" چمچہ بھر چینی اپنے کپ میں ڈالی۔

"کرتے رہو اپنی مرضی' میں جا رہی ہوں' گو ٹو ہیل۔"

وہ ناراض ہو کے اٹھ گئی' کاشا نے بھی اسے روکا نہیں تھا۔

✲ ✲ ✲

"منصور! آپ ان کو اسکول چھوڑ دیں گے؟"

عمیو کے بیگ میں اس کی کتابیں رکھتے اس نے اخبار پڑھتے منصور سے کہا۔ منصور کو بھی جلدی جانا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہی ٹیبل پر بیٹھا ناشتا کر رہا تھا۔

"ان کی وین نہیں آئی؟" اخبار سے دھیان ہٹا کر اس نے جوس کا گلاس اٹھایا۔

"آئی تھی مگر یہ دونوں لیٹ تھے' آپ یہ تکلیف کر لیجیے پلیز۔"

بیگ کی زپ بند کر کے وہ منصور سے مخاطب تھی۔

"او کے فائن' عمیو کو دودھ کا گلاس دو' اس نے نہیں لیا۔" جوس کے گھونٹ بھرتا وہ پھر سے اخبار کی طرف متوجہ ہو گیا۔

عمیو نے برا سا منہ بنا کے باپ کو دیکھا۔ اسے دودھ پسند نہیں تھا۔ اسے روز ڈانٹ کر پلایا جاتا تھا۔

"تم چیٹنگ کرنے سے باز نہیں آؤ گے' چلو پیو۔"

اس نے مصنوعی غصے سے ڈانٹتے گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔ حمزہ نے عمیو کو چڑایا تو اس نے گلاس

کے بازو پر دے مارا۔

"عمیر! کیا بدتمیزی ہے۔" شاہم نے اسے گھورا۔

"ماما میری بکس (بس)"

دعا جو کرسی پہ بیٹھی اپنی گود میں رکھی پلیٹ میں سلائس اور انڈا کھا رہی تھی' اس نے ہاتھ اوپر کر کے ماں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"تمہاری بس میں کرواتی ہوں' آدھا سلائس ویسے ہی ہے کیا کھایا ہے تم نے؟ ذرا میں ان کو فارغ کرلوں' آتی ہوں تمہاری طرف بھی۔" شاہم نے ٹشو ڈبے سے نکال کر اسے پکڑایا' تاکہ وہ ہاتھ صاف کر لے۔

"شاہم۔ وہ کہہ رہی ہیں' انہیں ناشتا نہیں کرنا۔"

ماجدہ ناشتا کی ٹرے واپس لے آئی تھی۔ "رات کے کھانے کی ٹرے بھی ویسے ہی پڑی ہے۔"

ماجدہ کا وہ سے مراد ماہم تھی۔ جو اوپر اپنے ہی کمرے میں ٹھہری تھی۔

منصور کا منہ کی طرف جاتا گلاس رک گیا۔ اس نے شاہم کو دیکھا۔

"او کے۔ میں خود دیکھتی ہوں۔"

شاہم نے منصور کو بغور دیکھ کر کہا تھا۔ منصور اس کے آجانے پر ذرا چپ سا تھا۔ شاہم اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"آپ جلدی کریں' بچے لیٹ ہو جائیں گے۔"

"چلو ہری اپ بوائز۔"

منصور اخبار کو گول کر کے فوراً اٹھ گیا۔

"اللہ حافظ پاپا کی جان۔" اس نے جھک کر بیٹی کا گال چوما۔

"اپنا خیال رکھنا' اللہ حافظ۔"

بیرونی برآمدے میں شاہم سے بریف کیس پکڑ کر اس نے بہت دھیمے سے کہا۔ عمیر اور حمزہ گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔

"اللہ حافظ۔" گاڑی کے گیٹ سے نکلتے ہی وہ اندر آگئی۔ ناشتے کی ٹرے ماجدہ نے ٹیبل پہ ہی رکھ دی تھی۔

"ماجدہ آپا! میرے ساتھ آئیں۔" ماجدہ نے ٹیبل سے برتن اٹھانا چھوڑ کر دوبارہ ٹرے اٹھالی۔ دروازہ کھلا تھا' ماہم بیڈ پہ بیٹھی تھی۔

"ناشتا کیوں نہیں کیا؟" روکھے سے انداز میں اس نے سیدھا پوچھا۔

وہ تین دن سے آئی ہوئی تھی اور آج ان دونوں کا سامنا ہوا تھا۔ شاہم نے اس کے پاس آنا یا کچھ پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

"بھوک نہیں۔" شاہم کا انداز تخاطب اس نے محسوس کیا تھا۔

"یہاں کوئی تمہارا ذاتی ملازم نہیں' نہ ہی کسی کے پاس اتنا فضول ٹائم ہے کہ تمہاری منتیں کرے۔ آئندہ ٹرے واپس نہیں آنا چاہیے اور ہاں ماجدہ آپا' اگر یہ ناشتا نہ کریں تو دوپہر کا کھانا بھی نہ بھجوانا۔"

اس کے جھٹکے سر کو گھورتی وہ واپس مڑ گئی۔

منصور اور اس کے درمیان خاموش کشیدگی ختم ہوئے دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ بچوں اور ملازمین کے ساتھ وہ نارمل رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی ان پہ کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

شاہم کی طرف سے نہیں مگر منصور کا رویہ کھنچا کھنچا ہی رہتا تھا۔ شاہم نے بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس نے پوری سچائی اور لگن سے منصور کو مجبور کر دیا تھا۔ اس کی بے اعتنائی کو صبر سے برداشت کیا تھا۔ ابھی وہ اپنی قربانی اور محنت کا صلہ ہی سمیٹ پائی تھی کہ وہ پھر سے سب کچھ چھیننے چلی آئی تھی۔

اس سب کے باوجود ماہم تھی تو بہن' شاہم اتنی سخت دل بھی نہ تھی۔ ماہم اس سے پانچ سال بڑی تھی۔ اس نے ہمیشہ شاہم کا خیال رکھا تھا۔ بس اس سے ذرا سی کوتاہی برتی اور شاہم کا سب کچھ لٹ گیا۔

کچن میں آکر وہ آنکھوں کی نمی کو پلکیں جھپکا جھپکا کر خشک کر رہی تھی' ماجدہ بھی آگئی۔

"کیا کرنے لگی ہیں ماجدہ آپا؟" رخ موڑے ہی اس نے ماجدہ سے پوچھا۔

"کچن سمیٹنے لگی ہوں۔"

"تم اوپر کمرے کی صفائی کر لو' کچن میں دیکھ لیتی ہوں۔" وہ ماہم کا نام نہیں لیتی تھی۔ اوپر سے مراد ماہم کا کمرا ہی تھا' جہاں وہ پہلے رہتی تھی۔

"ادھر آجائیں صوفے پہ۔ صفائی کرنا ہے۔"

ماجدہ ڈسٹنگ کے لیے کپڑا ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی۔ وہ اٹھ کے صوفے پر آگئی۔ تکیے گرا کر سیدھا رکھ کے وہ بیڈ شیٹ درست کرنے بچھانے لگی۔

"ماجدہ! بچے... بچے کہاں ہیں؟" تین دن بعد اس نے کوئی سوال کیا تھا۔ چادر درست کرتے اس کے ہاتھ ذرا کی ذرا رکے۔

"اسکول گئے ہیں۔" بے تاثر سے لہجے میں اس نے بتا دیا۔

"اور... دعا؟"

"وہ... کھیل رہی ہے۔"

ماہم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس گھر میں آکے اسے پہلا خیال بچوں کا ہی آیا تھا۔ جن کی شکلیں ابھی تک نہیں دیکھی تھیں۔ بیٹے اس قابل ہو گئے تھے کہ اسکول جانے لگے تھے اور بیٹی چلنے لگی تھی۔ منصور اتنا سخت دل کب سے ہو گیا کہ اس نے بچوں کو اس سے ملوایا بھی نہیں تھا۔

"شا... ہم نے شادی نہیں کی؟" اس گھر کی تبدیلیوں سے وہ واقف نہیں تھی۔

"کر لی ہے۔" ماجدہ نے چادر کی شکنیں دور کیں اور تکیے درست کر کے رکھنے لگی۔ وہ بھی شوہر اور اولاد والی تھی۔ ماہم کے ساتھ بھی اس نے ایک عرصہ گزارا تھا۔ وہ ان کے دور پار کے رشتے دار ان کے ہاں نوکر تھے۔ وہ مالکوں کی ٹیڑھ سیدھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ماجدہ کو ایک عورت ہونے کے ناتے ماہم پہ بہت غصہ یا شاید نفرت سی تھی۔ جس گھرانے سے وہ تھی وہاں عورت کو شوہر کی عزت اور غیرت پکارا جاتا تھا۔ شوہر مجازی خدا مانا جاتا تھا۔ ماہم کی ان حرکات پہ وہ توبہ استغفار کرتی تھی۔ ماہم کے آجانے سے اسے شاہم کا گھر خطرے میں پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔

"بچوں کی دیکھ بھال کے لیے گورنس ہوگی۔"

اس کے منہ سے "بچوں" کا لفظ ماجدہ کو اچھا نہیں لگ رہا تھا' ماجدہ اس سے کوئی بدتمیزی نہیں کر سکتی تھی۔

"نہیں۔" اس نے یک لفظ کہا۔ وہ تیز تیز ہاتھ چلاتی ڈسٹنگ کرنے لگی' وہ اسے مزید سننا نہیں چاہتی تھی۔

"شاہم یہاں کیوں رہتی ہے؟"

ماجدہ اس دن سے کھانا یہ کہہ کر لاتی تھی کہ شاہم بی بی نے بھجوایا ہے۔

ماجدہ نے اب کی بار تپ کے اسے دیکھا۔

"اس لیے جی کہ یہ ان کے شوہر کا گھر ہے' بیوی اپنے شوہر کے گھر میں ہی رہتی ہے۔" اس کی تلملاہٹ بہت واضح تھی۔

"یہ... اس کے شوہر کا گھر... میں سمجھی نہیں۔"

وہ تذبذب کے عالم میں تھی۔

"نا سمجھی والی کوئی بات ہی نہیں۔ شاہم بی بی منصور صاحب کی بیوی اور ان کے بچوں کی ماں ہیں اور کچھ پوچھنا ہے آپ کو؟"

ماجدہ دھاڑ سے کہتی کپڑا زور سے جھٹکتی باہر نکل گئی' ماہم نے سرد ہوتے اس خبر کو سنا۔ وہ اتنی بے یقین تھی کہ اس کی نگاہیں غیر مرئی نقطے پہ جم گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ماہم جب سے آئی تھی' اوپر صرف کمرے تک محدود تھی۔ وہ ابھی کاشا کے صدمے سے ہی سنبھل نہ پائی تھی کہ منصور اور شاہم کی شادی کی خبر نے اس کے اعصاب بالکل ہی توڑ کر رکھ دیے تھے۔ شاید منصور اور شاہم کی شادی کی خبر کاشا کے جانے سے زیادہ تکلیف دہ اور بھاری تھی۔ شاہم اس روز کے بعد نہیں آئی تھی' صرف ماجدہ اسے کھانا دینے اور صفائی کرنے آتی تھی۔ اس کا ذہن ماضی اور حال کی مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا رہتا۔

وہ بہت سا وقت روتے اور خود کو کوستے گزار دیتی۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ صرف ایک نظر بچوں کو دیکھ لے۔ وہ ان کی آواز تک نہ سن پائی تھی۔ کاشا کے پاس ایسے بچوں کی کمی اتنی شدت سے محسوس نہیں ہوتی تھی جتنی اب ہوتی تھی۔ چاروں طرف سے تہی داماں ہو کر اسے اب بچے ہی آسرا لگنے لگے تھے۔

کمرے کی گھٹن اور اپنے اندر کے حبس سے گھبرا کر اس نے کھڑکی کھول دی۔ نیچے لان میں کھیلتے بچوں پر جیسے ہی اس کی نگاہ پڑی پلٹ نہ سکی۔ وہ تینوں بیٹ بال کھیل رہے تھے۔ حمزہ باؤلنگ کروا رہا تھا اور عمیر بیٹنگ پہ تھا۔ دعا سارے لان میں بھاگ بھاگ کر بال پکڑنے پہ تھی۔ لان میں لگائی گئی میز کرسیوں پر منصور اور شاہم بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ سارا منظر بہت خوب صورت اور مکمل لگ رہا تھا۔

”ماما! حمزہ میرا اوور نہیں دے رہا' میں نے اسے بیٹ مار دینا ہے۔“ عمیر نے قبل از اقدام اطلاع دی۔

”تو ماما میں نے پورے سکس بال دیے ہیں' اسے ایک کم لگتا ہے۔“

حمزہ نے بھی فوراً ”وضاحت کی۔

”چلو حمزہ! آپ ایک بال اور کروا دو' بھائی ہے آپ کا۔“ منصور نے حمزہ کو پچکارا۔

”آپ ہمیشہ اس کی سائیڈ لیتے ہیں۔“ وہ روہانسا ہو رہا تھا۔

”آپ ماما کے اچھے والے بیٹے ہو' مان جاؤ۔“ شاہم نے تھوڑی اس کی طرف داری کی۔

”جسٹ ون بال۔“ اس نے تنگ کر عمیر سے کہا اور بال کروانے لگا۔

”آپ چکن پکوڑا ٹیسٹ کریں' میں نے فرسٹ ٹائم ٹرائی کی ہے۔“ شاہم نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

”تھینک یو۔“ اس نے پلیٹ پکڑلی۔

”منصور آپ نے۔“

”ماما وہ کون ہیں؟“

عمیر کے پکارنے پر شاہم کی بات بیچ میں ہی رہ گئی۔

ان دونوں نے عمیر کی طرف دیکھا' وہ اوپر کھڑکی میں کھڑی ماہم کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر رہا تھا۔ ماہم نے ان دونوں کی نظر خود پر پڑتے ہی کھڑکی زور سے بند کر دی۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اوپر ہونے کی وجہ سے وہ بچوں کے چہرے ٹھیک سے نہیں دیکھ پائی تھی۔

ماہم کے کھڑکی بند کرنے پہ انہوں نے دوبارہ کوئی سوال نہیں کیا۔

”آپ نے کیا سوچا ہے؟“ شاہم نے اپنی پلیٹ واپس ٹیبل پہ رکھ دی۔

”کس بارے میں؟“ منصور کسی اور ہی سوچ میں گم تھا۔

”اس کا۔“ شاہم نے ابرو سے کھڑکی کی طرف اشارہ دیا۔

”کچھ نہیں۔“ پھر وہ کافی توقف کرکے بولا۔ ”تم کیا کہتی ہو۔“

”سب آپ کے سامنے ہے۔ ہم دونوں نے کن مشکلات سے گزر کے سب سیٹل کیا ہے۔ اور اب اس کے آجانے سے مجھے لگتا ہے صرف ایک گلاس تباہ ہونے میں' منصور۔ اس شارٹ ہے کہ آپ کے اور اپنے بیچ میں کسی تھرڈ پرسن کو برداشت نہیں کر سکتی' چاہے وہ کوئی بھی ہو۔“

وہ دبے لفظوں میں جتا رہی تھی کہ اسے ماہم کا اب اس گھر میں رہنا پسند نہیں۔ ماہم اس کے لیے مستقبل میں خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔

”میں خود کو ان سیکیور (غیر محفوظ) محسوس کرنے لگی ہوں۔ مجھے اس پر ٹرسٹ نہیں رہا۔“

وہ ماہم کا کہہ رہی تھی اور منصور نے رخ اپنی طرف موڑ لیا تھا۔

”آپ کو یہ خوش فہمی کب سے ہوگئی کہ میں آپ پہ ٹرسٹ کرتی ہوں۔“ منصور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی وہ اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

”ہیلو ڈیئر! اکیلے ہی کارڈز کھیل رہے ہو۔“ لیلیٰ کوٹ اور شولڈر بیگ کاؤچ پہ پھینک کر کارپٹ پہ کاشا کے سامنے بیٹھ گئی' جو کارڈز میں اتنا غرق تھا کہ نہ ہی اس کے آنے کا نوٹس لیا' نہ جواب دیا تھا۔

”میں بھی کھیلوں گی۔“ اس نے کشن پہ پڑے کارڈز پہ ہاتھ رکھ دیا۔

”میں عورتوں کے ساتھ جوا نہیں کھیلتا۔“ اس نے لیلیٰ کے ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے اٹھانا چاہا۔

”ہم جوا نہیں کھیلیں گے اور ویسے بھی میں عورت نہیں تمہاری بیوی ہوں۔“ اس نے کاشا کا ہاتھ تھام لیا۔

”اچھا۔ پھر کھیلتے ہیں۔“ وہ پتے اکٹھے کرنے لگا۔

”کون ون کرے گا؟“ اس نے پتے پھینٹتے یوں ہی پوچھا۔

”آف کورس یو۔“ وہ حاضر جواب تھی۔

”جب تمہیں یقین ہے ہار کا تو پھر کھیل کیوں رہی ہو۔“ اس نے ہاتھ روک کر استفسار کیا۔

”مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ تم مجھ سے محبت کرنے لگو گے' تندرست ہو جاؤ گے اور ہم ساری زندگی ساتھ گزاریں گے۔ ہارنے کے ڈر سے گیم نہیں چھوڑی جاتی ہے۔“ وہ یہ سب اس کے چہرے کو دیکھ کر نہیں کہہ سکتی تھی۔

”دنیا میں محبت کے علاوہ بھی بہت سے دھندے ہیں تم تو بس۔“ اس نے نفی میں سر ہلا کے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”واٹ اباؤٹ آف یو۔“ کاشا کی غیر سنجیدگی نے اسے دکھ دیا تھا۔

”تم مجھے نہ سوچا کرو۔“ اس کے لیے نصیحت کرنا آسان تھا۔

”میڈیسن ریگولر لیا کرو۔“ اس نے گہری سانس خارج کرتے موضوع بدل دیا۔

”ہاں' لے رہا ہوں۔“

"کاشا! اس نے تمہارا چیک کیش کروالیا ہے۔" یاد آنے پر اس نے بتایا۔

"بینک گئی تھیں؟" وہ کارڈز بانٹنے لگا تھا۔

"ہاں' ایک نیوز اور ہے' پیٹرسن نے مجھے بتایا کہ تمہارے اکاؤنٹ میں پاکستان سے پچاس لاکھ آئے ہیں۔ میں نے نام وپتا پوچھا تھا' پیٹرسن نے چیک کرکے غنی کا نام اور اکاؤنٹ نمبر بتایا۔"

"غنی نے کیوں پیسے بھیجے ہیں۔" وہ زیر لب پر سوچ بڑبڑایا۔

"ظاہر ہے' تم اس کے بزنس شیئرز ہولڈر ہو' تمہارا حصہ ہی بھیجا ہوگا کوئی خدا ترسی تھوڑی کی۔"

"شٹ اپ' تمہیں یہ رائٹ کس نے دیا ہے کہ تم میرے اس قدر پرسنل میٹر میں انٹرفیئر کرو' آئندہ اتنی جرات نہ کرنا اینڈ یو کین گو ناؤ۔" غصے سے سرخ ہوتے اس نے سارے کارڈز کو ہاتھ مار کر بکھیر دیا۔

"سوری کاشا۔" وہ خائف سی ہوگئی۔

"واٹ سوری' آئندہ کبھی غنی کے بارے میں اس انداز سے بات مت کرنا۔"

"کناب اینڈ لسن ون تھنگ ڈرکو' اور ایک بات سنو' وہ رقم غنی کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروادو۔" اس کا انداز تحکم بھرا تھا۔

"ہوجائے گی' گڈ نائٹ۔" وہ دھیمے پن سے کہتی نکل گئی۔ وہ بالوں میں انگلیاں پھنسائے کچھ سوچنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

منصور ٹی وی پہ بزنس اپ ڈیٹس دیکھ رہا تھا۔ حمزہ وہیں نیچے کارپٹ پہ سو گیا تھا۔ دعا اور عمیر وہیں کھیل رہے تھے۔ شاہم بھی کام نپٹا کر ان کے پاس آبیٹھی۔

"عمیر ہوم ورک کمپلیٹ ہے۔" اس نے سینٹر ٹیبل سے نیوز پیپر سمیٹتے ہوئے کہا۔

"جی ماما! میرا بھی اور حمزہ کا بھی۔"

"منصور! آپ کے ہاتھ میں تو ریموٹ آنا ہی نہیں چاہیے۔"

شاہم منصور کے ٹاک شو اور بزنس نیوز دیکھنے سے بہت بور تھی۔

"سوری' میں تمہیں اسٹار پلس کے لیچڑ سوپ کے لیے ریموٹ دینے کو متحمل نہیں ہو سکتا۔" منصور کی رگ شرارت پھڑکی تھی۔

"دفع دور اسٹار پلس' نہ میری کوئی نند' نہ ساس' آئی ڈونٹ نیڈ ٹولرن دس نانسی ٹرک۔"

ماجدہ اوپر سے سیڑھیاں اتر کے سیدھی لاؤنج میں ان کے پاس آگئی۔

"شاہم بی بی! ان کی طبیعت بہت خراب' بہت ہی تیز بخار ہے۔"

ماجدہ دوپہر کو بھی اوپر گئی تو وہ بستر پہ لیٹی تھی۔ وہ کھانا رکھ کے واپس آگئی' اب بھی کھانا ویسا ہی پڑا تھا۔ وہ بے سدھ آڑی ترچھی بستر پر پڑی تھی۔

"اچھا۔ ایسا کرو پیناڈول کی دو ٹیبلٹ دودھ کے ساتھ دے دو' افاقہ ہوجائے گا۔" شاہم نے لاپروائی سے کہا۔

اسے ماہم یا اس کی ذات میں ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے جو کچھ کیا تھا اب تو بھگتنے کا وقت تھا اور شاہم اسے اس کے کیے کی اچھی طرح نصیحت دلانا چاہتی تھی۔ اس نے بچوں کا اوپر [illegible] میں جانا سختی سے بند کروا دیا تھا۔ ماجدہ [illegible] بتایا تھا کہ ماہم بچوں کا پوچھتی ہے [illegible] اور محتاط ہوگئی تھی۔ وہ بچوں پر اس کا سایہ تک [illegible] نہیں پڑنے دینا چاہتی تھی۔

"تمہیں ڈاکٹر کو کال کرنا چاہیے۔" منصور نے ٹی وی کا والیوم کم کرکے لہجہ کو حتی الامکان نارمل رکھا۔

"فیملی ڈاکٹر شہر سے باہر گئے ہیں اور کس ڈاکٹر کو بلاؤں۔"

"تم جاؤ ماجدہ اور جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہی کرو۔ جلدی سے اپنا کام ختم کرو اور کوارٹر میں جاؤ۔"

یہ سب کہتے ہوئے اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پہ

جمی رہیں۔ ماجدہ سرہلاتی مڑ گئی۔ منصور کو شاہم کا انداز بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ ماہم کی غلطیاں اپنی جگہ' مگر اس وقت وہ بیمار تھی' انہیں اس کا خیال رکھنا تھا۔

"اس کی طبیعت زیادہ بھی خراب ہوسکتی ہے۔" تھوڑا توقف کرکے وہ بہت سوچ کے بولا۔

"کس کی طبیعت؟" اس کے چہرے پہ حد درجہ بے گانگی تھی۔

اس کا نام کبھی شاہم نے نہیں لیا تھا' وہ کیسے لے لیتا' پھر منصور سے زیادہ گہرا رشتہ اس کا تھا۔ وہ اسے احساس دلانے کی غلطی بھی نہیں کرسکتا تھا۔ شاہم کے حساس دل اور [illegible] زیادہ خود [illegible] تھا۔

"ہوا کرے۔ آپ والیوم تیز کریں اور ٹی وی پہ دھیان دیں۔ منصور!" ان دونوں کو اٹھاتے اس نے جھک کر کارپٹ پہ سوئی گڑیا کو بھی احتیاط سے بازوؤں میں بھر لیا۔

☼ ☼ ☼

"تو نے پیسے واپس کیوں بھجوا دیے ہیں کاشا۔" غنی نے پوچھا تھا۔

"کیا کرتا پیسوں کا' سیریسلی غنی! مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے' سب کچھ ہے' سب کچھ۔"

وہ نیچے کارپٹ پہ بیٹھا تھا۔ صوفے کے بازو سے ٹیک لگائے تھکا ماندہ سا۔

"تمہارے ٹریٹمنٹ کے لیے کاشا ضرورت تو پڑے گی' کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟"

"فائن' کوئی سر یا پیٹ کا درد نہیں ہے۔"

اسے اپنی بیماری کا بالکل دکھ نہیں تھا۔ اس نے جو کچھ ساری زندگی کیا' یہ اس کا نتیجہ تھا۔ وہ اپنی باقی رہ جانے والی زندگی کو پچھتاووں میں بسر نہیں کرسکتا تھا۔

"ایسا مت بول کاشا' تو ٹھیک ہوجائے گا' میں۔۔۔ میں دعا کروں گا۔"

"میں خود کو کوئی جھوٹی تسلی نہیں دینا چاہتا' رہ گئی دعا' وہ مت کیا کر۔ میں دعاؤں سے بہت آگے نکل چکا ہوں۔"

اس کے لیے کبھی کسی نے دعا نہیں کی تھی۔ اس نے اپنے لیے فقیروں کے علاوہ کسی سے دعائیہ کلمات نہیں سنے تھے' نہ ہی اس نے کبھی خود دعا مانگی تھی۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ دعاؤں میں اثر ہوتا بھی ہے کہ نہیں' لوگ کیوں جھولیاں اٹھاتے ہیں' کیوں منتیں' مرادیں مانگتے ہیں' گڑگڑانے میں تاثیر کیوں ہوتی ہے؟ اس کا اس سب عمل سے کبھی واسطہ نہیں رہا تھا۔

"تم نے مجھے پاکستان میں ٹھہرنے کو کیوں بولا تھا؟ سم تھنگ اسپیشل۔" بالوں میں انگلیاں پھنسائے وہ چند لمحے سوچتا رہا۔

"ڈونٹ مائنڈ یار' بس میں تھوڑا سا خود غرض ہوگیا ہوں' چاہتا ہوں کہ پاکستان میں کوئی تو میرا منتظر ہو' میرا جنازہ اجنبیوں کے کندھوں پر نہ اٹھے' پلیز غنی آخری وقت تک میرے ساتھ رہنا۔"

وہ یہ کہتے ہوئے ضبط کے باوجود بھی رو دیا تھا۔ غنی اسے روتے ہوئے سن رہا تھا۔ ان دونوں کی جذباتی تکلیف ایک ہی نہج پہ تھی۔

"بولتا ہوں نا' تو اس نہ کیا کر' پر تو باز نہیں آئے گا۔" وہ روتے ہوئے رک رک کے کہہ رہا تھا۔

اس تلخ حقیقت سے وہ دونوں غیر معمولی انداز میں نظریں چراتے تھے۔

"بچ جاؤں تو مجھے دیکھے گا تو حیران رہ جائے گا۔ میں سب کچھ چھوڑ چکا ہوں۔" وہ ہتھیلی سے آنسو صاف کرتا' گال پھر بھیگ جاتے۔ وہ دونوں آمنے سامنے شاید کبھی نہ یوں روتے یا پھر روتے ہوئے ایک دوسرے کے آنسو پونچھتے۔ غنی کے آنسو اس لیے نہیں تھم رہے تھے کہ کاشا جیسا مضبوط مرد بھی رو رہا تھا۔ اس کا جگر رو رہا تھا۔ کاشا غنی کے چپ کروائے بغیر کیسے رونا بند کرتا۔

"ہاں لیکن تو نے بہت دیر کردی۔"

"یا۔۔۔ یا اس دیر کا رزلٹ بھگت رہا ہوں' بٹ

ذرخشوری میں بہت نہیں ہاروں گا' نہیں ہاروں گا۔"

اس نے بچوں کی طرح انداز اپنا کر کہا۔

"پلیز کاشا! تو نے میری کبھی کوئی بات نہیں مانی' صرف ایک مان لے' مجھے امریکہ آنے کی پرمیشن دے دے۔"

"میں نے غنی۔"

اس نے غنی کو ٹوکا تھا' جبکہ اس نے بھی اسے بات مکمل نہ کرنے دی۔

"زیادہ دن نہیں رکوں گا۔ بس کچھ دن۔ پلیز یار!" وہ منت کر رہا تھا۔

وہ چاہے حقیقت کو جتنا بھی جھٹلا لیتا' یہ اٹل ہی تھا کہ کاشا کی بیماری آخری اسٹیج پر تھی۔ ایک ناقابل علاج بیماری اپنے آخری مرحلے میں۔ اس کی فطرت میں لاپروائی کے عنصر سے وہ آگاہ تھا۔ ان دنوں اسے بہت دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔

میں ماما۔ ماما سے ملنے جا رہا ہوں' اپنی ماں سے پورے ستائیس برس بعد غنی۔ میں اپنی ماں کو دیکھوں گا' اس کے سینے سے لگوں گا' میرے سینے اور جسم میں بہت درد رہتا ہے' جب۔ جب میں ماں کی آغوش میں سر رکھوں گا تو میرا سارا درد دور ہو جائے گا۔ مجھے بہت درد ہے غنی بہت درد۔"

وہ پھر سے رونے لگا تھا۔ اسے درد کی شدت یا شاید ماں سے دوری کا احساس رلا رہا تھا۔ اپنی موت سے قبل وہ اپنی برسوں کی ناآسودہ خواہش کی تکمیل کر لینا چاہتا تھا۔ وہ صرف ایک بار اس آغوش کا طلب گار تھا جو چند دن کا وعدہ کر کے ستائیس برس ہوئے نہیں لوٹی تھی۔

"ٹھیک ہے' میں نہیں آتا' تو ماں سے ضرور مل۔" غنی کو اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں چاہیے تھا' اس کا امریکہ جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ کاشا کو کسی بھی طرح اس کی ماں سے ضرور ملوائے گا' تاکہ دونوں ماں بیٹا کے دلوں میں ایک دوسرے کو دیکھنے کی حسرت نہ رہ جائے۔

"میں ماں سے مل لوں' تھوڑی طبیعت بہتر ہو جائے تو تیرے پاس آ جاؤں گا' میں بھی کب پردیس میں رہنا چاہتا ہوں۔" اس نے غنی کو اطمینان دلایا۔

"پکا والا پرامس ہے نا۔"

"بالکل پکا والا۔" اس نے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیر کے دوسرے کان سے فون لگایا۔

"اچھا اپنا بہت زیادہ خیال رکھنا' میڈیسن ٹائم پہ لینا اور جن چیزوں سے ڈاکٹرز نے پرہیز بتایا ہے' عمل کرنا' میں روز تجھے کال کروں گا' بی کیئر فل اللہ حافظ۔" اس نے ڈھیر ساری نصیحت کی۔

اسے کاشا کی لاپروا طبیعت سے بڑا خطرہ محسوس ہوتا تھا۔

"اللہ حافظ۔"

فون بند کر کے اس نے الماری میں سے اپنے کپڑے نکالے اور بیڈ پر پھینک کر واش روم میں چلا گیا۔ نچڑتے چہرے کو اس نے آئینے میں غور سے دیکھا۔ رنگت ہلکی زردی مائل تھی۔ رنگ بھی قدرے سنولا گیا تھا۔ آنکھوں کی چمک عرصہ ہوا ماند پڑ چکی تھی۔ انگلیوں سے گالوں پر سے بہتے پانی کے قطرے جھٹک کر اس نے چہرہ پونچھا۔ کپڑے اٹھا کر ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ آئینے کے سامنے ذرا سا رک کے بالوں کو انگلیوں کی مدد سے ہی سلجھانے کے بعد باہر نکل گیا۔ اس کے گھر کا کمرا' البتہ اس کے پاس تھا۔ کیب کی پچھلی سیٹ کی بیک سے ٹیک لگائے وہ خود کو خالی الذہن رکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا' وہ عورت کیسی ہوگی؟

سات سال کی عمر کے بچے کے ذہن میں ماں کی حقیقی دھندلی سی شبیہ تھی۔ اس کے نانی والے گھر میں اس کے بیڈ روم میں ماں کے ہمراہ کئی فوٹو تھے۔ جب گھر چھوڑا تصویریں بھی وہیں رہ گئیں۔ اسے باتیں یاد رکھنے اور یادیں اکٹھی کرنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ ایک کھرا اور حقیقت پسند انسان تھا۔ اپنی بیماری اور اس کی نوعیت سے بھی اچھی طرح آگاہ تھا۔ اسے یہ تسلیم کرنے میں بھی عار نہیں تھا کہ وہ صرف چند مہینوں کا مہمان تھا۔ اس نے شاید اپنی پوری زندگی

میں ایک عورت سے محبت اور اسی کی عزت کی تھی۔ جسے وہ بھی ماں کہتا تھا۔

واشنگٹن ڈی سی کے ایک خوب صورت عالی شان گھر کے باہر کھڑا تھا۔

گھر تھا یا محل۔

اونچے مضبوط لوہے کی سلاخوں والے گیٹ کے اس پار باوردی چوکیدار نے اس کی شناخت مانگی۔

"میڈم رابعہ سے ملنا ہے' پاکستان سے آیا ہوں۔"

اسے انگلش میں اپنی شناخت بتا کے وہ خود پہ حیرت زدہ تھا۔ اتنے برس بعد اچانک اس کے منہ سے ماں کا نام نکل گیا تھا۔ اسے ابھی تک اس عورت کا نام یاد تھا۔ مگر وہ اپنا نام نہیں بتا پایا تھا۔ نہ ہی ان کے لیے ماں کا لفظ استعمال کر سکا۔

چوکیدار نے انٹرکام پہ آنے والے کے بارے میں بتایا اور اسے اندر بھیجنے کی اجازت لے کر اس کے لیے گیٹ کھول دیا۔ لمبی روش اس نے بہت سست روی سے طے کی تھی۔ اندرونی دروازہ ایک چھوٹے سے قد کی ادھیڑ عمر انگریز عورت نے کھولا اور اسے اپنی رہنمائی میں ڈرائنگ روم تک پہنچا دیا۔

"پلیز ویٹ۔" وہ دہلیز سے واپس مڑ گئی۔

وہ ڈرائنگ روم تھا یا حیرت کدہ' وہ سحر زدہ سی کیفیت میں گھرا کھڑا رہا۔ وہ کھلی آنکھوں سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کی زیب و آرائش اپنے مکینوں کی مالی حیثیت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

اس حیرت کدے کی ملکہ ایک شان سے دھیرے دھیرے قدم اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔ ہلکے رنگ کی خوب صورت سی ساڑھی' کنپٹیوں پہ صرف چند ایک سفید بال اس کی عمر کی چغلی کھاتے تھے' نازک سے فریم کا چشمہ۔ وہ ابھی بھی بھرپور جوان لگ رہی تھیں۔

"کون ہیں آپ؟" وہ اس کے پاس آ گئیں۔

ان کے سوال نے کاشا جیسے مضبوط اعصاب کے شخص کا سینہ چیر دیا تھا' خون اپنے خون کو دیکھ کر جوش مارتا ہے۔ وہ کیسی ماں تھی جسے اپنے جنے ہوئے کی پہچان نہیں تھی۔ اس کا جی چاہا' چپ چاپ اس ڈرائنگ کے دروازے سے باہر دوڑ لگا دے۔ ایک پل کے لیے مزید یہاں نہ رکے۔ اس جیسے صاف گو اور منہ پھٹ بندے پہ یہ لمحہ بہت بھاری تھا۔

"مم... میں کنگ... کاشف حسین' کلرک غلام حسین مرحوم کا اکلوتا بیٹا۔" ماں کی بے خبری نے اس کا لہجہ بھاری کر دیا۔

زندگی میں پہلی بار اس کی خود اعتمادی اور زبان لڑکھڑائی تھی۔

اس عورت نے ہی اس کا نام کاشف رکھا تھا' ورنہ وہ اپنے اور دنیا والوں کے لیے صرف کاشا تھا۔

اس کی زیرک نگاہوں نے ماں کے خدوخال کو بہت غور سے پرکھا' جن میں کوئی بے قراری واضح نہیں ہوئی تھی۔ اس نے شاید ان لمحات کا کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ وہ سات برس کا بچہ اتنا بھرپور جوان ہو کر اس کے سامنے مضبوط اپنے قدموں پہ کھڑا تھا کہ اب اسے ماں کی انگلی کا سہارا بھی درکار نہیں تھا۔

"کاشف... بیٹھو۔"

"جی..." اس کے حلق سے پھنسی ہوئی نکلی۔

کتنا خلاف توقع بولی تھی وہ عورت۔ اس بات کے لیے اس نے کتنے برسوں کا سفر طے کیا تھا۔ اپنی تکلیف کے باوجود وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے۔ اسے موت کے بعد ملنے والی جنت اور دوزخ میں بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو صحیح طور پر جنت اور دوزخ کے فرق کا بھی علم نہیں تھا۔ مگر وہ ایک بار ان قدموں کو چومنے کا خواہاں تھا۔ وہ دونوں چپ چاپ سر جھکائے بیٹھ گئے۔ کتنے لمحے یوں ہی بے معنی خاموشی کی نذر ہو گئے۔ کاشا کے جسم میں اچانک درد ہونے لگا۔

ایک لڑکی بڑی سی ٹرالی گھسیٹتی ہوئی آئی۔ کمرے کے سامنے والی دیوار کے ساتھ ٹیبل اور کرسیاں تھیں۔ وہ ٹرالی سے لوازمات ٹیبل پہ منتقل کرنے لگی۔ کمرے میں صرف برتنوں کے کھنکنے کا ہلکا سا شور ابھر کر معدوم ہو رہا تھا۔

"پلیز میم کم ہیئر۔" اس نے ساری کراکری سیٹ کر دی تھی۔

وہ دونوں گونگے بہرے سے بنے بیٹھے تھے۔ وہ اپنا فرض نبھا کے واپس چلی گئی۔

کاشا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان سے کیا پوچھے؟ کہاں سے گفتگو کا آغاز کرے۔ صورت حال کا آغاز ہی اس کی سوچ کے برعکس ہوا تھا۔

"آپ... آپ مڑ کے آئیں نہیں۔"

بالکل غیر ارادی اس نے شکوہ کر دیا۔ حالانکہ وہ گڑے مردے اکھاڑنے نہیں آیا تھا۔ اس نے گزرے برسوں میں ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اس مقدس رشتے کو [illegible] نہیں چاہتا تھا۔

"بعض اوقات منزل کے حصول کے لیے بہت سے ہموار رستے چھوڑ کر چلنا پڑتا ہے۔ ہر رستہ منزل پہ جا کے ختم نہیں ہوتا۔ کبھی تھوڑے سے سکون کے لیے بہت بڑی قربانی دینا پڑتی ہے' مگر میں آج تک فیصلہ نہیں کر پائی کہ میں نے جو قربانی دی وہ بڑی تھی یا چھوٹی۔ مجھے سکون ملا کہ نہیں۔ ایک عورت کے اس کے سے سکون کے دیے ہوئے دکھ کبھی الفاظ میں بیان نہیں کیے جا سکتے۔ میں نے اپنی پوری زندگی کا صرف وہ عرصہ آسودگی اور خوش حالی میں گزارا جو غلام حسین کے ساتھ بیتا۔ ڈھائی مرلے کے مکان کے دو کمروں میں' میں کلرک غلام حسین کے ہمراہ بہت خوش تھی۔ تم پیدا ہوئے تو لگا کہ دنیا کی ساری خوشیاں میرے قدموں میں ڈھیر ہو گئیں۔ تمہارے باپ کے منہ سے میں نے کبھی اپنے لیے "نہیں" کا لفظ نہیں سنا تھا۔ سب کچھ درست چلتے چلتے یک دم درہم برہم ہو گیا' جب تمہارے باپ کی میت آئی۔ میری بدنصیبی نے دوبارہ مجھے تمہاری نانی اور ماموں کے در پہ لا پٹخا۔ بس... اس روز سے میری بربادی کی ابتدا ہو گئی۔ تمہاری بڑھتی ہوئی ضروریات اور کفالت کے لیے مجھے گھر سے باہر قدم نکالنا پڑا۔ حالات کی سختیوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے کے لیے تمہارے مرحوم باپ کی دلوائی ہوئی تعلیم میرے کام آئی۔ میری لائی ہوئی کمائی سے تمہارا پیٹ تو تب بھرتا' جب میری ماں اور بھائیوں کا بھرتا۔ میں نے وہ ہر عذاب [illegible] لیا تھا۔ تم میری اولاد نرینہ تھے۔ میں تمہارے سہارے اپنی زندگی کا سفر کاٹ سکتی تھی۔ میں اچھا خاصا کما رہی تھی۔ بھائیوں کی ہڈحرامی سے اکتا کر میں نے فیصلہ کیا کہ واپس اپنے مرحوم شوہر کے گھر لوٹ جاؤں' میں نے ماں سے اپنے فیصلے کا ذکر کیا تو اس نے بتایا کہ وہ گھر تمہارے بھائی نے کاروبار کے لیے گروی رکھا تھا۔ کاروبار جما نہیں' سود ادا نہیں ہو سکا۔ اس طرح گھر بک گیا۔

میری آمدنی سے تم اچھے اسکول میں پڑھ سکتے تھے۔ بہترین لباس اور اچھی خوراک بھی پوری ہو سکتی تھی مگر میری پائی پائی گھر کے راشن پانی میں صرف ہو رہی تھی۔ مجھے یہ قطعاً منظور نہیں تھا کہ میں اپنے بیٹے کا حق ان نکھٹوؤں پہ لٹاؤں' تب میں نے ماں سے کہا کہ میں الگ گھر کرائے پہ لے کر رہوں گی۔ میرے بھائیوں نے یہ سنا تو مجھے دھمکیاں دیں۔ وہ مجھے ہاتھ سے نکلنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ میں بہت پریشان رہنے لگی۔ ان ہی دنوں میری ملاقات آفس میں اپنے باس کے فرینڈ جرار احسان سے ہو گئی۔

جرار احسان دو جوان بیٹیوں کا رنڈوا باپ تھا۔ عمر میں مجھ سے دو دہائیاں بڑا سخت اصول پسند شخص تھا۔ اس نے میرے باس سے میری ہسٹری سنی اور جانے کیوں اس کی نظر مجھ پہ ٹک گئی۔ اس نے مجھے اپنے آفس میں پرسنل سیکریٹری کی جاب آفر کر دی۔ اچھی سیلری کی کشش مجھے اس کے آفس تک لے گئی۔ آہستہ آہستہ ہمدردی سے باتوں باتوں میں اس نے میرے تمام حالات مجھ سے معلوم کیے۔ میں تو اس کی نیت سے اس روز بھی بے خبر تھی' جس دن اس نے مجھے پروپوز کیا۔ مجھے لگا جیسے قید زندان سے چھٹکارا پانے کے لیے سیڑھی میسر آ گئی ہو۔ آٹھ' دس قدم اوپر اٹھاؤ اور باہر آزاد فضا میں۔ ہم دونوں کی پہلی شادیوں سے اولادیں تھیں۔ نہ میں نے اس کی بیٹیوں کا تذکرہ چھیڑا' نہ اس نے تمہارا۔

مجھے لگا جیسے سب خاموشی سے طے ہے ' جب میں ایک بڑی عمر کے شخص جس کی دو جوان بیٹیاں ہیں ' سے شادی پر رضامند ہوں تو اسے میرے چھ سات سالہ بیٹے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں اپنے خیالوں کی دنیا میں تمہیں بھی جرار احسان کے گھر میں کھیلتا دیکھتی تھی ' مگر یہ صرف میری خام خیالی تھی۔ جرار احسان کی گاڑی میں صرف میرے لیے جگہ تھی ' میرے جگر کے ٹکڑے کے لیے نہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اپنی محبت اور خدمت سے اسے رام کرلوں گی ' آخر میں نے بھی تو اس کی بیٹیوں کے لیے فراخ دلی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ سخت اصول پسند شخص سخت دل بھی تھا اور میرے حتیٰ کہ اپنی ذاتی چیزوں تک کے لیے بہت پوزیسو تھا۔

وہ مجھ سے دور اور میں تم سے دور نہیں رہ سکتی تھی۔ ہمارے مابین ایک کشمکش کا سلسلہ چلنے لگا۔ وہ تمہیں دنیا کی ہر سہولت ' آرام دینے پر رضامند تھا ' مگر اپنے گھر میں جگہ نہیں ' اسے اپنے اور میرے بیچ تم تھرڈ پرسن لگتے تھے۔ جب اس نے دیکھا کہ میرا دھیان کسی بھی طور تم پر سے نہیں ہٹتا تو اس نے مسئلے کا حل بڑی عقل مندی سے ڈھونڈ نکالا۔ اس نے اندر ہی اندر امریکہ شفٹ ہونے کی ساری تیاریاں مکمل کر کے مجھے آگاہ کیا۔

میں بہت روئی ' تڑپی ' مگر اس نے اپنے کان اور آنکھیں بند کرلیں۔ میں تمہیں اپنوں کے روپ میں دشمنوں کے حوالے کر کے چلی گئی۔ میں پھر سے ماں بننے والی تھی اور ہر وقت تمہارے لیے روتی رہتی۔ میں جب بھی پاکستان فون کرتی ' میری ماں تم سے میری بات ہی نہ کرواتی۔ کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ دیتی۔ تم ان لوگوں کے لیے ایک بینک کی مانند تھے۔ وہ تمہیں ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ میں اپنی طبیعت کی وجہ سے پاکستان نہیں آسکتی تھی۔ جرار احسان کو اپنے کروڑوں کے بزنس اور جائیدادوں کا وارث ملنے والا تھا۔ میں نے اس کے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ ایک اور بیٹے کی ماں بننے کے بعد تمہاری یاد مجھے مزید ستانے لگی۔ تمہارے معاملے میں مجھے اپنی ماں اور بھائیوں پر قطعی بھروسہ نہیں تھا۔

جرار احسان اس عمر میں بیٹا پاکر بے انتہا خوش تھا۔ مجھے اہمیت بھی پہلے سے کہیں زیادہ دینے لگا تھا۔ تب میں نے ہمت کر کے اس سے پاکستان جانے کی بات کی۔ اس نے صاف انکار کردیا۔ میں نے ضد کی تو کہا ' کاغذ لو اور ہمیشہ کے لیے واپس لوٹ جاؤ ' میں تمہیں بیٹا بھی نہیں دوں گا۔ پہلے بیوہ ہوئی اور اب طلاق یافتہ ' ہر طرف سے مایوس ہو کر میں نے اس کی بہت منت و سماجت کی کہ میرا بیٹا ' میرے کاشف کو بھی یہیں بلالو ' تمہیں اس معصوم بچے سے کیا بیر ہے؟ کہنے لگا ' ابھی سے اپنے بیٹے کا شریک اس کے سر پہ لا بٹھاؤں ' میں روتی رہی ' وہ تمہارے متعلق ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے میری ضد اور رونے دھونے سے اکتا کر مجھے ایک دن سختی اور قطعیت سے کہا کہ ہم باپ ' بیٹے کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے چلی جاؤ ' میں اپنا بیٹا خود پال لوں گا۔

ایک کے لیے تڑپ رہی تھی ' دوسرے کو کیسے چھوڑ دیتی۔ جرار احسان نے مجھ سے قسم لی کہ اگر اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں تو مجھے بھول جانا پڑے گا۔ میں کبھی بھی تمہارا اور پاکستان جانے کا نام نہیں لوں گی۔ اس کے بدلے میں اس نے وعدہ کیا کہ وہ مرتے دم تک تمہاری ہر ضرورت پوری کرے گا۔ تمہیں ہر طرح کا عیش و آرام دے گا۔ تم پہ پیسہ لٹانے سے دریغ نہیں کرے گا۔

جرار احسان سے میرے بیٹے نہیں جانتے کہ میں ان کے باپ سے پہلے بھی شادی شدہ تھی۔ وہ دونوں بھی اپنے باپ کی طرح بہت پوزیسو ہیں۔ ہم دونوں نے اپنی اپنی زبان کی پاس داری کی۔ میں نے غلط کیا یا ٹھیک ' اس کا فیصلہ تم کرو۔"

وہ اپنی داستان مکمل کر کے اس کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھنے لگی تھیں۔

اسے کیا فیصلہ کرنا تھا۔ اس کی داستان میں ماں سے کہیں زیادہ محرومیاں تھیں۔ اسے نانی ' ماموں یا جرار احسان کا نہیں ' صرف ماں کا دامن پکڑنا تھا ' جو بظاہر اسے بھی مظلوم نظر آرہی تھیں۔ وہ یقیناً سچ ہی کہہ رہی ہوں گی کہ طلاق اور دوسرے بیٹے کے چھن جانے کا خوف ہی اس کے اور ماں کے درمیان حائل رہا ہوگا۔

"مجھے آپ سے کوئی وضاحت نہیں چاہیے ' جرار احسان نے اپنا وعدہ ایفا کیا ' بلکہ ابھی تک کر رہے ہیں اور آپ..."

باہر کسی گاڑی کے انجن کی آواز آنے پر وہ زور دار اور اس کی ماں کرنٹ کھا کے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بیرونی پردہ ہٹا کر باہر دیکھا اور [illegible] آیا۔

"عثمان آگیا ہے ' میرا سب سے بڑا بیٹا۔" وہ بہت حواس باختہ ہو گئی تھیں۔

"تو..." کاشا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے چاہا تھا کہ وہ بھی باپ کی طرح بہت پوزیسو ہے ' تو میں اس سے تمہارا کیا تعارف کرواؤں گی۔ تمہیں اس سے پہلے یہاں سے جانا ہوگا ' میری [illegible]..."

وہ پھولی ہوئی سانسوں سے تیزی سے سب کہتیں کسی کو آوازیں دینے لگیں۔

"جی میم۔" ایک عورت فوراً سے پیشتر حاضر تھی۔

"انہیں دوسرے دروازے سے باہر نکال دو۔ عثمان کی نگاہ نہ پڑے ' جلدی پلیز۔" انہوں نے عجلت میں پھر سے پردہ ہٹا کے دیکھا۔

"نہیں آپ سے..." کاشا کی آنکھوں میں نمی تھی۔

وہ عورت اس کی ماں اسے سینے سے لگائے بغیر اپنے گھر سے چوروں کی طرح نکال رہی تھی۔

"میں تمہاری مجبور ماں عمر کے اس حصے میں تمہیں کیا دوں گی ' جب تمہیں میری ضرورت تھی ' وہ وقت تم نے میرے بغیر کاٹ لیا۔ اب... میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں کہ یہاں پھر کبھی مت آنا۔ تمہیں جتنا پیسہ ' جو کچھ بھی چاہیے ' میں تمہیں دوں گی ' یہاں نہ آنا۔" وہ ہاتھ جوڑے رو رہی تھیں۔

کاشا کی آنکھوں میں بھی نمی تیر رہی تھی۔ اس نے اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے ان بندھے ہاتھوں کو تھام کر چومنا چاہا ' مگر بے بسی سے نفی میں سر ہلاتا بازو سے آنکھیں پونچھتا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

اس نے واپسی کے سفر کے لیے ٹیکسی نہیں لی ' وہ پیدل چل رہا تھا کیونکہ وہ چوبیس برس کا فہم و فراست رکھنے والا کاشا نہیں ' سات سال کا کاشف تھا ' جسے اس کی ماں نے بہت بے دردی سے جھٹلایا تھا۔ اس بے دردی کا زہر اس کے پورے جسم میں پھیل رہا تھا۔ وہ کبھی عورت کے لیے نہیں رویا تھا ' مگر وہ عورت اس کی ماں تھی۔ وہ لوگوں سے بھری ' رواں دواں ٹریفک میں سات سال کے بچے کی طرح روتا ہوا چل رہا تھا ' جیسے بچہ بھیڑ میں گم ہو جانے پر روتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی پیسے کی پروا نہیں کی تھی ' نہ اس کی فطرت میں کسی قسم کا لالچ تھا۔ ماں کی ممتا پیسوں کے برابر نہیں تولی جاسکتی تھی۔ اسے عمر کے اس حصے میں بھلا کب ماں کے سہارے کی ضرورت تھی؟ وہ تو صرف اس سے ملنے آیا تھا۔ وہ اب کوئی معصوم بچہ نہیں رہا تھا ' جسے تحفظ کے لیے جرار احسان کا آسرا درکار تھا۔ وہ تب ان کی زندگیوں میں مداخلت نہ کرسکا ' اب کیا کرتا۔ جرار احسان نے اسے پاکستان جانے اور بیٹے سے نہ ملنے کو کہا تھا۔ یہ تو نہیں کہ اگر بیٹا خود چل کے سامنے آجائے تو اسے پیار بھی نہ کرنا ' گلے سے بھی نہ لگانا۔

وہ چلتا جا رہا تھا ' روتا جا رہا تھا ' وقت نے اسے کہاں لا پہنچا تھا ' وہ کتنا بے بس تھا۔ پون گھنٹے کی پیدل مسافت طے کر کے وہ گھر پہنچا۔ اس نے لیلیٰ کو گھر سے باہر جانے کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ غنی کو اس نے صرف اس لیے فون کیا تھا کہ اسے بتا سکے کہ میں ماں سے ملنے جا رہا ہوں۔ لیلیٰ ابھی نہیں آئی تھی۔ وہ کچن میں آگیا۔ اس نے ریفریجریٹر کھولا جو کہ لاک تھا۔ لیلیٰ خود بھی ڈرنک کرتی تھی۔ مگر کاشا کی طرف سے احتیاط برتتے ہوئے اس نے ریفریجریٹر لاک کیا ہوا تھا۔ وہ باؤلا سا ہو گیا۔ اس نے بایاں ہاتھ ریفریجریٹر کے اوپر رکھا ' تاکہ اس کا بیلنس برقرار رہے اور دائیں سے اس کا ہینڈل

مضبوطی سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ دو سرے جھٹکے پہ وہ کھل گیا۔ اس میں سے کین نکالا اور وہیں کھڑے کھڑے منہ لگا کے چڑھا گیا۔

وہ اپنی بیماری ' ڈاکٹرز کی ہدایات ' ممی اور لیلی کی تمام نصیحتیں بھلائے کین پہ کین چڑھا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

چھٹی کے دن کام بہت بڑھ جاتے تھے۔ عام روٹین میں وہ کام ختم کر کے تھوڑی دیر آرام بھی کر لیتی تھی۔ چھٹی کے دن اسے بالکل وقت نہیں ملتا تھا۔ وہ ملازموں کے ساتھ برابر ہاتھ بٹاتی تھی۔ بچوں کی تمام ذمہ داری مکمل اسی پر تھی۔

آج بھی اس نے ناشتے سے بھی پہلے واشنگ مشین لگالی تھی۔ بچوں کے بہت کپڑے جمع ہو گئے تھے۔ ماہ رو بھی صبح سے کاموں میں جتی ہوئی تھی۔ وہ دھلے ہوئے کپڑے بیڈ پہ رکھ کرتہ لگا رہی تھی 'تاکہ وارڈ روب میں رکھ سکے۔ منصور بالوں کو تولیے سے رگڑتے ہوئے واش روم سے نکلا۔ عمیر اور حمزہ دروازے کو زور سے دھکا دے کر بھاگتے ہوئے اندر آئے۔

"کیا ہو گیا ہے؟ کیوں بھاگ رہے ہو؟" اس نے کپڑے چھوڑ کر دونوں کو ڈانٹا۔ منصور انہیں دیکھ کر مسکرا کر رہ گیا۔

"وہ ہم بہت دور سے آرہے ہیں 'مجھے سانس نہیں آرہا' پانی دیں ماما۔" عمیر کا سانس پھول رہا تھا' وہ صوفے پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ شاہم سے پہلے منصور نے جگ میں سے پانی کا گلاس بھر کر اس کے منہ سے لگایا۔

"آرام سے چھوٹے چھوٹے سپ لو' پھولے سانس کے درمیان پانی نہیں پیتے۔" وہ اسے ساتھ میں ہدایت بھی کرتا جا رہا تھا۔ حمزہ کے چہرے پر بھی گھبراہٹ تھی۔ شاہم بیڈ سے اٹھ کر ان کے پاس آگئی۔

"کہاں سے آرہے ہو حمزہ۔"

عمیر نے کہا تھا کہ بہت دور سے آرہے ہیں۔ شاہم نے بھی یاد کیا کہ وہ تقریباً" آدھے گھنٹے سے غائب تھے۔ وہ کاموں میں مصروف یہ سوچ کر رہ گئی تھی کہ یہیں کہیں چھپے ہوئے کوئی شرارت کر رہے ہوں گے۔

"ماما۔ وہ۔ وہ۔" اس نے عمیر کی طرف دیکھا۔ وہ اٹک رہا تھا۔ منصور بھی مکمل طور پر ان کی طرف متوجہ تھا۔ ان کی ہچکچاہٹ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کچھ غلط کر کے چھپا رہے ہیں۔

"حمزہ! عمیر کی طرف نہیں میری طرف دیکھو اور جلدی بتاؤ کہاں تھے؟" شاہم نے لہجہ سخت کر لیا۔ عمیر نے سے سب بتانے کا اشارہ دیا۔

"ماما ہم نے گھوسٹ (بھوت) دیکھا' اسی لیے ہم ڈر گئے تھے۔" وہ ابھی بھی سہما تھا۔

"بھوت؟ وہ کہاں دیکھ لیا' وہ بھی گھر میں۔" وہ حیران ہوئی۔

منصور دھیما سا مسکرا دیا۔ ان دونوں کی شرارتیں عقل سے بالا ہوتی تھیں۔ خاص طور پر چھٹی کے دن وہ سارا گھر سر پر اٹھائے رکھتے۔ شاہم بھی ڈانٹ دیتی یا نظر انداز کر دیتی۔ وہ بچوں پر زیادہ سختی کی ہر گز قائل نہیں تھی۔

"وہ ماما اوپر۔ اوپر اس روم میں 'جس میں آپ نے جانے سے منع کیا تھا۔" اب عمیر نے اٹک اٹک کر بتایا۔

شاہم نے ماہم کے اوپر شفٹ ہونے کے بعد انہیں اس طرف جانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ بچوں کی شکل بھی ماہم کو دکھانے کی روادار نہیں تھی۔

"جب میں نے تمہیں منع کیا تھا پھر کیوں گئے وہاں۔ تمہیں ماں کا کہا سمجھ میں نہیں آتا۔" اس نے حمزہ کو بازو سے پکڑ کر ہلکا سا جھنجوڑا۔ عمیر باپ کی طرف کھسک گیا۔

"عمیر نے کہا تھا ادھر گھوسٹ ہو گا جیسا موویز میں ہوتا ہے۔" وہ شاہم کے تاثرات سے خاصا نروس ہو گیا تھا۔

"پھر دیکھ لیا بھوت؟" منصور نے شاہم کو ٹالنے کے لیے خود ہی بچوں سے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

"یس پاپا' ایک آنٹی کے روپ میں' ہم دروازے سے آگے نہیں بڑھے 'ہمیں بولا' آؤ بیٹا اندر آجاؤ' آؤ نا بیٹا میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی' ڈرو مت۔" باپ کی نرمی پر عمیر کی زبان چلنے لگی۔

ان کا اشارہ ماہم کی طرف تھا' وہ اسے بھوت سمجھ رہے تھے۔

"پاپا! اس نے ہم سے جھوٹ بھی بولا' وہ بھوت کہنے لگا 'میں بھی تمہاری ماما ہوں' تو میرے گلے سے لگو میں بھی۔"

"جسٹ اسٹاپ اٹ حمزہ!"

اس میں مزید سننے کی سکت نہیں تھی' اسی لیے حمزہ کو ٹوک گئی۔ وہ اندر ہی اندر رو رہی تھی۔ اس نے منصور کو دیکھا جس کے ہونٹوں پر چپ تھی۔

"آئی ایم سوری ماما۔" وہ دونوں کورس میں بولے۔

"ہم وہاں کبھی بھی اوپر نہیں جائیں گے 'آپ کو ہرٹ بھی نہیں کریں گے۔" حمزہ ماں کا ہاتھ پکڑے اپنی غلطی کا اعتراف کر رہا تھا۔

"تم میں ماما کی جان نہیں' پھر ایسا کبھی مت کرنا۔" اس نے دونوں کو خود میں بھینچ لیا۔ وہ اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ بچوں پر آشکار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"آپ دونوں باہر لاؤنج میں جا کے کارٹون دیکھو' میں تھوڑا سا کام نبٹا کر آتی ہوں' پھر کھانا کھاتے ہیں۔" اس نے ان دونوں کو پچکار کر باہر بھیج دیا۔ اب کمرے میں صرف وہ اور منصور تھے۔ منصور بیچ میں ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ بلکہ ماہم کے سلسلے میں وہ کچھ نہیں کہتا تھا۔ کبھی ذکر ہو رہا ہو تو یوں انجان بن جاتا جیسے یہاں موجود ہی نہیں۔ مگر اب اکثر شام میں وہ خاموش سا ہو کر اسٹڈی روم میں مقید ہو جاتا۔ جیسے وہ شاہم سے اپنا آپ چھپانا چاہ رہا ہو۔

"آپ کوئی حتمی فیصلہ کیوں نہیں کرتے منصور؟" کافی توقف کر کے وہ بولی۔

"کیسا فیصلہ؟" وہ انجان تھا یا بن رہا تھا۔

"اس عورت کا' جو ہمارے سروں پر بیٹھی ہے۔ ابھی بچے اسے بھوت سمجھ رہے ہیں' کل کو ماں کہنے لگیں گے' وہ آخر یہاں کیا لینے آئی ہے۔"

وہ منصور پر چڑھ دوڑی' اسے یہ بھی خیال نہیں تھا کہ فی الوقت منصور سے زیادہ اس سے اس کا رشتہ بنتا ہے۔

"میں اسے اٹھا کے نہیں لایا' کوئی اور پناہ گاہ نہیں ملی ہو گی تو یہاں چلی آئی' اس میں میرا کیا قصور ہے۔" منصور اپنی جگہ سچا تھا۔

"یہ کوئی ایدھی سینٹر یا دارالامان نہیں ہے 'جس کا جب جی چاہے منہ اٹھائے چلا آئے' گھر ہے ہمارا فیملی ہے۔ آپ اسے یہاں سے جانے کو کہہ دیں۔ میں اسے مزید برداشت نہیں کر سکتی۔"

وہ غصے سے لال پیلی ہو رہی تھی۔ اس کے منہ سے بات نکلنا مشکل تھی۔

"سوری' آئی کانٹ۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر صاف انکار کر دیا۔

"او کے' آپ نہیں تو میں خود ابھی جاتی ہوں اور اسے دھکے دے کر گھر سے باہر نکالتی ہوں' دیکھتی ہوں کیسے نہیں نکلتی۔" شاہم غصے میں آگے بڑھی تو منصور سامنے آگیا۔

"واٹ نان سینس' بچوں کے سامنے تماشا کری ایٹ کرو گی۔ ملازم ہیں' وہ کیا سوچیں گے؟ میں کرلوں گا اس کا کچھ بندوبست' مجھے سوچنے تو دو' صرف تھوڑا ٹائم اور پلیز۔"

اس نے بہت نرمی سے اسے روکا۔ ورنہ وہ ابھی عمل کرنے والی تھی۔ یہ بھی شکر تھا کہ یہ واقعہ منصور کی موجودگی میں پیش آیا تھا۔ ورنہ ماہم کی خیر نہیں تھی۔

وہ ساری شام منصور نے اسٹڈی روم میں خاموش کچھ سوچتے گزاری۔ اسی کمرے میں ماہم نے اپنے جرم کا اعتراف کیا تھا اور اسی کمرے میں اس نے منصور سے طلاق کا مطالبہ بھی کیا تھا۔ ماہم نے اسے پھر سے کشمکش میں ڈال دیا تھا۔ اسے پہلے روز ہی دیکھ کر منصور نے سوچا تھا کہ اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ منصور نے پورے چھ سال اس سے پل پل بے انتہا محبت کی تھی۔ وہ محبت کسی بھی وقت انگڑائی لے کر

بیدار ہو سکتی تھی۔ وہ دل میں بغض، کینہ یا کھوٹ رکھنے والا انسان نہیں تھا۔ اس کی فطرت میں معاف کر دینے، صلہ رحمی اور بھول جانے کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ ماہم کی حرکات اسے شروع سے کھٹکتی آئی تھیں، مگر اس نے اپنے ذہن کو کسی بھی شک و شبے میں نہ پڑنے دیا۔ مگر ماہم نے وہی کر دیا جسے وہ نظر انداز کر رہا تھا۔ ماہم چلی گئی بچے اس کے سپرد کر کے، وہ چاہتا تو شاہم کے کردار پر شک کر کے اس کی بہن کے کیے کا غصہ اس پر نکال سکتا تھا۔ اسے گھر سے باہر کر سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا کرنا تو درکنار سوچا بھی نہ۔

وہ اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ شاہم نے اس سے شادی کا فیصلہ محبت کی نہیں، عقل کی بنیاد پہ کیا تھا۔ محبت تو ابھی تک ان دونوں میں صرف نام کی حد تک تھی۔ ورنہ وہ دونوں صرف اپنے رشتے کا احترام کرتے تھے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے سے محبت، التفات جیسی توقعات کبھی نہیں رکھی تھیں۔ نہ شاہم سج سنور کر منصور سے تعریف و توصیف سننے کی خواہاں تھی، نہ ہی وہ اس کے ناز نخرے اٹھاتا تھا۔ ان دونوں کے اس تعلق کا اہم سبب صرف بچے تھے۔

ماہم کے آجانے پر اس نے چند ایک بار سوچا تھا کہ کاش میں نے شاہم کی زبردستی کا یہ بندھن قبول نہ کیا ہوتا۔ جب سے ماہم آئی تھی شاہم صرف ایک بار اوپر گئی تھی، وہ بھی اسے تنبیہہ کرنے کے لیے۔ منصور کے سامنے اگر وہ ماجدہ سے اس کی پوچھ کچھ کر رہی ہوتی وہ انجان بن جاتا۔ وہ شاہم کو اپنی طرف سے کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ شاہم سے محبت نہ سہی وہ اس کی قربانی اور ہمت کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اگر اس کے ماہم کے ساتھ گزارے چھ سال کا شاہم کے ہمراہ بتائے پونے دو سال کا موازنہ کیا جاتا تو شاہم کا ساتھ ہر زاویے سے بہتر تھا۔ وہ ایک اچھی ماں، اچھی بیوی اور سلیقہ مند عورت تھی۔ گھر کے بیرونی کام بھی سرانجام دے لیتی تھی۔ جب بھی اسے گھر سے باہر جانا ہوتا وہ آفس فون کر کے منصور سے اجازت ضرور لیتی۔ وہ اس کو اطلاع دیے بغیر کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی تھی۔ اپنے ملازمین کی موجودگی میں بھی وہ چھوٹے سے چھوٹا کام اپنی نگرانی میں کرواتی۔

اس نے منصور کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ نہ کوئی چھوٹی بڑی خواہش نہ ہی کسی معاملے میں بحث۔ منصور کے منہ سے نکلا ہر لفظ اس کے لیے حرف آخر تھا۔ منصور اس کی خدمات کا دل سے قدر دان تھا مگر جب سے ماہم لوٹی تھی اس کا دل عجیب سا دھڑکنے لگا تھا۔ وہ شاہم سے بے ایمانی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی عقل کہتی تھی کہ ماہم کو جتنی جلدی ممکن ہو اس گھر سے فارغ کر دیا جائے جبکہ دل کی منطق اس کی عقل سے برعکس تھی۔ وہ خطرہ محسوس کرنے کے باوجود آنکھیں بند کیے ہوئے تھا۔

آج کا واقعہ خطرے کا الارم تھا۔ اس نے بچوں کو اپنے پاس بلایا تھا اور انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ میں تمہاری ماں ہوں، یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ابھی تو بچے اسے بھوت خیال کر رہے تھے۔ وہ بھوت نہیں بلکہ ان کی حقیقی ماں تھی ہے اور یہ حقیقت کبھی بھی کھل سکتی ہے۔ ماہم کو جتنی جلدی یہاں سے فارغ کر دیا جاتا، ان دونوں کے بچوں کے اور ان کے رشتے کے حق میں بہتر تھا۔ لیکن اگر وہ اسے نکال دیتا تو کہاں جائے گی؟ یہ ہی سوچ منصور کو [illegible]

ماجدہ رات کا کھانا لے کر آئی تو ماہم عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی۔ ماجدہ کھانا رکھ کر اس کی نماز ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے نماز باقاعدگی سے پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جتنے گناہ وہ کر چکی تھی شاید ان کا کفارہ ادا ہو جاتا۔ اس کے اپنے معاف کرنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ رب سے معافی کی طلب گار تھی۔ ہر طرف سے خود کو بے آسرا کر کے اب اسے بچے اپنا سہارا نظر آنے لگے تھے۔ وہ ان سے ملنے کے لیے تڑپتی تھی۔ ہر نماز کے بعد دعا مانگتی کہ بچے اسے مل جائیں۔

"کھانا رکھ دیا ہے۔" اس کے سلام پھیرنے پر ماجدہ اطلاع دے کر پلٹنے لگی کہ اس نے روک لیا۔

"ماہدے"

"نہیں... وہ بیٹی۔"

اس کو ماہم کے اندر آنے والی اس نئی تبدیلی سے بڑا خوف آتا تھا۔ گھر کے تمام ملازمین کو شاہم سے دلی لگاؤ تھا۔ وہ سب بھی اس کی قربانی کو دل سے سراہتے تھے۔ ان سب کے خیال میں بھی ماہم کا اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں تھا۔

"ایک کام کرو گی میرا، کسی تک پیغام پہنچانا ہے، مہربانی کرو۔"

وہ ماجدہ سے بچوں کی خیر خیریت پوچھتی رہتی تھی۔ اس کی ماجدہ سے زیادہ تر گفتگو بچوں کے متعلق ہی ہوتی تھی۔ جو وہ ہرگز شاہم کے گوش گزار نہیں کرتی تھی۔

"جی بتائیں۔" ماجدہ کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

"منصور سے کہو مجھ سے ایک بار مل لیں۔ مجھے ان سے ضروری کام ہے، پلیز ماجدہ تم یہ کر سکتی ہو۔"

ماجدہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ وہ اس گھر کی ملازم ہی نہیں ان کی دور پار کی رشتے دار بھی تھی۔ یہاں کی بچی خیر خواہ اور نمک خوار تھی۔ ان کے آپس کے معاملات کے بارے میں وہ اپنی الگ سے ذاتی رائے تو رکھ سکتی تھی، مگر مداخلت کی جرأت نہیں تھی۔ پھر وہ شاہم کے حق میں بھی تھی۔ وہ اسے بے خبر رکھ کے وار نہیں کر سکتی تھی۔

"نہ بی بی جی، کسی کو دھوکا دے کے نمک حرامی نہیں کر سکتی، شاہم بی بی کے ساتھ اتنی زیادتی نہیں، ہرگز نہیں۔" وہ بہت گھبرا گئی۔

"میرا یقین کرو ماجدہ میں جائے نماز پہ بیٹھی ہوں۔ منصور سے ملنے کا میرا کوئی غلط مقصد نہیں ہے، نہ ہی میری نیت میں کوئی کھوٹ ہے۔ اب وہ میری چھوٹی بہن کا شوہر ہے، مانا کہ میں بری ہوں ماجدہ! اگر ظالم نہیں، میں نے منصور سے صرف اپنے بچوں کے متعلق بات کرنا ہے، تمہیں اللہ کا واسطہ ماجدہ! تم بھی تو ماں ہو، مجھ پہ یہ احسان کر دو۔" وہ ہاتھ باندھ کر رونے لگی تھی۔

ماجدہ کا دل اس کے آنسوؤں کے آگے نرم پڑتا جا رہا تھا۔ وہ بھی ماں تھی۔ ماہم کی بچوں کے لیے بے چینی اس سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔

"وہ جی ٹھیک ہے، میں... کوشش کروں گی۔"

ماجدہ نے تذبذب کے عالم میں ہامی بھری۔

وہ نیچے آئی تو سب کھانا کھا چکے تھے۔ شاہم نے کچن سمیٹ لی تھی۔ منصور کھانے کے بعد گھنٹہ دو گھنٹہ ٹی وی دیکھتا تھا۔ شاہم بچوں کو سلانے کے لیے لے گئی تھی۔

ماجدہ ہاتھ رگڑتی ہوئی اس کے پاس آرکی۔ ماجدہ کو نہیں پتا تھا کہ منصور اس پیغام کو کس طرح لے گا؟

"کیا بات ہے ماجدہ، کچھ کہنا چاہتی ہو؟" منصور کی نظر اس پر پڑ گئی۔

"جی... وہ... وہ صاحب جی۔" اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"گھبراؤ نہیں، بولو کیا بات ہے؟" اس نے نرمی سے استفسار کیا۔ ماجدہ کو اس کی نرمی سے حوصلہ ملا تھا۔

"پتا نہیں صاحب جی مجھے یہ سب کرنا چاہیے کہ نہیں... مجھے جی ماہم بی بی نے آپ کے نام پیغام دیا ہے، آپ ان سے مل لیں کوئی ضروری کام ہے ان کو۔"

ماجدہ نے کسی مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔

منصور نے ٹی وی کا والیوم کم کیا اور ماتھے کو انگلیوں سے رگڑنے لگا۔

"میں چلتی ہوں صاحب جی بارش ہونے والی ہے، مجھے اپنا سامان وغیرہ اندر کرنا ہے۔"

اسے شاہم کے آجانے کا ڈر تھا۔ وہ اسے منصور کے پاس کھڑا دیکھ کر ضرور کچھ پوچھتی۔

"ہاں جاؤ۔" وہ اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا تھا۔

وہ صوفے پہ نیم دراز ہو کے سوچوں میں گم ہو گیا۔

✡ ✡ ✡

اپارٹمنٹ کے اندھیرے نے اس کا استقبال کیا۔ باہر تیز بارش کے ساتھ ہلکی برف باری بھی ہو رہی تھی۔ موسم کی ٹھنڈک ہڈیوں کو منجمد کرنے والی تھی۔

دروازہ لاک کر کے وہ تھوڑا جھنجلا گئی۔

"کتنا لاپروا ہے یہ کلائنٹ بھی آن نہیں کی۔ پڑا رہتا ہے اپنے کمرے میں۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے موبائل ٹارچ سے سوئچ بورڈ تک کا فاصلہ طے کیا۔ روشنی کر کے وہ سیدھی کاشا کے کمرے میں چلی گئی۔

"ہیلو کاشا، آر یو ہیر۔" اس کے کمرے میں زیرو پاور کی روشنی تھی۔

"کیا مصیبت ہے کاشا! ہر جگہ بلیک آؤٹ کیا ہے۔" اس نے بٹن پہ انگلی رکھ دی۔ یک دم اسے کمرے کے سرد ٹمپریچر کا احساس ہوا۔ باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ بارش اور ٹھنڈی ہوا اندر آنے سے کمرے میں اچھی خاصی ٹھنڈک ہو گئی تھی۔ کاشا کارپٹ پہ بیٹھا گھٹنوں میں سر دیے ہوئے تھا۔ بوتلیں اور گلاس اس کے پاس پڑے تھے۔

لیلیٰ یہ سارا منظر دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"کیا ہوا کاشا، آر یو او کے۔" اس نے کاشا کا بازو ہلایا۔ اس نے آدھے بازو کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کے بازو پہ رونگٹے کھڑے تھے۔ سارا جسم سرد تھا۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ تھا۔ لیلیٰ اسے چھوڑ کر کھڑکی کی طرف بڑھی، اسے بند کر کے بھاری پردے برابر کیے۔ جلدی سے ہیٹر آن کیا۔ کاؤچ پہ پڑا ہوا اس کا گرم لانگ کوٹ اٹھا کے اس کے کندھوں پہ ڈال دیا۔

"کاشا! کیسی طبیعت ہے تمہاری... ڈاکٹر کو بلاؤں۔" وہ اس کے گال تھپتھپا رہی تھی۔ اس کی حالت نے لیلیٰ کو حواس باختہ کر دیا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں، پریشان مت ہو۔" اس نے لیلیٰ کو خود سے پرے کیا۔

"ہوں او کے!" اس نے ناراضگی سے نفی میں سر کو جھٹکا۔ "تمہیں معلوم ہے نا الکحل تمہارے لیے کتنا نقصان دہ ہے اس حالت میں۔ پھر بھی تم نے ڈرنک کیا، بے تحاشا ڈرنک۔"

وہ اس کی حالت پہ کڑھ رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا مجھے، مرا نہیں ہوں۔ زندہ ہوں ابھی بھی۔" اس نے کلائی اس کی طرف بڑھائی۔

"نظر آ رہا ہے خودکشی کرنے کی کوشش تو کی ہے نا، تمہارا پرابلم کیا ہے، صبح میں تمہیں اچھا بھلا چھوڑ کے گئی تھی۔"

کاشا نے اسے بالکل نہیں بتایا تھا کہ وہ اپنی ماں سے ملنے جانے والا ہے۔

"لمحہ بھر میں دنیا ختم ہو جاتی ہے، تم صبح سے رات تک کی بات کر رہی ہو۔" ابھی بھی اس کے حواس قائم تھے۔

"چائے بناؤں؟"

"ہوں۔"

کاشا کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ اسے گھورتی ہوئی اٹھ گئی۔

چائے بنانے رکھ کے اس نے خالی بوتلیں شیلف کے نیچے رکھ دیں۔ گلاس دھو کے کیبن میں رکھا اور اسٹینڈ سے دو مگ اتار لیے۔ فریج میں سے اس نے بریڈ نکالی اور سینڈوچ تیار کرنے لگی۔

"تم نے دن بھر کوئی دوا نہیں لی نا، نہ ہی کھانا کھایا ہے۔" مگ اس کے آگے رکھ کے وہیں بیٹھ گئی۔

اس نے مگ اٹھا کے منہ سے لگا لیا۔ لیلیٰ نے اصرار نہ کیا۔ وہ اس کی نہ کو ہاں میں نہیں بدل سکتی تھی۔

"جب تم کنفیوز ہوتی ہو کیا کرتی ہو؟" وہ مگ کے کناروں پہ انگلی پھیر رہا تھا۔

"اپنی ماما کو کال اور دعا۔" اس نے سینڈوچ کی بڑی سی بائٹ لی۔

کاشا نے یک دم اسے دیکھا۔ یہ دونوں کام اس کے بس سے باہر کے تھے۔ ماں کا تو وہ باقی ماندہ زندگی میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور دعا کا وہ قائل نہیں تھا۔

"تم دعا پہ بلیو کرتی ہو۔"

"یا اللہ پاک پہ کسے بھروسہ نہیں ہوتا۔"

"میں جب بھی، جس چیز کے لیے بھی Prey کرتی ہوں وہ مجھے مل جاتا ہے۔" اس نے فٹ بتا دیا۔

"اور اگر نہ دے تو نہیں مانو گی؟"

"تمہیں کاشا ایسا مت بولو، یہ سراسر کافرانہ سوچ

ہے۔ اگر وہ نہیں دے گا تو اسے مانیں گے اس کے نہ دینے میں بھی کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ ہماری بھلائی کے لیے ہی ہمیں محروم رکھتا ہے۔ وہ ہم سے ستر ماؤں جتنا پیار کرتا ہے۔ ہم ایک ماں کی محبت اور شفقت کا قرض پوری زندگی نہیں چکا پاتے۔"

اسے بھی مذہب کی بہت زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ جتنا پتا تھا' بتا رہی تھی مگر اسے کاشا کی باتوں سے عجیب سا خوف آرہا تھا۔ اس نے کبھی دین مذہب کو موضوع بحث نہیں بنایا تھا۔

"پتا نہیں کیونکہ میری ماں نہیں ہے۔ اس نے ہمیشہ مجھے اپنی مرضی سے دیا' جس کی چاہ میرے اندر تھی وہ کبھی نہیں۔" اس کا انداز بہت مایوسانہ تھا۔

"بے بی وہ تم سے بہت محبت کرتا ہو اور اسی میں تمہاری بہتری ہو۔" لیلیٰ اسے بہت نرمی سے سمجھا رہی تھی۔

"مجھے پیار لینا آتا ہے نہ دینا' مجھے یاد ہے غنی نے کہا تھا محبت خدا کا تحفہ ہے۔"

اسے غنی کی چند سال قبل کہی بات یاد تھی۔

"سچ بولو کاشا' تمہیں کسی سے محبت نہیں' کبھی کسی کو دیکھ کر ہارٹ بیٹ مس نہیں کی۔"

وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا' پھر بولا۔

"سیریسلی نہیں' ماہم سے تھوڑا بہت جسٹ لگاؤ تھا' مجھے بھی کبھی کسی نے پیار نہیں کیا۔ پیدا ہونے سے لے کر اب تک' میں نے کسی اپنے کی آنکھوں میں محبت کی چمک نہیں دیکھی' پھر جو مجھے نہیں ملا' وہ میں دوسروں کو کہاں سے دوں' صرف ایک شخص مجھے بہت چاہتا ہے غنی' میرا جگر' ویل وشر۔"

غنی کی اس سے محبت کسی سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ وہ کئی برس ایک دوسرے کے ہمراہ ایک چھت تلے رہے تھے۔ ان دونوں کی دوستی میں زیادہ ہاتھ غنی کا تھا۔ کاشا اس کے ساتھ بھی اکھڑا اکھڑا ہی رہتا۔

"تمہیں اپنی ماں سے محبت نہیں' تم نے کبھی ان کا ذکر نہیں کیا۔"

لیلیٰ نے اس کا موڈ دیکھ کر بہت ہمت سے استفسار کیا۔ ورنہ وہ کسی کو بھی اپنی ذاتیات میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

اس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی۔

"میری ماں مر گئی' اسی روز جب میرا باپ مرا' جب اس نے میری کفالت کے لیے باہر قدم رکھا یا تب جب اپنے باس سے شادی کی یا۔۔۔ یا شاید پھر آج۔ میں نے زندگی اسی الوژن میں گزاری کہ وہ ہے۔ سات برس کے بچے کو اس کی محبت' شفقت اور توجہ کی ضرورت تھی اور اس نے میری معصومیت کا سودا پیسوں کے عوض کرلیا' اسے لگتا تھا' اس بچپن نامی شے سے میں ناآشنا ہوں' پتا ہی نہیں چلا میں کب نانی کے چانٹے اور ماموں کی گالیاں کھاتا بڑا ہوگیا' اتنا بڑا کہ گالیوں کا جواب گالیوں سے دیتا' نانی کا اپنے گال کی طرف بڑھا ہاتھ تھام کر جھٹک دیا۔ گلی میں دو چار لڑکوں سے ہنگے لیے تو کاشف سے کاشا بن گیا۔ کتابوں کی جگہ ہاتھ میں ریوالور آگیا۔ ماں سے الگ اور بڑے گھر کا مطالبہ کردیا۔ اب میں نانی کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔ میں اپنی اتنی آزادی کا ناجائز استعمال کرنے لگا۔ کوئی پوچھنے والا تھا نہ سمجھانے والا۔ میں نے ہر وہ کام کیا جو مجھے زیب نہیں دیتا تھا۔

مجھے ہر عورت قابل نفرت لگتی' اس کی ذات اور عزت کی دھجیاں اڑانا میرا محبوب مشغلہ بن گیا۔ میں پیسے کا بے دریغ ضیاع کرتا' اس پیسے نے مجھ سے میرا واحد خونی رشتہ چھین لیا تھا اور باقی وہ لالچی کیا تھا۔ حتیٰ کہ میری ماں مجھ سے دور ہو گئی' اسے دھن دولت مجھ سے زیادہ عزیز ہے۔ میں کتنا بدنصیب ہوں' مجھے کبھی کسی غیر نے ریجیکٹ نہیں کیا' میری ماں مجھے دھتکار رہی ہے' پیسوں کی طرح دے کر دھتکار رہی ہے۔"

اس نے گھٹنوں میں سر دے لیا تھا۔ لیلیٰ کو لگا وہ رو رہا ہے۔ اس کی گفتگو کا کچھ حصہ اس کی سمجھ میں آیا تھا' کچھ نہیں وہ اس سے وضاحت نہیں مانگ سکتی تھی وہ اسے صبح اچھا خاصا چھوڑ کر گئی تھی۔ اب اس کی حالت اس قدر بگڑی ہوئی تھی کہ آنکھوں کے نیچے قدرے سیاہ حلقے واضح ہورہے تھے۔

"میرے جسم میں بہت درد ہو رہا ہے' بہت درد لیلیٰ۔"

وہ ہاتھ سے بازو کو دبانے لگا تھا۔ تکلیف کے آثار اس کے چہرے پہ بہت واضح تھے۔

"تم نے میڈیسن ڈوز نہیں لی' اسی لیے درد ہو رہا ہے' میڈیسن کھالو۔" لیلیٰ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

"نہیں یہ درد دوا سے نہیں جائے گا' نہیں جائے گا۔"

اسے اٹھنے میں لیلیٰ نے سہارا دیا اور بیڈ پہ لے آئی' اسے لٹا کر اچھی طرح کمبل اوڑھا دیا۔

"تم سو جاؤ کاشا۔" اس نے کئی بار بولا ہے اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاؤ مگر تم نہیں مانتے' اگر اپنا مکمل علاج کروانا تھا تو پاکستان میں رہتے' امریکہ آنے کا تردد کیوں کیا۔"

وہ اس کی حالت پہ کڑھ رہی تھی۔

"میں نے کنفرم کرلیا ہے' پاکستان کے لیے فلائٹ جارہی ہے' میری بکنگ کروا دو' میں چلا جاؤں گا۔" تکیے پہ سر رکھے بند آنکھوں سے وہ کہہ رہا تھا۔

لیلیٰ اس کے پاس ہی ترچھی سی ہو کر ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سو گیا۔ وہ احتیاط سے اس کے پاس سے اٹھی۔ وال کلاک پہ ٹائم دیکھا۔ کمبل کو مزید اس پر اوڑھایا۔ ہیٹر بند کیا' لائٹ بند کرکے وہ باہر نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

شور سے اس کی نیند ٹوٹی تھی۔ کمرے میں چار سو اندھیرا تھا۔ یعنی ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ کمرے میں بہت مدھم سی روشنی میں اس نے اپنے ساتھ دعا اور شاہم کو لیٹے دیکھا اور کروٹ بدل گیا۔ بادل کی زوردار گرج نے یک دم اس کے حواس بیدار کردیے۔ اس نے کان لگا کے سنا تو بارش کی آواز آئی۔ وہ فوراً" اٹھ کے بستر پہ بیٹھ گیا۔ اسے یاد تھا۔ ماہم بارش' بجلی کی چمک اور بادل کی گرج سے بہت ڈرتی تھی۔ وہ تصور کرسکتا تھا کہ وہ اس وقت سہمی ہوئی بارش رکنے کی دعائیں کررہی ہوگی۔ اسے رات ماجدہ کا دیا پیغام بھی یاد تھا اس کا دماغ کہہ رہا تھا کہ سب کچھ ذہن سے جھٹک کر لیٹ جاؤ' جبکہ دل کی آواز تھی کہ ماہم کو سہارے کی ضرورت ہے۔

بارش کا زور بڑھتا جارہا تھا۔ اس نے سوئی ہوئی شاہم پہ طائرانہ سی نگاہ ڈالی اور اٹھ گیا۔ کمرے کا دروازہ احتیاط سے بند کرکے وہ دھیمے دھیمے چلتا لاؤنج میں آگیا۔ یہاں بھی لائٹ روشن نہیں تھی۔ ملازم اپنے ٹھکانوں پر دبکے پڑے تھے۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا رکتا' سوچتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہ اپنے نئے رشتے میں پہلی چوری کرنے جارہا تھا۔ وہ شاہم کو دھوکے میں رکھ کے محبت میں بے ایمانی کرنے والا تھا۔ اگر ماہم نے اس سے کچھ ضروری بات کرنا تھی تو وہ شاہم کو اعتماد میں لے کر اس کے ہمراہ ماہم کے پاس جاتا۔ اس کا دونوں سے رشتہ تھا۔ معاملہ بھی گھر کا تھا۔ اس نے غلطی کی تھی' مگر اب ان لوگوں کے سوا اس کے پاس کوئی ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔ انہیں مل کر اس کا مسئلہ حل کرنا چاہیے۔ شاہم کو منانا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ مگر یہ سب باتیں تو ہوش و حواس اور عقل کی تھیں اور اس کی عقل پر پردہ پڑچکا تھا۔

ہینڈل گھمانے پر دروازہ کھلتا چلا گیا۔ وہ بیڈ کے وسط میں بیٹھی بری طرح کپکپا رہی تھی اور رو رہی تھی۔ وہ تیزی سے اس تک پہنچا۔

"ما۔۔۔ ماہی کیا ہوا' رو کیوں رہی ہو؟" وہ بے تابی سے اس کا بازو ہلاتے پوچھ رہا تھا۔

کتنا کچھ بدل گیا تھا' مگر اس کے آنسوؤں نے آج بھی منصور کو بے تاب کردیا تھا۔

"منصور۔۔۔"

ماہم نے روتا ہوا خوف زدہ چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کے ساتھ لگ گئی۔ وہ روئی جارہی تھی۔ منصور ساکت وصامت ایک عرصہ بعد عورت کے وجود کو اپنے ساتھ جڑے ہوئے محسوس کررہا تھا۔

٭٭٭

فون کی مسلسل چنگھاڑتی بیل نے اس کی نیند خراب کی تھی۔ نیند میں مدہوش اس نے تکیہ کانوں پہ دھر لیا' بیل کا دم پھر بھی نہ ٹوٹا' البتہ اس کی نیند ٹوٹ چکی تھی۔ کارڈلیس کو گھور کے اس نے کان سے لگایا۔

"ہیلو۔" آواز پہ ابھی بھی غنودگی کا عنصر تھا۔

"آر یو لیلیٰ؟" دوسری طرف غنی تھا۔

"یس اینڈ یو؟"

"غنی اسپیکنگ فرام پاکستان ویئر از کاشا۔" وہ کچھ حواس باختہ سا لگ رہا تھا۔

"وہ اپنے کمرے میں سو رہا ہے' آپ اس وقت۔"

غنی کا نام سن کر اس کا لہجہ بدل گیا' وہ کاشا کا واحد دوست تھا' غنی سے کاشا نے اس کا اچھا خاصا تعارف کروا رکھا تھا۔

"پلیز آپ اسے جگائیں' مجھے بات کرنا ہے' ابھی۔"

اس نے "ابھی" پر خاصا زور دیا۔ پچھلے دو ڈھائی گھنٹے سے اس کا دل کاشا کی طرف بہت وسوسے میں گھرا ہوا تھا' اسے کاشا کے متعلق عجیب عجیب سے خیال آرہے تھے۔

"سم تھینگ از رونگ۔" وہ کاشا کو اٹھانے سے ہچکچا رہی تھی۔ وہ غنی کو بتانا نہیں چاہتی تھی کہ اس کی طبیعت بہت بگڑی ہوئی تھی۔ اتنی مشکلوں سے تو وہ سویا تھا۔

"پلیز۔" اس نے چبا کر کہا۔

"او کے۔" وہ کارڈلیس ہاتھ میں لیے اٹھ گئی۔ چپل پیروں میں اڑس کے وہ باہر آئی۔

کاشا کے کمرے کا ہینڈل گھمانے پر اسے دروازہ مقفل ملا' وہ حیران رہ گئی وہ خود اس دروازے کو کھلا چھوڑ کر گئی تھی۔ پھر وہ اور کاشا کبھی بھی اپنے کمرے مقفل کر کے نہیں سوتے تھے۔ کاشا تو سو چکا تھا' پھر دروازہ کس نے بند کیا؟

"ہیلو غنی' کاشا کا کمرا لاک ہے حالانکہ میں خود اسے کھلا چھوڑ کر گئی تھی اور تب کاشا بھی سو چکا تھا۔"

اب اس کے اوسان بھی خطا ہو گئے' اسے کسی گڑبڑ کا اندیشہ ہوا۔

"دروازہ ناک کرو۔" غنی نے اسے ہدایات دی۔

"کاشا۔ کاشا اوپن دا ڈور۔ پلیز کاشا۔" وہ پورے زور سے دروازہ دھڑ دھڑا رہی تھی۔ جب سے وہ بیمار ہوا تھا' اس کی نیند بہت گہری نہیں ہوتی تھی' ہلکی سی آہٹ سے ٹوٹ جاتی تھی۔

"لیلیٰ! تمہارے پاس ڈپلی کیٹ چابی ہے۔"

اس نے ہاتھ میں پکڑے کارڈلیس پہ غنی کو کہتے سنا اور اسے کان سے لگایا۔

"ہاں ہے' مگر ڈھونڈنا پڑے گی۔" اس نے جلدی سے یاد کر کے بتایا۔

"جلدی ڈھونڈو' ہری اپ۔"

بالوں میں انگلیاں پھنسائے وہ مسلسل چکرا رہا تھا۔

"یا اللہ خیر کرنا۔" بے اختیار اس مصیبت میں اس کے منہ سے مالک کا نام نکلا۔ لیلیٰ نے ریک کی ساری چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیا تھا۔ درازوں میں سے نکال نکال کر باہر پھینکتی جا رہی تھی' [illegible] رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن بہت تیز تھی اور ہونٹ خوف سے خشک ہو رہے تھے۔ کارڈلیس کراؤن پر رکھ کے اس نے سنگل بیڈ کی دراز کو باہر کھینچا' اس میں کچھ کاغذات تھے' اس نے پرے اچھال دیے۔ نیچے کچھ اور فالتو چیزوں کے ساتھ چابیوں کا گچھا بھی تھا۔ چابیاں مٹھی میں جکڑ کر اس نے کارڈلیس اٹھا کر باہر دوڑ لگا دی۔

"چابی مل گئی ہے' کھولتی ہوں۔"

تھر تھر کے چابی لاک میں گھماتے ہوئے اس کے ہاتھ واضح طور پر کپکپا رہے تھے۔ ٹانگوں سے جان نکلی جا رہی تھی۔ دروازہ دھکے سے کھول کر وہ اندر داخل ہوئی' آگے کے منظر نے اس کی سانس روک دی۔ وہ بت بن گئی تھی۔

"ہیلو۔ ہیلو لیلیٰ۔ ہیلو لیلیٰ کاشا کیسا ہے؟ اس کی

طبیعت ٹھیک ہے۔"

غنی دوسری طرف سے جواب نہ پا کر چیخ رہا تھا۔

"غنی۔ کاشا از نو مور۔" اس نے سوسائیڈ کر لی۔" وہ کارپٹ پر گرا تھا۔ خون نے سارا کارپٹ رنگ دیا تھا۔

٭٭٭

"میں سوچتی تھی آپ کبھی شادی نہیں کریں گے۔"

"تم مجھے سوچتی تھیں۔" منصور نے نرمی سے کہا۔

وہ دونوں کارپٹ پہ بیٹھے تھے۔ منصور اس کے سامنے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے سر جھکائے اسے سن رہا تھا۔ اسے رات کے [illegible] اپنی سابقہ بیوی کے کمرے میں تنہا اتنی تفصیل سے نہیں بیٹھنا چاہیے تھا۔

"مگر انسان جو سوچتا ہے ویسا ہی کب ہوتا ہے' میں جانتی ہوں منصور اب ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ میں نے نہ صرف آپ لوگوں کے ساتھ بلکہ خود اپنے ساتھ بھی بہت برا کیا۔ غلطی کا احساس ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ پروفیسر زوہیب رضا کی بیٹی تھی سب بے وقوف یا شاید خراب نکلی' انہوں نے اپنی بیٹی کی تربیت اس انداز میں تو نہیں کی تھی۔ انہوں نے تو میری شخصیت میں چن چن کے اچھائیوں کا اضافہ کیا تھا۔ میں ان کلمات کی [illegible] جب یونیورسٹی میں میرا پہلا دن تھا ایک رات پہلے انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا' کہنے لگے' 'بابا جان تم ایک سمجھ دار بچی ہو میں نے تمہاری عقل کو اتنا پالش ضرور کیا ہے کہ تم اچھے اور برے میں تمیز کر سکو۔ کل سے تم کو ایجوکیشن میں جاؤ گی بہرحال تمہاری عمر کا نازک مرحلہ ہے۔ میں تم پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا نہ ہی میں کوئی کنزرویٹو باپ ہوں پھر ہمارا مذہب اسلام بالغ عمر کی بچی کو ایک حد تک آزادی دیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی کبھی اس آزادی کا ناجائز استعمال نہیں کرے گی' تم چاہو تو اپنی مرضی سے زندگی کا ہم سفر چن لینا مگر ہم سفر ایسا ہونا چاہیے کہ ایک بیٹی کا ذمہ دار باپ ہونے کی حیثیت سے زوہیب رضا کے پاس انکار کی گنجائش نہ رہے۔'

میں اپنے باپ کے پڑھائے ہوئے سارے اسباق بھول گئی۔ میں نے اپنے باپ کا نام بدنام کر دیا۔ ساری چویشن سمجھتے ہوئے بھی اگنور کیا' میں نے خود بد نصیبی اپنا مقدر بنائی' ذلت کے راستوں پہ چلی' کسی بھی رشتے کی پروا نہیں کی۔ تم میرے شوہر تھے۔ میں نے تمہیں کبھی عزت کا مقام نہیں دیا۔ تمہاری قربت مجھے وبال جان لگتی تھی' تم نے مجھے محبت عزت اور تحفظ دیا میں نے بدلے میں تمہیں دنیا والوں کا تماشا بنا دیا۔ اپنی چھوٹی بہن کا بھی نہیں سوچا۔ جو ماما کے مرنے کے بعد میرے ساتھ لگ کے سوتی تھی۔ جس کی اسکول جاتے ہوئے میں لنچ باکس اور پونیاں بناتی تھی جسے میں ادب و اخلاق کے درس پڑھاتی تھی۔ میں نے اسے ہمیشہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا تھا۔ ایک ماں کی طرح اسے پروٹیکٹ کرتی تھی۔

پھر میں اتنی سخت دل' منصور کیوں ہو گئی کہ میری اولاد' میرے اپنے جنے ہوئے میرے پیروں کی زنجیر نہ بن سکے۔ مجھے اپنی دو ڈھائی ماہ کی بچی پہ بھی ترس نہیں آیا' لوگ اولاد کے لیے ترستے ہیں' جھولیاں پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگتے ہیں اور میں بدبخت ان کی قدر نہ کر سکی' کبھی انہیں سینے سے نہیں لگایا' ان کے لیے ایک رات تک نہیں جاگی' کبھی فیڈر نہیں بنایا' روتے ہوئے چپ نہیں کروایا۔

میں غلطی پہ غلطی کرتے تمہیں بے خبر سمجھتی رہی' میرے نزدیک تم ایک بے وقوف سے زیادہ نہیں تھے جو اپنی انسلٹ کروا کے بھی میرے سامنے جھکتا تھا' تم بے وقوف نہیں' مجبور تھے۔ تمہاری مجبوری مجھ سے محبت تھی۔ جس کی میرے نزدیک ذرہ برابر بھی قدر نہیں تھی۔ تم دیتے جاتے اور میں اتراتی۔ تمہاری توجہ' محبت کو میں اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی اور فرض کبھی ادا نہیں کیا۔ میں نے تمہیں کیا دیا۔ بدزبانی' ذلت' نظر اندازی' دھتکار' رسوائی اور۔ اور بے وفائی' مجھے یہ اعتراف ہے کہ میں تمہارے قابل نہیں تھی' تمہارے کیا کسی بھی رشتے کے قابل نہیں تھی۔ میں

ایک بری بیٹی، بری بیوی اور بری ماں ہوں، مجھے محبت، چاہت، عزت کچھ بھی راس نہیں آیا۔ میں اپنے پیروں تلے جنت کی بھی لاج نہیں رکھ سکی۔ میں نے جو کچھ بھی کیا۔ اب اس کی سزا مل رہی ہے، میں نے اپنے ساتھ ساتھ تمہارا بھی بہت نقصان کیا ہے منصور تم مجھے معاف کردو۔"

اس نے منصور کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔

منصور کا اندر رو رہا تھا اس نے جو بھی کہا لفظ بہ لفظ سچ تھا اس نے اعتراف کرنے میں واقعی بہت دیر کردی تھی۔ اس عورت کے آنسو آج بھی منصور کو تکلیف دے رہے تھے۔ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی تھی۔ اس کے دل کی زمین بھی گیلی ہوتی جارہی تھی۔ جس سے اس نے چھ سال لمحہ لمحہ اپنی ہر سانس کے ساتھ محبت کی تھی۔ اسے سینت سینت کر رکھا تھا۔ اس کی عزت کا رکھوالا مضبوط محافظ بنا رہا تھا۔

وہ شروع میں ہی اپنے رشتے کی جانے والی اس کی بے ایمانیاں جان گیا تھا مگر اس نے بغیر ثبوت کے سطحی ذہنیت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ روایتی مردوں کی طرح مار پیٹ نہیں کی تھی۔ وہ واقعی بے وقوف تھا یا اس عورت کی محبت اسے کمزور کرکے بے وقوف بنا دیتی تھی۔ وہ اسے بے اعتنائی اور بے رخی کے باوجود محبت دینے پر مصر تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ایک دن اس کے دل کی دنیا بھی بدل ڈالے گا، وہ بھی اسے چاہنے لگے گی۔ مگر ماہم نے ثابت کردیا تھا کہ وہ مکمل طور پر غلط ہے۔

اور اب شاید غیر محسوس انداز میں وہ دوسری بار یہ غلطی کر رہا تھا، اس کا ثبوت اس کا رات گئے ماہم کے کمرے میں ہونا، اس کی روداد سن کر اپنے دل میں نرم گوشہ اور ہمدردی محسوس کرنا تھا۔

"مجھے معاف کردو منصور پلیز! میں تم لوگوں کی زندگیوں سے دور چلی جاؤں گی ہمیشہ کے لیے۔ میرا منحوس سایہ تم لوگوں کی ہنستی بستی زندگی کو خراب نہیں ہونے دوں گی۔ میں تمہیں اور شاہم کو دوسری بار کھونا نہیں چاہتی۔۔۔ مجھے معاف کردو۔"

وہ ہاتھ جوڑے آہ و بکا کر رہی تھی۔ منصور کے دل پر بوجھ بڑھتا جا رہا تھا، بے اختیار ہو کے اس نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو تھام لیا۔ نفی میں سر ہلاتے وہ اس کے گالوں پہ پھیلے آنسوؤں کو صاف کرنے لگا۔

زوردار آواز سے دروازہ کھول کر جذبات سے بھری شاہم اندر آئی۔ ماہم اچھل کر منصور سے دور ہوئی جبکہ منصور نے اسے دیکھ کر سر جھکا لیا، اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثرات نہیں ابھرے۔

وہ دعا کے رونے سے اٹھی تھی۔ منصور کو اپنے ساتھ اور واش روم میں بھی نہ پا کر ڈھونڈتی ہوئی باہر آئی۔ اس نے گھر کا کونا کونا چھان مارا۔ لان میں بھی اس کی تلاش کی وہ اسے کہیں نہ ملا، بالآخر اسے اوپر کے شک نے گھیرا، وہ اسی طرف آگئی۔ اندر سے آتی ماہم کی بوجھل آواز نے اس کا شک یقین میں بدل دیا۔

"رات کے اندھیرے میں، میری پیٹھ پیچھے یہ گل کھلاتے ہو تم دونوں۔ اس کی قربت کی اتنی ہی چاہ تھی تو دوسرا کیوں کیا تھا، اس کے پاس رہتیں یا اب پھر منہ کا ذائقہ بدلنے آگئی ہو۔"

اس کے الفاظ تھے کہ تیر، ماہم زرد چہرہ لیے آنکھیں پھاڑے اس کی زبان کے تیر سہہ رہی تھی۔

"اب سمجھ میں آیا منصور آپ اسے گھر سے نکالنے پر رضامند کیوں نہیں ہوتے، پچھلی یادیں تازہ کرتے ہیں، رنگ رلیاں مناتے ہیں، مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے۔"

منصور کا سر ابھی بھی جھکا تھا، وہ بالکل خاموش اسے سن رہا تھا۔

"نن۔۔۔ نہیں شاہم! ایسا کچھ نہیں۔"

"بکواس بند کرو۔ میری آنکھوں میں دھول جھونکتی ہو، میری آنکھوں دیکھے کو جھوٹ کہہ رہی ہو۔ اندھی ہوں میں یا تم ریہرسل کر رہی تھیں اس کے ساتھ۔"

ماہم کی بات کاٹ کر وہ زور سے بولی۔ اس کا چہرہ سرخ اور نتھنے پھول رہے تھے۔ اسی لمحے کا اسے ڈر تھا جو آگیا تھا، وہ ماہم کے آجانے سے منصور کی بٹتی ہوئی توجہ سے آگاہ تھی۔

"تم جیسی ناپاک، ذلیل، مردوں کو کھانے والی عورت شریف گھروں میں رہنے کے قابل ہی نہیں ہے۔ آپ سے تو میں بعد میں نمٹوں گی، تم اسی وقت نکلو یہاں سے۔" وہ اس کی طرف بڑھی اور اس کا بازو پکڑ لیا۔ منصور نے جھٹکے سے شاہم کا بازو پکڑ لیا۔

"میرا بازو چھوڑو منصور۔" وہ منصور کی طرف منہ کرکے پھنکاری۔

وہ چپ چاپ اٹھ کھڑا ہوا، باری باری دونوں کو دیکھا دوسرے ہاتھ میں ماہم کی کلائی پکڑی۔ ایک ہاتھ میں شاہم کا بازو تھا۔ دونوں کو الگ کردیا۔

"ماہم کہیں نہیں جائے گی یہیں رہے گی۔" اس کی آنکھوں میں غصہ اور لہجے میں سنجیدگی تھی۔

"یہ عورت یہاں نہیں رہے گی۔ میں تمہاری بیوی ہوں، میرا بھی حق ہے جبکہ میں اپنے سارے فرائض پورے کر رہی ہوں، میرا جی چاہے اسے اپنے گھر میں رکھوں یا دھکے دے کر باہر نکالوں، تم مجھے نہیں روک سکتے۔"

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے چبا چبا کر بولتی آپ سے تم پر آگئی تھی۔ ماہم اس کے لیے اول روز سے ناقابل برداشت تھی۔ وہ بہن ہونے کے ناتے بھی اسے ذرا سی بھی رعایت دینے پر راضی نہیں تھی۔

"تم بھول سکتے ہو میں نہیں۔ اس گھر کو بچانے کے لیے میں نے کتنی قربانی دی۔"

"قربانی، کیسی قربانی؟ کس نے مانگی تھی تم سے قربانی؟ میں نے ہاتھ جوڑے تھے، تمہارے پیروں میں گرا تھا کہ مجھ سے شادی کرلو، میرے بچوں کی ماں بن جاؤ؟ میں نے تمہیں خودکشی کی دھمکی دی تھی؟ میری غلطی ماہم نہیں، تم ہو، ماہم کے جانے کے بعد مجھے تمہیں دھکے دے کر اس گھر سے نکالنا چاہیے تھا، مجھے تمہارے کردار پر بھی شک کرنا چاہیے تھا مگر میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ تمہیں تحفظ دیا، مان دیا، تمہارا ہر طرح سے خیال رکھا اور تم نے مجھ پر ہی وار کردیا۔ میری نرمی کا غلط مطلب لے کر مجھے بلیک میل کیا، میرے بچوں کی برین واشنگ کرکے انہیں ٹریپ کیا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے ارسل سے ملواؤ، تم نے اپنی محبت کا جھانسہ دے رکھا تھا اگر تم نہیں ملاتیں، تم نے اپنی من مانی کی، میرے پاس چلی آئیں لیے ایموشنل ڈائیلاگز لے کر۔ اگر تم سچی تھیں تو جھوٹا میں بھی نہیں ہوں۔

میں کہوں گا کہ مجھے ذاتی طور پر نہ تب تمہاری ضرورت تھی نہ اب ہے۔ میں ایسی بے وفا عورت کی یادوں کے ساتھ پوری زندگی بتا سکتا تھا جس میں اگر تم نے خلل ڈالا، ہاں ہے مجھے اس کی قربت سے لگاؤ۔ تم خود پر پہرے بٹھاؤ۔ میں نہیں۔ تمہیں بھی تو اس سے محبت ہے، اس کی یاد میں روتی ہو آج تک، بار بار اپنے عمل کی وضاحت دیتی ہو، ہوں۔۔۔ قربانی۔۔۔ قربانی نہیں شاہم بی بی قتل، تم قاتل ہو اس شخص کے ارمانوں، اس کے خوابوں کی، اس کی زندگی کی۔ مانا کہ وہ ایک قدرتی حادثہ تھا مگر اس کا سبب تم تھیں۔ اگر یہ ناپاک، ذلیل، مردوں کو کھانے والی ہے تو تم بھی اسی کٹھگری کی ہو، کم نہیں ہو اس سے۔"

اس نے ماہم کی طرف اشارہ کرکے کہا تھا، شاہم صدمے سے چور اسے سن رہی تھی۔

وہ شاہم کے بارے میں بالکل اتنا غلط نہیں سوچتا تھا، وہ اس سے محبت نہیں، عزت کرتا تھا۔ شاہم نے زبردستی اس سے شادی کی، اس کے بدصورت رویے کو برداشت کرکے بھی اس کی ہر ذمہ داری نبھاتی رہی، بچوں کو سگی ماں سے بڑھ کر پیار دیا، اس کا گھر سنوارا، بنایا، ماہم کے آنے سے پہلے تک وہ اس کا مداح تھا، اسے سب کچھ بہت مکمل اور شاہم اپنے اس عمل میں درست لگتی تھی، اس کی سوچ نے رخ ماہم کو دیکھ کر بدلا تھا۔ وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ کاش میں شاہم کی زبردستی میں نہ آیا ہوتا۔

"یہ اسٹوپڈ بہانے مت گھڑو، اسٹریٹ فارورڈ کہو کہ اس پر نیت خراب ہوگئی ہے۔" کافی توقف کے بعد منصور کی گھٹیا سوچ کو حلق سے اتارتی وہ تمسخرانہ مسکراتی اس کے سامنے ڈٹ گئی۔

منصور نے پورے زور کا تھپڑ شاہم کے گال پہ مار دیا۔

وہ اس کی جرأت پہ گال پہ ہاتھ رکھے اسے دیکھتی رہ گئی۔ ماہم تب سے خاموش تماشائی بنی کھڑی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ چپ کروائے۔

"میں بکواس کررہی ہوں' تمہارے پاکیزہ کردار پہ الزام لگا رہی ہوں' تو ٹھیک ہے' اگر تم سچے ہو تو اسے ابھی اسی وقت خود اس گھر سے نکالو۔" اس نے منصور کو چیلنج کیا' جو اسے کسی صورت قبول نہیں تھا۔

"یہ... یہ تمہاری بہن ہے شاہم۔" وہ یکدم نرم پڑ گیا۔

"میری بہن اسی روز مر گئی تھی' جب اس نے میرے مرحوم باپ کی سالوں کی کمائی ہوئی عزت پر دنیا کو تھو تھو کرنے کا موقع دیا تھا۔ یہ بہن نہیں' ڈائن ہے' ڈائن بھی سات گھر چھوڑ کر وار کرتی ہے۔ میں تمہیں آخری دفعہ وارن کررہی ہوں منصور! اگر تم اس حرافہ' بازاری عورت کو گھر میں رکھو گے تو میں چلی جاؤں گی۔" وہ زور سے چلانے لگی تھی۔

"بکواس بند کرو۔" منصور نے غصے میں بپھرتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کر سختی سے جھنجوڑا۔

"تم ہم دونوں کا تماشا کیا دیکھ رہی ہو' چلی کیوں نہیں جاتیں' بے شرم عورت۔" اس نے منصور سے اپنا آپ چھڑوا کر ماہم کو زور کا دھکا دیا' وہ بیڈ پہ اوندھے منہ گری۔ اس کا سر بیڈ کی دراز سے ٹکرایا اور خون نکلنے لگا اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

"ماہم۔" اس کا خون دیکھ کر منصور تڑپا۔

"میں چلی جاؤں یا اسے باہر پھینکو گے۔" وہ گرتی ہوئی ماہم کو سنبھالنے لگا تھا کہ اس نے بازو سے کھینچ لیا۔

"ہاں' تم نکل جاؤ اس گھر سے' میری زندگی سے دور ہو جاؤ۔" وہ بے اختیار چلاتے ہوئے شاہم کو دھکے دینے لگا تھا۔ اس کے حواس بالکل کام کرنا چھوڑ چکے تھے۔

"ایسے نہیں جاؤں گی' ہمیشہ کے لیے لکھو طلاق دے دو مجھے۔" اس کے دھکوں سے کارپٹ پہ گری ہوئی شاہم روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

بہت غلط موقع پہ اس نے غلط الفاظ بول دیے تھے۔ اس کی کھوپڑی الٹی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن پہ اس وقت صرف ماہم کا بھوت سوار تھا۔ جسے شاہم نے زخمی کردیا تھا۔

"تمہارا یہ شوق بھی پورا کردیتا ہوں۔ آئی ڈائیورس یو۔"

شاہم کو لگا ساری دنیا تہس نہس ہو گئی ہے۔ اس کے گرد غبار اڑنے لگا تھا۔

ماہم نے بمشکل سر اٹھا کے دیکھا۔

"آئی ڈائیورس یو۔"

"نہیں منصور!" ماہم چلائی تھی۔ شاہم کارپٹ پر گری ساکت تھی۔

"آئی... ڈائیورس یو۔" وہ نہیں رکا تھا۔

"نہیں۔ نہیں۔" ماہم رونے لگی تھی۔

وہ دونوں اس کا رونا نہیں سن رہے تھے۔ ایک دوسرے کے چہرے پہ طوفان کے آثار کی کھوج لگا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

شہر خموشاں میں چار سو خاموشی کا راج تھا۔ کاشا کی میت ابھی ابھی دفن کی گئی تھی۔ اس کے جاننے والے غنی کے آفس کا سارا اسٹاف اور ملازمین اس کی نماز جنازہ میں شریک تھے۔ سب لوگ کھڑے دعائے مغفرت کررہے تھے۔ غنی دعا کے انداز میں ہاتھ اٹھائے بیٹھا ہوا تھا مگر دعا کے لیے اس کے لب نہیں ہل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ دعا کر کے سب نے چہروں پہ ہاتھ پھیرے اور باری باری غنی کے کندھے پر دلاسے کے انداز میں ہاتھ رکھ کر قبرستان سے باہر نکلنے لگے۔

"گھر چلیں صاحب۔"

سب لوگ جاچکے تو رحیم خان نے اسے یونہی بیٹھے دیکھ کر کہا۔

"تم جاؤ میں آجاؤں گا۔"

اس کی آواز بہت بھاری اور بوجھل تھی۔ وہ کاشا کو اتنی جلدی چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اسے کاشا کی آواز بہت دور سے آتی سنائی دی۔

"میں ٹین ایج میں ایک رائٹر کو پڑھا کرتا تھا۔ میرا موسٹ فیورٹ رائٹر تھا۔ بہت کچھ سیکھا میں نے اس سے' اسے پڑھ کر میرے اندر ایک چیز کا خوف ختم ہو گیا۔ موت کا خوف۔ ارنسٹ ہیمنگوے۔"

غنی کو اپنا کہا بھی یاد تھا۔

"آخر اس نے خودکشی کرلی تھی۔"

"ہاں وہ واقعی ایک بہادر آدمی تھا۔" کاشا کے لہجے میں اس کے لیے [illegible] ایک کے بعد ایک یاد تھی۔

"جس دن میں مروں گا' میرے جنازے کو کندھا دینے چار لوگ بھی نہیں ہوں گے۔"

غنی اس وقت سخت غصے میں تھا۔

"تم مر کے تو دکھاؤ۔" وہ دو بدو بولا۔

اور اس کی آخری فون کال میں کہی گئی بات۔

"چاہتا ہوں کہ پاکستان میں کوئی تو میرا منتظر ہو' میرا جنازہ اجنبیوں کے کندھوں پہ نہ اٹھے۔"

"میں ماں سے مل لوں' تھوڑی طبیعت بہتر ہو جائے تو تیرے پاس آجاؤں گا' میں بھی کب اس پردیس میں رہنا چاہتا ہوں۔"

غنی قبر کی گیلی مٹی پہ ہاتھ پھیر کر زار و قطار رونے لگا تھا۔ گلاب کے پھولوں کی خوشبو اور اگربتیوں کی مہک ماحول کو بہت سوگوار کررہی تھی۔ اسے کاشا کا سب کہا یاد تھا۔

"تو نے پکا والا پرامس کیا تھا جگر' تو تو کبھی مجھ سے وعدہ کر کے نہیں توڑتا تھا' روز محشر میں تم سے ضرور پوچھوں گا' تو ہنس کے مجھے گلے لگائے گا' میں نہیں لگوں گا' میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ تھا تو کاشا' تو نے میرا کتنا بڑا نقصان کردیا' اس نقصان کو کون پورا کرے گا؟ اب مجھے فلسفہ کون سنائے گا' میں نصیحتیں' روک ٹوک کسے لگاؤں گا؟ اتنی بڑی بے ایمانی' میں رو رہا ہوں کاشا' تیرا جگر رو رہا ہے' چپ نہیں کروائے گا' پلیز کاشا ایسا مت کرو۔"

کتبے پہ لکھی عبارت اس کے آنسوؤں نے دھندلا دی۔ وہ آستین سے اپنے آنسو رگڑنے لگا۔ آوازیں دینے سے کوئی بھی واپس آنے والا نہیں تھا۔

کاشا نے ہر کام ہمیشہ اس کی توقع کے برعکس کیا تھا۔ وہ اپنی ملاقات کے اول روز سے لے کر آخر تک اسے چونکاتا آیا تھا۔ لیلیٰ نے غنی کو آخری رات کی اس کی اپنی ماں کے متعلق کی جانے والی گفتگو بتائی تھی۔ جس سے غنی جان گیا تھا کہ یقیناً اس کی ماں کا رویہ اس کے ساتھ درست نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اتنا غلط قدم اٹھالیا۔

☼ ☼ ☼

وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے گھومتا رہتا ہے' یہ کسی کے لیے رکتا نہیں ہے۔ وقت کی بہت بری فطرت ہے کہ یہ خود سے پیچھے رہ جانے والوں کا تھوڑی دیر بھی رک کر انتظار نہیں کرتا' نہ ہی خود سے آگے بھاگنے والوں کو پکارتا ہے۔ موسم' رتیں' چہرے' فطرتیں سب بدلتی رہتی ہیں' مگر دکھ... یہ جو دکھ ہوتے ہیں' یہیں رکے رہتے ہیں۔ ان کی تکلیف کم ضرور ہو جاتی ہے ختم کبھی نہیں ہوتی۔ وقت اپنے ساتھ بیس سال لے کر گزر گیا۔ اس بیس برس میں کیا کچھ بدل گیا۔ کس کے نصیب میں کیا آیا...

شاہم اس رات منصور سے طلاق لے کر گھر چھوڑ گئی پھر کبھی نہ لوٹی۔ منصور نے اپنا دبئی میں کاروبار سیٹ کرلیا تھا۔ ماہم اپنے بچوں کے ساتھ یہاں رہتی رہی۔ منصور اور اس کے درمیان — بیس برس بیتے مگر ماہم نے منصور کے چہرے پہ کبھی شگفتگی' سکون یا اسے قہقہہ لگاتے نہ دیکھا۔ اسے پہلے والا منصور ڈھونڈنے سے بھی نہ ملا۔

غنی نے کاشا کی موت کے بعد اپنے آفس کی ایک مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی سے شادی کرلی۔ جس گھر میں وہ رہتا تھا' وہ کاشا کے سوتیلے باپ کا تھا۔ اس میں ان دونوں کی بے شمار یادیں تھیں۔ اس کا دل اسے

چھوڑنے کو نہیں مانتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ کاشا زندہ ہے اسی گھر میں اس کے آس پاس۔ اس نے اس کے سوتیلے باپ سے وہ گھر خرید لیا اور ساری زندگی وہیں رہا۔ کاشا کے اس کے بزنس میں شیئرز تھے جن کا ریٹ کروڑوں کا ہو چکا تھا۔ اس نے ان پیسوں کا کاشا کے نام پہ صدقہ جاریہ کے طور پر "کاشا ٹرسٹ" قائم کیا جس میں لاوارث یتیم بچے پلتے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ دبے قدموں چلتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔ رات تین بجے کا وقت تھا۔ سب گھر والے سو رہے تھے۔ لاؤنج میں بھی ہلکی روشنی تھی۔ وہ دبے دبے قدم اٹھاتا کچن میں آگیا۔

لائٹ جلا کر اس نے شکر ادا کیا کہ یہاں تک تو پہنچا۔ فریج میں سے پانی کی بوتل نکال کر اس نے منہ سے لگالی۔

"کہاں سے آرہے ہو کاشا؟"

پانی کی بوتل منہ سے لگائے وہ غٹاغٹ پانی پی رہا تھا۔ ترچھی نگاہیں کرکے اس نے غنی کو دیکھا اور اپنے پیچھے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر اسی انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ بوتل اس نے منہ سے ہٹانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ غنی اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتا جا رہا تھا۔

"میں اپنے فرینڈ کی طرف کمبائن اسٹڈی کے لیے گیا تھا۔ بیس دن بعد فائنل ایگزام اسٹارٹ ہو جائیں گے۔"

وہ غنی کا اٹھارہ سالہ بڑا بیٹا تھا، جس کا نام کاشف عبدالغنی عرف کاشا تھا۔

"آر یو شیور، وہیں سے آرہے ہو؟" غنی مشکوک تھا۔

"پاپا! کاشا نے کبھی جھوٹ بولا ہے اور... اور غنی سے تو کبھی بھی نہیں۔"

اس نے شرارت سے باپ کا نام لیا۔ وہ اپنے باپ سے کاشا کے متعلق بہت سن چکا تھا۔ اس کی بہت سی تصویریں بھی دیکھی تھیں۔

"اچھا چلو، اب جاکر سو جاؤ۔ پھر پڑھنے مت بیٹھ جانا۔" اس نے فخر سے بیٹے کا شانہ تھپتھپایا۔

"جی پاپا! آپ بھی اپنے کمرے میں جائیں میں بس تہجد کی نماز پڑھ کے سو جاؤں گا۔" وہ دونوں چلتے ہوئے باہر آگئے۔

غنی نے اس کاشا کی تربیت میں بہت احتیاط کی تھی۔ اسے بھرپور پیار اور شفقت سے پالا تھا کیونکہ وہ دوسری بار کاشا کو کھونے کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

لکڑی کے بوسیدہ، مٹی سے اٹے ہوئے دروازے کے سامنے سفید رنگ کی گاڑی آکر رکی۔

اس میں سے تقریباً پچاس سالہ عورت جو اپنی عمر سے دس سال کم ہی دکھتی تھی باہر نکلی۔ اس نے ہلکے رنگ کی خوبصورت ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ اس کی شخصیت میں ایک وقار تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ وہ شخص بیٹھا تھا جو کبھی اس کا شوہر تھا آج کل وہ پاکستان آیا ہوا تھا اس کی کنپٹیوں پہ کچھ بال سفید تھے۔ چشمہ پہنے ہوئے اس مرد کے چہرے پہ خاصی سنجیدگی تھی۔ وہ عورت اس کچے گھر کے [illegible]

اس گھر کی واحد مکین کی حالت [illegible] اور شکست خوردہ سی [illegible] اس کی آنکھوں میں ویرانی اور وحشت کا ڈیرا تھا۔ اس کے بال کھچڑی نما تھے پرانے گھسے سے کپڑے، ہاتھوں کی ابھری ہوئی نسیں، بڑی سی چادر اوڑھے وہ شاید کہیں باہر جانے لگی تھی۔ اس عورت کو آتا دیکھ کر چھوٹے سے صحن میں پڑے واحد تخت پہ بیٹھ گئی۔ وہ عورت سر جھکائے اس کے برابر جا بیٹھی۔

"انیس سال ہو گئے مجھے تمہارے پاس آتے ہوئے۔" وہ بہت دھیما بول رہی تھی۔

"مزید انیس سال بھی آؤ، تب بھی کوئی فائدہ نہیں۔" اس کی آواز بھی بہت پست تھی۔

"مجھے کہیں سکون نہیں ہے۔ راتوں کو میری نیند ٹوٹ جاتی ہے، ایک وسوسہ، ایک بے چینی سی مجھے گھیرے رکھتی ہے۔ اب تو دعا بھی بڑی ہو گئی ہے مجھے ایک ماں ہونے کے ناتے اس کے نصیب سے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے معاف کرو شاہم! میں تمہاری گنہگار ہوں، میں نے تمہیں اس حالت تک پہنچا دیا، مجھے معاف کر دو اور میرے ساتھ گھر چلو، پلیز شاہم!" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

وہ ماہم تھی۔ شاہم نے اس رات گھر سے نکل کر کہاں کہاں دھکے کھائے وہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اس کا آخری ٹھکانہ یہ قبرستان تھا وہ قبرستان جہاں ارسل دفن تھا۔ ان قبروں کے رکھوالے ایک بوڑھے شخص نے اسے اپنے مکان میں پناہ دی تھی۔ وہ اس کے ساتھ [illegible] گئی۔

"تم یہاں کیسے گزارہ کرتی ہو، کیا حالت بن گئی ہے تمہاری، کیسی [illegible] بس! میرے ساتھ چلو۔" وہ یونہی ہر بار اس کی منت سماجت کیا کرتی تھی۔

"تم میری فکر نہ کرو، اس مالک نے رزق کا وعدہ کیا ہے، کھا رہی سوتی ہوں، رہنے کو چھت بھی ہے، تمہارے ساتھ جا کر کیا کروں گی۔" اس کا ہمیشہ والا جواب تھا۔

"شاہم! اتنے برس تو میں خدا سے معافی مانگتی تو وہ بھی مجھے معاف کر دیتا اور تم... تم مجھے معاف نہیں کرتیں۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا نہیں کرتیں۔" وہ رونے لگی تھی۔

"میں کتنی بار کہہ چکی ہوں۔ جب وہ مجھے معاف کرے گا میں تمہیں معاف کروں گی، وہ مجھے معاف نہیں کرتا تو میں تمہیں کیسے معاف کروں۔ جاؤ، چلی جاؤ یہاں سے، یہاں مت آیا کرو، کیوں ستاتی ہو مجھے، چلی جاؤ یہاں سے، پھر کبھی نہ آنا۔"

شاہم اسے پرے جھٹکنے لگی تھی۔ وہ ہمیشہ ماہم کو یونہی منع کرتی وہ چلی جاتی، پھر کچھ عرصہ بعد اس سے معافی مانگنے چلی آتی۔ منصور بھی اس کے سامنے اندر نہیں آیا تھا۔ شاہم اسے معاف نہیں کرتی تھی۔ وہ روتی دھوتی واپس چلی جاتی۔ ابھی بھی وہ آنسو پونچھتی اٹھ گئی۔

اس کی گاڑی کے جانے کی آواز سن کر وہ تخت سے اٹھی۔ دیوار کے قریب پڑا پیتل کا جگ اٹھایا اور چادر درست کرتی وہ باہر آگئی۔ دروازہ بھیڑ کر وہ قبرستان کی دیوار کے ساتھ نڈھال سی چلنے لگی۔

"تم تو مجھ سے، اپنی شاہی سے کبھی ناراض نہیں ہوئے تھے، اب کیوں ہو، تم نے میرے لیے دنیا چھوڑی، میں نے بھی تو سب کچھ چھوڑ دیا، تمہارے پاس ہی رہتی ہوں، تم مجھے معاف کر دو ارسل! اتنی معافی میں خدا سے مانگتی تو وہ بھی مجھے معاف کر دیتا مگر مجھے خدا ابھی معاف نہیں کرے گا جب تک تم معاف نہیں کرو گے۔ میرے اندر جو بے چینی، بے سکونی ہے یہ تب ختم ہو گی جب تم معاف کرو گے ورنہ میں یونہی بھٹکتی پھروں گی۔ میری سزا کم کر دو ارسل! میری سزا ختم کر دو ارسل۔"

وہ گیلی مٹی پہ ہاتھ پھیرتی جاتی اور روتی جاتی تھی۔ اسے ارسل کے آخری الفاظ بہت ستاتے تھے۔

اسے لگتا تھا جس رات وہ ارسل کو خواب میں دیکھے گی۔ اس سے ملے گی، وہ اسے معاف کر دے گا۔ اس نے اتنے برسوں میں اسے کبھی خواب میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ رو رہی تھی اور اس کے کتبے پہ لکھا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ (کرم وجہہ اللہ) کا فرمان دھندلا رہا تھا۔

"میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے رب کو پہچانا۔"



سائرہ عارف

میری صبح کا ستارہ

غریب گھرانے میں پیدا ہونے والی سارا کو اپنی خوب صورتی پر بہت غرور ہے۔ بچپن کا منگیتر باوجود خوب صورت ہونے کے محض غریب ہونے کی بنا پر ٹھکرا دیا۔ اگرچہ نواز اکرم کا پورا خاندان اور وہ خود معمولی شکل کے تھے۔ لیکن سارا نے پورے خاندان سے ٹکر لے کر ان سے شادی کر لی۔ لیکن کبھی نواز اکرم کو وہ مقام نہ دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ انہیں اپنی بڑی بیٹی ماہین سے صرف اس لیے نفرت ہے کہ وہ شکل و صورت میں ددھیال پر پڑی ہے، جبکہ چھوٹی بیٹی میرب بالکل ان کا پرتو ہے۔ سارا علوی اور میرب ہر وقت ماہین کو اس کی کم صورتی کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ جس سے ماہین اپنے رنگ کے معاملے میں حساس ہو گئی ہے۔ دونوں بہنوں میں بالکل نہیں بنتی۔ اس کی واحد دوست رفعت اسے نت نئی رنگ گورا کرنے والی کریمیں لا کر دیتی ہے اور پیسہ بٹورتی ہے۔ گھر میں وہ نواز اکرم کے قریب ہے، لیکن ہر وقت کی تنقید اور رشتوں سے انکار نے اسے نفسیاتی طور پر تنہا کر ڈالا ہے۔ نواز اکرم کی بہن ثروت بھی اس سے محبت کرتی ہے، لیکن سارا علوی کے ناروا سلوک کے باعث بھائی کے گھر آنے سے کتراتی ہے۔

میرب کے لیے نواز اکرم کے دوست رضا اپنے بیٹے کا رشتہ دیتے ہیں تو میرب اسے ٹھکرا دیتی ہے۔ سارا۔ کا ایک طور پر کمزور بھائی شہزاد ہے۔ جس کی ذمہ داری ماں نے مرتے وقت سارا کے سپرد کی تھی۔ اسے آوارہ گردی کا اور شعر و شاعری کا شوق ہے۔ ماموں شہزاد کو ماہین سے خاصی انسیت ہے، جو دیگر لوگوں کی طرح انہیں ڈانٹنے کے بجائے ان کا خیال رکھتی ہے۔

ناولٹ



فاخرہ کی اپنے شوہر ریاض کے انتقال کے بعد دنیا اندھیر ہو گئی۔ اسے چند ماہ تک اپنے بیٹے کاشف کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ نیکے والے اس موقع پر اسے تنہا چھوڑ دیتے ہیں اجبر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ریاض کے بچپن کا دوست اقبال کاشف کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے متاثر کر لیتا ہے۔ حالات کی سنگینی کا احساس فاخرہ کو اس وقت ہوتا ہے جب کاشف ماں کو اقبال سے شادی کا مشورہ دیتا ہے۔ فاخرہ اسے احساس دلاتی ہے کہ وہ اقبال سے دور رہے، لیکن کاشف اقبال انکل کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں۔ بیٹے کو مجبور کرنے پر وہ اقبال سے عقد ثانی کر لیتی ہے۔

شادی کے فوراً بعد اقبال اچھائی کا لبادہ اتار پھینکتا ہے اور ماں بیٹے کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔ گھر کا پیسہ فاخرہ کی اسکول کی نوکری پر ہی چلتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ کاشف کو اپنا گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ وہ نواز اکرم کے یہاں بطور اکاؤنٹ کلرک کام کرتا ہے اور کبھی کبھار ہی ماں سے ملتا ہے اور ہر وقت فاخرہ کو علیحدگی کا مشورہ دیتا ہے۔ اس عمر میں بدنامی کا خوف انہیں ایسے فیصلے سے روکے ہوئے ہے۔ فاخرہ کے لیے اقبال کی غیر اخلاقی سرگرمیاں ناقابل برداشت ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)

۶
چھٹی قسط

"ایک بار، دو، تین، وہ مسلسل کاشف کا نمبر ملا رہی تھی مگر ہر بار اس کا نمبر بزی مل رہا تھا۔

"کیا مصیبت ہے۔ کیا ہو گیا ہے۔ کیوں میرا فون اٹینڈ نہیں کر رہا۔ کہیں وہ... وہ مجھے چھوڑ تو نہیں گیا۔"

ماہین کا دل ڈوب سا گیا تھا۔ یہ تصور ہی روح فرسا تھا کہ کاشی اسے چھوڑنے کا سوچے گا۔

"مگر نہیں وہ مجھے نہیں چھوڑ سکتا۔ اسے یقیناً کوئی کام ہو گا۔ وہ مصروف ہو گا۔"

دوسرے ہی پل وہ خود کو تسلی دیتی تھی۔ شام تک اس کے دل میں پنکھے لگے رہے تھے۔ کبھی خود کو سمجھانے بیٹھ جاتی تھی تو کبھی گھبرا کر پورے گھر میں چکر لگاتی اندر کی بے چینی کم کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ کاشف کے معاملے میں وہ بہت حساس ہو گئی تھی۔ اتنے عرصے بعد کسی کو پانے کے بعد اسے کھونے کا تصور بھی محال تھا۔

گھر بھر میں میرب کی شادی کی تیاریاں عروج پر پہنچی ہوئی تھیں۔ میرب اور ماما دونوں ہی روزانہ بازاروں کے چکر لگا رہی تھیں۔ اس لیے گھر میں کچھ سکون تھا۔ ورنہ ان دونوں کی ایک آدھ جھڑپ تو روزانہ ہی ہو جاتی تھی مگر آج تو نہ میرب سے منہ ماری ہوئی تھی اور نہ ہی ماما سے ڈانٹ پڑی تھی پھر بھی کاشف کی وجہ سے اس کا پورا دن بہت برا گزرا تھا۔ اتنی محبت اور مان دینے کے بعد اس کی یہ لاتعلقی اور ناراضی کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔ جبکہ لڑائی جھگڑے والی کوئی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔

"آ جائے وہ ایک بار میرے پاس۔ پھر پوچھوں گی۔ صاف صاف بتا دوں گی کہ اب کبھی مجھ سے یوں ناراض ہو کر بغیر وجہ مجھے چھوڑ کر مت جانا۔ میرا تو دل بند ہو جائے گا۔ لگتا ہے کاشف کے بغیر رہنا اب ناممکن ہو گیا ہے اور وہ ہے کہ ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے۔ کبھی ماں بیمار تو کبھی باپ خراب۔ میرب کی شادی مجھ سے پہلے ہو رہی ہے۔ حالانکہ میری پہلے ہونی چاہیے تھی مگر کاشف کی ٹال مٹول نے کام خراب کر دیا ہے۔"

اس نے بے بسی سے گہرا سانس لیا۔

"باجی! آپ کو بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔" کچھ ہی دیر بعد خالد نے اندر آ کر پیغام دیا تھا۔ وہ چونکی۔

"اٹھو بھئی ماہی بیگم جا کر سن لو کوئی نیا حکم یا ڈانٹ۔"

وہ منہ بسورتی اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آ گئی۔ جہاں ماما اکیلی ہی بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھ کر ایک تیز نگاہ

اس پر ڈالی۔

"تم ابھی سے اپنے کمرے میں بند ہو۔ خیریت؟" وہ سمجھتی تھی ماما لاعلم ہیں جبکہ وہ اتنی لاعلم ہرگز نہیں تھیں۔

"جی ماما! خیریت ہے کوئی کام نہیں تھا کرنے کو اس لیے۔"

"شادی والا گھر ہے اور تم کہہ رہی ہو کوئی کام نہیں کرنے کو واہ! تمہاری وہ سلیقہ شعاری اور ... کس دن کام آئے گا۔ بہن کے جوڑوں کو پیک کر دو اور اس کی چیزیں ترتیب سے لگوا دو۔ یہی تو بہنوں کے کرنے کے کام ہوتے ہیں۔"

"جی۔" وہ بے ساختہ مسکرائی۔ ماما کو بھی یاد آ گیا تھا کہ وہ میرب کی بہن ہے۔

"جاؤ میرب بے چاری اکیلی کپڑوں کے ساتھ الجھ رہی ہے۔ اس سے تو کبھی بھی سیٹ نہیں ہو سکیں گے۔"

ماما کے لہجے میں میرب کے لیے جتنی ہمدردی تھی۔ ماہین کے اندر احساس کمتری اتنا ہی بڑھتا تھا۔ وہ بہت بجھا دل لیے ہوئے میرب کے کمرے میں آ گئی۔ جہاں بے حد خوب صورت اور قیمتی کپڑوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا اور میرب سخت بے زار کن تاثرات چہرے پر سجائے انہیں اٹھا پٹخ کر رہی تھی۔

"لاؤ مجھے دو۔ تم سے یہ ترتیب نہیں لگے گی۔"

اس نے ہینگر اور سوٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"ہاں واقعی مجھ سے نہیں ہوتا یہ کام۔ پکڑو۔" وہ پہلے سے ہی بے زار اور تنگ آئی ہوئی تھی۔ ہینگر اٹھا کر اس نے بیڈ پر پھینکا اور خود مزے سے کرسی پر جا بیٹھی تھی۔ ماہین نے سارے کپڑوں کو دوبارہ نکالا اور انہیں ترتیب اور توازن کے ساتھ پیک کرنے لگی۔

"ہیلو اوہ آیان! کیسے ہو یار۔ میں تمہیں تو۔۔۔" کچھ ہی دیر بعد وہ آیان واسطی کے ساتھ فون پر باتیں کرنے لگی تھی۔ اس نے پلٹ کر میرب کو دیکھا۔ وہ کتنی خوش لگ رہی تھی۔ فخر، غرور اور چاہے جانے کا احساس اس کے چہرے پر نمایاں تھا اور اس کے چہرے پر کیسی انوکھی جگمگاہٹ دکھا رہا تھا۔ اسے بے ساختہ میرب پر رشک آیا اور وہ خود... سامنے لگے قد آدم آئینے میں اسے اپنا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ سیاہ رنگت جس میں مایوسی اور بے بسی یوں گھلی ہوئی تھی جیسے اندھیری شام میں اندھیرا اور اجالا۔ میلا ملگجا اجالا۔ جسے اجالا تو نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ہاں اندھیرے میں اجالے کی ہلکی سی رمق، جو جھلک دکھلا کر غائب ہو جائے اور آج صبح سے جو کاشف کی بے اعتنائی اور سرد رویہ دیکھا تھا تو چہرہ مزید مرجھا گیا تھا۔ اس نے اداسی سے جگمگ جگمگ کرتے خوب صورت کپڑوں کو دیکھا۔ دل یک دم ہی اس کام سے اچاٹ ہو گیا تھا مگر وہ یوں ادھورا کام چھوڑ کر میرب کی طرح نہیں جا سکتی تھی۔ اسی لیے اپنا کام تیزی سے مکمل کرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

"میڈم آپ سے کوئی صاحب ملنے آئے ہیں۔"

ثروت آفس میں بیٹھی بچوں کا ریکارڈ چیک کر رہی تھی۔ جب پیون نے آ کر اسے اطلاع دی۔

"کون ہیں! کسی بچے کے پیرنٹس!"

"نہیں میڈم، کوئی احمد صاحب ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"احمد۔۔۔!" اس نے زیر لب دہرا کر ذہن پر زور دیا۔ "احمد۔۔۔"

"بلاؤ۔۔۔" اسے بالکل بھی اپنے ملنے جلنے والوں میں کوئی احمد نامی شخص یاد نہیں آ رہا تھا۔ بچوں کی ریکارڈ فائلز اس نے ایک طرف کیں۔

"میڈم! میں اندر آ سکتا ہوں۔" اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ نوجوان سر اندر کیے پوچھ رہا تھا۔ ثروت حیرانی سے مسکرائی۔ دبلا پتلا، لمبا قد، چھریرا بدن، سیاہ سیدھے بال، بھری سیاہ آنکھیں، سانولا رنگ، کھڑے کھڑے نقوش۔ اسے لگا اس نے یہ چہرہ پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ مگر کہاں۔

"میں۔" چند لمحوں کے توقف سے وہ سامنے والی

سیٹ پر بیٹھ رہا تھا۔

"احمد ابراہیم' پروفیسر ابراہیم کا بیٹا ہوں میں۔" اس نے اپنا تفصیلی تعارف کروایا۔ تو وہ بے ساختہ چونکی۔

"پروفیسر ابراہیم۔ آئی سی! جبھی تمہیں دیکھ کر مجھے لگا جیسے میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے' تمہاری شکل پروفیسر صاحب سے بہت ملتی ہے' کیسے ہیں سر؟"

"جی بالکل ٹھیک ہیں۔ میرا ٹرانسفر یہیں گورنمنٹ کالج میں ہو گیا ہے۔"

"اچھا اچھا تو آپ بھی اپنے والد کی طرح قوم کے نوجوانوں کو علم کی روشنی سے فیض یاب کرتے ہیں۔"

"جی بس ایک کوشش ہے۔ اب کون فیض یاب ہوتا ہے اور کون بے فیض' یہ تو دیکھنے رب ہے نا۔"

"بالکل۔ پروفیسر صاحب آپ کے والد بہت ہی اچھے استاد تھے۔ آج بھی ان کے شاگرد انہیں یاد کرتے ہیں۔"

"صرف شاگرد ہی نہیں۔ وہ بھی اپنے کچھ شاگردوں کو بہت یاد کرتے ہیں۔" احمد کی بات پر وہ بے ساختہ چونکی۔

"بابا جان نے مجھے بتایا تھا کہ آپ بہت ہی ذہین اور آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ تھیں۔ ابھی میری ٹرانسفر کا جب انہیں پتا چلا تو کہنے لگے تم ثروت سے ضرور ملنا اور اسے میرا سلام کہنا۔" احمد نے بتایا تو بے اختیار ثروت کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

"تو کیا اب بھی پروفیسر ابراہیم۔"

"آپ یہاں کی انچارج ہیں؟" احمد کی بات پر وہ چونکی' سنبھل کر اسے دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ انچارج' پرنسپل' منیجر سب ہی کچھ ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"بہت عظیم کام کر رہی ہیں آپ۔ معذور بچوں کو پڑھانا' انہیں سنبھالنا ان کی کیئر کرنا بہت ٹف کام ہے یہ۔"

"نہیں' مجھے ٹف نہیں لگتا۔ شاید اپنی اپنی دلچسپی کی بات ہے۔ اپنی بتاؤ' یہاں کہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔"

"ابھی تو کالج ہاسٹل میں ایک دوست کے ساتھ روم شیئر کر رہا ہوں۔ جونہی کوئی مناسب رہائش ملی شفٹ ہو جاؤں گا۔"

"مناسب رہائش؟ اگر تم مناسب سمجھو تو میرا گھر بھی مناسب رہائش کے قابل ہے۔" ثروت کی بات پر وہ چونکا تھا۔

"آپ کا؟ نہیں' مگر میں۔۔۔ یہ مناسب نہیں لگتا۔" اس کے انکار میں اقرار کی رضا مندی بھی شامل تھی۔ ثروت بے ساختہ مسکرائی۔ اس کی آمد کا مقصد تو وہ سمجھ ہی گئی تھی۔

"جب تک کوئی مناسب رہائش نہیں مل جاتی بیٹا! تب تک تم میرے گھر رہ سکتے ہو بلکہ اپنا سامان لے کر آج ہی شفٹ ہو جاؤ۔"

"جی تھینک یو ویری مچ۔ وہ میں ایک دو دن میں اپنا سامان لینے گھر جاؤں گا تو پھر آپ کی طرف شفٹ کر لوں گا۔"

"ضرور' ابھی کیا لو گے چائے' کافی یا۔۔۔"

"کچھ بھی نہیں میڈم۔۔۔ میں کھانا کھا کر آیا ہوں' بس آپ سے ملنا تھا۔ میں چلتا ہوں۔"

"بیٹھو بھی۔"

"آپ کے پاس شفٹ ہو کر آپ کے اس اسکول کا وزٹ بھی کروں گا اور اسکول کے لیے اپنی خدمات بھی پیش کروں گا۔ اس نیک کام میں اگر میرا بھی تھوڑا بہت حصہ شامل ہو جائے تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"جزاک اللہ ضرور بیٹا۔" اسے احمد کی بات سے دلی خوشی ہوئی تھی۔ اسکول کے لیے جو بھی اپنی خدمات کسی بھی طرح سے پیش کرتا تھا اسے دلی خوشی ہوتی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اسے رخصت کیا۔

"پروفیسر ابراہیم۔" دل کی دہلیز پر گونجتی اس نام کی صدا سے عجیب طرح بے چین ہوئی تھی۔

پل بھر میں وہ بائیس سال کا سفر طے کر کے لاہور یونیورسٹی کے سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے برآمدے میں

جا کھڑی ہوئی تھی۔ جہاں فائنل ایئر کی الوداعی پارٹی کے بعد سب ہی لڑکے لڑکیاں اپنے پروفیسروں سے آٹوگراف لے رہے تھے۔

"سر آٹوگراف۔" اس نے ہلکے نیلے رنگ کی سرخ حاشیے والی ڈائری' جس کے داہنے کونے میں سنہری رنگ کی کلی بنی ہوئی تھی۔ سرخ پین کے ساتھ لیے بلکہ ڈیپارٹمنٹ کے تمام اسٹوڈنٹس کے پسندیدہ پروفیسر ابراہیم کی جانب بڑھائی تھی' جو بے حد لائق' ذہین اور سمجھ دار تھے۔

"آٹوگراف!" انہوں نے ڈائری اور پین تھام لیا تھا۔ "کیا لکھوں؟" ان کے سوال پر ثروت نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"سر! کچھ بھی لکھ دیں جو آپ کو پسند ہو۔" اس کی بات کے جواب میں سر ابراہیم نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بغور اسے دیکھا تھا۔ پھر ڈائری پر کچھ لکھا۔ پین اسی کے اندر رکھا اور اس کی جانب بڑھا دی۔

"مجھے آپ کا جواب چاہیے۔" انہوں نے ہولے سے سرگوشی کی تھی اور پھر سامنے سے آتے اسٹوڈنٹس کے ٹولے کی جانب بڑھ گئے تھے۔ اس نے وہ صفحہ نکالا۔

"مجھے آپ پسند ہیں۔ میں رشتہ لے کر آپ کے گھر آنا چاہتا ہوں۔ پلیز جواب ضرور دینا۔ میرا فون نمبر یہ ہے۔" پل بھر کو اس کی دھڑکن بالکل ہی معدوم ہو گئی تھی۔

"سر نے یہ کیا لکھ دیا ہے۔" وہ سال پارسائی سے زندگی گزارنے والے سراب عمر کے اس دور میں یوں عشق فرما رہے تھے۔

"میں کیا جواب دوں گی۔" اسے ایک نئی فکر نے آ گھیرا تھا اگرچہ پروفیسر ابراہیم ایک ذہین' سمجھ دار' بے حد ڈیسنٹ اور پاپولر انسان تھے۔ بے حد اچھے استاد مگر وہ ان کی برادری سے نہیں تھے اور ثروت کے ابا جان ذات برادری اور ذات پات اور خاندان کے سخت قائل تھے۔ وہ ایک عجیب سی الجھن میں آ پھنسی تھی۔ آٹوگراف بک میں موجود وہ چند لائنیں اس کی زندگی کو ایک عجیب سا اضطراب بھرا موڑ دے گئی تھیں۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ انہیں کیا جواب دے اور خود سے اپنی اماں جی سے یہ بات کہنے کا اس میں حوصلہ نہ تھا۔ ایگزام بھی قریب تھے۔ پڑھنے بیٹھتی تو پروفیسر ابراہیم کا خیال جیسے مجسم ہو کر نظروں کے سامنے آ جاتا تھا اور باوجود اپنا پورا دھیان پڑھائی کی طرف لگانے کے وہ ذہنی رو بھٹک جانے کی وجہ سے ڈسٹرب ہو جاتی تھی۔ اسے لگتا وہ شاید پاس بھی نہ ہو سکے گی اور پوزیشن لینا تو بہت ہی دور کی بات ہو گی ان حالات میں اسی لیے وہ اتنی پریشان تھی۔

اور پھر ان ہی دنوں' جب وہ اتنی پریشان تھی تو پروفیسر ابراہیم کا فون آ گیا۔

"میں آپ کے جواب کا انتظار کر رہا تھا مگر آپ نے جواب ہی نہیں دیا۔" انہوں نے چھوٹتے ہی گلہ کیا۔

"سوری سر! مگر میں کیا جواب دیتی۔ ہمارا گھریلو ماحول ایسا نہیں ہے کہ میں خود سے کوئی فیصلہ کر سکوں۔ میرے پیرنٹس میرے لیے جو بھی فیصلہ کریں گے وہ مجھے قبول ہو گا۔"

"تو اس کا مطلب ہے' مجھے آپ کے پیرنٹس کے پاس اپروچ کرنا چاہیے۔" انہوں نے جواب میں کہا تھا۔ ثروت نے بے اختیار ہاں کی۔

"آپ میرا ساتھ دیں گی؟" انہوں نے کس آس سے پوچھا تھا کہ ثروت کا دل بے اختیار ڈول گیا۔

"سر! میں پڑھی لکھی باشعور' آزاد خیال لڑکی ضرور ہوں مگر ابھی بھی میں اپنی زندگی کا فیصلہ اپنے والدین کی پسند اور مرضی سے کروں گی اور ان کا جو بھی فیصلہ ہو گا' مجھے قبول ہو گا۔" اس نے دو ٹوک انداز میں صاف صاف انہیں کہہ دیا تھا۔

"میرا مطلب تھا کہ آپ مجھے۔" وہ ہچکچائے۔ "اگر آپ کے والدین میرا رشتہ قبول کر لیتے ہیں تو آپ کو

خوشی ہوگی، اگر میرے ساتھ زندگی بھر چلنے میں۔" انہوں نے ہچکچاتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔ ثروت کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ ہاتھ پاؤں جیسے سُن ہو گئے تھے۔ اس جیسی لڑکی کے لیے کسی مرد نے زندگی میں پہلی بار یہ الفاظ کہے تھے۔

"سر میں۔۔۔ سر مجھ جیسی لڑکی میں ایسا کیا ہے کہ آپ۔۔۔ آپ کے لیے تو یونیورسٹی کی ۔۔۔۔ خوب صورت اور حسین ترین لڑکیاں اپنا دل دینے کو تیار بیٹھی تھیں۔ پھر میں۔"

اس نے ۔۔۔ حیرانی سے سوال کیا تھا۔

"کیا کمی ہے آپ میں؟"

"کمی ہی کمی ہے سر! میں تو' میرا مطلب ہے۔"

کیسے اپنے منہ سے کہہ دیتی کہ مجھ جیسی عام سی شکل کی' سیاہ رنگت' بلکہ بدصورت لڑکی کے لیے کمی ہی کمی کہ دو سالوں کے دوران ہی کسی ایک بھی لڑکے نے اسے چھیڑنے کی ہمت کی تھی نہ ہی کوئی اور شرارت کی تھی۔ الٹا اس کے ساتھ سب ہی لڑکوں کا رویہ احترام آمیز اور انتہائی سنجیدہ ہوتا تھا۔ اسے۔۔۔ اپنے بارے میں کسی خوش فہمی۔۔۔ کی گنجائش نہ تھی۔ اس لیے یونیورسٹی کو محض پڑھنے کی مقدس درسگاہ سمجھ کر آئی تھی۔ مگر سر ابراہیم کا یہ اعتراف اسے شدید حیرت میں مبتلا کر گیا تھا اور اب وہ آرہے تھے۔

"میں اماں جان کو ان کی آمد کے متعلق بتا دیتی ہوں۔" بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا۔

"کیا؟ ہم ملک ہیں' چودھری۔۔۔ اور وہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ ہم خاندان سے باہر شادیاں نہیں کرتے ثروت!"

اماں کا جواب حسب توقع تھا مگر ان کا حیران کن رد عمل حسب توقع سے بڑھ کر تھا۔ انہیں شاید اپنی نیک' سنجیدہ' کم صم اور دو ہی بیٹی کے لیے کسی ایسے رشتے کی امید نہیں تھی۔

"اماں جی! وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔" اس نے گردن جھکا کر اپنی رائے دی۔

"تو کیسے جانتی ہے انہیں؟" انہوں نے سر تاپا کھوجتی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

"عمر بھر کی پارسائی کو ضائع ہونے میں محض ایک پل لگتا ہے۔" اس نے کسی کتاب میں پڑھا تھا اور اس پل جب اماں جی کی نظریں اس کی جانب اٹھی تھیں تو اسے لگا بس یہی ایک پل ہے۔ جس میں اسے اپنی پارسائی ثابت کرنا تھی اور نارسائی کو مقدر بنانا تھا۔

"وہ میرے استاد ہیں اماں جی اور بس میں ان کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی ہوں۔" اس نے سچائی سے اعتراف کیا۔

"استاد۔۔۔ استاد کا رتبہ پیغمبروں کتنا اونچا ہوتا ہے۔ خیر انہوں نے کہا۔ ہم نے سن لیا۔ اب فیصلہ تو ہمیں کرنا ہے کہ۔۔۔ تو فکر نہ کر' تیرے امتحان قریب ہیں۔ جا اپنی پڑھائی کر۔"

اماں جی نے گویا بات ہی ختم کر دی تھی۔ مگر اس کے لیے ابھی بھی بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ پروفیسر ابراہیم نے گھر آنے کا کہا تھا اور جس مقصد کے لیے وہ آرہے تھے۔ وہ اسے بے چین کیے ہوئے تھا۔

"خاندان میں کون ہے' جو میرے لیے مناسب ہوگا۔"

پل بھر کو اس کی نظر اپنے خاندان کے دور نزدیک موجود سب ہی لڑکوں پر گئی تھی۔۔۔ بے پناہ دولت اور خوبصورتی' دونوں کا ہی شدید فقدان تھا خاندان میں عام سی شکل و صورت والے سادہ لوحی کے تھے۔ بچپن سے ہی انہیں باپ دادا کی طرح کاروبار میں لگا دیا جاتا تھا اور وہ خوب کماتے تھے۔ پڑھائی لکھائی کا کسی کو بھی کوئی شوق نہیں تھا۔ نہ لڑکوں کو نہ لڑکیوں کو۔ وہ اپنے ماں باپ کی واحد لڑکی تھی' جس نے ایم اے کو ایجوکیشن سے کیا تھا اور اب ایم اے لکھ کر اپنے کسی ان پڑھ اور دو چار جماعتیں پڑھنے والے کزن کے ساتھ شادی کا تصور ہی روح کھینچتا تھا۔ اسے بچپن سے ہی خاندان کی دیگر لڑکیوں کی طرح بننے سنورنے' زیور' کپڑوں اور شو بازی کا شوق نہیں تھا۔ وہ بچپن سے ہی کتابی کیڑا تھی اور اسی لیے اتنی کامیابی سے ہر کلاس میں پوزیشن لے کر آگے بڑھتی رہی تھی کہ کسی کو اس کے پڑھنے پر اعتراض نہ ہو۔ اگرچہ کچھ رشتے داروں کی طرف سے اعتراض بھی ہوئے تھے کہ اکرم اپنی بیٹی کو اتنا کیوں پڑھا رہا ہے۔ جب خاندان برادری میں اس کے جوڑ کا کوئی اور نہیں ہے۔ "تو پھر کیا بیٹی کو عمر بھر کنوارا رکھے گا۔"

اعتراض تو بہت تھے۔ مگر ابا جان کا ایک ہی جواب تھا کہ میری لائق فائق بیٹی کو پڑھنے کا شوق ہے تو ضرور پڑھے گی۔

"اگر وہ ناراض ہو گئے تو! انہوں نے برادری کے غصے میں آکر ابا جان سے کچھ کہہ دیا تو۔ ابا جان نے اس کی بے عزتی کر دی تو۔" اتنے سارے "تو" اکٹھے ہو گئے تھے کہ وہ باوجود کوشش کے ان سے جان نہیں چھڑا پائی تھی۔ اس کا کمزور سا دل ایسے کی طرح لرزتا کانپتا رہا تھا۔ اور پھر اتوار کا دن بھی آپہنچا تھا۔

صبح سے ہی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ ابا جی اور اماں جی سے نظریں چراتی ہوئی تقریباً" کچن اور اپنے کمرے تک محدود ہو گئی تھی۔ اسے ابا جی سے شرم اور جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ پتا نہیں اماں جان نے اس کے بارے میں ابا جان کو کیا بتایا تھا۔ مگر وہ خود کو چور سا محسوس کر رہی تھی۔ بے نام سی ایک ہچکچاہٹ تھی' جس کی وجہ سے وہ ان کے سامنے آنے سے کترا رہی تھی۔

"پروفیسر صاحب اور ان کے والدین آگئے ہیں۔" نواز نے آکر بلند آواز میں بتایا تھا۔ کباب تلتے ہوئے بے ساختہ اس کا ہاتھ کانپا تھا۔ اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر خود کو دیکھا۔ وہی سادہ سا حلیہ' کچھ الجھے سلجھے بال' پاؤں میں سادہ گھریلو چپل اور چہرہ صبح کی نماز کے لیے وضو کیا ہوا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر کچن کے باہر گیلری میں لگی کلاس پینٹنگ کے ایک خالی کونے میں جھانک کر خود کو دیکھنے لگی تھی۔

گہرا سیاہ سانولا رنگ' مزید سیاہ لگ رہا تھا۔ سفید پسینے کے قطرے ماتھے پر چمک رہے تھے۔ اس نے بے ساختہ ہلکے آسمانی دوپٹے سے اپنا پسینہ صاف کیا۔ پھر چہرہ رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔

"کم از کم صابن سے منہ تو دھو لو۔" بوا مجیدن نہ جانے کب اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔ اس نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

"یہ سیاہی کسی صابن سے صاف نہیں کی جا سکے گی بوا! چھوڑیں۔"

اس کے بس میں ہی نہیں دل میں بھی کانچ ٹوٹا بکھرا تھا۔ بننے سنورنے کا موقع تھا کہ لڑکیوں کے لیے یہ مواقع تو زندگی میں اہم سنگ میل رکھتے ہیں۔

دیکھنے دکھانے کے بعد قبولیت کا وقت۔۔۔ اور پھر ایک بالکل نئی زندگی کی شروعات' جس کے خواب ہر پیدا ہونے والی لڑکی کے والدین دیکھتے ہیں اور جس کی تمنا ہر لڑکی کے دل میں ہوتی ہے۔ پسندیدگی کی سند پانے کے بعد کسی کی زندگی میں شامل ہونا اور پھر زندگی کے ساتھی کے ساتھ ایک لمبا عرصہ گزارنے کا تصور ہی عورت کے خوابوں کی تکمیل ہو جاتا ہے۔

مگر وہ نہ خوش نصیب تھی اور نہ ہی اس نے خواب دیکھے تھے کہ کوئی اسے پسندیدگی کی سند دے گا۔ عمر بھر کے لیے کسی کی جیون ساتھی بننے والا سپنا دیکھنا اس جیسی لڑکی کے لیے ناممکن ہی تھا۔ اسے بچپن سے ہی اپنی بدصورتی اور لوگوں کی نفرت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ اسی لیے اس نے خواب دیکھنا چھوڑ دیے تھے۔ جن خوابوں کی کرچیاں سمیٹتے ہوئے انگلیاں خون فگار ہوں' انہیں آنکھوں میں سجانا ہی بے کار تھا۔

"السلام علیکم۔" پروفیسر ابراہیم کی امی بہت سلجھی ہوئی' ملنسار اور ڈیسنٹ خاتون تھیں۔ اس بڑھاپے میں بھی ان کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو بیٹا۔" اس نے بغور انہیں دیکھا۔ وہ بڑے پیار سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"جی ٹھیک ہوں۔" اسے اب خود پر شرم آرہی تھی۔ "کم از کم منہ تو دھو لینا چاہیے تھا۔"

"پیپرز کی تیاری کیسی ہو رہی ہے!" انہیں پروفیسر صاحب اچھی طرح تمام حالات بتا کر آئے تھے۔

"جی اچھی ہو رہی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ کر ایک بار پھر سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی۔

"کھانا لگواؤ ثروت۔" اماں جان نے اسے بہانے سے اٹھایا۔

"جی۔" وہ فوراً "اٹھی۔ کھانے کے بعد چائے اور پھر بچوں کے درمیان گفتگو سے دوبارہ پروفیسر صاحب سے ملنے کا وقت ہی نہیں ملا اور وہ چلے بھی گئے۔

"وہ رشتہ مانگنے آئے تھے مگر صاحب نے انہیں بتا دیا کہ ہم ذات برادری سے باہر رشتہ نہیں کرتے۔ بے چارے مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔"

بوا مجیدن بتا رہی تھیں۔ اس کا چائے کے مگ کی طرف بڑھتا ہاتھ یکدم ساکت ہوا تھا۔ یقیناً "بوا مجیدن اسے سنا رہی تھیں۔

"وہ صاحب کو اسلام اور انسانیت بتانا چاہ رہے تھے کہ اسلام میں سب مسلمان بھائی بھائی ہیں اور یہ ذات برادری ہمارے اپنے اصول ہیں مگر صاحب نے صاف صاف کہہ دیا کہ بھلے آپ ناراض ہوں یا خوش ہم خاندان سے باہر شادیاں نہیں کرتے۔"

چائے کا گھونٹ بے حد گرم تھا۔ اس کا حلق تک جل گیا تھا۔ مگر اس جلن سے بڑھ کر جلن بوا مجیدن کی باتوں سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنا آپ کمپوز کر کے باہر نکل آئی۔ اماں جان کی زبانی بھی اسے ان کی آمد اور انکار دونوں کی اطلاع مل گئی تھی۔

اسے بے حد رونا آیا۔ اتنے عرصے بعد جو ایک ڈھنگ کا رشتہ آیا تھا۔ اسے بھی محض انا اور برتری کے زعم میں دھتکار دیا گیا تھا کہ پروفیسر صاحب کوئی بڑے زمین دار اور دولت مند شخص نہ تھے۔ ان کے والد ایک محکمے میں کلرک تھے۔ انہوں نے بڑی محنت سے اپنے بیٹے کو پڑھایا تھا اور اب پروفیسر بن کر ابراہیم صاحب کالج کے اندر ہی بنی پروفیسرز کالونی میں رہ رہے تھے۔ ان کا ایک چھوٹا سا آبائی گھر گاؤں میں تھا۔ جو کسی رشتے دار کو رہنے کے لیے دے رکھا تھا۔

"تو یہ کہانی یوں ختم ہو گئی جیسے کبھی شروع ہی نہ ہوئی ہو۔" اس نے آنکھوں کے کناروں سے بہتے پانی کو صاف کیا اور اس مختصر سی داستان کو عمر بھر کے لیے دل میں چھپا کر محفوظ کر لیا تھا۔ زیور کی طرح کیونکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا اس کے بعد زندگی میں شاید دوبارہ کبھی کوئی سوالی بن کر نہیں آئے گا۔

"میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا ثروت۔"

وہ آخری پیپر دے کر نکلی تو ان کے روم میں وہ سب فرینڈز ملنے گئی تھیں۔ وہ سب سے آخر میں کھڑی تھی۔ خاموش نظریں جھکائے پروفیسر ابراہیم اپنے سب ہی اسٹوڈنٹس کو ہنسی مذاق کرتے ہوئے انہیں ان کی آئندہ زندگی کے بارے میں دعا دے رہے تھے۔ وہ خاموش کھڑی تھی۔ کیونکہ ان کے پاس اس کو وش کرنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ ساری فرینڈز ہنستی مسکراتی ہوئی باہر نکلیں تو وہ بھی ان کے پیچھے ہی نکلنے لگی تھی۔

"ثروت۔" یکدم انہوں نے پکارا تھا۔ ثروت ٹھٹکی۔ مڑ کر دیکھا۔

"جی۔"

"آپ رکیں۔ آپ کے کچھ پیپرز میرے پاس ہیں۔ وہ لے لیں۔" اس نے مڑ کر اپنے گروپ کو دیکھا۔ سب ہی سر ہلا کر کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی تھیں کیونکہ کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت بھی کہاں تھی۔ پروفیسر ابراہیم کے پاس اس کا رکنا کوئی ایسی بات نہ تھی کہ کسی کو کچھ کہنا پڑتا۔

"جی سر۔" اس کا دل یکدم دھڑکا تھا۔ اس کے ذہن میں نہیں تھا کہ اس کے کوئی پیپرز پروفیسر صاحب کے پاس ہوں گے۔

"آپ کو آپ کے والدین نے بتایا ہو گا کہ ہمیں انہوں نے کیسے رد کر دیا ہے۔" وہ بڑے دکھ سے کہہ رہے تھے۔ ثروت کے دل میں پھانس سی چبھی۔ اس کے پاس اب کہنے کو کچھ نہ تھا۔ شرمندگی سے سر مزید جھک گیا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کی سوچ اتنی سطحی ہے ورنہ۔۔۔ خیر میں جانتا ہوں یہ خالصتاً ان کا اپنا فیصلہ ہے۔ آپ یقیناً کچھ اور چاہتی تھیں نا۔" اس نے بے ساختہ سر اٹھایا۔ وہ کیسے اس کی نظروں اور ذہن کو پڑھ چکے تھے کہ اتنا بڑا دعویٰ کر رہے تھے۔

"حیران ہیں کہ مجھے کیسے پتا چلا؟ دل جن کے ساتھ دھڑکتے ہوں ان کی باتیں بن کہے سمجھ میں آجاتی ہیں۔

ان کی نظروں کی نمی چھپی نہیں رہ سکتی۔" ٹپ ٹپ یکدم ہی دو آنسو سبز رنگ کی پلاسٹک کور والی فائل پر گرے تھے۔ وہ چونکی۔ سر اٹھایا۔ پروفیسر ابراہیم نے اگلے ہی پل وہ دونوں پانی کے قطرے ٹشو میں سمیٹ لیے تھے۔

"یہ میرے لیے بننے والے بہت قیمتی آنسو ہمیشہ میرے ساتھ، میرے پاس رہیں گے۔"

انہوں نے عجیب سے حسرت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ اسے لگا اس کا دل پھٹ جائے گا۔ وہ یکدم مڑ کر ان کے کمرے سے نکلی تھی۔ اور سیدھا گھر آ کر سانس لیا تھا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔

اس کی زندگی میں آنے والا واحد فرد تھا جو اس سے محبت کا دعویٰ بھی کر رہا تھا۔ ورنہ تو اس کی شکل و صورت دیکھ کر کوئی محبت کا دعویٰ کرتا ہی نہیں تھا۔ ہاں زمین، جائیداد اور مال و دولت کے لالچی بہت آتے تھے۔ جو اس سے شادی کر کے اس کے حصے کی جائیداد ہتھیانا چاہتے تھے اور اسے ایسے لالچی خودغرض، جاہل قسم کے لوگوں کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

ہاں اسے زندگی میں دوسری بار شدید صدمہ اس وقت ہوا تھا، جب نواز نے اپنی پسند سے ایک بہت ہی غریب گھر کی برادری سے باہر ایک لڑکی سے شادی کی تھی اور اماں جان نے بھی اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ نواز نے اس کے معاملے میں خاموشی اختیار کی تھی اور اپنے معاملے میں اس نے جان دینے تک کی دھمکی دے کر گھر والوں کو منا لیا تھا۔ سارا علوی کی خوب صورتی پر تو سارے دل و جان سے فدا تھے۔

"ماشاء اللہ دلہن پیاری ہے تو میرے نواز کے بچے بھی پیارے ہوں گے۔" اماں جان کا موقف تھا مگر ثروت کے دل پر جیسے منوں بوجھ آ پڑا تھا۔ اس کی دفعہ تو خاندان کی عزت، ناموس اور برادری کا خوف سونے نہیں دیتا تھا اور نواز کی دفعہ میں اس کی دھمکیوں سے سب ہی ڈر گئے تھے۔

اس نے امید سینٹر کے نام سے معذور بچوں کے لیے ایک بہت بڑا اسکول کھول لیا تھا اور یتیم بچوں کے لیے بھی ایک سینٹر کھولا تھا۔ جہاں انہیں نہ صرف تعلیم دی جاتی تھی بلکہ ان کے لیے رہائش کا بھی انتظام تھا۔ وہ اپنی زندگی تو اس عظیم مشن کے لیے وقف کر کے خوش تھی۔ زندگی ایک مقصد کے تحت گزر رہی تھی اور اب ابراہیم کی آمد ساکت جھیل میں ایک پتھر بن کر گری تھی۔ یادوں کی لہریں بڑی زور سے اٹھی تھیں۔

اس نے گہرا سانس لے کر اپنے گال صاف کیے۔ جن پر ہلکی ہلکی سی نمی ابھی بھی موجود تھی۔

اسے ماہین کی شادی میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ مگر احمد کی آمد کی وجہ سے وہ لیٹ ہو گئی تھی۔ اگلے ہفتے احمد کے لیے انیکسی سیٹ کروانے کے بعد وہ جب یہاں شفٹ ہو گیا تو اس نے لان میں، اترتی شام کے دھندلکے میں اسے اپنی روانگی کے بارے میں بتایا۔

"کس کی شادی! "شادی میں جانے کا سن کر وہ چونکا۔

"میری بھتیجی ہے ماہین۔ بالکل مجھ جیسی ہے۔ اس کی شادی ہے۔"

"اوہ۔۔۔ میرا نہیں خیال کہ آپ جیسا کوئی دوسرا بھی ہو سکتا ہے۔" احمد کی بات پر وہ بے ساختہ چونکی۔

"کیا مطلب۔۔۔!"

"میرا مطلب۔ آپ جیسی ہمدرد، رحم دل اور کیئرنگ خاتون کوئی اور کہاں۔"

"ارے ایسی بھی اب کوئی بات نہیں ہے۔ ماہین بالکل میرا ہی پرتو ہے۔"

"اوہ پھر تو میں لیٹ ہو گیا۔" اس نے گہرا سانس لے کر مایوسی سے کہا تھا۔

"کیا مطلب!" وہ حیرت سے اسے دیکھ کر بولی۔

"بھئی میں تو سمجھتا تھا کہ آپ اپنے نام کی ایک ہی اکلوتی عظیم خاتون ہیں جن کی میرے بابا اتنی تعریفیں کرتے ہیں۔ مگر آپ جیسا کوئی اور بھی ہے۔ یہ معلوم ہوتا تو ضرور آپ سے رجوع کرتا۔"

وہ اتنا سنجیدہ ہو کر کہہ رہا تھا کہ ثروت کو حیرت سی ہوئی تھی۔ مگر اگلے ہی پل اس کی چمکتی آنکھوں سے چھلکتی مسکراہٹ دیکھ کر ہی ہنسی تھی۔



"حیرت ہے۔ سر تو اتنا نہیں بولتے تھے۔"

"میں اپنی ماما پر گیا ہوں۔ میری ماما بھی بہت بولتی تھیں۔"

"تھیں...!" وہ چونکی۔

"جی... میرے بچپن میں ان کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ انہوں نے مجھے ماں اور باپ دونوں بن کر پالا ہے۔"

اس نے اداسی سے آسمان کو دیکھا۔ جہاں پرندے اپنی آخری اڑان بھرتے گھروں کو واپس آ رہے تھے اور آسمان کا رنگ سیاہی مائل ہو گیا تھا۔

"اوہ سو سیڈ سوری بیٹا۔" اس کا گہرے سانولے رنگ کا ہاتھ احمد کے ہاتھ پر آ ٹکا تھا۔ احمد نے چونک کر اپنے مضبوط، لمبے اور بالوں بھرے ہلکے سانولے ہاتھ کو دیکھا اور پھر ثروت کے اداس چہرے کو۔

"اٹس اوکے میڈم! میں نے آپ کو بھی اداس کر دیا۔ اینی ہاؤ، آپ شادی میں جانے کی بات کر رہی تھیں۔" ثروت کی ساری توجہ اس وقت اس کے ہاتھوں میں جکڑے اپنے ہاتھ پر تھی۔ جو نہ جانے کب اس کی گرفت میں آیا تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ سرکایا۔ احمد نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر فوراً" دونوں ہاتھ اٹھا لیے۔

"میں کل جاؤں گی تم بھی چلو ہماری فیملی کی شادی دیکھ لینا۔"

"بن بلایا مہمان...؟" اس نے برجستہ جواب دیا تھا۔

"نہیں، تمہیں کارڈ مل جائے گا۔ تم انوائیٹڈ ہو گے تب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا نا۔" ثروت بے ساختہ مسکرائی۔

"بالکل نہیں۔ دراصل کوئی بھی شادی اٹینڈ کیے مجھے بہت عرصہ ہو گیا ہے۔ دوستوں کی بہن بھائیوں کی شادیاں اٹینڈ کی ہیں۔ مگر جو مزا اپنی گھریلو شادی میں آتا ہے۔ وہ پرائی شادیوں میں کہاں!" اس نے اتنی حسرت سے کہا تھا کہ ثروت نے بے اختیار پوچھا۔

"کیوں تمہارے گھر میں کسی کی شادی نہیں ہوگی کیا؟"

"تمہارے گھر میں بابا اور میں رہتے ہیں۔ میری ابھی شادی کی عمر نہیں ہوئی اور رہے بابا تو وہ دوسری شادی کے لیے تیار نہیں ہوتے۔"

اس کے جواب پر وہ کھلکھلائی۔

"میں تمہارے کزنز وغیرہ کے متعلق پوچھ رہی تھی۔"

"کوئی کزن نہیں ہے۔ دور پرے کے کوئی رشتے دار ہوں گے۔ بابا بھی اکلوتے تھے مما بھی۔ اور اتنے قدامت پسند، روایت پسند تھے میرے والدین کہ اپنی روایت کو توڑا نہیں انہوں نے۔ اسی لیے تو میں بھی اکلوتا ہوں۔" وہ اتنے دکھی اور غم زدہ کہانی اس انداز میں سنا رہا تھا کہ ثروت کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

"اف احمد! میں آج اتنا ہنسی ہوں کہ اپنی پوری زندگی کی ہنسی بھی جمع کر لوں تو اس سے کم ہو گی۔" اس نے آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"تو بس پھر آپ اسی طرح ہنسنے کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ میں تو زندہ دل انسان ہوں اور زندہ دلی سے جیتا ہوں۔" احمد کی بات پر اس نے بغور اسے دیکھا۔ جی میں آیا پوچھے 'تمہارے باپ نے میرے بارے میں کیا کیا بتایا ہے۔ صرف اسٹوڈنٹ کا رشتہ یا اور بھی کچھ۔'

مگر یہ سوال پوچھ نہیں سکی تھی۔ وہ پوچھ سکتی بھی نہیں تھی کیونکہ ڈر رہی تھی۔ اگر احمد نے کوئی جواب اس کی توقع کے برعکس دے دیا تو!

"تو پھر تم بھی شادی میں جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" اس نے ہنستے ہوئے گویا حکم دے دیا تھا۔

"میں تیار ہوں۔" وہ تو جیسے پہلے سے ارادہ باندھے بیٹھا تھا۔ ثروت نے سر ہلایا۔ طوطا مینا، گٹو مانو اور بے شمار مختلف اقسام کے پرندوں، پودوں کے بعد اب وہ زندہ انسان بھی اس کی ذمہ داریوں میں شامل ہو گیا تھا۔

صبح وہ اپنے ساتھ ساتھ اس کا ناشتہ بھی بناتی تھی۔ دونوں اکٹھے اپنے اپنے آفس جانے کے لیے نکلتے تھے۔ ثروت کی سوزوکی ڈرائیونگ کے لیے اس نے پہلے دن ہی سنبھال لی تھی۔ دوپہر کو وہ اپنے کالج ہی میں

چیک کر لیتا تھا۔ البتہ شام کی چائے پر وہ دونوں اکٹھے ہوتے تھے۔

"مجھے شامی کباب پسند نہیں۔ چپلی کباب پسند ہیں۔ میں ٹماٹو کیچپ کی جگہ دہی کا رائتہ لینا پسند کرتا ہوں۔ مجھے چائے بہت گرم پسند ہے۔" پہلے ہی روز اس نے اپنی پسند ناپسند یوں بتائی تھی جیسے کوئی میس مینیو ترتیب دیتا ہے۔ اس کے لہجے میں بلا اعتماد اور انداز میں بے انتہا بے تکلفی تھی۔ وہ پروفیسر ابراہیم جیسے سنجیدہ مزاج سخت طبیعت کے ریزرو انسان کا بیٹا تو لگتا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ اپنے باپ کے برعکس واقعی ایک زندہ دل ہنس مکھ' جلد گھل مل جانے والا بندہ تھا اور محض دو تین دن کے اندر اندر ہی وہ ثروت کے ساتھ یوں رہ رہا تھا' جیسے برسوں سے رہ رہا ہو اور برسوں کی جان پہچان ہو۔

ثروت کے لیے یہ بہت ہی اچھی بات تھی۔ وہ پُرسکون ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آیان! گھر میں ماہین کی شادی کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اسی لیے بزی ہوں۔"

"تم کیا جوڑے ٹانک رہی ہو۔"

"واٹ' جوڑے ٹانکنے کا تمہیں پتا ہے۔" میرب اس کے لہجے پر بے ساختہ ہنسی تھی۔ حیرت سے پوچھا۔

"ہاں یار! کسی زنانہ سے ڈرامے میں دیکھا تھا' شادی کا موقع تھا اور ہیروئین ہیرو سے کچھ اسی قسم کی مصروفیت کا بہانہ کر رہی تھی۔ تو میں نے تمہاری مصروفیت کو بھی اسی سے جوڑ دیا۔"

"او نو...! میں نے کیا جوڑے ٹانکنے ہیں۔ مجھے نفرت ہے ایسے پینڈو کاموں سے۔ میرے تو تمام ڈریس ماہین نے پیک کیے ہیں۔ میں تو پارلر سے ڈیٹ لے رہی تھی کہ شادی تک اچھے والے فیشل کروا لوں گی۔"

"او یار! تمہیں پارلر جانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ تم تو اس قدر حسین ہو کہ تمہیں مزید سجانا سنوارنا بھی پارلر والی کو نہیں آتا ہو گا۔" آیان کے الفاظ نے اسے ساتویں آسمان پر چڑھا دیا تھا۔ اس نے بے حد غرور سے سامنے لگے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔

"میں واقعی بہت خوب صورت ہوں نا۔" اس نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں آیان سے پوچھا تھا۔ اپنی تعریف سننے کا نشہ تو دنیا کا سب سے تیز اور برا نشہ ہوتا ہے۔ جو پل میں انسان کو زمین سے اٹھا کر عرش تک لے جاتا ہے

سامنے موجود لوگ بونے اور بدصورت نظر آنے لگتے ہیں۔

میرب نواز کو لوگوں کی تعریفی باتیں اسی دنیا میں رہنے کے باوجود بہت اعلیٰ اور بلند مقام پر بٹھا دیتی تھیں۔ اسی لیے اس کے انداز اور رویے میں تبدیلی آ گئی تھی۔ مگر مقابل بھی تو آیان تھا ٹکر کا مقابلہ تھا۔

"ہم دونوں ہی بہت خوب صورت ہیں۔ بقول ماما' ہماری جوڑی چاند سورج کی جوڑی ہے۔"

آیان بھی تو اپنی تعریف کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ میرب کا منہ بن گیا۔ میرے ساتھ خود کو ضرور ملائے گا۔ کیا مجال جو کبھی اپنی تعریف کا موقع بھول جائے۔ وہ بڑبڑائی۔

"کیا ہوا میرب! خاموش کیوں ہو گئی ہو۔" اس کی خاموشی کے جواب میں وہ حیرت سے بولا تھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے لب... "اچھا چلو میں ملنے کا ٹائم نکالتی ہوں۔"

"تم اگر میرب! جب چاہو ٹائم نکال سکتی ہو۔"

آیان اس کی بات پر ہنسا تھا۔ میرب کو طنز کبھی بھی پسند نہیں آتا تھا۔ اسی لیے وہ [illegible] فون بند کر چکی تھی۔

"ہونہہ... خود کو کچھ زیادہ ہی پرنس چارمنگ سمجھتا ہے۔" اس نے منہ بنا کر سر جھٹکا۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ وہ آیان واسطی کے ساتھ تعلق جوڑ کر بھی خوش نہیں رہ سکے گی۔ کیونکہ آیان اس سے

زیادہ ضدی' خود سر اور انا پرست تھا اور دو انتہا پسند شخص ایک ساتھ ایک معتدل زندگی نہیں گزار سکتے ہیں۔ اسے بھی یہ احساس تھا۔ کیونکہ زندگی میں کامیابی کے لیے اگر ایک فریق انتہا پسند ہے تو دوسرے کو معتدل مزاج ہونا چاہیے۔ اسی طرح زندگی میں توازن اور عدل رہتا ہے اور یہ گاڑی چلتی رہتی ہے۔ ورنہ ضد' انا پرستی اور "میں" سے نہ صرف زندگی بلکہ گھر بھی برباد ہوتے ہیں۔

اس نے اپنے گھر میں ہی یہ تجربہ کیا تھا۔ ماں انتہائی تحمل' ضدی اور اپنی منوانے والی تھی جبکہ باپ اس کے بالکل برعکس تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ دونوں کی زندگی ابھی تک ایک دوسرے کے ساتھ چل رہی تھی۔ نبھ رہی تھی مگر کیا وہ آیان کے ساتھ زندگی گزار سکے گی۔

"میں اسے اپنے جیسا بنا لوں گی' اسے میرے سامنے جھکنا ہو گا... وہ جھکے گا۔"

اس نے اپنی خوب صورت صراحی دار گردن غرور سے اکڑا کر گویا خود کو تسلی دی تھی کہ وہ اس معاملے کو بھی اپنے حسن ادا اور خوب صورتی کے زور سے سلجھا لے گی۔ جیسے اب آیان واسطی اس کا دیوانہ ہے۔ بعد میں بھی وہ اسی طرح اس دیوانے کو قابو کر کے اپنی ساری باتیں منوا لیا کرے گی۔

"حسن اور خوب صورتی سے تو بڑے بڑے تخت و تاج ہلائے جا سکتے ہیں۔ سارا علوی نے بھی تو بزنس ٹائیکون نواز اکرم کو اپنا بے دام غلام بنا رکھا ہے تو میں کیوں نہیں۔" اس نے بڑے تفاخر سے اپنا اور ماں کا موازنہ کر لیا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ سارا علوی کے مقابلے میں نواز اکرم ایک بے حد بدصورت اور احساس کمتری کا شکار شخص تھا۔ جبکہ اس کے مقابلے میں آیان واسطی ہے جسے اپنی خوب صورتی پر اتنا ہی گھمنڈ تھا' جتنا میرب کو۔

"تو پھر اب اس سے ملا جائے۔" اس نے بالوں میں برش کرتے ہوئے سوچا۔ ماما کو منانا تو کوئی مشکل نہیں ہے۔ اسے سارا علوی کی پروا بھی نہ تھی۔ البتہ ثروت سے وہ ڈرتی تھی۔

"پھپھو اس وقت گھر میں نہیں ہیں۔ مطلب... نکل لے میرب۔" اس نے چٹکی بجا کر پل بھر میں سوچا تھا اور بیگ اٹھا کر لمحوں میں کمرے سے باہر تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہمیں ہر صورت میں اس سے فلیٹ اپنے نام کروانا ہے۔ وہ سجا ہوا فلیٹ جس کی مالیت کا اندازہ لاکھوں میں ہے۔ بلکہ اس کے لیے تو پراپرٹی ڈیلر نے گاہک بھی تلاش کر لیے ہیں۔"

"تو پھر یہ نیک کام جتنی جلدی ہو سکے کر لو۔ کیونکہ ایک بار تم اس کالی چڑیل کے پنجے میں آ گئے تو سمجھو' کبھی بھی اس کی قید سے نہیں نکل سکو گے۔"

رانی کے خدشات کو وہ جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ مگر اتنی جلد ہتھیلی پر سرسوں بھی تو نہیں جما سکتا تھا۔ وہ جلد بازی میں کام کو بگاڑنے کے حق میں نہ تھا۔ یہ کام تو اسے ہر صورت میں نبٹانا تھا' ماہین سے جان چھڑانا تھی۔ لاکھوں مالیت کا یہ فلیٹ بہت عرصے سے اس کی نظر میں تھا اور اب وہ عین اس وقت جب یہ سب اس کا ہونے والا تھا تو رانی کی باتوں میں آ کر جلد بازی میں کوئی گھاٹا اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔

"دیکھ رانی! حوصلہ رکھ۔ سب کچھ مل جائے گا ہمیں مگر اتنی بے صبری مت دکھا۔"

"کیا مطلب ہے تیرا... میں بے صبری ہوں۔ تین دن رہ گئے ہیں۔ تیری شادی میں ارے۔" وہ یکدم معنی خیزی سے خاموش ہو کر اسے گھورنے لگی

"کہیں اس کالی چڑیل پر تیری نیت تو خراب نہیں ہو گئی ہے۔" رانی کی بات پر اس نے ٹھٹک کر اسے دیکھا تھا۔ یک دم دو سیاہ گہرے کالے دھبے آنکھوں کے سامنے آ گئے تھے اور جو آہستہ آہستہ ہاتھوں کی شکل اختیار کر گئے تھے اور یہ ہاتھ...

"نہیں' نہیں۔" اس نے یکدم اپنے دونوں ہاتھ بری طرح جھٹکتے ہوئے چیخ کر کہا تھا۔

"ہرگز نہیں... مجھے نفرت ہے اس سے۔"

کراہیت آتی ہے اور شادی تو میں کبھی بھی نہیں کروں گا اس سے۔" اس نے شدت سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا۔ رانی نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

"چل ٹھیک ہے۔ جیسے تو چاہتا ہے کر لے۔ مگر یاد رکھنا صرف تین دن ہیں۔" رانی نے تین انگلیاں اٹھا کر اسے اشارہ دیا۔

"بہت ہیں، سائن ہو جائیں تو پھر سارا قبضہ ہمارا ہو گا۔ ویسے آج شام کو وہ اپنا سامان سیٹ کرنے آ رہی ہے۔ میں بھی جاؤں گا۔ وہاں موقع دیکھ کر بات کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"ضرور کرنا بات۔ بلکہ کاغذ جیب میں رکھ لینا اور کچے سائن کروا لینا۔" "کچے سائن، اتنا آسان ہے کروانا؟ تو جانتی نہیں یہ امیر پڑھی لکھی لڑکیاں بڑی تیز ہوتی ہیں، سارے کاغذ پڑھ کر ہی سائن کرتی ہیں۔"

"اچھا۔ تو تو کہتا تھا وہ تیرے لیے جان بھی دے سکتی ہے، پھر یہ مکان کیا ویلیو رکھتا ہے۔" رانی نے طنز سے اسے گھورا۔

"ہاں جان تو دے سکتی ہے۔ مگر۔ خیر تو فکر کیوں کرتی ہے، کرلوں گا میں کچھ نہ کچھ بندوبست، نہیں کرتا اس سے شادی، بس۔" وہ اس کی بار بار کی رٹ سے تنگ آ گیا تھا۔ اسی لیے اسے تسلی دینے کے بہانے جلدی سے ہار مان لی تھی۔

"تو جانتا نہیں رانی کو، میں تجھے قتل کر دوں گی، سمجھا! تو میرے علاوہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔" رانی کے بے حد جذباتی انداز پر وہ ٹھٹکا۔

"رانی! خدا کے لیے سمجھنے کی کوشش کر۔ اگر تو جذباتی پن کا مظاہرہ کرے گی تو ٹھیک ہے میں انکار کر دیتا ہوں۔ مگر پھر مجھے یہ نہ کہنا کہ مجھے اس کچے سے پرانے گھر میں کیوں رکھا ہے۔ بڑا شاندار سجا ہوا خوب صورت فلیٹ ہاتھ سے نکل جائے گا، تیری وجہ سے، صرف تیری وجہ سے۔" کاشف نے ناراضی سے اسے دیکھا تھا۔

"اچھا اچھا۔ مت کر تو انکار۔ میں تجھے منع نہیں کرتی ہوں، مگر وہ گھر وہ بنگلہ ہاتھ سے جانے نہ دینا۔" لالچی رانی اس کی دھمکی سے فوراً مان گئی تھی۔ اسے کاشف سے زیادہ اس دولت میں دلچسپی تھی، جو کاشف سمیٹ رہا تھا اور مزید سمیٹنے والا تھا۔ اس کی تمام عمر جس طرح سسک سسک کر گزری تھی۔ پیسے پیسے کے لیے ترسی تھی وہ۔ باپ معمولی ریڑھی والا اور ماں لوگوں کے گھروں میں کام کر کے بچے ہوئے سالن اور روٹیاں اکٹھی کرنے والی عورت تھی۔ خود اس نے تمام عمر اترن پہنی تھی۔ اب کاشف کے ذریعے یک دم اتنی دولت، گھر، گاڑی سب مل رہا تھا تو چھوڑنا بے وقوفی تھی۔ رانی نے لمحوں میں فیصلہ کیا تھا۔

"تو فکر نہ کر رانی! تو میرے دل کی رانی ہے، بس دعا کر کسی طرح آج کل میں ہی یہ کام ہو جائے تو پھر ہم دونوں یہاں سے بھاگ جائیں گے، کچھ عرصہ کسی چھوٹے سے گمنام گاؤں میں گزار کر پھر کسی دوسرے بڑے شہر میں بڑی سی کوٹھی لے کر عیش سے رہیں گے۔"

"اور ہمارے ماں باپ۔" رانی کو بہرحال اپنے ماں باپ کا خیال بھی تھا۔ کاشی کو تو اس ٹائپ کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اقبال گجر سے پیچھا چھڑانے کی کوشش وہ عرصے سے کر رہا تھا۔ فاخرہ ناراض تھی اس کے باوجود بھی اس کے ساتھ کہیں جانے کو راضی نہ ہو گی۔ کاشف کو اندازہ تھا۔

"کیا مطلب، ہمارے ماں باپ! کبھی ان کو بھی کچھ پیسے دے دلا کر خوش کر دیں گے۔ تیرا باپ ریڑھی سے دکان والا بن جائے گا۔" اس نے لالچ سے انداز میں اسے بھی لبھایا۔ مگر وہ بھی رانی تھی اپنے نام کی۔

"ارے واہ کاشی! صرف کچھ پیسے نہیں، تو آیا تو وہ تین لاکھ روپیہ دے کر جاؤں گی اور اماں کو سونے کے کڑے اور ہار بنوا کر دینا ہے، بے چاری ساری عمر سونے کے لیے ترسی ہے۔ میں نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ میں اماں کی یہ خواہش ضرور پوری کرواؤں گی۔"

"الو کی پٹھی، کمینی۔" کاشف نے اس کا منصوبہ سن کر دل ہی دل میں اسے گالیاں دی تھیں۔ مگر چہرے

پر اس غصے یا نفرت کے اثرات نہیں آنے دیے تھے۔

"ہاں۔ ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔ مگر پھر تجھے بھی میری بات ماننا ہو گی۔ یہ بھاگنے کے بارے میں کسی کو نہ بتانا۔ ورنہ ہم پکڑے جائیں گے اور اگر پکڑے گئے تو پولیس ہماری ہڈیوں کا سرمہ بنا دے گی۔ ساری عمر نواز اکرم ہمیں جیل میں چکر لگوائے گا۔ اس لیے اپنا منہ بند رکھنا۔ سمجھ گئی۔"

"ہاں ہاں اچھی طرح سمجھ گئی، بچی نہیں ہوں میں۔ جانتی ہوں یہ معاملے۔ تو فکر نہ کر۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر جیسے وعدے سے کاشف کو یقین دلایا تھا۔ مگر یہ وعدہ وہ پورا کر بھی سکے گی یا نہیں یہ یقین کاشی کو نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

فاخرہ کو کئی دن سے بخار اور زکام ہو رہا تھا۔ مگر وہ اپنی لاپروائی کی وجہ سے ڈاکٹر کے پاس جانے کے بجائے گھر پر ہی گولیاں کھا رہی تھی۔ اس کی کھوں کھوں سے عاجز اقبال گجر روزانہ اسے ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دیتا تھا۔ مگر وہ نہ جانے کیوں اپنی طرف سے اس قدر لاپروا ہو گئی تھی کہ باوجود اقبال گجر کی لعن طعن کے وہ اب ڈاکٹر پاس نہیں جا رہی تھی۔ اسے زندگی سے محبت نہیں رہی تھی۔ کاشف کی باتوں اور منصوبوں نے اسے بری طرح توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔

ساری عمر کا غرور اور فخر کہ وہ قوم کے بچوں کو اچھائی اور نیکی کا درس دیتی ہے۔ انہیں حلال حرام کی تمیز سکھانے والی، نماز روزے کا درس دینے والی مس فاخرہ اسلامیات ٹیچر جس سے لوگ اپنے گھریلو مسائل قرآن و سنت کی روشنی میں حل کروانے آتے تھے۔ فقہی مسائل پوچھتے تھے۔ اسی فاخرہ کا بیٹا ایک لڑکی کو شادی کے نام پر دھوکہ دے کر اس کی زندگی برباد کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خوشیوں کو آگ لگا کر اپنی زندگی گل و گلزار بنانا چاہتا تھا۔ اتنا بڑا دھوکہ، فراڈ اور وہ بھی فاخرہ کو ساتھ ملا کر۔ کیسا روح کو کھینچ لینے والا احساس تھا کہ اسے نیم مردہ بنا گیا تھا۔ کئی دنوں سے نزلہ زکام چل رہا تھا۔ رات میں ہلکا ہلکا بخار بھی ہو جاتا تھا۔ مگر اس نے اسکول سے چھٹی نہیں لی۔ ہفتہ اسی طرح چلتا رہا تھا۔ کبھی کھانسی کا سیرپ پی لیا تو کبھی بخار کی دوائی لے لی، مگر اب وہ چار روز سے رات کو چڑھنے والا بخار دن بھر رہنے لگا تھا۔ کمزوری اور نقاہت بڑھ گئی تھی اور اس نے اسکول سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی تھی۔ مگر بخار تو لگتا تھا اسے قبر میں پہنچا کر اترے گا۔

بیماری کے ان ہی دنوں میں اس نے کاشف کو بے انتہا یاد کیا تھا۔ اس نے رانی کے ذریعے اسے پیغام بھی بھجوایا تھا کہ ماں مرنے کو پڑی ہے، اگر مل جاؤ تو ایک بار اپنی شکل دکھا جاؤ، مگر وہ نہیں آیا تھا۔ وہ اس سے مائین والے معاملے پر ابھی تک ناراض تھا اور یہ اطلاع اسے اقبال گجر نے دی تھی۔

"ماں کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں انتظار میں اور وہ۔"

"وہ اپنی شادی کی تیاری میں بزی ہے استانی، نئی دلہن، نیا گھر اور لمبا مال، تیری جیسی پرانی بڈھی، ہر وقت اسلامیات کا لیکچر دینے والی اسے کہاں یاد رہی ہو گی۔" اقبال اس کا جی بھر کر مذاق اڑاتا تھا۔ وہ آنکھوں میں آنسو سمیٹے گم صم ساکت خاموش لیٹی رہتی تھی۔

اقبال گجر محلے کے کمپوڈر نما ڈاکٹر سے دوائی لے آتا تھا۔ جو کبھی تو فاخرہ کھا لیتی تھی اور کبھی کبھی دو دن کی خوراک چار دن پر محیط ہو جاتی تھی اور شاید اسی لاپروائی کا یہ نتیجہ تھا کہ اس کی بیماری دن بدن بگڑتی جا رہی تھی جبکہ علاج نہ ہونے کے مترادف تھا۔

اس روز بھی اس کے جسم میں صبح سے سخت درد تھا۔ کھانسی اور بخار بھی بہت زیادہ ہو رہا تھا۔ اس نے محلے کے ایک بچے کو بھیجا تھا کہ وہ رانی کو بلا لائے۔ مگر رانی اپنے گھر نہیں تھی۔ کاشف کا موبائل نمبر مل نہیں رہا تھا۔ وہ بے حد بے چین اور مضطرب سی اس کے لیے پریشان ہو رہی تھی۔ جب ہی تو اقبال گجر آیا تھا۔

سفید شلوار، بوسکی کی قمیص ـــــ تیلے والا کھسہ، خوب جما کر کی گئی کنگھی اور سستے قسم کے

عطر کی خوشبو کے ساتھ ساتھ سستے برانڈ کی سگریٹ اس کے قریب سے آرہی تھی۔ فاخرہ کے قریب آکر اس نے بڑے فخر اور ادا سے اپنے کرتے کا بازو اٹھا کر سنہرے ڈائل والی گھڑی میں ٹائم دیکھا تھا۔

"لے استانی۔ جارہا ہوں میں تیرے پتر کی جنج میں تو بیمار نہ ہوتی تو میرے ساتھ ہی چلتی پر اب... خیر دعا کرنا سیٹھ نواز اکرم کے گھر جارہے ہیں لے بھئی یہ نوی نکور گھڑی مجھے تیرے پتر کی شادی میں تحفہ ملی ہے۔ اپنی اپنی قسمت ہے استانی! اچھا رب راکھا۔"

وہ بڑے موڈ سے ہاتھ ہلاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ فاخرہ نے پتھرائی نظروں سے اسے جاتے دیکھا۔

"کاشف کی شادی میرے کاشی کی۔" پل بھر میں ممتا نے جوش مارا تھا۔ یک دم اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے ہنستا مسکراتا خوب صورت صحت مند شرارتی سا کاشی آگیا تھا جو اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا تھا اور پھر وہ صحت مند تندرست نوجوان کاشی جس کے لیے دلہن لانے کا خواب اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کردیتا تھا اور دل میں جیسے لڈو پھوٹنے لگتے تھے۔ ہر ماں کی طرح اس نے بھی کاشی کے لیے ایک پیاری سی خوب صورت معصوم سی دلہن لانے کا خواب سوچا تھا۔ مگر یہ خواب اتنا بھیانک ہوگا اسے اندازہ نہ تھا۔

اور آج...

آج وہ بیاہنے جارہا تھا تو ماں بستر مرگ پر پڑی تھی اور اسے کچھ علم نہ تھا۔ یک دم اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا تھا۔ اور وہ کھانستے کھانستے کمزوری سے نڈھال ہوکر بستر پر اوندھی گر پڑی تھی۔ لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے اس نے بمشکل خود کو سنبھالا دیا تھا۔ مگر لگتا تھا اس کا آخری وقت قریب آگیا ہے اور کسی بھی لمحے وہ مرجائے گی۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا معاملہ ہے بھئی' یہاں تو نہ جنج ہے نہ دولہا' نہ گھوڑا' نہ باراتی' کدھر گئے سارے..."

اقبال گجر نے اپنا بوسکی کا کرتا دامن سے اٹھا کر حیرانی سے چاروں جانب دیکھا تھا' یہ کاشف کا چھوٹا سا فلیٹ تھا جو اسے آفس کی جانب سے رہائش کے لیے ملا ہوا تھا۔ اور یہیں سے تمام لوگوں کو مل کر بارات کی شکل میں نواز اکرم کے گھر جانا تھا تب ہی وہ بہت تیار ہوکر مونچھوں کو تاؤ دیتا آیا تھا کہ نواز اکرم کے گھر سے کاشف کا باپ ہونے کی حیثیت سے کوئی نہ کوئی بھاری مالیت کا تحفہ ملے گا' یک دم جیسے مایوسی سے اس کی مونچھیں لٹک گئی تھیں۔

"بارات چلی گئی' بیو کے بغیر' اقبال گجر کے بغیر' مگر ابھی تو ویاہ ہی نہیں ہوا' میں تو آدھا گھنٹہ پہلے ہی آگیا ہوں تو پھر سب کدھر... اوئے... اوئے ہوئے۔"

حیرت سے سوچتے سوچتے وہ یک دم بری طرح چونکا تھا۔ گھبرا کر چاروں جانب خالی کمرے کو دیکھا۔

"کاشف کی گمشدگی کا مطلب۔" پل بھر میں اس کا دماغ بہت آگے تک سوچ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے موبائل نکال کر کاشف کا نمبر ملایا۔

"آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے' برائے مہربانی کچھ دیر بعد ٹرائی کریں۔" بار بار ایک ہی جواب مل رہا تھا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے موبائل کو دیکھا تھا کہیں دور جیسے سرخ بتی جل بجھ رہی تھی۔ اس نے فوراً نواز اکرم کا نمبر ملایا۔

"ہیلو' اقبال صاحب۔" نواز اکرم نے دوسری ہی بیل پر فون ریسیو کرلیا تھا۔

"جی... جی سیٹھ صاحب۔" اقبال ہکلایا۔ فون ملانے کے بعد اب اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے نواز اکرم کو فون کرکے غلطی کی ہے۔

"اقبال صاحب! کہاں ہیں آپ لوگ' یہاں ہم آپ کا انتظار کررہے ہیں۔ آپ لوگ لیٹ ہیں' اور کاشف کہاں ہے' اس کے موبائل پر بھی کال...۔" نواز اکرم متفکر لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اقبال کی پوری انگلی بے اختیار سرخ نشان والے بٹن پر جا ٹھہری تھی۔ اس نے نواز اکرم کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی فون کاٹ دیا۔

"اوئے ہوئے' یہ کیا ہوگیا اقبال۔" اس نے سر پر ہاتھ رکھ کر ساری صورت حال سمجھنے کی کوشش کی۔ عین وقت پر کاشف کا غائب ہونا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ماہین سے شادی کے لیے اس نے کتنے جیلے بنائے تھے۔ پاپڑ بیلے تھے۔ منصوبہ سازیاں کی تھیں' اقبال جیسے بندے کو اپنا باپ بنایا تھا۔ اور اس سب کے بعد اس کا عین شادی سے قبل بھاگنا کیا معنی رکھتا تھا۔

"اس نے بھاگنا تھا مگر اس وقت...!" اقبال جانتا تھا کہ وہ ماہین کے ساتھ مستقل نہیں رہے گا۔ اسے کبھی نہ کبھی طلاق دے کر رولی سے شادی کرے گا مگر اس وقت' اقبال نے پریشانی سے کرسی پر بیٹھ کر سر پر ہاتھ مارا۔

"اب تیرا کیا ہووے گا بالے' نواز اکرم تجھے نہیں چھوڑے گا۔ تو کاشف کا باپ ہے اور... ہائے ہائے اب میں پھنس گیا' اوئے تیرا بیڑا غرق کاشی' تو مجھے جاتے جاتے بھی پھنسا گیا ہے۔ ہائے میں کدھر جاؤں' کہاں جاکے چھپ جاؤں۔ نواز اکرم تو مجھے ڈھونڈ لے گا اور میرا حشر کردے گا' لے بھئی بالے' یہ تو وہی ہوا' کمائی چار آنے' لٹائی بارہ آنے۔ نکل یہاں سے' بھاگ لے' ورنہ ابھی وہ نواز سیدھا یہاں ہی آئے گا۔"

اقبال گجر نے منٹوں میں فیصلہ کیا تھا اور اگلے ہی پل وہ وہاں سے نکل کر بھاگتا ہوا گلی پار کرکے سڑک پر آگیا تھا اور سامنے سے آتی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر اس میں سوار ہوگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"نواز... کیا بات ہے' دس بج رہے ہیں' بارات کا ٹائم آٹھ بجے کا تھا۔ فون کرو کاشف کو کہاں رہ گئے ہیں وہ۔" سارا تھوڑی بلو ساڑھی میں وائٹ گولڈ کا خوب صورت قیمتی سیٹ پہنے بے حد حسین لگ رہی تھی۔ فکر مندی سے اس نے نواز کے قریب آکر کہا تو وہ بے اختیار چونکا' موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔

"میں... میں فون کررہا ہوں سارا! مسلسل فون کررہا ہوں مگر... مگر کاشی کا نمبر بند مل رہا ہے۔" نواز اکرم شدید بے بسی لہجے میں رو دینے کو تھا' سارا نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔

"کیا مطلب! بند ہے تو اس کے باپ کا ملاؤ' کسی دوست کا۔" سارا نے جھنجلا کر اسے ٹوکا۔

"کرچکا ہوں' سب ہی کے موبائل آف ہیں۔" نواز اکرم کا کپکپاتا لہجہ' سہما ہوا انداز اور آنکھوں میں خوف و ہراس کی پرچھائیاں' سارا نے اب کے واقعی بغور حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا مطلب! یعنی سب کے فون آف ہیں۔ کہیں خدانخواستہ کوئی حادثہ۔" اس کے قیاس کے گھوڑے یہاں تک ہی دوڑ سکتے تھے۔

"نہیں... ایکسیڈنٹ نہیں...۔" نواز کے منہ سے سرسراتی آواز سارا کو کسی طوفان کی آمد سے کم نہیں لگی تھی۔ وہ بری طرح ٹھٹکی' اسی پل اس کی ساڑھی کا ریشمی پلو اس کے سڈول' دودھیا' مرمریں بازو سے ڈھلکا تھا۔ سفید اجالا سا اردگرد پھیل گیا تھا۔ مگر یہ وقت سفید اجالا دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والا نہیں تھا۔ اس پل تو تشویش' فکر مندی' اندیشے' خوف تھے' جو آنکھوں میں بھوت بنے کھڑے تھے۔

"پھر...!" اب کے سارا کے منہ سے جیسے خوف زدہ سی سسکی نکلی تھی۔

"پھر پتا نہیں کیا' کیا بات ہے سارا' میرا دل بیٹھا جارہا ہے' مجھے لگتا ہے کوئی انہونی ہوگئی ہے۔ کوئی حادثہ' کاشف نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے' وہ... وہ...۔"

نواز اکرم کا رنگ سیاہ تھا' مگر اب سیاہی مائل پیلا زرد ہوگیا تھا۔ اس کا منہ سوکھا ہوا اور لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ سارا کو ساری صورت حال سمجھنے میں پل لگا تھا۔

(باقی آئندہ)

آمنہ ریاض

ستارہ شام

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خونِ جگر سے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے جو وہ اپنے چھ مربعہ زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں رواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوبصورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی جنت کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے روز و شب نوکری کی چکی میں پستے گزر رہے ہیں۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ بہتر مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا ہے۔ ہجوم اس کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے جنت بی بی حراست میں ہے جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگم بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت بی بی شیزوفرینیا کی مریض ہے جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی شکن کا شکار کر گئی ہے جسے اس نے نوکروں کے سہارے طلوع گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

شبیہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آتی ہیں تو انہیں قمر صاحب کے بتائے گئے بنگلے تلاشنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست قمر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ نزہت بیگم ملنسار اور نیک خاتون ہیں۔ ولی، ولید اور انیا ان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں انیا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

شبیہ العباس طبعاً سخت گیر اور غصہ ور نوجوان تھے۔ جسے صنفِ نازک کا کمزوری بننا بالکل ناگوار گزرتا ہے۔ وہ نازتوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے نالاں ہے۔ شبیہ تنوی کو کال ... ہے تو سہیلیاں





عبیرہ اور ہیرہ، شتوی کے سر ہو جاتی ہیں، وہ یہ جان کر کہ عبیرہ شتوی کا منیجر ہے۔ وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ شتوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروج کو اس کی بات کا علم نہ ہو۔

ثمینہ بیگم، ثروت دانیال کی اولاد ہے جسے انہیں دانیال حسن سے شادی سے پہلے چھوڑنا پڑا۔ بچپن کی محرومی نے اسے بدمزاج اور فصیلا بنا دیا۔ وہ زنیا اور علیہ سے بہت ترشی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے بحیثیت بہن بھائی قلبی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ زنیا اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ زنیا پر بری نظر ڈالنے پر وہ جے ڈی کے دوست سعدی کو پیٹ ڈالتا ہے۔ صرف جے ڈی اس کی کیفیات سمجھتا ہے۔

بیمار پڑنے پر بیگم دانیال، ثمینہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہے تو ثمینہ ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ انہیں بیگم دانیال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پہلے ان سے مل چکی ہیں۔

بچوں کی لڑائی میں جنت کو چوٹ لگتی ہے تو دین محمد اپنی بہن زبیدہ کے بیٹے فاروق کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ ساتھ ہی زبیدہ بہن اور رفیق بھائی سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ زہرہ اس کی جنت سے طوفانی محبت سے خوف زدہ ہے۔ دین محمد، زہرہ کو یاد کرواتا ہے کہ وہ جنت کو بیاہ کر دوسرے گھر نہیں بھیجے گا بلکہ اس کے شوہر کو گھر داماد بنائے گا۔

اتفاقاً ہادی کا ٹکراؤ ثمینہ سے ہوتا ہے جس سے ہادی کا سر زخمی ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود جھنجلاہٹ میں ثمینہ ہادی کو بری طرح سے ڈانٹتی ہے تو ہادی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ ثمینہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔

ثمینہ کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ہادی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے۔ جس پر ثمینہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ ثمینہ اسے گھر بلاتی ہیں۔ ثمینہ، ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر جب کار ایکسیڈنٹ سے قتل ہوا تھا۔ اور یہ بات ہادی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیہہ، جے ڈی کا اپنی ماں اور ثمینہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں جس پر وہ جے ڈی کو تنبیہہ بھی کرتا ہے۔

انیہا دل ہی دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب ثمینہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے۔ ہادی ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان ہادی سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں کے اصرار پر اس لیے ثمینہ ہادی کو پاکستان میں مزید رہنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔

عبیرہ، نمو اور شتوی کو عوش کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیرہ کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے۔ وہ عوش کے متعلق ثبوت اکٹھا کر رہی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد، بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب ہی حق دق رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی حالت پر دین کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے جاتے ہیں۔ دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سناتا ہے۔ وہ اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ جنت کے اندر پنپنے والی منفی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۱۵

پندرہویں قسط

جنت نے اپنی چوٹیا کے بل کھولتے ہوئے گردن موڑ کر دیکھا۔ ولاور حسین پلنگ پر اوندھے منہ لیٹا گہری نیند سو رہا تھا اور سوتے ہوئے بھی کتنا پیارا لگ رہا تھا۔ جنت نے دل ہی دل میں بے اختیار اعتراف کیا کہ اس کے باپ نے یقیناً ایک بہترین شخص کو اس کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ سر جھٹک کر اپنے بکھرے ہوئے لانبے بالوں کو کنگھی کی مدد سے سلجھانے لگی۔

شادی کے دن قریب آنے کے ساتھ ساتھ اس کی اپنے باپ سے ناراضی میں اضافہ ہوتا گیا تھا کہ وہ اس کی شادی زبردستی اس سے دگنی عمر کے آدمی سے کر رہا تھا۔ ویسے اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی۔ اس دور میں ایسی شادیوں کو معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ قابل اعتراض بات یہ تھی کہ اسے فاروق پسند تھا اور اس کے باپ کو اس بات کی رتی بھر بھی پروا نہیں تھی۔ ضدی اور منہ زور ہونے کے باوجود جنت میں اتنی ہمت نہ تھی کہ باپ کے سامنے احتجاج کر سکے۔

بہرحال ولاور حسین سے پہلی ملاقات کے بعد ہی اسے اپنے شوہر سے بے پناہ محبت ہو گئی تھی اور فاروق کا خیال ساون کے اس بادل کی طرح اس کے ذہن سے نکل گیا تھا جو بن برسے گزر جاتا ہے۔

ولاور حسین اس سے دگنی عمر کا تھا لیکن اس نے جنت کا دامن محبت سے بھر دیا تھا۔ وہ دن رات جنت کو سراہتا تھا۔ اس کے حسن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا تھا۔ اسے دیوی، پری، حور اور جانے کیا کیا کہتا اور جنت خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان قرار دیتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ فاروق کی طرح نہیں تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جنت کو ولاور حسین سے محبت بھی جلدی ہو گئی تھی۔

دین محمد کی بے جا محبت نے جنت کو بگاڑا تھا تو ولاور نے اسے سر پر چڑھا لیا اور جنت بھی اب قریب قریب اس عمر میں پہنچ چکی تھی جہاں انسان اپنے مزاج اور رویوں پر غور کرنا شروع کر دیتا ہے لیکن جنت نے ایسی کوئی زحمت گوارا نہ کی۔ ولاور حسین کی ستائش نے اس کی خود پسندی میں اور بھی اضافہ شروع کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ جنت خود کو عام انسانوں سے بالاتر سمجھنے لگی۔ وہ اپنے باپ کو جتلاتی تھی کہ باپ کی اندھی محبت نے اسے بہت ساری چالاکیاں اور ہوشیاریاں سکھا دی تھیں جو لڑکی اپنے باپ سے جھوٹ سچ کہہ کر سوتیلی ماں کو جوتے پڑوا سکتی تھی اس کے لیے کیا مشکل تھا کہ شوہر کو قابو میں رکھنے کے حربے نہ اختیار کر پاتی۔

جس طرح کھانے میں شکر حد سے زیادہ بڑھ جائے تو کڑواہٹ محسوس ہونے لگتی ہے تو یہی معاملہ جنت کے ساتھ تھا۔ اسے محبت اتنی زیادہ ملی تھی کہ محبت کی مٹھاس نے کڑواہٹ کی صورت اختیار کر لی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے پتا تھا کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہو رہا ہے جو ہمارے لیے پریشان کن ہے۔ یوں ہی تو میرا دل نہیں گھبرا رہا تھا۔" انیہا فون بند کر کے ولید کی طرف پلٹی۔ اس کے انداز میں سراسیمگی نمایاں تھی۔

"کیا ہوا ہے انو!" ولید نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ممی ہاسپٹلائزڈ ہیں پچھلے تین روز سے۔ مجھے ابھی روشی نے بتایا ہے۔" انیہا نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" ولید نے کہا۔ "ممی تین روز سے ہاسپٹلائزڈ ہیں اور کسی نے ہمیں خبر بھی نہیں دی۔"

"روشی کہہ رہی تھی کہ وہ سب ممی کی بیماری سے بہت پریشان ہو گئے تھے۔ اسی پریشانی میں انہیں کسی کو اطلاع دینے کا خیال ہی نہیں آیا۔" روشی ان لوگوں کی ماموں زاد تھی۔

"ممی کو ہوا کیا ہے۔ روشی نے کچھ بتایا؟" ولید نے پوچھا۔

"صرف یہی کہ ممی اچانک بے ہوش ہو گئی تھیں، جب انہیں اسپتال لے کر گئے تو ڈاکٹرز نے ایڈمٹ کر لیا اور ان کی انوسٹی گیشن ہو رہی ہے۔ ابھی کوئی فائنل رپورٹ نہیں ملی۔" انیہا نے روہانسی ہو کر کہا۔

"ٹھیک ہے، تم سامان پیک کرتے ہیں۔" ولید نے حتمی انداز میں کہا، انیہا نے استعجابیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو جلدی سے بولا۔

"ہم اسلام آباد جا رہے ہیں، میں جب تک ممی کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لوں گا، میری تسلی نہیں ہو گی۔"

"لیکن ولید! ڈیڈی؟" وہ تذبذب کا شکار ہو کر بولی۔ ولید نے ایک لمحے کے لیے رک کر سوچا۔

"تمہیں فون پر انفارم کر دو، لیکن اس سے بھی پہلے اپنی اور وہاں کی تیاری مکمل کر لو، میں سیٹس کنفرم کروا لیتا ہوں۔" وہ سرعت سے لینڈ لائن کی طرف بڑھا۔

"اور اگر ڈیڈی نے جانے سے منع کر دیا تو۔" انیہا کا خدشہ زبان پر آیا۔

"وہ منع نہیں کریں گے اور اگر ایسا ہوا تو بھی میں تمہیں روکوں گا نہیں، ممی کے ساتھ ڈیڈ، فرینڈز ان کے ہیں، میرے یا تمہارے نہیں کہ ہم اپنی ماں کی بیماری میں ان کے پاس نہ جا سکیں۔" ولید کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

"اب یہاں کھڑی رہ کر سوچو مت، ہمارے پاس پہلے ہی وقت کم ہے۔" انیہا ایک دم ہوش میں آ کر اپنے کمرے کی طرف دوڑی تھی۔

✡ ✡ ✡

دلاور حسین سے بے تحاشا محبت کے باوجود کچھ اعتراضات تھے، جو جنت کو بری طرح کھٹکتے تھے۔ سب سے پہلا اعتراض جنت کو دلاور حسین کی فرماں برداری پر تھا، جس کا مظاہرہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے باپ کے سامنے کرتا تھا۔ جنت کو دلاور حسین کا ہر بات پر اپنے باپ کے سامنے سر جھکانا برا لگتا تھا۔ باپ کی کہی ہوئی ہر بات دلاور حسین کے لیے پتھر پر لکیر کی سی حیثیت رکھتی تھی۔

جنت نے سب سے پہلے بے حد سمجھ داری کے ساتھ سسر کا اثر و رسوخ گھر میں ختم کروانا شروع کر دیا۔ جہاں جتنا ضروری سمجھتی سسر کو اہمیت دیتی ورنہ دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکتی۔ غیر محسوس انداز میں دلاور کے کان اس کے باپ کے خلاف بھرتی رہتی اور اسے باپ کے فیصلے ماننے سے انکار کرنے پر اکساتی۔ ماموں اور دیور اس کے پہلے ہی شادی شدہ تھے اور اپنی الگ الگ گھر گرہستیاں سنبھال رہے تھے۔ پہلے دن سے ہی جنت نے انہیں زیادہ اہمیت دینا ضروری نہ سمجھا تھا۔ سب سے بس کر بات کرتی تھی اور ان کے منہ پر میٹھی بنی رہتی تھی، لیکن منظر سے ہٹتے ہی وہ بہت چالاکی سے کوئی ایسی چال چل دیتی کہ مڑ کر کوئی اس کے گھر آنے کی جرأت نہ کرتا۔

دوسرا بڑا اعتراض جنت کو دلاور کی مرحومہ بیوی کی اولاد سے تھا، اس معاملے میں اس کے سسرال کی طرف سے غلط بیانی سے کام لیا گیا تھا۔ دلاور کے پہلی بیوی سے ایک نہیں دو بچے تھے۔ بڑا بیٹا رجب تقریباً چھ سال کا تھا جبکہ چھوٹی بچی دو سال کی تھی۔ اسی بچی کی پیدائش کے وقت پیچیدگیاں ہو جانے کی وجہ سے دلاور حسین کی پہلی بیوی جانبر نہ ہو سکی تھی اور بچی کی پیدائش کے اگلے روز فوت ہو گئی تھی۔

دونوں بچے جنت کو زہر لگتے تھے۔ بچی اس لیے کیونکہ وہ بہت روتی رہتی تھی اور رجب، دلاور حسین کا بے حد لاڈلا ہونے کی بنا پر جنت کو برا لگتا تھا۔ وہ ہر ممکن حد تک اسے ڈرانے دھمکانے کی کوشش کرتی، لیکن رجب کچھ زیادہ ہی سر چڑھا بچہ تھا۔ وہ جنت کا منہ چڑا کر اسے جھکا دیتا، منہ کھینچ کر بھاگ جاتا۔ جنت دلاور سے اس کی شکایت کرتی تو وہ ہنس کر ٹال دیتا اور رجب کو سرزنش کرنے کے بجائے جنت کو سمجھانے لگتا۔

"بچہ ہے ابھی، تم پیار سے سمجھاؤ گی تو سمجھ جائے گا، آخر کو ماں ہے تو رجب کی۔"

اور اس بات پر جنت دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتی۔ اسے کسی پرائی عورت کے بچوں کی ماں بننے کا شوق نہیں تھا۔ کبھی اس نے خود سے یہ سوال نہیں کیا کہ جب وہ کسی پرائی عورت کے مرد کی بیوی بن سکتی ہے تو اس پرائی عورت کے بچوں کی ماں بننے میں کیسی اٹکاوٹ؟ کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ شاید وہ بھی بشریٰ کے لیے ایسا ہی بچہ ثابت ہوئی ہوگی، جیسا رجب اس کے لیے ثابت ہو رہا ہے، لیکن رجب اس کے مقابلے میں بہت معصوم تھا۔ اس کی شرارتیں بہت بے ضرر قسم کی ہوتی تھیں، بلکہ اگر غیر جانب داری سے موازنہ کیا جاتا تو رجب کی شرارتیں جنت کی عیاریوں کا عشر عشیر بھی نہیں تھیں، لیکن چونکہ جنت کے پاس غیر جانب دار نظر نہیں تھی، اس لیے رجب کی شرارتیں اسے رجب سے نفرت کرنے پر مجبور کرتی تھیں۔

چند مہینے اپنے تئیں تحمل سے گزارنے کے بعد بالآخر جنت کے منصوبہ ساز ذہن نے ایک چال تیار کر لیا تھا۔ جس میں جنگ کر وہ نہ صرف دلاور کو اپنے مٹھی میں کر سکتی تھی، بلکہ اس سے ہر طرح کا فیصلہ بھی کروا سکتی تھی۔

✡ ✡ ✡

گلابی جھیلی ہاتھ پر جلی ہوئی تھی۔ دلاور حسین نے اسے عجب صورت بیوی کے نئے نئے عشق میں مبتلا دل پر گھونسا سا لگا۔

"یہ سب کیا ہے؟" فکر مندی سے بے حال ہوتے اس نے پوچھا۔

"رجب ضد کر رہا تھا، میں نے منع کیا تو اس نے مجھے زور سے دھکا دے دیا، گرتے ہوئے میرا ہاتھ چولہے میں جلتی لکڑی سے ٹکرا گیا۔ میں جلدی سے ہاتھ پر پانی ڈالنے لگی تاکہ جلن کچھ کم ہو تو رجب نے لکڑی اٹھا کر دوبارہ میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ ابا جی سامنے بیٹھے سب دیکھتے رہے، انہوں نے رجب کو ایک بار بھی نہیں روکا۔" جنت نے عیاری سے سسکتے ہوئے اسے بتایا۔ دلاور حسین نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، رجب کو پکڑ کر اتنا مارا کہ روتے روتے اس معصوم کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ رجب باپ کے ہاتھوں پہلی بار مار کھا رہا تھا، اس بے چارے کو تو اپنی غلطی کا علم بھی نہیں تھا کہ سزا کا ادراک ہوتا۔ باپ سے پٹتے ہوئے وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا رہا، لیکن دلاور حسین بیوی کی محبت میں اندھا اور غصے کے ہاتھوں پاگل ہو چکا تھا، اسے رجب پر رتی بھر بھی ترس نہیں آیا۔ یہاں تک کہ بچہ پٹنے کے بعد صحن کے ایک کونے میں خوف اور تکلیف سے ہچکیاں بھرتا سو گیا۔

حسین احمد کی واپسی اس روز رات گئے ہوئی تھی۔ رجب کی حالت دیکھ کر اس نے دلاور کی خبر لینے کا ارادہ کیا، لیکن اس سے بھی پہلے دلاور نے باپ کی ایسی خبر لی کہ حسین احمد کی طبیعت صاف ہو گئی اور وہ اسی وقت اپنا سامان باندھنے لگے۔

"میں اب اپنے چھوٹے بیٹے کے پاس رہوں گا۔" اس نے اعلان کر دیا۔

"شوق سے ابا! خواہ مخواہ ذرا سی بات پر دنیا کو تماشا دکھانے کی ضرورت نہیں۔" دلاور نے کڑے لہجے میں کہا۔

"اور جو تو نے کیا وہ تماشا نہیں تھا؟ باپ کو ذلیل کیا، اپنی عورت کے کہنے پر بیٹے کو مار کے ادھ موا کر دیا۔"

"کوئی غلطی کرے تو اسے سمجھانا نہیں چاہیے کیا؟" دلاور نے جل کر کہا۔

"غلطی تو کر رہا ہے دلاور حسین! اپنی بیوی کی ہر بات مان کر دنیا کو تماشا بھی تو ہی دکھائے گا، اسی عورت کی بات مان کر۔ مجھے افسوس ہے تیرے لیے اس لڑکی کا انتخاب میری زندگی کی سب سے بڑی حماقت تھی۔ یہ منحوس۔"

"جنت کو منحوس نہ کہو ابا! تم نہیں جانتے یہ کتنی بخت آور ہے، اسی کے نصیبوں سے مجھے ترقی مل رہی ہے۔"

"ہونہہ۔ بخت آور۔ اس عورت نے سوچنے سمجھنے جتنی عقل چھوڑی تیرے اندر تو تو سب سمجھ جائے گا۔"

ایسی عورت کسی کام کی نہیں ہے جو اپنی نسل بڑھا نہیں سکتی۔"

حسین احمد نے بد دعا بھی دی تھی یا پیش گوئی کی تھی۔ دلاور حسین نے پروا کیے بغیر جنت سے شادی کر لی۔ حسین احمد، رجب اور اس کی بہن کو جنت کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنے چھوٹے بیٹے کے یہاں چلا گیا جہاں اس کی عزت و قدر اس گھر سے تو کہیں زیادہ تھی۔

✡ ✡ ✡

یہ زندگی کا نیا دور تھا، ہر چیز منفرد اور بدلی بدلی سی محسوس ہوتی۔ دلاور حسین کی محبت اسے جن جذبوں سے روشناس کروا رہی تھی۔ اس کا کوئی نعم البدل ہو ہی نہیں سکتا تھا، لیکن اس محبت نے بھی اس کی شخصیت میں کوئی سُدھار پیدا نہ کیا، الٹا اس کے اندر کی حاکمیت پسند، ضدی، خود سر اور خود اپنے عشق میں مبتلا عورت زور پکڑتی چلی گئی۔

شاید غلطی اس کی بھی نہیں تھی، دراصل غلط تربیت تھی جو اسے باپ کے گھر ملتی رہی۔ جس عمارت کی بنیاد ہی صحیح نہ رکھی جائے اس عمارت کے سیدھے کھڑے رہنے کے امکانات ہمیشہ کم ہوتے ہیں، لیکن انسان اور پتھر، گارے، اینٹ سے بنی عمارت میں فرق ہوتا ہے۔ عمارت کے پاس سوچنے سمجھنے اپنا احتساب کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ انسان کے پاس ہوتی ہے، یوں ہی تو اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات نہیں بنا دیا۔

بہرحال جنت نے دل ہی دل میں خود کو بہت ہی اعلا و ارفع مقام دے رکھا تھا۔ دوسرے انسان اسے حقیر کیڑے مکوڑے نظر آتے تھے، گو کہ دلاور سے اسے محبت تھی، لیکن کبھی کبھار وہ بھی اسے ایسا شخص لگتا جو اس کی پرستش کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی عقل بھی چھوٹی چھوٹی ڈوریوں سے بندھی جنت کی انگلیوں میں قید تھی، وہ جس طرف اور جس طرح چاہتی اسے موڑ دیتی۔

حسین احمد کے قطع تعلق اختیار کرتے ہی اسے بچوں کے معاملے میں گویا کھلی چھوٹ مل گئی تھی۔ وہ معمولی معمولی باتوں پر انہیں مارتی پیٹتی، سزا کے طور پر اندھیرے کمرے میں بند کر دیتی اور کبھی کبھار کھانا بھی روک دیتی۔

پھر ان ہی دنوں اسے پہلی خوش خبری نصیب ہوئی۔ وہ خوش خبری جو عورت کو مکمل ہونے کا احساس دلاتی ہے اور کڑے سے کڑے مزاج والی عورت کے دل میں بھی گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن جنت کے ساتھ الٹا ہی ہوا۔ رجب اور اس کی بہن کے لیے دل میں مزید کدورت آ گئی۔ اسے لگتا یہ دونوں منحوس اس کے بچے کا حق چھین لیں گے۔ تب ہی اس نے دونوں بچوں پر سختیاں اور بڑھا دیں۔

وقت گزرتا رہا، اپنے مخصوص بہاؤ اور رفتار کے ساتھ، لیکن اس دوران بہت سے چھوٹے بڑے واقعات رونما ہوتے رہے جو بظاہر معمولی تھے، لیکن زندگی کے کینوس پر انہوں نے اپنا گہرا رنگ چھوڑا۔

دلاور حسین کو ایک کے بعد ایک ترقی ملتی رہی، ہر ترقی کے ساتھ اس کی تنخواہ اور پیسے کا بھی اضافہ ہوا۔ دلاور حسین اسے جنت کی بخت آوری اور اس کی قسمت کا رزق قرار دیتا۔

پہلے سال جنت نے دو جڑواں بیٹوں کو جنم دیا۔ گود میں اولاد خصوصاً بیٹوں کے آتے ہی جنت کی حیثیت دلاور کی زندگی میں اور بھی مضبوط ہو گئی جبکہ رجب اور اس کی بہن چند قدم اور پیچھے دھکیل دیے گئے۔ سن پینسٹھ کی جنگ میں جب دلاور حسین کو محاذ پر جانا پڑا تو اس نے جنت کو بچوں کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ جنت نے اس کی بات کا مان رکھا اور بچوں کا بے حد خیال رکھا، لیکن یہ بچے وہ تھے جنہوں نے اس کے بطن سے جنم لیا تھا۔ رجب سے تو خیر اسے چڑ تھی ہی، وہ تھی بچی جو کم عمر اور جسمانی طور پر خاصی کمزور تھی، اس کی بھی جنت نے کچھ خاص پروا نہ کی۔ نتیجتاً بچی تپ دق میں مبتلا ہوئی اور بروقت مناسب علاج معالجہ نہ ہونے کی وجہ سے مر گئی۔

اس واقعے کے بعد رجب کے دل میں جنت سے نفرت میں کچھ اور اضافہ ہوا۔ اس نے جنت کا ایک ایک ظلم دیکھا تھا، اپنی ذات پر سہا تھا، یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس سے نفرت محسوس نہ کرتا۔ ساتھ ہی ساتھ رجب کے خوف میں بھی اضافہ ہوا تھا، جنت اسے چھل پیری لگتی تھی، جس کے بارے میں گاؤں کے دوست نے بتایا تھا کہ سالہا سال سے گاؤں کے قبرستان میں ڈیرہ ڈالے بیٹھی ہے اور موقع ملتے ہی لوگوں کے گھروں میں گھس کر ان کے بچے کھا جاتی ہے۔

رجب کو لگتا تھا، اس چھل پیری نے قبرستان چھوڑ کر اس کے گھر کو اپنا مسکن بنا لیا ہے۔ پہلے اس کے باپ کو چھین لیا، پھر اس کی بہن کو کھا گئی، اب وہ وقت دور نہیں جب وہ اسے بھی کھا جائے گی۔

بے چارے کو خوف سے رات رات بھر نیند نہیں آتی تھی، برآمدے کی کونے والی چارپائی پر دبکا بیٹھا رہتا، لیکن کون تھا جو اس خوف کی قید سے آزاد کرا کے اسے اپنے بازوؤں میں چھپا لیتا۔ ماں کو اللہ نے لیا اور باپ کو سوتیلی ماں نے۔

رجب کی زندگی غموں اور خوف سے ۔۔۔۔ بھری ہوئی تھی۔

✡ ✡ ✡

جنت سے دلاور حسین کی شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور ان کے جڑواں بچے سات سال کے تھے، جب ایک رات انہوں نے بڑے بیٹے کو صحن میں کھیلتا دیکھ کر دلاور حسین کے خدشات میں تشویش ناک حد تک اضافہ ہوا تھا۔ بچہ چلنے کی کوشش میں بار بار گر رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اس کی ٹانگوں میں جان ہی نہ ہو۔ شام سے رات گئے تک وہ بے حد فکرمند رہا۔

"تو اس میں فکرمندی کی کیا بات ہے؟" جنت نے اس کی بات سن کر لاپروائی سے کہا۔ "بچے تو کھیل کود میں تھک کر گر ہی جاتے ہیں، آپ اتنی سی بات کے لیے تمام اپنی اور میری نیند برباد کرو گے۔"

لیکن دلاور حسین جانتا تھا بات اتنی سی سے کچھ زیادہ پریشان کن تھی، تب ہی اگلے روز وہ دونوں بچوں کو شہر کے بہترین ڈاکٹر کے پاس لے آیا۔ گو کہ جنت نے بے حد اعتراض کیا تھا، اس کا خیال تھا یہ شہری ڈاکٹر انگریزی دوائیاں کھلا کر معدہ خراب کر دیتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے بچے تو بیمار بھی نہیں تھے۔

"اور کتنے بچے ہیں؟" ڈاکٹر نے دونوں بچوں کے بہت سارے ٹیسٹ اور تفصیلی چیک اپ کرنے کے بعد دلاور حسین اور جنت سے پوچھا۔

"دو بیٹے اور ہیں اور سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔" دلاور نے جواب دیا۔

"ان میں سے بھی کوئی جڑواں ہے؟" ڈاکٹر نے پھر پوچھا۔

"نہیں۔"

"بہتر ہوگا، آپ ان تینوں بچوں کا بھی چیک اپ کروا لیں اس طرح کی بیماریاں اگر ایک بچے میں ہوں تو امکان ہوتا ہے کہ خاندان کے باقی بچے بھی متاثر ہو سکتے ہیں۔ آپ کے تو پھر دو بچے ذہنی معذوری کا شکار ہیں۔"

ڈاکٹر نے جیسے دلاور کے سر پر دستی بم دے مارا تھا۔ اس کے خدشات درست ثابت ہو چکے تھے۔ اگلے روز اس نے اپنے باقی تینوں بچوں کا بھی معائنہ کروایا اور جو تفصیلات اسے ڈاکٹر نے بتائیں وہ ساری تفصیلات عام فہم انداز میں اس نے جنت کے گوش گزار کر دیں۔

"ہمارے دونوں بچوں کے دماغ عام بچوں کے مقابلے میں بہت چھوٹے ہیں۔ وہ نہ عام بچوں کی طرح بڑھ سکتے ہیں، نہ کھا پی سکتے ہیں، نہ کوئی اور کام کر سکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ سات سال کی عمر میں بھی ان دونوں کا رویہ کسی



دماغی بلاتیں سال کی عمر کے بچے جتنا ہے۔ میں نے تمہیں بہت پہلے ہی کہا تھا جنت ہمارے بچے عام بچوں کے جیسے نہیں ہیں۔ ان کا دیر سے چلنا ــــــ اور پھر چلتے ہوئے گر جانا، ہر وقت رال بہتے رہنا، اپنی بنیادی ضروریات کے لیے بھی کسی کو نہ پکارنا کوئی یہ معمولی باتیں ہیں۔ لیکن سات سال کی عمر میں یہ معمولی باتیں نہیں رہتیں۔ ڈاکٹر کہتا ہے یہ مرض اب ہماری نسلوں میں آگے تک چلے گا۔ ہمیں احتیاط کرنا ہو گی۔ اگر ان دونوں کے مرض کا پہلے پتا چل جاتا تو ہم باقی تینوں کو بھی بچا سکتے تھے۔"

وہ بستر پر لیٹا کمرے کی چھت پر نظریں ٹکائے شکستہ آواز میں رک رک کر بول رہا تھا۔ اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ جنت نے کچھ باتیں سمجھیں، کچھ نہیں۔

"تو کیا باقی تینوں بھی؟" جنت بری طرح چونک گئی۔

"مستقیم اور زرین بالکل ٹھیک ہیں۔ لیکن مصطفیٰ کا آئی کیو لیول کم ہے۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"مطلب۔ تو یوں سمجھو۔ بڑے والے دونوں کی طرح اس کا دماغ چھوٹا نہیں ہے۔ لیکن سمجھنے کی صلاحیت کم ہے۔" دلاور نے اسے بات عام ترین اور آسان طریقے سے سمجھائی۔

"تم فکر نہ کرو جی! یہ کوئی اتنی فکر مندی کی بات نہیں ہے۔ ہمارے گاؤں میں بابا فردوس ہوا کرتا تھا۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی کم تھی۔ لیکن اسے تو کسی ڈاکٹر نے یہ آئی کیو لیول کم ہونے کا نہیں کہا۔ اچھا خاصا خوش خوش پھرتا ہے۔" جنت نے کہا۔

"وہ اس لیے پاگل عورت! کہ بابے فردوس کی شادی ہی نہیں ہوئی، نہ نسل آگے بڑھی، نہ پاگل پن، ہم نے اپنے بچے بیاہنے بھی ہیں۔ ان کی نسل بھی چلانی ہے۔" دلاور نے غصے سے کہا۔

"فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے جی! تم دیکھنا ہمارے بچے بیاہے بھی جائیں گے اور نسل بھی کسی پاگل پن کے بغیر آگے بڑھے گی۔ یہ شہری ڈاکٹر تو خود پاگل ہوتے ہیں۔ میں نے بچوں کو بھی برگد کے نیچے جانے سے نہیں روکا۔ کوئی ہوائی چیز چمٹ گئی ہو گی۔ نکل ہی جائے گی۔ انہیں سید کامل شاہ کے مزار پر لے جاؤں گی۔ میٹھے چاولوں کی دیگ چڑھا کے اپنے بچوں کو پیر جی کا دم کرواؤں گی۔ دیکھنا دنوں میں بھلے چنگے ہو جائیں گے۔"

"پاگل پن کی باتیں نہ کر جنت! انہیں علاج کی ضرورت ہے۔"

"اب تو جو کریں گے، پیر صاحب ہی کریں گے۔"

جنت نے قطعیت سے کہا۔ دلاور حسین جانتا تھا۔ وہ اب ایک لفظ نہ سنے گی۔ شادی کے اک عرصے میں اتنا تو وہ جنت کو سمجھ ہی چکا تھا اور اب خاموشی سادھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جنت کی ضدی اور ہٹ دھرم فطرت سے واقف تھا۔

☆ ☆ ☆

"دم تو میں نے کر دیا ہے۔"

پیر صاحب نے اپنی نشست کے قریب رکھے صندوق میں سے کاغذ کی چند پڑیاں جن میں سفید رنگ کا سفوف بند تھا، نکالتے ہوئے جنت سے کہا۔

سید کامل شاہ کے مزار سے ملحق یہ ایک وسیع کمرا تھا۔ دو دروازے تھے اور چاروں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے کی نشست کے قریب دو تین کھڑکیاں تھیں۔ جن سے ساگھ کی تیز چمکیلی ٹھنڈی دھوپ چھن چھن کر اندر آ رہی تھی اور عجیب سا اجالا کمرے میں بکھیر رہی تھی۔ اگر بتی کی خوشبو اور دھواں آزادانہ وہاں پھیلا ہوا تھا۔

پیر صاحب کی گدی کے سامنے بچھی چٹائی پر جنت اور اس کے دونوں بچوں کے علاوہ کچھ اور عورتیں بھی تھیں جو اپنی باری کے انتظار میں تھیں۔

"یہ سفوف ہر روز دن میں دو بار چینی کے ساتھ ملا کر بچوں کو کھلانا ہے۔"

پیر صاحب نے پڑیاں جنت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ جنت جو کمرے کا جائزہ لینے میں مشغول تھی چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی اور ادب سے پڑیاں پکڑ لیں۔

"نماز اور قرآن کی پابندی کرو اور اپنے شوہر سے کہو وہ بھی باقاعدگی سے نماز پڑھا کرے۔ تمہارے بچوں کو کوئی آسیب نہیں ہے۔ یہ بیمار ہیں اگر ان کا علاج ممکن نہیں تو اپنے رب سے دعا کرو وہ بیماری ٹالنے پر قادر ہے۔"

پیر صاحب نے تسبیح کے دانے گراتے ہوئے اپنی بھاری پر رعب آواز میں کہا۔

"لیکن پیر صاحب! مجھے لگتا ہے یہ آسیب ہی ہے، ویسے تو دونوں بھلے چنگے رہتے ہیں لیکن ہر دوسرے تیسرے مغرب کی نماز کے بعد انہیں غش آنے لگتے ہیں۔ ہاتھوں پیروں کی رگیں پھول کر نظر آنے لگتی ہیں گردن مڑنے لگتی ہے۔ حلق سے عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد حالت سنبھل بھی جائے تو کھانے کو نہیں مانگ سکتے۔ مجھے تو لگتا ہے کسی ظالم آسیب نے میرے بچوں پر قبضہ کیا ہوا ہے۔" جنت نے ماتا بھری فکر مندی سے کہا۔

"میں کہا کہ اللہ نے جنات کو بے شک نوری مخلوق قرار دیا ہے لیکن نوری مخلوق بنا کر بھی انہیں کھلا نہیں چھوڑ دیا۔ ان کی بھی ایک دنیا ہے۔ اس دنیا کا بھی کوئی ضابطہ اخلاق ہے، کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ جنات اتنے فارغ نہیں ہوتے کہ تمہارے تمہارے بچوں کی ناک لگائے بیٹھے رہیں، ہاں ٹھیک ہے کچھ شریر قسم کے جنات بھی ہوتے ہیں لیکن خود پر آئی ہر مصیبت یا بیماری کے لیے جنات کو مجرم قرار دے دینا انصاف کی بات نہیں ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے تمہارے بچوں پر آئی مصیبت تمہارے کسی گناہ کی سزا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارے بچوں کو بیمار کر کے اللہ تمہیں آزمانا چاہ رہا ہو۔"

پیر صاحب کی آواز جنت کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح برسی تھی۔

"گناہ؟" اس نے زیر لب کہا۔

"کوئی کتنا بھی گناہ گار کیوں نہ ہو اللہ اس کے لیے دعا کا راستہ کبھی بند نہیں کرتا۔ وہ اپنے بندے کو کبھی مایوس نہیں رکھتا۔ جو اللہ اپنے بجائے کسی دوسرے کو خدا بنا کر پوجنے والے پر بھی اپنی رحمت بند نہیں کرتا وہ اپنے بندے کے لیے دعا اور توبہ کا راستہ کیسے بند کر سکتا ہے۔ اسی لیے اپنی چھوٹی بڑی غلطیوں پر اپنے رب سے توبہ کرتے رہو دعا کا ہاتھ نہ چھوڑو۔"

پیر صاحب اب وہاں بیٹھی تمام عورتوں سے مخاطب تھے۔

"لیکن پیر صاحب!" جنت کے عقب میں بیٹھی ایک عورت نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اس بات کا فیصلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ جو ہم پر نازل ہوا ہے وہ خدا کا قہر ہے یا اس کی آزمائش؟ اللہ تو ہمیں نہیں بتاتا کہ یہ آزمائش ہے یہ سزا نہ وہ عام انسانوں کے لیے فرشتے زمین پر اتارتا ہے جو انسان کو بتا دیں پھر ہم کس طرح فیصلہ کر سکتے ہیں۔ میری مثال آپ کے سامنے ہے۔ پچھلے چار سالوں سے میں عذاب میں مبتلا ہوں۔ میرے اردگرد انا سناٹا ہے کہ بعض اوقات مجھے اپنی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ میں اللہ سے دعا مانگتی ہوں کہ وہ میری آزمائش کو ٹال دے پھر خیال آتا ہے کہ یہ ذہنی عذاب کسی گناہ کی سزا بھی تو ہو سکتا ہے، تب میں اللہ سے توبہ کرنے لگتی ہوں۔ لیکن پھر یا میں الجھ جاتی ہوں آزمائش ٹلنے کی دعا اور کسی گناہ پر توبہ مانگنے کے درمیان پھنس جاتی ہوں۔ پورے خشوع و خضوع سے دعا مانگ سکتی ہوں نہ پورے دل سے توبہ کر پاتی ہوں۔ مجھے بتائیں پیر صاحب! میں کیا کروں، عجب

کشمکش میں پھنس گئی ہوں۔ آپ کو سب علم ہے پیر صاحب! مجھ پر بیتی ہر کیفیت کا علم ہے۔ اللہ کے واسطے میری مدد کریں مجھے اس کشمکش سے نکال دیں۔"

وہ عورت اب سسکنے لگی تھی کمرے میں سناٹا چھا گیا صرف اگر بتی کے دھوئیں کے ساتھ اس عورت کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

"دیکھو بیٹی!" پیر صاحب نے نرم آواز میں کہا۔

"کبھی کسی انسان سے مت پوچھو کہ وہ تمہیں تم پر بیت رہی کیفیت کا اصل نام بتا دے۔ تم نے مجھے اپنے ہر عمل کی داستان سنا دی بقول تمہارے تم نے ایک بھی لفظ مجھ سے نہیں چھپایا، لیکن جو کچھ تم نے مجھے بتایا اس میں تمہاری غلطی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ انسان [illegible] ہے [illegible] جب وہ اپنی زبان سے اپنی کہانی بیان کر رہا ہوتا ہے تو غیر ارادی طور پر نہ جانے انجانے خود کو غلطیوں اور کوتاہیوں سے بالاتر قرار دے دیتا ہے۔ ممکن ہے تم نے بھی جو کچھ مجھے بتایا اس میں سے اپنی [illegible] سامنے شرمندگی کے ڈر سے حذف کر دی ہوں۔ اب میں تو تمہاری کیفیت کو تمہاری کہانی کے تناظر میں ہی پرکھوں گا اور اس کیفیت کا نام بتا دوں گا کہ یہ سزا ہے یا آزمائش لیکن تمہاری ساری غلطیوں سے صرف [illegible] ہیں۔ ایک اللہ دوسرا تمہارا دل۔ اس لیے کسی انسان سے یہ پوچھنے کے بجائے کہ جو تم پر بیت رہی ہے یہ سزا ہے یا آزمائش اپنے دل سے رجوع کرو، یہ فیصلہ اسے کرنے دو۔ تمہاری ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔"

"لیکن میرا دل کہتا ہے پیر صاحب! مجھے نہیں لگتا میں نے کوئی گناہ کیا ہے۔" اسی عورت نے کہا۔

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم نے کبھی کسی کا دل دکھایا ہو؟ جانے انجانے اتنی تکلیف پہنچا دی ہو کہ اس کا دل بے اختیار تمہیں بددعا دے ڈالے۔ میری ایک بات یاد رکھنا۔ کسی کی دل آزاری یا دل دکھانا بہت عظیم گناہ ہے۔ دکھی دل سے نکلی ہوئی بددعا پھر ساری زندگی دل دکھانے والے شخص کے تعاقب میں رہتی ہے اور تب تک انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی جب تک بندہ اسے معاف نہ کرے۔ اسی لیے میں تجھے سمجھا رہا ہوں اپنے رب سے کہہ تیرے دل کو فیصلہ کرنے کی صلاحیت عطا کرے۔ بددعا کے نتیجے میں سزا مل رہی ہو گی تو اس کا فیصلہ بھی تیرا دل کرے گا۔ آزمائش ہو گی تب بھی دل ہی بتا دے گا۔"

جنت چپکے سے وہاں سے نکل آئی۔ اسے ہمیشہ ایسی گفتگو بری لگتی تھی جس میں بے کار کی نصیحتوں کے سوا کچھ نہ ہو۔ پیر صاحب کو وہ بہت مانتی تھی لیکن آج ان کی باتوں نے اسے الجھا سا دیا تھا۔

"گناہ! کیا گناہ؟ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔" اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا ساتھ ہی اسے کئی سال پہلے اپنے باپ کی کہی ہوئی ایک بات یاد آئی۔

"میری بیٹی بچی ہے وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ ایسی بھولی بھالی صورت کی سچائی پر کوئی شک کرے تو اس کی عقل پر شک کرنا چاہیے۔ مجھے تو آسمان سے اگر اللہ کے فرشتے بھی کہیں کہ جنت نے جھوٹ بولا تھا تو میں یقین نہ کروں، اتنا بھروسا ہے مجھے اپنی بیٹی پر۔"

اس سے قبل کہ وہ اپنا احتساب کر پاتی، مرے باپ کا خود پر بھروسا یاد آ گیا۔ اسی بھروسے کے ذریعے اس نے کئی سال باپ کو بے وقوف بنائے رکھا تھا۔

"اوئی بی بی۔ سنو۔" جنت نے مزار کے احاطے میں پہنچ کر اپنے عقب میں اپنی آواز سنی۔ پیر صاحب کا معتقد خاص دوڑا چلا آ رہا تھا۔

"تم یہ دوائیاں بھول آئی تھیں، یاد سے بچوں کو پلاتی رہنا اللہ شفا دے گا اور پیر صاحب کہتے ہیں اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔"

جنت کی تھیوری [illegible] سے محبت کریں۔

"میں کس کس گناہ کی معافی مانگوں؟ کون سے گناہ ہیں میرے جن کی پکڑ ہو گی؟ وہ ڈاکٹر اور اب پیر صاحب فارغ ہی ہیں۔ اللہ کی بھیجی ہوئی آزمائش کو خوامخواہ میرے گناہوں کی سزا بنانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ او شٹ۔ بھئی! میرے بچے یوں ہی ٹھیک ہیں بھاڑ میں جائے وہ انگریزی ڈاکٹر اور یہ دیسی حکیم۔"

اس نے نخوت سے سر جھٹک کر کہا تھا اور مطمئن ہو بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

شبیہہ العباس کو عجیب سی بے چینی لاحق تھی۔

وہ بیڈ پر اوندھا لیٹا ہوا تھا اور کچھ غیر واضح کیفیت کا شکار تھا۔ اسی کیفیت سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ تین گھنٹے سڑکوں پر خوار ہو کر آیا تھا' دو گھنٹے اس نے ٹی وی کے سامنے برباد کیے۔ بہت بار پڑھنے کی کوشش کی مگر بے سود' دل میں موجود بے چینی لمحہ بہ لمحہ دھوئیں کی طرح اس کے وجود سے لپٹتی جا رہی تھی۔

بہت بار اسے خیال آیا کہ اسے کسی دوست سے گپ شپ لگا لینی چاہیے' لیکن اس کا بھی کچھ فائدہ نہ ہوتا۔ دراصل وہ بہت سیلف سینٹرڈ انسان تھا۔ اس لفظ کے جتنے بھی اجزائے ترکیبی ہو سکتے ہیں' وہ اس میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ قریبی دوستوں کی تعداد بہت کم تھی اور جو دوست تھے ان کے ساتھ بھی اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ طویل گفتگو کر پاتا' شاید اسے ہمہ وقت یہ خدشہ لاحق رہتا تھا کہ کوئی اس کے اندر تک رسائی حاصل نہ کر لے۔ خود رو پودے کی طرح اس کے اندر اگ آئے ہوئے احساس کمتری کا سراغ نہ لگا لے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے گرد بدمزاجی' غصے اور غرور کی دیواریں کھڑی کر لی تھیں اور خود کو سیلف سینٹرڈ کہلوانے میں فخر محسوس کرنے لگا تھا۔

پہلی بار ایسا ہو رہا تھا کہ اس کا حویلی جانے کا بھی ارادہ نہیں بن پا رہا تھا۔ جلال ہوتا تو کچھ سہولت رہتی کہ جلال دنیا کا وہ واحد شخص تھا جس کے سامنے شبیہہ نے کبھی اپنا آپ چھپانے کی کوشش نہیں کی' وہ اس کے سامنے اپنا ہر خدشہ کھول کر بیان کر سکتا تھا' وہ اس کے ہر احساس کمتری سے واقف تھا یا شاید یہ بھی شبیہہ کی خام خیالی تھی' لاشعوری طور پر وہ جلال سے بھی بہت کچھ بیان نہیں کر پاتا تھا۔ ہاں لیکن جلال اس کا اچھا غم گسار تھا' اپنی تمام تر بے وقوفیوں اور نالائقیوں کے باوجود وہ ایسا دوست ثابت ہوتا تھا جس کا کندھا ہر وقت ضرورت شبیہہ کو میسر رہتا تھا۔

لیکن فی الوقت جلال نہیں تھا اور شبیہہ دل کے کسی کونے میں بالکل غیر ارادی طور پر اس بات پر پچھتا رہا تھا جس روز اس نے ثروت سے بہت غیر مناسب انداز میں بات کی تھی۔

ملازم انہیں اندر لے آیا تھا' اگر وہ شبیہہ سے پوچھتا تو یقیناً وہ اسے ثروت کو اندر لانے سے منع کرتا اور انہیں دروازے سے ہی واپس بھجوا دیتا' لیکن ملازم انہیں اندر لے آیا تھا اور شبیہہ کے سامنے وہ گم صم سی بیٹھی تھیں۔

"میں نے سوچا آج تم سے کچھ باتیں کر لوں۔" انہوں نے دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے کہا تھا۔ وہ آف وائٹ اور براؤن کنٹراسٹ کی شلوار قمیص میں ملبوس تھیں۔ بالوں کو انہوں نے ہمیشہ کی طرح ایک خوب صورتی سے جوڑے میں باندھ رکھا تھا۔ اور بلاشبہ وہ بہت سوبر دکھائی دے رہی تھیں۔

شبیہہ نے دل ہی دل میں ان کی شخصیت کی خوب صورتی اور کشش کا اعتراف کیا۔

"آپ نے خوامخواہ یہاں آنے کی زحمت کی' مجھے باتیں کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ خصوصاً آپ سے تو بالکل نہیں۔" اس نے لہجے میں حتی المقدور بیزاری سمو کر کہا۔ ثروت کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

"شبیہہ! میں جانتی ہوں' تم مجھ سے سخت خفا ہو' لیکن بیٹے! میری کچھ مجبوریاں تھیں۔" انہوں نے کہا۔

"مجبوریاں ضرور ہوں گی' لیکن مجھے ان مجبوریوں کے قصے سننے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" اس نے سپاٹ انداز میں کہا تھا۔

"کیونکہ جب میری قصے کہانیاں سننے کی عمر تھی تو آپ کی بے وفائی اور دھوکہ دہی کے قصے سن لیے تھے میں نے۔"

"یہ سب تمہارے باپ اور دادی کی پھیلائی ہوئی من گھڑت باتیں ہیں' میرے خلع لینے کے بعد انہوں نے میرے کردار کے متعلق ایسی ایسی ہرزہ سرائیاں کیں کہ میں دنگ رہ گئی۔" ثروت نے تڑپ کر کہا۔

"دادی کے متعلق تو آپ کچھ نہ کہیں' میں ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا' باقی بات رہی ابو کی' تو انہوں نے آج تک مجھ سے آپ کے متعلق کچھ نہیں کہا' بلکہ انہوں نے تو کبھی کچھ نہیں کہا۔ آپ کی بے وفائی کا غم منانے سے انہیں کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔ دادی نے مجھے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا' کیونکہ ماں تو مجھے باپ کے دروازے پر پھینک کر چلی گئی تھی' آپ دونوں نے اپنے اختلافات میں مجھے ایک ایسا پودا بنا دیا جس کی جڑیں کسی ایک زمین میں اتر ہی نہیں سکیں' لیکن آپ کہتی ہیں میرے باپ اور دادی نے من گھڑت باتیں پھیلائیں۔ میں ان ہی من گھڑت قصوں کی بنیاد پر بڑا ہوا ہوں' کیا آپ دونوں میں سے کوئی ایک بھی مجھے بتا سکتا ہے کہ میرا قصور کیا تھا۔"

وہ بات کرتے ہوئے جیسے پھٹ پڑا تھا۔

"آپ جانتی ہیں میں کتنی ٹوٹی بکھری شخصیت کا مالک ہوں۔ لوگوں سے کتراتا ہوں کہ کہیں کسی کو میری زندگی کے اس سب سے بڑے راز کا سراغ نہ مل جائے جو میری ماں سے وابستہ ہے۔"

"شبیہہ! میری بات سنو۔"

"سنوں گا ضرور سنوں گا' آپ بس ایک سوال کا جواب دے دیں' اگر آپ کو دانیال حسن سے ہی شادی کرنا تھی تو مجھے..."

ثروت پر جیسے بجلی سی گری' اس سے زیادہ شرم ناک بات اور کوئی نہ ہو سکتی کہ ان کا بیٹا ہی ان کے کردار کو ہدف بنا رہا تھا۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو شبیہہ! ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

"کیوں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آپ نے دانیال حسن کے لیے ابو سے خلع لیا تھا۔"

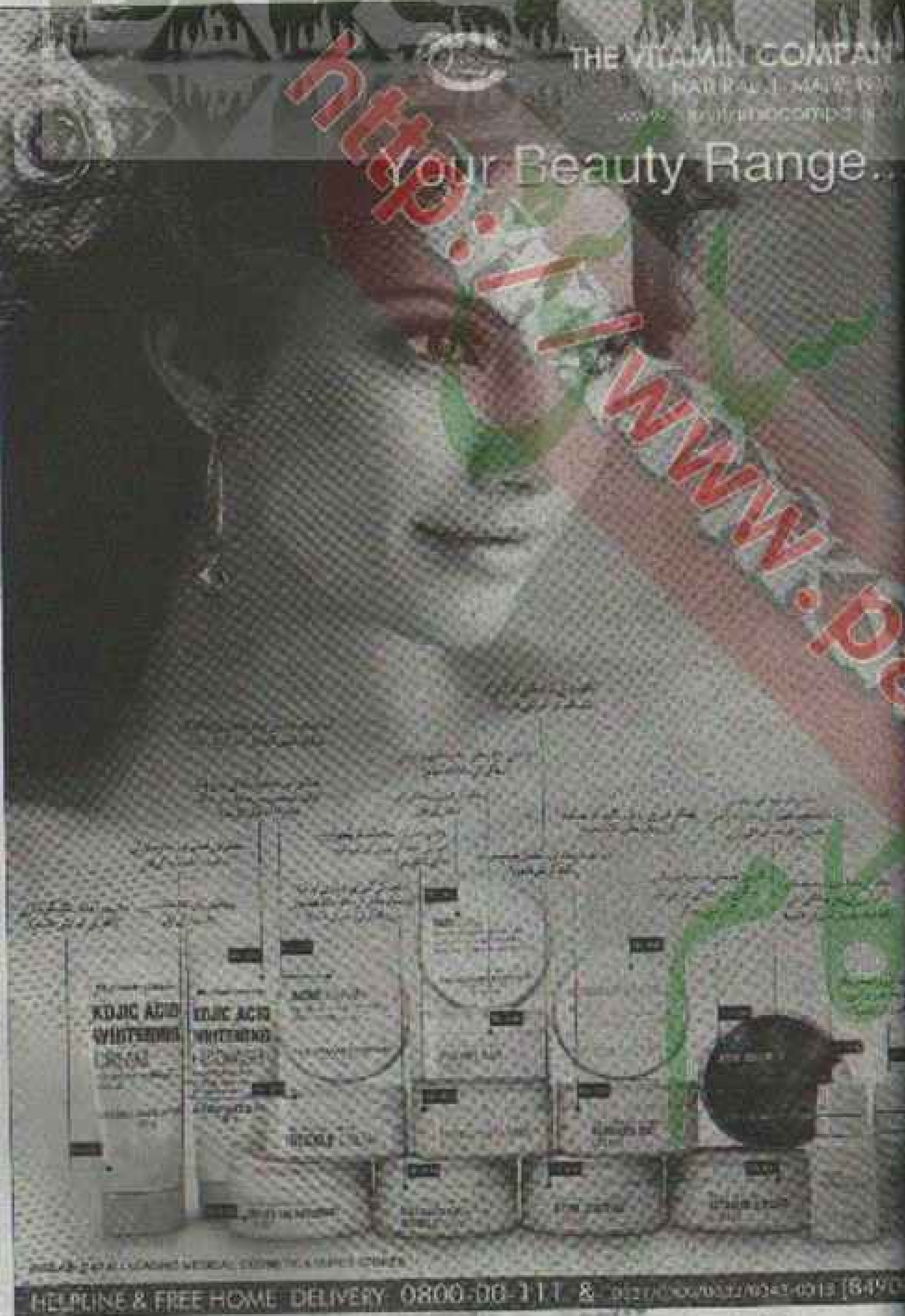
"ہرگز نہیں۔"

"ہاں۔ میں جانتا تھا' آپ جھٹلائیں گی' سب سے بڑی حقیقت تو یہ ہے کہ آپ اسی آدمی کی بیوی ہیں۔ کانوں سنا جھوٹ ہو سکتا ہے۔ آنکھوں دیکھا نہیں۔"

اس نے تمسخر سے کہا۔

"بعض اوقات کانوں سنا اور آنکھوں دیکھا بھی سچ نہیں ہوتا' آنکھوں اور کانوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہو تب تو ہرگز نہیں' تمہاری دادی اور باپ نے تمہیں کچھ حقائق ضرور بتائے ہوں گے' لیکن وہ حقائق پوری حقیقت پر مبنی نہیں۔ جب کبھی ماں کی طرف سے دل نرم پڑ جائے تو آ جانا۔ باقی کی حقیقت تمہیں میں بتا دوں گی۔ یہ تمہارے لیے ایک چھوٹا سا گفٹ خریدا تھا۔ تمہاری سالگرہ پر تو نہیں دے سکوں گی' اس لیے آج ہی لے آئی۔"

"اسے لے جائیں' مجھے ضرورت نہیں' اپنی تمام سالگرہ آپ کے تحفے کے بغیر منائی ہیں میں نے' اگلی بھی مناؤں گا' آپ آئیں' مجھے خوشی ہوئی' اگلی بار نہ آئیے گا' مجھے زیادہ خوشی ہو گی۔"



اس نے بدلی لی دو بے مروتی کی انتہا کردی تھی ثروت کی طرف دیکھے بنا بھی وہ جانتا تھا ان کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے۔ ان کے جانے کے بعد ۔۔۔ شدید پشیمانی نے گھیر لیا تھا۔ اسی لیے وہ ان سے ملنے سے کترا رہا تھا کیونکہ جانتا تھا جب بھی بات کرے گی اس کی بچپن کی محرومیاں اس کو تلخ کلامی پر مجبور کردیں گی۔

اس روز کے بعد اس نے ثروت کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ پہلے لاشعوری اور پھر شعوری طور پر انہیں پارک میں آتے جاتے تلاش کرتا رہا تھا۔ لیکن اس کی تلاش ہر بار رائیگاں گئی تھی۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے دل پر بوجھ بڑھ رہا تھا اور وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا اس بوجھ کو کس طرح دور کرے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ ثروت کو شدت سے یاد کررہا تھا اور ان کی خیریت کے لیے دعا گو بھی تھا لیکن اس بات کا اعتراف خود اپنے آپ سے کرتے بھی اسے ہتک محسوس ہوتی تھی۔

تو وہ بیڈ پر اوندھا لیٹا تھا اور دل میں موجود بے چینی دھوئیں کی طرح لمحہ بہ لمحہ اس کے وجود سے لپٹ رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

سالوں کے سکے وقت کے کشکول میں پے در پے گرتے رہے۔

اس دوران اکرام کی دھن دولت زمین جائیداد میں اضافہ ہوا تو دوسری طرف اپنی اولاد کا غم بھی جان سے چپکا رہا جو بسا اوقات بے حد پریشان کردیتا تھا۔ جنت اسے آزمائش سمجھ کر اس کے ٹلنے کی دعا کرتی اس نے کبھی نہیں سوچا یہ سزا بھی ہوسکتی ہے۔ انسان اپنا احتساب بھی تب ہی کرتا ہے جب اسے اپنے رویوں میں کوئی کمی دکھائی دے جبکہ جنت خود کو غلطیوں کوتاہیوں سے ماورا تصور کرتی تھی اس نے اپنا آپ ایک اونچے سنگھاسن پر بٹھا رکھا تھا اور اپنی پرستش کرنے سے اسے عشق تھا۔

لیکن دلاور حسین کے ذہن میں اب کوئی ابہام نہیں رہ گیا تھا۔ اس کے پاس بہرحال اتنی سوجھ بوجھ تھی کہ سزا اور آزمائش میں سے فرق تلاش کرسکے۔ وہ خدا سے اپنے کردہ ناکردہ گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگتا اسے رہ رہ کر اپنی مرحوم بیوی یاد آتی تھی۔ خالہ اور مرحوم باپ یاد آتا تھا۔

رجب کی طرف اس نے خصوصی توجہ دینا شروع کردی تھی کچھ اس لیے کہ وہ اس کا بڑا بیٹا تھا اور کچھ اس لیے بھی کہ وہ اپنی غلطیاں دوہرانا نہیں چاہتا تھا کئی بار اس نے جنت کو بھی سمجھانے کی کوشش کی مگر ہر بار نتیجہ اس کی توقعات کے برعکس نکلا۔ جنت غصے میں اگر رجب کے ساتھ اور برا رویہ اپنا لیتی یوں بھی وہ اپنے بچوں کے پاگل پن کو رجب کی نحوست قرار دیتی تھی پھر اسے دلاور حسین کا رجب سے محبت کا رویہ بھی برا لگتا تھا وہ دلاور پر خوب چیخ چلاتی ناچار دلاور کو چپ سادھنا پڑتی۔ اسے اس بات کی … تھی کہ اس کی بے جا محبت نے جنت کو اس کی ذات پر اتنا حاوی کردیا تھا کہ دلاور اس سے دب … سکتا تھا کہ وہ چار طمانچے لگا کر جنت کو اس کا رویہ درست کرنے کے لیے کہتا۔

دلاور کی پسپائی نے جنت کی خودسری اور حاکمیت پسندی کو مزید ابھار دیا تھا۔

وقت یوں ہی کٹتا رہا۔ سوتیلی ماں کسی کے لیے اتنا بڑا عذاب ثابت ہوتی ہوگی جتنا رجب کے لیے ثابت ہورہی تھی گوکہ وہ بڑا ہوگیا تھا باپ کی طرح لمبا قد اور مضبوط جسم والا لیکن اس کے اندر جنت کا خوف کچھ اس طرح پھیلا ہوا تھا جس طرح بوڑھے درخت کی شاخیں زمین کے سینے میں پھیلی ہوئی ہیں۔

دلاور حسین نے کئی بار دیکھا جنت سب کا بچا کھچا کھانا ایک پلیٹ میں جمع کرکے رجب کو دے دیتی ہے گوکہ وہ کئی بار اسے سرزنش کرچکا تھا لیکن جنت نے … سالوں میں اس کی بات نہ سمجھی تھی اب کیا سمجھتی اس روز بھی دلاور حسین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ جنت نے ضد میں آکر رجب کو روٹی کے وہ ٹکڑے

لیے جس پر پھپھوندی لگ چکی تھی۔

رجب اس روز [illegible] اور متحمل تھا۔ اس نے جنت کی اس ناانصافی پر خود بڑھ کر چنگیر سے نان اٹھانا چاہی، لیکن جنت نے بری طرح اسے پیچھے دھکا دیا۔ ردعمل کے طور پر رجب نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹکا اور بے حد نفرت و اشتعال سے جنت کو گھورا۔ لیکن جنت کے لیے اس کی یہ گستاخی ناقابل معافی تھی۔ اس نے نفرت و تکبر آنکھوں میں سمو کر رجب کو دیکھا اور رعونت سے خاموشی کے ساتھ باہر نکل گئی۔

رجب نے سوچا مصیبت ٹل گئی اور مطمئن ہو کر کھانا کھانے لگا۔ لیکن اس کا یہ خیال دیوانے کے خواب سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔

اسی رات جنت کا بے حد وزنی سونے کا کنگن غائب ہو گیا جو بعد ازاں رجب کی ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر بچھے میلے سے کھیس کے نیچے سے برآمد ہوا۔ گو کہ دلاور حسین کو ثبوت مل جانے کے باوجود اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا بیٹا چوری کر سکتا ہے۔ لیکن جنت نے وہ ادھم مچایا کہ اس کا دماغ پھٹنے کے قریب پہنچ گیا۔

غصے، بے بسی اور بے زاری کے احساس سے مغلوب ہوتے ہوئے اس نے رجب کو چولہے میں جلانے والی کھردری لکڑی سے اتنا مارا کہ جنت کے شیطانی دل میں سکون اتر گیا۔ جبکہ رجب نڈھال اور کسی حد تک لہولہان بھی ہو گیا۔ اس روز رات ہونے تک گھر میں سناٹا چھایا رہا۔ ملازمین تو ملازمین پالتو جانوروں میں سے بھی کسی کی ہمت نہ تھی کہ آواز نکالے۔

اگلی صبح رجب گھر چھوڑ کر جا چکا تھا۔ ڈیرے کے رکھوالے نے بتایا اس نے رجب کو روکنے کی بہت کوشش کی، لیکن وہ روتا جاتا تھا اور کہتا تھا۔

"ابا سے کہنا۔ یہ حویلی اس کو اور اس کی بیوی کو مبارک ہو۔ میں اب یہاں نہیں آؤں گا۔ جہاں میری ماں اور بہن چلی گئی ہیں میں بھی وہیں چلا جاؤں گا۔"

دلاور حسین کے دل پر کسی نے گویا گھونسا کھینچ مارا تھا۔ اس نے ملازمین کو دوڑایا۔ آس پاس کے سارے گاؤں موضع تک چھان مارے۔ خود جا کر اپنے تئیں قریبی شہر بھی کھنگال آیا۔ لیکن رجب کا پتا چلنا تھا سو نہ چلا۔

ناچار دلاور حسین کو دل پر صبر کی سل رکھنا پڑی۔ لیکن ایک روز جب اس کے سامنے کھانا آیا۔ سرسوں کا ساگ، مکئی کی روٹی، چاولوں کا بھرا تھال، مکھن، اچار، لسی سے بھرے گلاس۔ تو اس کا دل یکایک بیٹھنے لگا اور ایک عجیب سا کرب سارے جسم میں پھیل گیا۔ منہ میں نوالہ لے جاتا ہاتھ کانپنے لگا۔ دلاور کے سینے سے گھٹی گھٹی سسکیاں ابھریں۔ آنکھوں سے اتنے آنسو الڈے کہ وہ بے حال ہو کر رہ گیا۔

اس کے بیٹے نے خدا معلوم اتنے روز سے کھانا کھایا ہو گا یا نہیں؟ اسے سوکھی روٹی [illegible] یا پانی کی چند بوندیں نصیب ہوتی ہوں گی یا پیالہ بھر پانی؟ اس کا لباس پھٹ چکا ہو گا، چپل ٹوٹ چکی ہو گی؟ کیونکہ جب وہ حویلی میں تھا اس کا حال تب بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھا۔ لیکن اب دلاور کو رہ رہ کر پچھتاوے کے ناگ ڈس رہے تھے۔

جب وہ دیر تک رو چکا تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ جنت چپ چاپ بیٹھی تاثر زریں کو کھانا کھلا رہی تھی اور وقتاً فوقتاً اس پر بھی نظر ڈال لیتی تھی۔ دلاور کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے سرد مہری سے کہا۔

"اپنے چور بیٹے کو جتنا رونا ہے۔ ایک ہی بار رو دو، بار بار یہ نحوست پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے بچوں پر برا اثر پڑے گا۔"

دلاور نے نفرت انگیز نظروں سے اس عورت کو دیکھا جس کے سینے میں شاید دل نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ اس حسین و دلکش عورت کو اس نے خود اپنے سر چڑھایا تھا اور اب اسے سر سے اتارنا ہرگز بھی آسان نہ تھا۔

"رجب چور نہیں تھا۔" دلاور نے غصے سے کہا۔ انہیں بھی غم کا ایسا شدید غلبہ تھا اس پر کہ جنت سے سخت لہجے میں بات کرتا ہوا [illegible] نہ ہوتا۔

"تم نے اس کے کھیس کے نیچے سے خود کنگن برآمد کیا تھا۔ [illegible] وہاں سے جا کر رکھا ہو۔ اس کی چوری کا ثبوت تم نے خود دیکھا تھا۔" جنت نے ساتھ سرد مہری سے دلاور کے اشتعال کے غبارے سے ہوا نکال دی۔

"رجب حویلی چھوڑ کر گیا ہے۔ مر نہیں گیا کہ تم ہر گھڑی اسے روتے رہو۔ ایک نہ ایک دن جس روز دنیا کی ٹھوکریں کھاتا تھک جائے گا تو یہیں واپس آئے گا۔ اس لیے تمہارے بار بار رونا چھوڑو۔ روتے ہوئے منحوس لگتے ہیں مجھے۔"

جنت نے نخوت سے ناک چڑھا کر کہا اور دلاور حسین نے بزدلی سے آنکھیں موند کر بیٹے سے جدائی کا کرب اپنے اندر اتار لیا۔ اس کی خواہش تھی کہ رجب اسے دوبارہ مل جائے، لیکن دل کے کہیں اندر سے وہ جانتا تھا رجب اسے اب دوبارہ کبھی نہ ملے گا۔ [illegible] اور بیٹی کے بعد اس نے رجب کو بھی کھو دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

بادل بری طرح برس رہے تھے اور آسمانی بجلی شیطانی کڑک کے ساتھ کمرے میں گھس کر ستانے کو لگنے لگی تھی۔ ثمینہ نے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ رکھے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات تھے اور ہاتھوں میں رکھی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

ثمینہ بڑی دیر سے اٹھیں اور کھڑکی کے پاس جا کر باہر کا جائزہ لینے لگیں۔ بارش رک چکی تھی، لیکن آسمان بادلوں سے اٹا پڑا تھا۔ ہوا گم، پیڑ پودے ساکت، بڑی دیر تک ان دونوں کے درمیان خاموشی حائل رہی، صرف بادلوں کی گرج تھی جو بند کھڑکی کی دروازوں کی درزوں سے اندر داخل ہو کر اس خاموشی و سناٹے کی چادر پر سلوٹیں ڈالتی رہی۔

"میں حیران ہوں کہ کوئی اتنا جلاد صفت کیسے ہو سکتا ہے۔" بہت دیر بعد ہادی نے کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا تھا۔ ثمینہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بادل پھر گرجے۔ "اور مجھے تو اس بات کا بھی یقین نہیں آ رہا کہ بابا نے اتنی مصائب زندگی گزاری۔ اتنے ظلم سے اپنی ذات پہ۔ کاش! وہ خاتون میرے سامنے آ جائیں تو میں انہیں بتاؤں کہ ظلم کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔" ہادی نے اپنی جوان مٹھیاں بھینچتے ہوئے پرعزم لہجے میں کہا تھا۔

ثمینہ نے بے اختیار گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ہادی کا فوری ردعمل ان کی توقعات کے عین مطابق تھا۔ ثمینہ کو بے ساختہ خوشی محسوس ہوئی۔

"جو کچھ میں تمہیں بتا چکی ہوں، وہ جنت بی بی کے ظلم کا ایک حصہ تھا۔ سارے حقائق جان کر تو تمہارا ردعمل نہ جانے کیا ہو گا۔" ثمینہ نے تھکے تھکے سے انداز میں کہا تھا۔

"کیا مطلب؟" ہادی بری طرح چونکی۔ "کیا ابھی اور بھی کچھ ایسا ہے جس کے متعلق جاننا باقی ہے؟"

"ہاں بالکل۔" ثمینہ نے فوری کہا۔ "میں تہیہ کر چکی ہوں اب تمہیں مزید لاعلمی کے اندھیرے میں نہیں رکھوں گی۔"

"پھر آپ مجھے جلدی سے سب کچھ بتا دیں۔" ہادی نے بے چینی و بے صبری سے کہا۔

"میرے ذہن میں تو اتنے سوال اودھم مچا رہے ہیں کہ لگتا ہے دماغ ہی پھٹ جائے گا۔"

"اچھا ہے۔ جتنا تمہارے ذہن میں سوال جنم لیں گے اتنا ہم اپنے مقصد کے قریب پہنچیں گے۔" ثمینہ نے

دل میں جواب دیا کہ ایسی بات ابھی اس کے سامنے کہنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ اس داستان حیات کے کچھ اسرار و رموز تھے۔ کچھ پیچ و خم تھے۔ کچھ انکشافات کے اتار چڑھاؤ تھے جنہیں ہادی پر منکشف ہونا تھا۔ داستان بیان کرنے کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے، کوئی سلیقہ ہوتا ہے۔ جس انسان نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے لمبا انتظار کیا ہو، صبر و تحمل کے ساتھ مناسب وقت کا انتظار کیا ہو، وہ چند جملے غلط وقت پر بولنے کی حماقت کس طرح کر سکتا ہے۔

"جب بابا کا انتقال ہوا تو میں اس وقت بہت چھوٹی تھی، لیکن جب بھی میں نے انہیں یاد کیا میرے ذہن میں ایک بے حد کمپوزڈ پرسنالٹی کا اسکیچ ابھر آیا۔ ان کی کہی ہوئی کچھ باتیں اب تک میرے لاشعور میں محفوظ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں بابا کو جتنا جانتی ہوں وہ سب کا سب آپ کی باتوں یا ان ڈائریز کے مرہون منت ہے جو بابا نے لکھی تھیں۔ میرے تو کبھی وہم و گمان میں بھی یہ ——— نہیں ——— تھا کہ اپنی زندگی کے کسی حصے میں بابا اس قدر ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہے ہوں گے کہ اپنا آبائی گھر چھوڑنے پر ہی مجبور ہو گئے۔" ہادی الجھن آمیز لہجے میں بول رہی تھی۔

"وہ اس لیے کیونکہ تمہارے بابا نے تلخ یادوں کو کبھی اپنی ڈائریز میں تحریر نہیں کیا۔" ثمینہ نے کہا۔ "وہ کہا کرتے تھے۔ سنبھال کر رکھنا ہو تو خوش گوار یادوں کو سنبھالو اور تلخ واقعات کو لاشعور کے کوڑا دان میں ڈال دو، تاکہ کئی سال بعد جب ماضی کو یاد کرو تو تمہیں خوش گوار یادوں کے ثبوت ملیں جو تمہارے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیں نہ کہ تلخیاں آنکھوں میں آنسو لے آئیں۔"

"ویل سیڈ۔" ہادی نے بے ساختہ ستائشی لہجے میں کہا۔

"اچھا خیر۔ آپ مجھے آگے کی detail (تفصیلات) بتائیں ممی! اپنے آبائی گھر سے نکلنے کے بعد بابا پر کیا بیتی؟ کیا وہ دادا جان کو دوبارہ مل گئے تھے؟ اگر ہاں تو پھر آپ ان سے کہاں ملیں؟ آپ دونوں کی شادی کس طرح ہوئی؟ کیا آپ ان کی کوئی کزن تھیں؟" وہ سوال پہ سوال کرتی چلی گئی۔ ثمینہ نے گہری سانس بھر کر سلسلہ کلام جوڑا۔

"حویلی سے نکلنے کے بعد رجب صحیح معنوں میں دنیا کی ٹھوکروں پر آ گئے تھے۔ اس دور میں انہوں نے بہت کڑا وقت دیکھا، پیٹ بھرنے کے لیے کوڑے دانوں سے کھانا چنا، فٹ پاتھوں پر سوئے سخت گرمیوں میں سر پر سورج کی چادر تنی رہی تو سردیوں کی طویل راتوں میں خنکی اوڑھ کر سوتے رہے۔ انہوں نے مزدوری بھی کی۔ پھر تک دھوئے، لیکن قسمت نے ان کے لیے کچھ اور سوچ رکھا تھا۔ ہر بار رجب کو لگتا کہ اب وقت ذرا سہولت سے کٹے گا تو ان پر کوئی نئی مصیبت آ جاتی۔ کم عمر تھے۔ زمانے کی چالاکیوں کا مقابلہ کرنا نہ آتا تھا۔ ایسے ہی وقت میں ایک بار وہ کام سے نکال دیے گئے۔ سرکاری سڑکیں بناتے ہوئے جو مزدور رکھا جاتا ہے رجب بھی ان ہی میں سے تھے اور سڑک کے ساتھ ساتھ ہی سیالکوٹ جا پہنچے تھے کہ کسی بات پر سپروائزر نے غصے میں آ کر انہیں نکال دیا اور مزدوری دینے سے بھی انکار کر دیا۔ رجب پورا دن بھٹکتے رہے۔ شام کو ایک ڈھابے کے قریب سے گزرے تو روٹی کی خوشبو انہیں اپنی طرف کھینچنے لگی، لیکن جیب میں دھیلا بھی نہ تھا اور پیٹ میں آنتیں کھنچ رہی تھیں۔ یہیں رجب کی ملاقات ہدایت اللہ صاحب سے ہوئی۔"

"ہدایت اللہ؟" ہادی انہماک سے سنتے ہوئے زیر لب دہرانے لگی۔

"ہاں ہدایت اللہ۔ جنہیں خدا نے تمہارے بابا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا تھا، وہ قریبی میز پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ رجب کے چہرے پر بھوک، پیاس اور بے بسی دیکھ کر انہوں نے رجب کو اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ رجب اس وقت بھوک کے ہاتھوں مغلوب تھے انہوں نے پیٹ بھر کر کھایا جب حواس کچھ ٹھکانے پر آئے تو سامنے بیٹھے صاحب کو دیکھا اور بغور انہیں اپنی طرف دیکھتا پا کر شرم سار ہو گئے۔

"معاف کیجیے جناب! میں دو دن سے بھوکا تھا۔" رجب نے سر جھکا کر کہا۔

"میرے سامنے تکلف برتنے کی ضرورت نہیں ہے بیٹے! کچھ اور کھانا ہو تو منگوا دوں؟" ہدایت اللہ صاحب نے پوچھا۔ رجب کو اور خفت نے گھیر لیا۔

"شرمندہ نہ کریں بڑے صاحب! میں نے بتایا نا دو دن سے بھوکا تھا۔ کھانا نظر آیا تو خود کو روک نہیں سکا۔ آپ نے کھانا کھلا کر بڑا احسان کیا مجھ پر۔ اس کا اجر آپ کو اللہ دے گا۔"

"اچھا ابھی جانا نہیں، ہم کو چائے بھی پلواتے ہیں۔"

"نہیں جی۔ شکریہ۔"

"ارے شکریے کی کیا بات؟ دراصل ہمیں سامنے بیٹھ کر چائے پینے کی عادت نہیں۔ تم ساتھ دے دو تو کیا بات ہے۔" انہوں نے بے تکلفی سے کہا ساتھ ہی ڈھابے کے لڑکے کو چائے لانے کا کہا۔

"جب تک چائے آ رہی ہے۔ تم اس سامنے والے نلکے سے منہ ہاتھ کیوں نہیں دھو لیتے؟ چلو آؤ ہم ہی تمہارے لیے نلکا چلا دیتے ہیں۔" وہ اٹھنے لگے، لیکن رجب نے منع کر دیا اور خود نلکے کی طرف آ گئے۔ یہ ایک ہاتھ والا نلکا تھا۔ تم نے ایسے نلکے تو نہیں دیکھے ہوں گے۔"

ثمینہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اسے تمام تر جزئیات کے ساتھ بتا رہی تھیں۔ بجلی چمکتی تو ان کا آدھا چہرہ روشنی میں نہا جاتا۔ یوں لگتا تھا ان کے سامنے وہ منظر چل رہا ہو اور ٹی وی اسکرین سے دیکھ کر وہ اسے تفصیلات بتا رہی ہوں۔

رجب نے خوب رگڑ رگڑ کر ہاتھ منہ دھوئے، پیر رگڑے اور جب واپس آئے تو چائے آ چکی تھی۔

"کون ہو میاں! چہرے مہرے، چال ڈھال سے تو اچھے گھر کے لگتے ہو، پیشانی بھی روشن ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ان حالوں میں پہنچ گئے؟" ہدایت اللہ نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ہمدرد لہجے میں پوچھا۔

رجب کم عمر تھے، تنہا تھے انہیں ایک پرسان حال، ہمدرد دوست کی ضرورت تھی جو بھلے ہی تسلی نہ دیتا، لیکن دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جاتا ہے، پھر ابھی ابھی تو ہدایت اللہ کا نمک کھایا تھا۔ ایک طرح سے جذباتی طور پر وہ ان کے مقروض ہو گئے تھے۔ شک و شبہ کی تو گنجائش ہی نہ نکلتی تھی۔ تب ہی سب کچھ انہیں کہہ سنایا، ایک لفظ بھی مخفی نہ رکھا۔

ہدایت اللہ نے سب کچھ تحمل سے سنا، تاسف سے سر ہلانے لگے۔

"بے حد افسوس ہوا میاں! خدا معلوم انسانوں میں سے مروت و لحاظ کیوں ختم ہوتا جا رہا ہے، لیکن پھر بھی ایک بات کہیں گے، سوتیلی ماں کے ناروا سلوک سے گھبرا کر تمہیں گھر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا، برے تھے یا بھلے تمہارے والد تھے۔"

"میں گھر نہ چھوڑتا تو وہ عورت ابا سے پٹوا کر مجھے مروا دیتی اور ابا کے ہاتھوں مرنے سے بہتر میں نے سمجھا کہ اس گھر سے ہی نکل جاؤں، کم سے کم اتنا احساس تو رہے گا کہ ابا کو مجھ سے کچھ نہ کچھ محبت تھی۔" رجب نے دکھی لہجے میں کہا۔

"اور اب کیا خیال ہے، وہ تم کو ڈھونڈتے ہوں گے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہاں۔ پتا نہیں۔ شاید۔" رجب نے سر جھکا کر غیر واضح یقین کے ساتھ کہا تھا۔

"ضرور ڈھونڈتے ہوں گے کہ بہرحال تم ان کی اولاد ہو، پھر تم نے خود ہی بتایا کہ کچھ عرصے سے وہ تم سے شفقت برتنے لگے تھے۔ غصے میں آ کر دو چار طمانچے مار بھی دیے تو کون سا گناہ کر بیٹھے۔"

"دو، چار طمانچے نہیں تھے۔" رجب نے بعد اصرار کہا۔ "میری کمر پر ابھی بھی اس مار کے اتنے نیل ہیں کہ

لیتا ہوں تو تکلیف جاگ اٹھتی ہے۔"

"اچھا ابھی تمہاری خفگی تازہ تازہ ہے' ڈبل روٹی کے تازہ سلائس کی طرح' اسے پھپھوندی لگ کر بے کار ہونے میں وقت لگے گا اور تب تک تمہیں سمجھانے کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔" ہدایت اللہ نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"ہمیں پتہ بتاؤ' آگے کا کیا ارادہ ہے؟ جذباتی ہو کر گھر سے تو نکل پڑے' اب کیا تمام عمر یوں ہی بھٹکو گے؟"

رجب مخمصے میں پڑ گئے کہ انہوں نے اب تک اس کے متعلق نہ سوچا تھا۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" ہدایت اللہ صاحب نے انہیں خاموش پا کر فوری کہا۔

"جب تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ جاتے ہمارے ساتھ چلو' ایک چھوٹا سا گھر ہے' جس میں ہم اور ہماری زوجہ رہائش پذیر ہیں۔ ایک سرکاری اسکول میں گریڈ پندرہ کے استاد کی حیثیت سے ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ اولاد نہیں ہے ہماری' تم کو سر چھپانے کا ٹھکانا میسر آجائے گا اور ہماری بیگم تمہارے لیے کھانا بھی بنا دیا کریں گی۔ چند روز اپنی زندگی پر غور کر کے آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دے لو کہ بے مقصد زندگی گزارنے والا انسان عموماً" بھٹکتا ہی رہتا ہے۔"

"لیکن... بڑے صاحب!" رجب شش و پنج میں پڑ گئے۔

"نہیں' نہیں... کوئی زور زبردستی نہیں' ہم تو تجویز دے رہے ہیں صرف دل راضی ہو تو چلے چلو' اتنا بتا دیں کہ ہمارے ساتھ چل کر نقصان میں نہیں رہو گے' ہم دراصل پیدائشی استاد ہیں' جسے اللہ نے روحانی تربیت کا فریضہ سونپا ہوا ہے' یعنی یہ ذمہ داری ہمیں پیدا کرتے ہوئے اللہ نے ہمارے خون میں ڈال دی تھی' اب جہاں کوئی راہ سے بھٹکا ہوا دکھائی دیتا ہے' ہم اسے "انسان" بنانے کی کوششوں میں لگ جاتے ہیں۔ یوں سمجھو اپنی عادت سے مجبور ہیں' ہم کو بھی انسان بنائیں گے تو ہماری استادانہ حس کی تسکین ہوگی اور احساس خود پسندی کو جلا ملے گی۔"

انہوں نے ہنس کر کہا تھا۔ رجب کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ انہیں سڑکوں پر بھٹکنا ہی تھا۔ چلو اور کچھ نہیں تو سر چھپانے کو ٹھکانا تو مل ہی جائے گا' پھر ہدایت اللہ صاحب انہیں نیک طبیعت بھی لگے تھے گو کہ انسانوں کی پرکھ انہیں نہیں تھی' پھر بھی ہدایت اللہ صاحب کے ساتھ چل دیے۔

ہدایت اللہ صاحب کا گھر شہر کے ایک پسماندہ علاقے میں تھا اور بے حد چھوٹا سا تھا' ابھی داخلی دروازے سے اندر داخل ہو کر شروع بھی نہ ہوا کہ پتا چلا ختم بھی ہو چکا۔ مین داخلی دروازے کے پاس سے سیڑھیاں دوسری منزل کی طرف جا رہی تھیں' سامنے کے رخ پر دو کمرے اور چھوٹا سا باورچی خانہ تھا۔ صحن نہایت مختصر جس کے درمیان ـــــ ننھی سی کیاری بنا کر امرود کے درخت کا بھی اہتمام کر لیا تھا' صحن صاف ستھرا اور کمرے ٹھنڈے اور ہوادار تھے۔ سامان و اسباب کچھ خاص دکھائی نہ دیتا تھا۔

ہدایت اللہ صاحب کی بیگم نے خوش دلی سے استقبال کیا۔ وہ ملیح ملیح نقوش والی سادہ دل خاتون معلوم ہوتی تھیں۔ بڑی بیگم صاحبہ کہہ کر پکارنے پر رجب کو خوب ڈانٹا اور کہنے لگیں۔

"خالہ' پھپھی' چاچی' تائی' جو مرضی کہہ کر پکار لو' لیکن یوں غیریت بھرے ناموں سے مت پکارو بیٹے! یوں بھی ہمارا مرحوم بیٹا آج حیات ہوتا تو لگ بھگ تمہارا ہی ہم عمر ہوتا۔" آنکھوں میں آنسو' لہجے میں رقت' رجب کا دل ڈوب سا گیا۔

"بھئی۔ ہم سرکاری اسکول کے استاد ہیں تو یہ لڑکیوں کے پرائمری اسکول کی استانی' ہم کو تو یہی نام بھلا معلوم ہوتا ہے۔ تم چاہو تو اماں کہہ لو چاہو تو باجی' ہمیں البتہ ابو کہہ کر پکارو گے تو ہمیں خوشی ہوگی کہ تمہیں شاگرد نہیں بیٹا بنا کر ساتھ لائے ہیں۔"

ہدایت اللہ صاحب نے ہنس کر کہا۔ ماحول پر چھائی غمگینی چھٹ گئی۔ رجب کو رہنے کے لیے اوپری منزل کا کمرا دیا گیا' صاف ستھرا جوڑا جو غالباً" ہدایت اللہ صاحب کا ہی تھا۔ پھر انہیں رات کا کھانا گھر کے خالص گھریلو ماحول میں ملا۔

رجب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ابا کی حویلی گو کہ اس چھوٹے سے مکان سے کہیں بڑی تھی لیکن ایسی بے لوث محبت کی خوشبو وہاں کہاں؟

رجب وہیں رہنے لگے اور انہیں اس پیارے ماحول اور گھر کے مکینوں سے محبت ہو گئی۔ اماں بڑی اچھی خاتون تھیں' انہوں نے رجب کو سگے بیٹوں والی محبت دل کھول کر دی۔ جبکہ ہدایت اللہ صاحب بوقت ضرورت باپ کی سی شفقت سے پیش آتے اور ضرورت پڑنے پر استاد بن جاتے۔

رجب نے دیکھا' وہ واقعی استاد تھے' پیدائشی استاد۔ اندر باہر' ہر طرف سے۔ دنیا کا کون سا موضوع تھا جس پر انہیں معلومات حاصل نہ تھیں۔ ان کے پاس اتنا ذخیرہ علم تھا کہ سونے سے بھرے ہوئے گھڑے کی طرح ابل ابل کر باہر آتا' پھر رجب پر ہی انہوں نے احسان نہ کیا تھا' ایسی بے لوث نیکیاں کرنے کے وہ عادی تھے البتہ گھر میں جگہ رجب کو ہی ملی تھی۔ رجب دیکھتے' جسے دیکھو منہ اٹھائے ان سے فیض حاصل کرنے ان کے گھر میں گھسا چلا آرہا ہے' رجب نے سوچا۔

"بھئی یہ تو بڑی حماقت کی بات ہے کہ ایک گھنا سایہ دار درخت آپ کو چوبیس گھنٹے میسر رہے۔ ساری دنیا اس کے سائے میں ستائے اور آپ اس درخت کے مہربان سائے سے مستفید بھی نہ ہو سکیں۔"

بس اسی روز رجب نے ہدایت اللہ صاحب کے ہاتھ پر روحانی بیعت کر کے ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ اب وہ ان شاگردوں کی جماعت میں شامل ہو گئے جنہیں ہدایت اللہ صاحب سے فیض یاب ہونے کا موقع مل رہا تھا۔ اتفاق سے اسی جماعت میں سے ایک فیاض بھائی بھی تھے۔

"فیاض بھائی... یعنی بڑے ماموں؟" ماوی نے پوچھا۔

"ہاں... تمہارے بڑے ماموں' ناصر صاحب کا دست شفقت ان کے سر پر تھا۔ ہم لوگ ان کے سامنے والے مکان میں رہا کرتے تھے۔ فیاض بھائی اور رجب کی خوب دوستی ہو گئی۔ ہمارے گھر بھی ان کا خوب آنا جانا تھا۔"

ہدایت اللہ صاحب نے رجب کو بیٹا کہا ہی نہیں مانا بھی تھا جو انسان اپنے شاگردوں کو کسی صلے کی آس امید کے بغیر اپنا علم بانٹتا رہے وہ منہ بولے بیٹے پر اپنا علم کیسے نچھاور کرتا ہو گا۔ ذرا سوچو۔ تم کہتی ہونا تمہارے بابا بہت انٹلیکچوئل پرسنالٹی کے مالک تھے' ان کی ذہنی تربیت کا سارا سہرا ہدایت اللہ صاحب کے سر ہے۔

انہوں نے رجب کو پڑھایا لکھایا' اپنی شفقت دی۔ ان کے گھر میں رجب کو وہ آئیڈیل ماحول ملا جس میں ان کی صلاحیتوں کو بڑھنے پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ اگر وہ حویلی میں رہتے تو یقین ممکن تھا ان کی صلاحیتوں کو اس طرح سے نکھرنے کا موقع ہرگز میسر نہ آتا۔ وہ ایک تنزلی کا شکار ناقابل ذکر شخصیت ہی رہتے اور انہیں خود بھی اپنے پوٹینشل کا اندازہ نہ ہو پاتا۔ بہرحال.....

رجب کی چمکتی دمکتی مسحور کر دینے والی شخصیت ایک طرف اور ان کا احساس کمتری اور بزدلی ایک طرف۔

"پلیز ممی!" ماوی نے تڑپ کر انہیں ٹوکا۔ "بابا کے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال مت کریں۔"

"میں جانتی ہوں میری جان! اپنے باپ کے لیے اس طرح کے الفاظ سننا کتنا تکلیف دہ ہو سکتا ہے' لیکن اگر تم ساری باتوں کو Analyse (تجزیہ) کرو تو تم بھی اسی نتیجے پر پہنچو گی کہ انجام کار رجب ایک بزدل انسان تھے۔ ایک

نکھری ستھری شخصیت بن کر اپنی اہمیت کا احساس کر لینے کے باوجود انہوں نے دوبارہ حویلی جانے کی ہمت نہیں کی۔ مجھے بتاؤ، اسے بزدلی نہیں تو کیا کہتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ جنت بیگم کا مقابلہ کرتے انہوں نے پسپائی اختیار کرلی اور مجھے بھی ویسی ہی ڈری سہمی زندگی گزارنے پر مجبور کردیا جیسی خود گزارتے آئے تھے۔" ثمینہ کے لہجے سے آنچ آئی تھی۔ ہادی کا دل چاہا خاموش ہو کر انہیں کہنے دے لیکن اپنے بابا کا دفاع کرنا بھی ازحد ضروری تھا۔

"ان خاتون کے کسی نفسیاتی الجھاؤ کی وجہ سے اگر بابا نے دوبارہ اپنی آبائی حویلی کا رخ نہیں کیا تو اس کے پیچھے ضرور ان کی کوئی مصلحت ہوگی ممکن ہے انہوں نے سوچا ہو ان کے فادر انہیں قبول نہیں کریں گے یا وہ خاتون پھر سے ان کو بے عزت نہ کردیں۔ اب ان کی مصلحت آمیزی کو بزدلی جیسے شرمناک لفظ سے تعبیر کرنا تو کوئی انصاف کی بات نہ ہوئی۔" ثمینہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"نفسیاتی الجھاؤ؟" انہوں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا کہ ہادی کے تمام جملوں میں یہی لفظ انہیں قابل گرفت اور ناقابل فہم لگا تھا۔

"جی ہاں۔ نفسیاتی الجھاؤ۔ کوئی "Psychotic Disorder" ہادی نے قطعیت سے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"جینٹ کہا کرتی تھی کسی انسان کے اردگرد موجود غیر متوازن رویے اس انسان کی سوچ میں گرہیں لگا دیتے ہیں۔"

(وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ) یہ گرہیں نفسیاتی الجھنوں میں بدل جاتی ہیں۔ مجھے اس بات کا مطلب آج سمجھ میں آرہا ہے کیونکہ جینٹ کی یہ بات جنت بیگم پر پوری اترتی ہے۔ ممکن ہے سائیکاٹری میں اس کے لیے کوئی مکمل لفظ استعمال کیا جاتا ہو لیکن مجھے تو یہی سمجھ آرہا ہے کہ وہ خاتون Psychosis (نفسیاتی مرض جس سے ظاہری شخصیت پر اثر نہیں ہوتا لیکن باطنی شخصیت متاثر ہو کر رہ جاتی ہے) کا شکار تھیں۔ ورنہ آپ خود سوچیں کیا کوئی نارمل انسان اتنی معمولی باتوں پر ایسا ہارش ری ایکشن (تلخ رد عمل) دے سکتا ہے جیسا وہ خاتون دیتی تھیں؟"

ثمینہ الجھن میں پڑ گئیں اس پہلو پر انہوں نے اب تک نہ سوچا تھا۔

"تو کیا کسی کو اس کے جرم میں نفسیاتی الجھن کا مارجن دیا جاسکتا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"نفسیاتی "الجھن" کا تو شاید نہیں البتہ نفسیاتی "مرض" کا مارجن ہمارا قانون دیتا ہے۔" ہادی نے کہا "خیر چھوڑیں اس بات کو۔ ہم یہاں ان خاتون کی سائیکالوجی ڈسکس کرنے تو نہیں بیٹھے۔ آپ مجھے آگے کی تفصیلات بتائیں۔" اس نے گہری سانس بھر کر کہا۔

"خصوصاً" ان دنوں کے بارے میں جب آپ اور بابا ایک دوسرے سے ملے اور شادی کی۔ یقیناً" آپ سے شادی کے بعد بابا کی زندگی میں اور بہتری آئی ہوگی۔"

ہادی نے مسکرا کر اور اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔ ماضی کے دالانوں میں گھومتے پھرتے ثمینہ بوجھل پن کا شکار ہو چکی تھیں۔ ہادی اسی بوجھل پن کو ختم کرنا چاہتی تھی۔

ثمینہ نے مسکرا کر وہیں سے آغاز کیا جہاں سے بات منقطع ہوئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فصلِ گل آئی ہے یادوں میں دیے جلتے ہیں
دل دہک اٹھتا ہے زخموں میں دیے جلتے ہیں

شہرِ احساس ترے لمس سے جاگ اٹھتا ہے
رات آتی ہے تو زخموں میں دیے جلتے ہیں

روشنی سبز درختوں پہ اتر آتی ہے
پھول کھلتے ہیں تو شاخوں میں دیے جلتے ہیں

اک اجالے کو سخن کرتے سنا ہے میں نے
ہونٹ لو دیتے ہیں لفظوں میں دیے جلتے ہیں

یہ ترے نقشِ قدم ہیں کہ ستارے ہیں کہ پھول
تو گزرتا ہے تو رستوں میں دیے جلتے ہیں

فکر اک عمر میں احساس میں حل ہوتی ہے
بڑی مشکل سے دماغوں میں دیے جلتے ہیں

سلیم احمد

کیا کہوں وہ کدھر نہیں رہتا
ہاں مگر اس نگر نہیں رہتا

تو ہو، تیرا خیال ہو یا خواب
کوئی بھی رات بھر نہیں رہتا

جب سکوں ہی نہ دے سکے تو پھر
گھر کسی طور گھر نہیں رہتا

جس گھڑی چاہو تم چلے آؤ
میں کوئی چاند پر نہیں رہتا

لب کھلیں تو زباں نہیں رہتی
سر اٹھائیں تو سر نہیں رہتا

یوں تو اپنی بھی جستجو ہے مجھے
تجھ سے بھی بے خبر نہیں رہتا

دل فگاروں کے شہر میں تابش
ایک بھی بخیہ گر نہیں رہتا

تابش کمال

دیکھیے کس نگر کو جاتے ہیں
راستے گرد جو اڑاتے ہیں

آؤ اک دوسرے کی خوشبو سے
ایک خوشبو نئی اگاتے ہیں

یہ جو لمحے ہیں بھاگتے رکتے
یہ کوئی دائرہ بناتے ہیں

کس سے ہم پوچھتے، بتاتے کیا
کون ہیں، کس طرف کو جاتے ہیں

ایک کے بعد آسماں ہیں کئی
خاک زادے خبر یہ لاتے ہیں

اس کا انکار سننے آئے تھے
اس کا انکار سن کے جاتے ہیں

مجھ سے کہنے لگی وہ کامی شاہ
آپ باتیں بہت بناتے ہیں

سامی شاہ

جنگل،

شیر کی اپنی خدائی
ریچھ کے اپنے ضوابط
بھیڑیے کا اپنا ہی قانون
ان پر
حرف گیری کا کسی کو حق نہیں
بھیڑوں کو حکم ہے
وہ اپنی بھیں بھیں سے غرض رکھا کریں

گفتار کے غازی،

ہر جانب پر کترے توتے
چوری کے چکر میں گم ہیں
اپنے اپنے پنجروں میں گردن اکڑائے
[illegible] کرتے گھوم رہے ہیں
دنیا کو اُلجھا رکھا ہے
اپنی لاحاصل ٹیں ٹیں میں

حمیدہ شاہین

جواب،

مالکن نے شرم دلانے کے انداز میں ملازم سے کہا۔
"یہ پلیٹ دیکھو ذرا، ... کتنی گندی ہے، تمہیں اس کو مہمانوں کے سامنے رکھتے ہوئے شرم نہیں آئی؟"
"اس میں میرے لیے شرم کی کیا بات ہے بیگم صاحبہ!" ملازم نے اطمینان سے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ اس پر انگلیوں کے نشان ہیں لیکن سالن کی چکناہٹ تو اس پر میرے اس گھر میں آنے سے پہلے موجود تھی۔"

شہلا اظہر۔ وہاڑی

ریاضی دانی،

ایک دفعہ مرحوم احمد ندیم قاسمی نے اپنے انٹرویو میں ایک دلچسپ انکشاف کیا۔
"مجھے اسکول میں ریاضی کے مضمون سے نفرت تھی اس نفرت کی وجہ سے میری قابلیت کا یہ عالم تھا کہ جب میں محکمہ ایکسائز میں ملازم تھا تو ایک دفعہ میرے ایک ساتھی نے رجسٹروں میں حساب کتاب کرتے کرتے اچانک مجھ سے پوچھ لیا۔
'چھ چھکا؟' تو میں نے فوراً جواب دیا۔
'چھتیس' انہوں نے بھی روانی میں یہی لکھ دیا اور جب ٹیکس کی رپورٹیں آئیں تو ان میں لاکھوں روپے کا فرق تھا۔ میرے اس ساتھی کی طلبی ہو گئی تھی، جس نے میری ریاضی دانی پر بھروسا کیا تھا۔"

افشاں غلام۔ کراچی

بے بسی،

ایک بچے کو دکانوں سے چھوٹی چھوٹی چیزیں چرانے کی عادت پڑ گئی۔ جب اس کے والد اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے تو انہوں نے ایک فیصلہ کیا کہ اسے خوفزدہ کرنے کے لیے چند گھنٹوں کے لیے حوالات بھجوا دیا جائے انہوں نے ایک تھانے دار سے بات کی۔ اس نے تجویز مان لی اور بچے کو حوالات میں بند کر دیا۔ اس وقت حوالات میں ——— پختہ عمر کا ایک اور مجرم بھی بند تھا۔ اس نے لڑکے سے پوچھا۔
"تمہیں یہاں کس جرم میں ——— لایا گیا ہے؟"
"میں دکانوں سے چھوٹی چھوٹی چیزیں چراتا ہوں۔"
"بے وقوف! تم کوئی بینک کیوں نہیں لوٹتے؟" مجرم نے کہا۔
"کیا کروں، مجھے اسکول سے تین بجے چھٹی ہوتی ہے۔ تب تک بینک بند ہو چکے ہوتے ہیں۔" لڑکے نے بے بسی سے جواب دیا۔

عائشہ، تحریم۔ گوجرہ

مسئلہ،

فلم انڈسٹری کے ایک ولن نے چند فلموں میں ایسا خوبصورت کام کیا کہ ہر طرف ان کی واہ واہ ہو گئی۔ ایک روز ولن نے اپنے ایک دوست سے کہا۔
"جب سے میں فلموں سے منسوب ہوا ہوں جہاں جاتا ہوں، لوگ مجھے گھیر لیتے ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔"
دوست نے جواب دیا۔ "تمہیں پریشان ہونے کے بجائے خوش ہونا چاہیے۔ شوبز ایسا ادارہ ہے جو انسان کو راتوں رات شہرت کی بلندیوں پہ پہنچا دیتا ہے۔ جب انسان اس شعبہ میں کام کر کے مشہور ہو جاتا ہے تو پرستار اسے ہر موڑ پر گھیر لیتے ہیں۔ آٹوگراف

مانگتے ہیں، اُدھار نہیں کرتے ہیں۔"
"لیکن میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔" دلن بولا۔
دوست نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا مسئلہ؟"
دلن بولا۔ "میں جہاں جاتا ہوں، مجھے گھیرنے والے تقاضا کرتے ہیں کہ اب تو فلموں میں کام کر کے خوب کما رہے ہو، ہم سے اُدھار لی ہوئی رقمیں تو واپس کر دو۔"

مدیحہ حمید۔ کراچی

ہیلو

ایک بڑے ہوٹل میں ماہرین نفسیات کا کنونشن منعقد ہو رہا تھا۔ کنونشن کے دوران ایک روز دو ماہر نفسیات راہداری میں ایک دوسرے کے پاس سے گزرے۔ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ایک نے مسکرا کر دوسرے کو "ہیلو" کہا۔ دوسرے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور کافی آگے جا کر ایک ستون کی آڑ میں کھڑے ہو کر سر کھجاتے ہوئے بڑبڑایا۔
"آخر اس کا ہیلو کہنے کا مقصد کیا تھا؟"
دو گھنٹے وہ وہیں کھڑا اس سوال پر غور کرتا رہا۔ تب جا کر اس کی سمجھ میں آیا کہ دوسرے ماہر نفسیات کا ہیلو کہنے کا مقصد محض ہیلو ہی کہنا تھا۔

نسیم سحر۔ کراچی

ارشاد فرمائیے!

☆ بجلی کی لوڈشیڈنگ سے پریشان ساری رات مچھروں سے مقابلہ کرنے والا شہری بجلی سے ارشاد فرماتا ہے۔

نیند نے بھی تیری ادا پائی
بے وفا رات بھر نہیں آئی

☆ بچے کا قد نہ بڑھنے کی وجہ سے والدین نے بچے کا نام "مہنگائی" رکھ دیا ہے۔ بچے کا قد حیرت انگیز طور سے بڑھنا شروع ہو گیا۔ مہنگائی کے مارے غریب عوام مہنگائی سے ارشاد فرماتے ہیں۔

کون کہتا ہے ہم تم میں جدائی ہو گی
یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہو گی!

☆ دکان دار اُدھار لے کر واپس نہ کرنے والے گاہک کو دیکھ کر ارشاد فرماتا ہے۔

مجھے جن کی دید کی آس تھی، وہ ملے راہ میں تو یوں ملے
میں نظر اٹھا کے تڑپ گیا، وہ نظر جھکا کے چلے گئے

☆ شعیب اختر دو میچ کھیلنے کے بعد تیسرے میچ کے لیے پٹھا چڑھ جانے کی وجہ سے اَن فٹ ہو جاتے ہیں۔ کپتان شاہد آفریدی ارشاد فرماتے ہیں۔

قدم گن گن کے رکھتے ہیں کمر بل کھا ہی جاتی ہے
خدا جب حسن دیتا ہے، نزاکت آ ہی جاتی ہے

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

وجہ

دو مکینک گاڑیوں کے بارے میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ ایک بولا۔
"تمہیں گاڑیوں کی سیٹوں پر چمڑے کے کور اچھے لگتے ہیں یا کپڑے کے؟"
"کپڑے کے۔" دوسرے مکینک نے جواب دیا۔ "چمڑے کے کور پر ہاتھ اچھی طرح صاف نہیں ہوتے۔"

نورین اسد۔ پشاور

گلابو

سردار جی [illegible] کے گھر گیا اور دروازے پر دستک دی۔
گلابو نے پوچھا۔ "کون؟"
سردار بولا۔ "میں ہوں۔"
گلابو نے پوچھا۔ "میں کون؟"
سردار نے کہا۔ "لے دس تو گلابو ہے ہور کون؟"

نوشین اقبال نوشی۔ گاؤں بدو مرہال

غصہ

ایک سردار جی فوتگی والے گھر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد

ہی واپس آ گیا۔
دوسرا سردار۔ "یار اتنی جلدی آ گیا ایں۔"
پہلا سردار۔ "مجال اے جے کسے نے اس کے گل کیتی ہووے۔" (مجال ہے کسی نے ہنس کے بات کی ہے)

رضیہ چوہدری۔ میاں چنوں

مشترک

وہ مڑ مڑ کے ہمیں دیکھ رہے تھے اور ہم انہیں
کیونکہ [illegible] نہ انہیں [illegible] نہ ہمیں

پاکستانی

انگلینڈ میں ایک باربر شاپ پر ایک سپاہی بال کٹوانے آیا۔ بال کٹوانے کے بعد سپاہی نے باربر کو پیسے دینے چاہے تو باربر نے یہ کہہ کر پیسے لینے سے انکار کر دیا کہ "آپ ہمارے ملک کے عوام کے لیے لڑتے ہیں۔ میں آپ سے پیسے نہیں لوں گا۔"
دوسرے دن اس کی دکان کے باہر چاکلیٹس اور پھولوں کے تحائف رکھے ہوئے تھے۔
اگلے دن اس کی دکان پر ایک ڈاکٹر آیا۔ بال کٹوانے کے بعد باربر نے یہ کہہ کر اس سے بھی پیسے لینے سے انکار کر دیا کہ "آپ ہمارے ملک کے بیمار لوگوں کا علاج کرتے ہیں۔ میں آپ سے پیسے نہیں لوں گا۔"
دوسرے دن اس کی دکان کے باہر ایک قیمتی سُوٹ رکھا ہوا تھا۔
اگلے دن ایک پاکستانی اس کی دکان پر آیا۔ باربر نے اس سے بھی پیسے لینے سے انکار کر دیا اور کہا۔ "آپ ہمارے ملک میں سیر و تفریح کی غرض سے آئے ہیں۔ میں آپ سے پیسے نہیں لوں گا۔"
اگلے دن اس کی دکان کے باہر دس پاکستانی بال کٹوانے کے لیے لائن میں بیٹھے ہوئے تھے۔

ثمرہ، اقراء۔ کراچی

رہنمائی

سلیم صاحب اپنی دفتری ساتھی سعدیہ کے بہت آگے پیچھے پھرتے تھے مگر وہ انہیں گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ ان کی ایک دوسری دفتری ساتھی نازیہ نے ایک روز ان پر ترس کھاتے ہوئے کہا۔
"اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ سعدیہ آپ کو گھاس نہیں ڈالتی، آپ بھی تو حد کرتے ہیں۔ اس کے سامنے بالکل حکم کے غلام بنے رہتے ہیں۔ اس کے آگے پیچھے پھرتے ہیں، اس کے پیچھے دُم ہلاتے پھرتے ہیں۔ ہر بات پر اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے آپ کی اپنی کوئی شخصیت، آپ کی اپنی کوئی مرضی ہی نہیں ہے۔"
"تو کیا عورتیں ایسے مردوں کو پسند نہیں کرتیں؟" سلیم صاحب نے قدرے حیرت سے پوچھا۔
"ایسے مردوں کو عورتیں شادی کے بعد پسند کرتی ہیں۔" نازیہ نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔

مدیحہ، فضہ۔ کراچی

امریکہ رے امریکہ

امریکی بہت ذہین ہوتے ہیں۔ ایک جگہ امریکی نوجوانوں کے انٹرویو ہو رہے تھے۔ ایک نوجوان سے مندرجہ ذیل جواب سننے کو ملے۔
"واشنگٹن کہاں ہے؟"
"وہ تو عرصہ ہوا مر چکا ہے۔" (جارج واشنگٹن)
"میرا مطلب تھا کہ امریکہ کا کیپٹل کہاں ہے؟"
"امریکہ نے اپنا سارا کیپٹل (سرمایہ) یورپ کو قرضوں میں دے دیا ہے۔"
"اگر تمہیں ملازمت دے دی گئی تو تم اپنے ملک کے آئین کو سپورٹ (حمایت) کرو گے؟"
"میں آئین کو سپورٹ کیسے کر سکتا ہوں؟ میرے پاس تو سپورٹ (کفایت) کرنے کے لیے پہلے ہی میری بیوی اور دو بچے موجود ہیں۔"

مریم یوسف۔ کراچی

شگفتہ جاہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جن لوگوں میں اللہ کی نافرمانی کی جائے جب کہ وہ (گناہ کرنے والوں سے) زیادہ طاقت ور اور زیادہ زور آور ہوں۔ اس کے باوجود (مجرموں کو گناہ سے) منع نہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان سب پر عذاب نازل کر دیتا ہے۔"

فوائد و مسائل؛

1۔ جس کو اللہ تعالیٰ دنیاوی طور پر دولت، عزت اور قوت دے، اس کی ذمہ داری ہے کہ نیکی کے فروغ اور گناہ کے سدباب کے لیے کوشش کرے۔
2۔ ہر شخص کو اپنی طاقت کے مطابق برائی رد کرنا چاہیے۔
3۔ دنیا میں اللہ کا عذاب آتا ہے تو نیک بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ لیکن یہ عذاب اس وقت آتا ہے جب معاشرے میں گناہ کی کثرت ہو جائے۔

غصہ،

ایک نبی اللہ نے اپنی جماعت کے لوگوں سے فرمایا۔
"کوئی ایسا ہے جو اس بات کا کفیل ہو کہ وہ غصہ نہیں کرے گا۔ وہی میرے بعد خلیفہ ہو گا اور بہشت میں میرے ساتھ رہے گا۔"
ایک شخص نے کہا "میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں۔"
چنانچہ اس نے اس بات کو قبول کر لیا۔
دوسری بار پھر انہوں نے دریافت کیا تو پھر اسی نے جواب دیا کہ میں قبول کرتا ہوں۔ چنانچہ اس نے اس عہد کو پورا کیا اور وہی شخص ان کا جانشین ہوا۔

اسی کفالت اور ذمہ داری کے باعث ان کا لقب ذوالکفل رکھا گیا۔

عشرہ مبشرہ،

عشرہ مبشرہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ دس صحابہ جن کو اللہ تعالیٰ کے نبی نے اس دنیا کی زندگی میں ہی جنت کی بشارت دے دی۔ ان کا ٹھکانا جنت ہو گا۔ وہ دس صحابہ یہ ہیں۔

1۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
2۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
3۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
4۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
5۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
6۔ حضرت طلحہ بن عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
7۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
8۔ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
9۔ حضرت سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
10۔ حضرت ابو عبیدہ الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

عائشہ رانا۔ کنڈن سیان ڈسکہ

قطرہ،

کسی شے کو چھوٹا سمجھنے کے لیے ضروری ہے یا تو اسے دور سے دیکھا جائے یا پھر غرور سے دیکھا جائے ورنہ اگر اسے قریب سے دیکھا جائے، عزت سے دیکھا جائے تو وہی شے اپنے اندر اک جہاں رکھتی ہے۔ اک ذرہ بے مایہ اپنے اندر سرمایہ گرانمایہ رکھتا ہے۔ ذرے کا دل چیرا گیا تو کتنے آفتاب لرز گئے۔

اسی طرح قطرے کے اندر وسعت بے کراں ہے وہ اپنے دل ہی دل میں قلزم ساز سمجھتا ہے خود کو۔ بلکہ قلزم نواز سمجھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسی کے دم سے کائنات میں زندگی ہے۔ ہر شے کی زندگی پانی ہے اور پانی کی اساس قطرہ ہے۔ یہ قطرے کا تصور ہے اپنے بارے میں۔

(واصف علی واصف)

ثمینہ کوثر

اولاد میں فرق،

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں اس کا ایک بیٹا آیا۔ اس نے اسے چوم کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔ پھر اس کی ایک بیٹی آگئی۔ اس نے اسے اپنے سامنے بٹھا لیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تم نے دونوں سے ایک جیسا سلوک کیوں نہیں کیا؟"

نمرہ، اقرا۔ کراچی

بیت المال،

حضرت حسن رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب نے ایک لڑکی کو دیکھا جو کمزوری کی وجہ سے لڑکھڑا کر چل رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا۔
"یہ لڑکی کون ہے؟"
تو حضرت عبداللہ بن عمر (ان کے بیٹے) نے کہا۔
"یہ آپ کی بیٹی ہے۔"
حضرت عمرؓ نے پوچھا "یہ میری کون سی بیٹی ہے؟"
حضرت عبداللہ نے کہا "یہ میری بیٹی ہے۔"
حضرت عمرؓ نے پوچھا "یہ اتنی کمزور کیوں ہے؟"
حضرت عبداللہ نے کہا "آپ کی وجہ سے، کیونکہ آپ اسے کچھ نہیں دیتے۔"
حضرت عمرؓ نے فرمایا "اے آدمی اللہ کی قسم! میں تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ (خود کما کر) تم اپنی اولاد پر خرچ کرو۔ میں بیت المال میں سے نہیں دوں گا۔"

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

حاصل،

ایک آدمی نے مکان بنایا اور ایک بزرگ کے پاس گیا اور ان سے کہا۔
"جناب! میں نے مکان بنایا ہے۔"
انہوں نے کہا "مبارک ہو۔ ایسا مکان بنانا کہ چھوڑتے وقت تکلیف نہ ہو۔ اب تم نے کہا مکان بنایا ہے۔ جتنا اچھا ہے گا چھوڑتے وقت اتنی ہی تکلیف ہو گی۔ حاصل میں بھی تکلیف اور چھوڑنے میں بھی تکلیف۔ بڑی مشکل سے حاصل ہوا۔ بڑی مشکل سے چھوڑا۔ آسانی سے حاصل کرو اور آسانی سے چھوڑ دو۔"

حور العین اقبال۔ کراچی

شانِ کریمی،

منصور بن عماد کو کسی نے خواب میں دیکھا اور دریافت کیا کہ تم پر کیا گزری؟ انہوں نے جواب دیا۔
"اللہ تعالیٰ نے مجھے سامنے کھڑا کر کے فرمایا۔
"اے منصور تو جانتا ہے کہ میں نے تجھے کیوں بخشا ہے؟"
میں نے عرض کیا "یارب مجھے خبر نہیں۔"
پھر خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ایک دن تو بیٹھا ہوا بہت سے آدمیوں کو وعظ اور نصیحت کر رہا تھا اور یہ باتیں سنا کر رلا رہا تھا۔ میرے ان بندوں میں سے ایک بندہ میرے خوف سے ایسا رویا جو پہلے کبھی نہ رویا تھا۔ میں نے اسے بخش دیا اور اس کی وجہ سے تجھ کو اور تمام مجلس کو بخش دیا۔"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

موتی مالا،

- خاموش انسان، خاموش پانی کی طرح گہرے ہوتے ہیں۔
- تعریف سننے کی تمنا انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ لیکن اپنے منہ سے اپنی تعریف، اپنی

ماہنامہ شعاع 270 ستمبر 2011

انسانیت کی تکمیل ہے۔

• جب قائدین کی بہتات ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ قیادت کا فقدان ہو گیا۔

اللہ کے تقرب کا ثبوت مخلوق سے محبت میں پنہاں ہے۔

(واصف علی واصف)

ثوبیہ خالد۔ حافظ آباد

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

• کبھی ظاہر پر نہ جانا آگ دیکھنے میں سرخ نظر آتی ہے مگر اس کا جلایا ہوا سیاہ ہو جاتا ہے۔

(برم)

• بُرائی کرنے والے سے نہیں بلکہ بُرائی سے نفرت کرو۔

(گرو نانک)

• اگر انسان بننا چاہتے ہو تو ساری انسانیت کا احترام کرو۔

(علامہ اقبال)

• خوش مزاج شخص وہ ہے جو دوسروں کو خوش مزاجی عطا کرے۔

(ٹینی سن)

• تکلیفوں سے مت گھبراؤ کیونکہ تکلیفیں انسان کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ سوچنے سے آدمی دانا بنتا ہے اور دانائی آدمی کو جینے کے قابل بناتی ہے۔

(جان پیٹرک)

• قطرے کو سمندر سے تعلق ہو جائے تو وہ فنا اور بقا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

(واصف علی واصف)

صبا افضل بٹ۔ ریناله خورد

مہکتی کلیاں

※ جب عمر رفتہ کا غبار جھریوں میں ڈھل جاتا ہے تو یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ خوشیاں کہاں کہاں سجائی گئیں۔

※ جتنا کسی کا ساتھ پرانا ہوا اتنا ہی اس کی بے وفائی کے لیے تیار رہنا چاہیے کیونکہ تبدیلی کائنات کا خمیر ہے۔

※ لاحاصل محبت اور دیوانگی میں کچھ خاص فرق نہیں ہوتا۔ دونوں ہی جنوں کی منزل پہ لے جاتی ہیں۔

عائشہ تحریم۔ گوجرہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں کی نظر میں

• میرا یقین ہے کہ اگر ایک سو سال کے اندر یورپ میں کوئی مذہب ہوگا تو وہ صرف اور صرف اسلام ہوگا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے پاکباز انسان کو اگر رسول اللہ کا خطاب دیا گیا ہے تو یہ صداقت ہے۔

(جارج برنارڈ شا)

• میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عظیم قرآن کے دین پر یقین رکھتا ہوں۔ ایک ایسی مملکت قائم کرنا چاہتا ہوں جو قرآن کے اصولوں پر قائم ہو۔

(نپولین)

• آپ کی تعلیم میں ہمیں بہت سی خوبیاں نظر آتی ہیں جن کو دیکھ کر بے اختیار آپ کی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔

(ماسٹر شنکر داس گیانی)

• رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم روحانی پیشوا ہی نہیں بلکہ ان کی تعلیمات کو میں سب سے اعلیٰ سمجھتا ہوں۔ کسی روحانی پیشوا نے خدا کی وحدانیت کا پیغام ایسا جامع نہیں سنایا جیسا پیغمبر اسلام نے سنایا۔

(گاندھی جی)

اقرا انعم۔ گلشن سیمان۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

عید دعا کے اشعار

خالدہ جیلانی

یاسمین کنول ______ پسرور

میں نے چاہا کہ تجھے عید پہ ایسا تحفہ بھیجوں
جس میں تابندہ ستاروں کی چمک شامل ہو
جس میں گزرے ہوئے لمحوں کی سنہری یادیں ہوں
جس میں انجان جزیروں کی مہک شامل ہو

سمیرا ملک ______ ٹوبہ ٹیک سنگھ

وہ جو جدا ہوا ہے مدت سے
کاش وہ آن ملے عید کے روز
میں نے جو خواب سے بُن رکھے ہیں
وہ ملاقات کرے عید کے روز

انیس فاطمہ ______ پسرور

تارے اُترے جب پھیلایا دامن کو
عید کے چاند میں دیکھا میں نے ساجن کو
چاند رات کی مہندی مجھ سے کہتی ہے
تم بھی اک پیغام لکھو نا ساجن کو

تسلیم اختر ______ کچا کھوہ خانیوال

دل میں احساس جدائی کا اندھیرا ہے ابھی
چاند دیکھا ہی نہیں عید منائیں کیسے

بشریٰ نور محمد ______ میانوالی

عید کی سچی خوشی تو دوستوں کی دید ہے
سامنے جب تو نہیں تو خاک میری عید ہے

ثوبیہ نذیر ______ بھائی والا فیصل آباد

بڑی مشکل سے فلک پہ نظر آتا ہے
عید کے چاند نے انداز تمہارے سیکھے

سیدہ طوبیٰ جلالی ______ کراچی

وفا کا سندیس لے کر آتے مہکتے پل ہیں
گواہ رفاقتوں کا محبتوں کا بن کر ہلال عید
تمام روز و شب یوں ہی فروزاں رہیں ہر دم
ہر شب شب برات ہو ہر روز روز عید

نشانہ بٹ ______ لاہور

کہتے ہو کہ بچھڑے کوئی مدت نہیں گزری
لگتا ہے کبھی تم نے کیلنڈر نہیں دیکھا

ناعمہ فاطمہ ______ امرہ کلاں

کتنی عیدیں گزر گئیں تم بن
اب خدا کے لیے نہ تڑپانا
دیکھو پھر عید آنے والی ہے
عید کے ساتھ تم بھی آ جانا

نمرہ اقرا ______ کراچی

کیا بھلا مجھ کو پرکھنے کا نتیجہ نکلا
زخم دل آپ کی نظروں سے بھی گہرا نکلا
تشنگی جم گئی پتھر کی طرح ہونٹوں پر
ڈوب کر بھی ترے دریا سے میں پیاسا نکلا

ثمرین حبیب ______ مین وال

بچھڑے ہوئے بھی آج کے دن یاد آ گئے
آنکھوں میں آنسوؤں کا ہے طوفان بروز عید
یارب سجا کے چہرے پہ جھوٹی مسرتیں
کچھ لوگ پھر رہے ہیں پریشاں بروز عید

مینا بشیر وڑائچ ______ گجرات

تو ہنسے تو مہک اٹھیں دل کی کلیاں
تیری اک مسکراہٹ سے ہماری عید ہو جائے

رضوانہ ناز نجرا ______ کھر منڈی

جتنی خوشی تیرے جیون کا ہر سفر گزرے
میری دعا ہے کہ تیری عید خوب تر گزرے

رخسانہ امجد ______ ملک وال

نظر کا چین دل کا سرور ہوتے ہیں
کچھ ایسے لوگ جہاں میں ضرور ہوتے ہیں
سدا چمکتا ہے ان کی عید کا جلوہ
قریب رہ کر بھی جو ہم سے دور ہوتے ہیں

شہزیدہ ____ انگلینڈ

تعلقات بھی کچھ خوشگوار نہیں تھے
راستے بھی تو ہموار نہیں تھے
تمہیں مناتے بھی تو بھلا کس طرح
حالات جو سازگار نہیں تھے

نفر فاطمہ ____ امرہ کلاں

ایسی ہر سال خوشی میسر آئے تجھ کو
میری ہر سانس کہے عید مبارک تجھ کو

ماریہ سید واحد علی ____ کراچی

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی
نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نمازِ شوق تو واجب ہے بے وضو ہی سہی

روبینہ ____ جلال پور

آتا ہے جو خوشی کی انتہا پر
بہت روئے ہیں اُس آنسو کی خاطر

فرزانہ انصاری ____ صادق آباد

ہر فرخیر و شر میں کہیں اک ساعت ایسی ہے جس میں
ہر بات گناہ نہیں ہوتی سب کار ثواب نہیں ہوتا
کبھی عشق کرو اور پھر دیکھو اس آگ میں جلتے بنتے سے
کبھی دل پہ آنچ نہیں آتی کبھی رنگ خراب نہیں ہوتا

طیبہ ____ لاہور

تمام عمر کی وابستگی کی خواہش تھی
یہ کب کہا تھا میرا شہر چھوڑ جائے وہ
میرے بھی من کے دریچوں میں عید ہو جائے
میرے اُفق پہ اگر چاند بن کے آئے وہ

ماریہ واحد علی ____ کراچی

گنگناتی مسکراتی جھومتی آئے گی عید
لے کے دامن میں بہاروں کی مہک آئے گی عید
ہم پہ کب موقوف ہے رونق تمہاری بزم کی
ہم نہ ہوں گے تو بھی آئے گی ضرور آئے گی عید

نوشین اقبال ____ کاؤں بدرجاں

میں ہوں تیرا خیال ہے اور چاند رات ہے
دل درد سے نڈھال ہے اور چاند رات ہے
پھر تتلیاں سی اُڑنے لگیں دشت خواب میں
پھر خواہش وصال ہے اور چاند رات ہے

شاہدہ ذوالفقار ____ خانپور

آؤ اس عید پہ بھلا دیں پرانے غم
جن کا کوئی نہیں ان کے ہو جائیں ہم
عید تو بل جل کر ہنسنے مسکرانے کا نام ہے
تو پھر روتے چہروں کو ہنسائیں ہم

سیدہ لوبا سجاد ____ کروڑ پکا

میری اُداس سی شاموں میرے سفر میں ہے تو
میری نظر کے اُجالوں میرے سحر میں ہے تو
میں اپنی زندگی میں بھی وہ منظر عید کا پاؤں
مجھے خبر ہو میرا چاند بن گیا ہے تو

صبا سلیم ____ منڈو جان محمد

تم ابھی ٹھہرو مسرت بھرے پل کی یاد دلا
میں ذرا اپنی اُداسی سے نمٹ کر آیا
میں نے دیکھا ہی نہیں چاند مکمل فرحت
میری دیوار پہ آیا بھی تو بٹ کر آیا

عائشہ رانا ____ خانیوال

میں نے چاہا کہ تجھے عید پہ کچھ نذر کروں
جس میں احساس کے سب رنگ ہوں روشن روشن
جس میں آنکھوں کے تراشے ہوئے موتی لاکھوں
جس میں شامل ہو میرے قلب کی دھڑکن دھڑکن

امبر گل مہر گل ____ بھکر

خط میں لکھا ہے عید کب ہو گی
ہم کو تار بھیج کر پوچھ لینا
جو کہ جھگڑا تھا اس پہ ہم نے
کو دیا، آپ جب بھی آ جائیں

کنول شاہ ____ جلال پور جٹاں

اب تیری طلب بھی ہے ملنے کی تمنا بھی
اب تو عید نئے ہی انداز سے گزرے گی

فری منجرا ____ گگھڑ منڈی

عید کا دن بھی بس یہی سوچتے گزر جاتا ہے
ہمارے واسطے یہ عید بھی پچھلی عید سی کیوں ہے

*



فضل حسین

آج کل ایک ڈرامہ سیریل "اک ہتھیلی پہ حنا اک ہتھیلی پہ لہو" آپ سب ہی دیکھ رہے ہوں گے کیونکہ سیریل تو اچھا ہے ہی لیکن ایک کردار "طفیلی" بہت مقبول ہو رہا ہے "طفیلی" کا کردار ایک بچہ کر رہا ہے اور کم عمری میں جو رول اس بچے نے کر ڈالا ہے میں سمجھتی ہوں کہ کوئی نہیں کر سکتا۔

"فضل کیسے ہو اور بہت بہت پیار" ہنس دیے ہم نے ایک جملہ کہا تھا کہ ارسٹ ہو تا ہے گیا

دستک دستک دستک

شاہین رشید

"میں ہو تم یہ بات کس نے بتائی؟"

"میں ٹھیک ہوں تعریف کا شکریہ اور یہ جملہ میرے والد صاحب نے مجھے بتایا تھا پھر مجھے اس کا تجربہ بھی ہے۔"

"کیسے تجربہ ہوا؟ کتنے ڈرامے کیے ہیں تم نے؟"

"میں تقریباً"150"ڈرامے کر چکا ہوں۔"

"150"ڈرامے؟ مگر شہرت تو تمہیں "اک ہتھیلی پہ حنا اک ہتھیلی پہ لہو" سے ملی؟"

"اللہ کا شکر ہے میری شہرت تو بہت ہے لیکن کوئی کوئی ڈرامے ایسے ہوتے ہیں جو ایک ایسی سیڑھی ہوتی ہے کہ جو انسان کو اوپر تک لے جاتی ہے۔ فلم "رام چند پاکستانی" بھی میرے لیے بہت لکی ثابت ہوئی۔ اس میں پھر میری پرفارمنس کو بہت پسند کیا گیا وہ میری پہچان بنی۔"

"150"ڈرامے بہت بڑی تعداد ہوتے ہیں۔ تو کیا پیدا ہوتے ہی اداکاری شروع کر دی تھی؟"

"جی میں نے چار سال کی عمر سے کام شروع کیا تھا۔ ڈرامے کا نام "معید مقابلہ" اس کے ڈائریکٹر میرے پاپا تھے اور مجھے نہیں یاد کہ میں نے اس میں کیا کیا تھا۔ "ظلم رام چند پاکستانی" "ایک اور ڈرامہ جو میرے پاپا نے ہی ڈائریکٹ کیا تھا" "جادوگر نگل خان" ٹوٹا ہوا گھر" فرقان ٹائیگر" ٹوٹا پھوٹا ہی سہی" اور بھی بہت سارے ہیں مگر اس وقت ان کے نام یاد نہیں آ رہے۔ "یہ سب بہت مقبول ہوئے۔"

"کتنے سال کے ہو تم تمہاری تاریخ پیدائش کیا ہے۔ تمہارا نام خاصا بڑوں والا ہے۔"

"میں گیارہ سال کا ہوں۔ 31 اگست کو میں بارہ سال کا ہو جاؤں گا یعنی 31 اگست 2000ء میری تاریخ پیدائش ہے۔ اور میرا پورا نام سید فضل حسین ہے اور جب مر بن جاؤں گا تب تو یہ نام فٹ آ جائے گا۔ کوئی کوئی نام لکی ثابت ہوتے ہیں۔ میرے اور بھی نام تھے مگر مجھے سوٹ نہیں کیے۔ لیکن جب فضل رکھا تو اللہ کا فضل ہو گیا۔ میں ساتویں کلاس کا طالب علم ہوں۔"

”اس ڈرامے کے لیے تم کیسے منتخب ہوئے۔ اس کردار کے لیے تمہارا انتخاب کیسے ہوا؟“

”بابر جاوید انکل کے ساتھ میں نے موول پروڈکشن کا ایک ڈرامہ ”مانے نہ یہ دل“ کیا تھا اس کے بعد پاپا کے پاس بابر جاوید انکل کا فون آیا کہ اس ٹاپ کا کردار ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ یہ رول فیصل کرے۔ پھر مجھے اسکرپٹ دیا گیا اور سب سینئر فنکاروں نے مجھ پر بہت محنت کی اور اس کردار کے بارے میں مجھے سمجھایا۔ فیصل انکل اور بابر انکل نے بہت زیادہ محنت کی مجھ پر تب میں یہ کردار کرنے میں کامیاب ہوا۔“

”گویا اتنی آسانی سے کردار نہیں ہوا، کبھی ایسے لڑکوں کے درمیان رہے ہو؟“

”جی، بہت محنت کی تب ہی کامیابی نصیب ہوئی۔ اور اسی کو آرٹ کہتے ہیں جب بھی میں کہیں گھر سے باہر جاتا ہوں تو میرے پاپا کہتے ہیں کہ لوگوں کا مشاہدہ کیا کرو۔ تمہیں بہت سے کردار مل جائیں گے کرنے کے لیے تو اس ڈرامے میں ”کالر“ کو اوپر نیچے کرنا میں نے ایک بندے کو دیکھ کر سیکھا، پاپا نے کہا کہ کالر تو سب کھڑے کرتے ہیں مگر یہ اسٹائل اپناؤ گے تو سب پسند کریں گے۔ اب میں کہیں بھی جاتا ہوں تو سب مجھے دیکھ کر کہتے ہیں ”او طیفی استاد کیا حال ہیں۔“

”بہت خطرناک رول ہے تمہارا۔ کیا آئندہ بھی ایسے رول کرو گے؟“

”نہیں ہرگز نہیں۔ اس طرح کا رول دوبارہ نہیں کروں گا۔ یہ کردار کرلیا بس یہ ختم ہے۔ دوسرا کردار دوسرے طریقے سے کروں گا تاکہ وہ بھی مشہور ہو اگر اس طرح کے رول دوبارہ کروں گا تو لوگ کہیں گے کہ اس کو یہی کام آتا ہے اور کچھ نہیں آتا۔“

”کوئی خاص بات اس کردار کے حوالے سے کوئی مشکل ہوئی؟“

”مجھے مشکل کہیں بھی نہیں ہوئی بس ایک مرتبہ جب میں حجاب کو (آمنہ شیخ) ٹیکسی میں بٹھا رہا ہوتا ہوں تو ٹیکسی کا لوہا جو ٹوٹا ہوا تھا میرے بازو میں لگ گیا تھا اور بازو سے خون نکلنے لگا تھا۔“

”سب تعریف کرتے ہیں یا ڈانٹ بھی پڑتی ہے؟“

”تعریف تو بہت ہوتی ہے۔ مگر ڈانٹ بھی بہت پڑتی ہے۔ میری بہنیں مجھے مارتی ہیں۔ ایک سین تھا جب میں ”حجاب“ کو چھیڑتا ہوں تو اس پر میری بہن نے مجھے تھپڑ مارا تھا کہ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ اور میری آپی کی دوست کی دوست ایک دن کہنے لگیں کہ وہ جو لڑکا فلاں ڈرامے میں آتا ہے وہ بہت بدتمیز ہے اور وہ سچ میں بھی بدتمیز لگتا ہے تو آپی کی دوست نے کہا کہ نہیں نہیں۔ وہ بہت پیارا بچہ ہے۔ اگر میں نے بھی نہ دیکھا ہوتا تو میں بھی یہی سمجھتی۔“

”اسکرپٹ یاد کرنے میں مشکل ہوتی ہے؟“

”نہیں۔ بالکل نہیں۔ ہوم ورک کی طرح لیتا ہوں اسے پریکٹس بھی کرتا ہوں اور جس طرح امتحان میں یاد کرتے ہیں اس طرح یاد کرلیتا ہوں۔ یہ کردار بہت ہٹ گیا ہے جبکہ میں نے دوسرے بھی بہت اچھے اچھے کردار کیے ہیں۔“

”اب بتاؤ کہ کون سے اسکول میں پڑھتے ہو۔ اور بڑے ہو کر کیا بنو گے؟“

”نیو جنریشن ہائی اسکول“ میرے اسکول کا نام ہے اور بڑے ہو کر بزنس مین بنوں گا، بزنس بھی کروں گا اور ساتھ ساتھ اداکاری کو بھی جاری رکھوں گا ویسے یہ ابھی نہیں سوچا کہ کیا بزنس کروں گا۔ اور میرے ابو کہتے ہیں کہ یہ ایکٹنگ ایک ... نہیں رہے گی کیا پتا کب ساتھ چھوڑ جائے۔“

”اسکول کی چھٹیوں میں کیا کیا تھا اور دیگر بہن بھائی کتنے ہیں؟“

”اسکول کی چھٹیوں میں سارا دن شوٹ میں ہی مشغول و مصروف رہا، بس دو تین دن کے لیے ہی گھومنے پھرنے گیا تھا، باقی میرے پورے دو مہینے شوٹ میں گزر گئے ــــ ہم سات بہن بھائی ہیں چار بہنیں اور ہم تین بھائی ہیں ــ میں پانچویں نمبر پر ہوں اور میرا چھوٹا بھائی سید کرم حسین وہ بھی اداکاری کرتا ہے مگر وہ موڈی بہت ہے۔“

”فارغ وقت میں کیا کرتے ہو ہمی ابو کیا کرتے ہیں؟“

”اپنی بڑی بہن سے پڑھتا ہوں۔ کمپیوٹر پہ گیم کھیلتا ہوں یا فیس بک پر ہوتا ہوں۔ ہاؤس وائف ہیں اور ابو ڈائریکٹر ہیں جن کا نام سید سرفراز حسین ہے۔ انہوں نے ڈرامے بھی بنائے ہیں اور فلمیں بھی بنائی ہیں۔“

”کمرشلز کیے؟“

”جی بہت کیے ہیں۔ ... کے کمرشلز میں کام کیا ... میں کام کیا، اس کے کمرشلز میں ڈبنگ کی ہے میں نے۔ مختلف کمرشلز میں وائس اوور کرتا ہوں ”ٹونز“ کے جو کارٹون چلتے ہیں ان میں بھی میری آواز ہوتی ہے۔ ایک فلم آئی تھی ہوم الون home alon اس کے تینوں پارٹ کی ڈبنگ میں نے کی تھی۔“

”بڑی بات ہے کہ اتنی سی عمر میں اتنا کچھ کررہے ہو اور ماشاءاللہ کما بھی رہے ہو۔ پیسوں کا کیا کرتے ہو، خرچ کردیتے ہو؟“

”نہیں ــــ سب پیسے اپنی امی کو لاکر دیتا ہوں اور جتنی بھی ضرورت ہوتی ہے، میں اپنی مما سے لیتا ہوں۔ ویسے بھی مما مجھے مخصوص اماؤنٹ دیتی ہیں ان میں سے میں اپنے بہنوں بھائیوں کو بھی دیتا ہوں اور جو بچ جاتے ہیں وہ میں خرچ کردیتا ہوں۔“

”اپنے پیسوں سے اپنے لیے کوئی قیمتی چیز خریدی؟“

”جی، میں نے اپنے پیسوں سے اپنے لیے ”لیپ ٹاپ“ خریدا ہے۔“

”بہنوں پر رعب ڈالتے ہو کہ میں کمانے والا ہو گیا ہوں۔“

”نہیں نہیں ــــ بالکل نہیں اور اللہ نہ کرے کہ میں ایسا کچھ بولوں۔ یہ تو پھر غرور والی بات ہو جائے گی میرے ابو کہتے ہیں کہ جس دن تم میں غرور آیا اس دن جس بھی سیٹ پہ تم بیٹھے ہو گے ادھر سے زمین پر ایسے گرو گے کہ وہ چوٹ تمہیں ہمیشہ یاد رہے گی۔“

”سرفراز صاحب کی اس نصیحت کو گرہ سے باندھ لو۔“

”بالکل جی باندھ لی ہے۔ ایک مرتبہ میں پرائیویٹ چینل میں شوٹ کے سلسلے میں گیا تو وہاں کی ایک پروڈیوسر کہنے لگیں کہ ہم نے کئی بچے دیکھے ہیں ان میں تھوڑے بہت نخرے ضرور ہوتے ہیں کہ جی جوس پینا ہے، فلاں کھانا کھانا ہے۔ لیکن ہم نے آج تک فیصل میں نخرے نہیں دیکھے۔“

”ہمیشہ ایسے ہی رہنا۔ پھر تم بہت ترقی کرو گے تم نے ابھی تک موبائل فون کیوں نہیں لیا۔“

”میرے ابو کہتے ہیں کہ ابھی تم چھوٹے ہو۔ جب بڑے ہو جاؤ گے تو لے کر دوں گا۔“

”کام تو بڑے بڑے کررہے ہو؟“

”کام بڑے کررہا ہوں مگر میں اور میرا دل تو چھوٹا ہی ہے نا، ہوں تو بچہ ہی۔“

”خوش رہو پھر بات کریں گے۔“



فضا علی

فضا علی کا ہاتھ آنا بہت مشکل ہے۔ ہماری خواہش تھی کہ ان سے تفصیلی انٹرویو کریں۔ مگر فضا کے پاس ٹائم ہی نہیں ہے۔

"کیسی ہو فضا؟ بہت مصروف رہتی ہو۔"

"جی ٹھیک ہوں۔ مصروف تو واقعی بہت رہتی ہوں' ڈراموں کے ساتھ ساتھ بوتیک بھی تو چل رہا ہے۔ آپ کو تو پتا ہی ہے۔"

"تم ہو کہ چپ" میں نہ صرف اچھی لگ رہی ہو بلکہ پرفارمنس بھی بہت اچھی ہے۔ کیا رسپانس مل رہا ہے؟"

"بہت اچھا رسپانس مل رہا ہے۔ جہاں لوگ مجھے ملتے ہیں مجھے روک روک کر پوچھتے ہیں کہ اب کہانی میں آگے کیا ہوگا؟"

"پھر تم بتاتی ہو۔"

"نہیں بالکل نہیں۔ کہانی پتا چل جائے تو پھر کون سیریل دیکھتا ہے۔ تو اس لیے کسی کو نہیں بتاتی۔"

"تم شوبز میں بھی ہو۔ بوتیک بھی چلا رہی ہو۔ گھریلو لائف تو متاثر ہوتی ہوگی؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ میں سب کاموں کو اتنا ہی وقت دیتی ہوں جتنے میں وہ نمٹ جائیں۔ میں اپنا گھر بالکل ڈسٹرب نہیں ہونے دیتی۔ کیونکہ اداکاری سے مجھے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ گھر کی لائف ڈسٹرب ہونے کی وجہ سے میں اپنے اس جنون کو پورا نہ کرسکوں۔ اس لیے میں ہر بات کا بہت خیال رکھتی ہوں۔"

"کپڑے خود ڈیزائن کرتی ہو؟"

"نہیں میں کپڑے خود ڈیزائن نہیں کرتی' لیکن آج کل کے فیشن پہ میری گہری نظر رہتی ہے۔ میرے پاس بہت اچھے ڈیزائنرز ہیں اور میں ان کو گائیڈ کرتی رہتی ہوں۔"

"اور کیا کیا مصروفیات ہیں آج کل۔"

"میں نے کسی ایک کام میں ہاتھ نہیں ڈالا ہوا۔ پینٹنگ کا بھی شوق ہے مجھے اور یقین کریں میری پینٹنگ میرے دوست ہی لے جاتے ہیں۔ اور گلوکاری کا شوق اب اس حد تک زیادہ ہوگیا ہے کہ میں آج کل اپنی البم کی تیاری کررہی ہوں۔ ان شاء اللہ جلد ہی ریلیز کروں گی۔ اور ہاں ایک بات اور بتانا چاہوں گی کہ اب میں ایک بار پھر مستقل طور پر کراچی شفٹ ہورہی ہوں' کیونکہ خاوند کا بزنس کراچی میں ہے۔ بس لاہور آنا جانا لگا رہے گا۔ کیونکہ مجھے لاہور بہت پسند ہے۔"

"کراچی شفٹ ہونے سے سسرال والے تو بہت خوش ہوں گے؟"

"جی بہت خوش ہیں میرے سسرال والے پنجابی ہیں اور اب میں بھی ان کے رنگ میں رنگ گئی ہوں۔ سارے سسرال والے میرے گرویدہ ہیں۔"

بدقسمت بادشاہ

1485ء سے لے کر 1491ء تک عبداللہ الزاغل "غرناطہ" کا بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی سلطنت پچاس لاکھ میں فرڈیننڈ کو فروخت کی۔ اس نے سوچا کہ اس رقم سے ساری زندگی عیش کرے گا اور حکومت سنبھالنے کے مصائب سے بھی چھٹکارا مل جائے گا لیکن وہ زیادہ دیر اس رقم سے عیش نہ کرسکا۔ ہوا یہ کہ الزاغل یہ دولت لے کر افریقہ چلا آیا۔ یہاں فقس کے بادشاہ نے اسے گرفتار کرکے نہ صرف اس کی دولت چھین لی بلکہ الزاغل کی آنکھیں بھی نکلوادیں۔ اب الزاغل کو فقس کی سڑکوں پر بھیک مانگنا پڑی تاکہ دو وقت کی روٹی مل سکے۔ الزاغل نے اپنی زندگی کے باقی بارہ سال بھیک مانگ کر گزار دیے۔

اس کی پیٹھ پر ایک چادر سی پڑی ہوتی تھی۔ جس پر عربی زبان میں لکھا تھا۔ "یہ اندلس کا بدقسمت بادشاہ تھا۔"

تاریخ کے ان صفحات میں ان حکمرانوں کے لیے ایک عبرت ناک سبق ہے' جو ملک و قوم کا سودا کرکے غیر ملکی بینکوں میں رقوم محفوظ کرتے ہیں کہ ان سے عیش و عشرت کی زندگی گزاریں گے لیکن وہ نہیں جانتے کہ لوح محفوظ میں ان کے لیے کیا انجام رقم ہے۔

صبا طارق۔ گوجرانوالہ

ڈھال

محمد غوری نے جب دوسری مرتبہ دلی پر حملہ کیا تو اپنی فوج کے آگے گائیوں کا بہت بڑا گلہ کردیا اور اس کی آڑ میں پیش قدمی جاری رکھی۔ گائیوں کے احترام کے سبب چوہان اپنی تلواریں بند کیے پیچھے ہٹتے رہے اور محمد غوری کی فوج آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ انہوں نے گائیوں کی ڈھال کی آڑ میں دلی فتح کرلیا اور چوہان گائیوں کو کاٹ کر ترکوں تک نہ پہنچ سکے یوں لڑے بغیر دلی فتح ہوگیا۔

(کرن شبیر' کراچی)

سلطان کی ماں

جب غرناطہ کا آخری سلطان ابو عبداللہ اپنے آخری قلعہ کی کنجیاں عیسائی فاتحوں کے سپرد کررہا تھا تو اپنی تھوڑی سی جماعت کے ساتھ اس سرزمین پر جہاں مسلمانوں نے 600 برس حکومت کی' آخری نظر ڈالتے ہوئے آنسوؤں کے تار اس کی آنکھوں سے جاری ہوگئے۔ اس وقت سلطان کی والدہ عائشہ آگے بڑھیں اور کہنے لگیں۔

"فرزند من! جس چیز کو تم مردوں کی طرح بچا نہ سکے اب اس کے لیے عورتوں کی طرح رونے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

زینب احسن زیبی۔ منصور آباد فیصل آباد

قوم سبا

قوم سبا کے شہر میں ایک ڈیم تھا جو ملکہ بلقیس نے اپنے دور حکومت میں تعمیر کروایا تھا۔ اس ڈیم سے بارہ نہریں نکلتی تھیں ان ہی نہروں کے ذریعے لوگوں تک پانی پہنچتا تھا۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ اس ڈیم کو سبا بن یشجب نے بنوایا تھا اور اس نے ستر وادیوں کا پانی اس بند میں منتقل کردیا تھا لیکن ڈیم کی تعمیر مکمل ہونے

سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ پس اس کے بعد حمیر کے بادشاہوں نے ڈیم کی تعمیر مکمل کی۔ سبا کا نام عبدالشمس بن یشجب بن یعرب بن قحطان تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قوم سبا کا پہلا فرد تھا جس نے ضرب لگانے کی سزا مقرر کی۔ اسی وجہ سے اس کا نام سبا پڑ گیا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یمن کے بادشاہوں میں یہ پہلا بادشاہ تھا جس نے سر پر تاج پہنا لیکن بعض مورخین یہ کہتے ہیں کہ اس ڈیم کو لقمان بن عاد نے بنوایا تھا اور اس نے ہر میل کے رقبہ میں پانی کی نکاسی کے لیے ایک نہر بنائی تھی اور اس طرح تیس میل کے رقبہ میں تیس نہریں تعمیر کروائی تھیں۔ جن سے تمام وادیوں کو علیحدہ علیحدہ پانی مہیا کیا جاتا تھا۔

جو سبرہ فعخی نے فروہ بن میک قطیفی سے روایت کی ہے کہ ایک آدمی نے کہا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے سبا کے متعلق خبر دیجیے کہ وہ مرد تھا یا عورت یا کسی زمین کا نام ہے؟" پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "سبا عرب کے ایک آدمی کا نام تھا اور اس کے دس لڑکے تھے ان میں سے چھ خوش بخت اور چار بد بخت ہوئے۔"

زینب احسن رحمانی

قدیم کوفہ

کوفہ عراق کا شہر ہے اور بغداد سے تیس فرسخ (تین میل کا فاصلہ) کے فاصلے پر ہے کوفہ کے معنی ہیں ریت کا تہہ بہ تہہ ہونا۔ چونکہ کوفہ میں لوگوں کی کثرت تھی اس لیے اس کا نام کوفہ رکھا گیا۔

کوفہ کو حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایک چھاؤنی کے طور پر بسایا تھا۔ اس سے پہلے یہ علاقہ سورستان کہلاتا تھا۔ شروع میں چونکہ یہ ایک چھاؤنی تھی اس لیے پختہ مکانات کے بجائے یہاں رہنے والے مجبور کے پتوں اور بانسوں سے عارضی مکانات بناتے تھے۔ جب حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہاں کے گورنر ہوئے تو پھر ان کے زمانے میں پختہ اینٹوں کے مکانات بنائے گئے۔ کوفہ اپنے عہد عروج میں سولہ میل کے اندر پھیلا ہوا تھا اور ستر ہزار مکانات پر مشتمل تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس شہر کا چپہ چپہ علم حدیث سے جگمگا ڈالا تھا۔ ان کو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دینی تعلیم کی غرض سے اپنے زمانہ خلافت میں یہاں بھیجا تھا۔ یہاں سے بڑے بڑے علماء اور رجال دین کی تاریخ وابستہ ہے۔

آج کل کوفہ حکومت عراق کے تحت ہے اور سیاسی علمی اور جغرافیائی لحاظ سے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

خون ناحق

1909ء میں عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا۔ اس کا اندازہ ان الفاظ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے بطور مبارک باد پوپ کو لکھے۔ انہوں نے پوپ کو لکھا۔ "اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ جو افراد وہاں موجود تھے ان کے ساتھ ہم نے کیا سلوک کیا تو اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ جب ہمارے ساتھی سلیمانی کے معبد میں داخل ہوئے تو ان کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون تھا۔"



وینا ملک کی دال میں کالا

وینا ملک ایک طویل عرصے سے بھارت میں ڈیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ اس دوران وہ کبھی پاکستان آئیں بھی تو صرف حاضری لگوانے کی خاطر ہی آئیں۔ بھارت میں ان کا یہ طویل قیام بالآخر ان کے لیے خوشیوں کا پیغام لے ہی آیا۔ جی نہیں! آپ غلط سمجھے ابھی وینا جی کے سہرے کے پھول اشمت جی کے سنگ نہیں کھلے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ وینا کو ایک عدد بھارتی فلم میں کام مل گیا ہے۔ اس فلم میں وینا ڈبل رول ادا کر رہی ہیں۔ فلم کے ہدایت کار آنند بلراج ہیں اور فلم کا نام "دال میں کچھ کالا ہے" قرار پایا ہے۔ بھارت میں اتنا طویل قیام اور پھر وہاں کی فلم کے حصول میں کامیابی کی کوششیں ظاہر کرتی ہیں کہ وینا کی دال میں کچھ کالا کیا ساری کی ساری دال ہی کالی ہے۔

وینا جی! ذرا اسٹیبلشمنٹ کے فلم میں کام کرنے سے پہلے دو عظیم فنکاروں عدنان سمیع اور راحت فتح علی کے ساتھ ہونے والے بھارتی سلوک پر بھی ذرا ایک نظر ڈال لیں تو خود آپ ہی کے حق میں بہتر ہوگا۔ عقل مند کہتے ہیں کہ سیانا وہی ہے جو دوسروں کے تجربے سے فائدہ اٹھائے۔ کیوں وینا جی!

جب زیبا ہوئیں آبدیدہ

گزشتہ دنوں پی ٹی وی ایوارڈ کی تقریب اسلام آباد میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں اداکارہ زیبا نے بطور خاص شرکت کی۔ زیبا بیگم اس وقت اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکیں جب اداکار جاوید شیخ اور اداکارہ میرا نے محمد علی زیبا کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ان

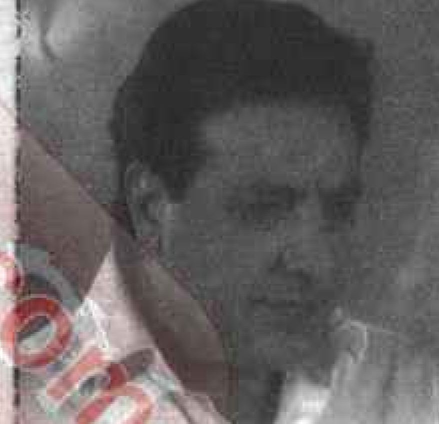


برعکس بڑے گھمبیر گانوں پر پرفارم کیا۔ گانوں کے بول تھے "مجھ سا تجھ کو چاہنے والا" اور "جب کوئی پیار سے بلائے گا۔ تم کو ایک شخص یاد آئے گا۔" ان گانوں کے ساتھ ہی محمد علی کی یاد آنسو بن کر زیبا بیگم کی آنکھوں میں جھلملانے لگی اور وہ رو پڑیں۔

پہلا شاٹ

پہلی کامیابی، پہلا اعزاز، پہلی تنخواہ، پہلی چاہت کی جاذبیت سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے کیونکہ اولین نقش کی بات ہی الگ ہوتی ہے۔ اس حوالے سے اپنے پہلے احساس کو کوئی فراموش نہیں کرسکتا۔ آج کے معروف اداکار جاوید شیخ بھی اپنی پہلی فلم کی پہلی شوٹنگ کو برسوں بعد آج بھی یاد رکھے ہوئے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں۔

شوٹنگ سے قبل میں رات ہی سے بے چین تھا۔ سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں کام کر بھی پاؤں گا یا نہیں۔ آدھی رات تک شیشے کے سامنے کھڑا ڈائیلاگز بولتا رہا۔ شوٹنگ کے لیے اتنا پرجوش تھا کہ وقت سے بہت پہلے اسٹوڈیو پہنچ گیا۔ یونٹ کے لوگ مجھے اتنی جلدی موجود دیکھ کر حیران رہ گئے۔ سیٹ پر پہنچ کر بھی میری بے چینی





ختم نہ ہوئی۔ کبھی اسکرپٹ یاد کرنے لگتا تو کبھی شیشے میں دیکھ کر اپنے بال بار بار سنوارتا۔ بالآخر شوٹنگ کا آغاز ہوا۔ جاوید بتاتے ہیں کہ وہ اتنے نروس تھے کہ بہت سے ٹیکس دینے کے بعد ہی وہ پہلا شاٹ اوکے کرانے میں کامیاب ہوسکے تھے۔

ماں تجھے سلام

معروف نیوز کاسٹر اور میزبان ندا اکبر کا کہنا ہے کہ ہر بچے کی طرح انہیں بھی اپنی ماں سے بے حد محبت ہے۔ وہ ان کے بے حد قریب بھی رہیں لیکن انہوں نے کبھی اپنی ماں سے محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ والدہ نے ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لیے جو کچھ بھی کیا، وہ ان کا فرض تھا۔ گویا انہیں پرورش کے دوران اپنی ماں کی طرف سے دی جانے والی قربانیوں کا ذرا بھی احساس نہیں تھا مگر جب ندا خود ماں بنیں تو انہیں ماں کی عظمت کا احساس ہوا۔ وہ کہتی ہیں کہ جیسے ہی ان کی بیٹی پیدا ہوئی تو وہ فوراً اپنی والدہ کے گلے لگ کر رو پڑیں۔ اس وقت ندا کو احساس ہوا کہ مائیں اولاد کے لیے کس قدر تکلیفیں برداشت کرتی ہیں۔ ندا آج اپنی والدہ کے نقش قدم پر

چلتے ہوئے اپنی بیٹی کی پرورش اور تربیت پر بے حد توجہ دے رہی ہیں۔

کاش اسی طرح ساری اولادیں والدین کی قربانیوں کا احساس کرسکیں مگر بدقسمتی سے دیکھا گیا ہے کہ جب والدین بوڑھے ہوجاتے ہیں تو اکثر اولادیں انہیں بوجھ سمجھنے لگتی ہیں۔ سو والدین بہت سی اولادوں کو بھی پال پوس لیتے ہیں مگر بہت سی اولادیں مل کر بھی والدین کو نہیں سنبھال سکتیں۔

✿

بیان کا لمانہ

"کوئی بھی مضمون ایک اخبار کے آدھے صفحے جتنے لمبے مضمون میں وہ بات نہ کہہ پاتا جو لندن کے فساد زدہ علاقوں میں شامل ایک پاکستانی اکثریت والے محلے کے ایک پاکستانی نژاد شہری نے کہہ ڈالی۔ اس نے کہا۔

"ہمارے علاقے میں فسادی حملے کر رہے ہیں۔ ہمیں اب کچھ کرنا ہوگا۔ ہم مقابلہ کریں گے اور اس علاقہ کو "کراچی" نہیں بننے دیں گے۔"

(عبداللہ طارق سہیل وغیرہ وغیرہ)

"میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جو بھی شخص کھلے ذہن کے ساتھ قرآن کا ترجمہ پڑھے خواہ وہ کسی مسلک یا فرقے کے عالم کا ترجمہ ہو (تفسیر نہیں) چند صفحات کے بعد اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ واقعی کائنات کی عظیم ترین قوت کا کلام ہے۔ قرآن پڑھنے والے کسی شخص کا کسی بھی قسم کے شرک میں مبتلا ہونے کا کوئی امکان نہیں کہ قرآن بار بار یہ بات جتلاتا ہے کہ اصل قوت اللہ ہی ہے۔" (محمد عامر خاکوانی۔ زنگار)

آسٹریلیا کے اخبار "سیرالڈسن" کے ایک پول میں آسٹریلیا کے 77 فیصد شہریوں نے یقین ظاہر کیا کہ نائن الیون کا واقعہ امریکی حکومت کا "اندرونی کام" ہے اتنی ہی تعداد میں امریکیوں کا بھی یہی خیال ہے۔

(کوروئن ڈف۔ ویٹرنز ٹوڈے)

"افغانستان کے سخت کوہستانی صحراؤں میں امریکا کی گاڑی پھنس چکی ہے۔ ان ہی سخت ترین حالات سے دوچار ہوکر ایڈ مل پٹراس بھی چلا اٹھے تھے "میں اس حقیقت سے آگاہ ہوا ہوں کہ افغان کتنے سخت جان لوگ ہیں اور افغانستان کی سرزمین کی طرح ان کی ہر چیز سخت ہے۔" (جنرل (ر) اسلم بیگ)

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوچکی ہے کہ کراچی میں عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر بم دھماکہ امریکا کی سی آئی اے اور بھارت کی خفیہ ایجنسی را کا کارنامہ تھا۔ (محمد توصیف الحق صدیقی)

کراچی کے علاوہ پاکستان کا کوئی دوسرا ایسا شہر نہیں جہاں بندوق کی سیاست، لسانی اور نسلی کشیدگی، فرقہ وارانہ تناؤ، ریاستی کمزوری، عسکریت پسندی اور منظم جرائم ہوں۔ سیکیورٹی اداروں کو حکومت کی طرف سے ٹارگٹ کلرز کو پکڑنے کی نہیں ان پر نظر رکھنے کی ہدایت ہے۔ (برطانوی اخبار فنانشل ٹائمز کا تبصرہ)

✿



مہندی کے ڈیزائن

ادارہ

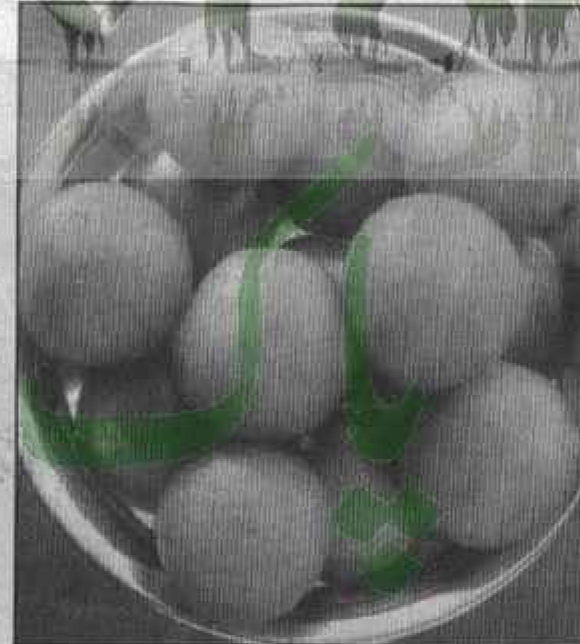












عید کے پکوان

خالدہ جیلانی

عیدالفطر خوشیوں بھرا حسین تہوار ہے۔ اسے "میٹھی عید" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ تہوار مٹھاس کی لذتوں سے بطور خاص منسوب ہے۔ ویسے عید ہو یا خوشی کا کوئی بھی تہوار، رنگا رنگ کھانوں کی لذت کے بغیر ادھورا سا لگتا ہے۔

عید تہوار کے موقعوں پر میل ملاقات کی خوشی کو لذت بھرے ذائقوں سے مزین کرنا ہر تہذیب کا حصہ رہا ہے۔ ہماری مشرقی تہذیب تو ویسے بھی سب سے جداگانہ رنگ رکھتی ہے کہ یہ مہمان نوازی کی حسین روایت سے مزین ہے۔ عیدالفطر کے موقع پر مہمانوں کی خاطر تواضع میں مدد کے لیے آج جو پکوان کا انتخاب بھی کچھ خاص ہی ہے۔ اس میں مٹھاس کی لذتوں کے ساتھ ساتھ نمکین ذائقوں کی بہار بھی شامل ہے۔

لقمی

اشیاء:

قیمہ	250 گرام
پیاز	ایک عدد
ادرک لہسن پسا	ایک ٹی اسپون
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک ٹی اسپون
نمک	ایک ٹی اسپون
گرم مسالا پاؤڈر	نصف ٹی اسپون
سبز دھنیا	چند پتے
سبز مرچیں	4 عدد کٹی ہوئیں

گوندھنے کے لیے:

آٹا یا میدہ	8 اونس
انڈا	ایک عدد
گھی	دو ٹیبل اسپون
نمک	نصف ٹی اسپون
شکر	نصف ٹی اسپون

ترکیب:

آٹا یا میدہ چھان کر اس میں گھی انڈا اور نصف ٹی اسپون شکر اور نمک ملا دیں پانی کی مدد سے گوندھ لیں۔

پلاسٹک میں لپیٹ کر چند گھنٹوں کے لیے ریفریجریٹر میں رکھ دیں۔ فلنگ یا بھرائی تیار کرنے کے لیے تیل گرم کر کے اس میں پیاز سنہری کریں۔ اب ادرک لہسن مرچ، نمک، ڈال کر بھون لیں پھر قیمہ ڈال کر پکائیں۔ جب قیمے کا پانی خشک ہو جائے تو چولہے سے ہٹا کر گرم مسالا، ہرا دھنیا اور مرچیں ڈال دیں۔ اب آٹے کی لمبی پٹیاں بنالیں۔ قیمہ بھر کر چوکور سموسے بنالیں۔ انڈے کی لئی سے کنارے بند کرلیں۔ گرم تیل میں فرائی کرلیں۔ سنہرے ہونے پر پیش کریں۔

چکن ڈونٹس

ضروری اشیاء:

مرغی بغیر ہڈی کے	1 کلو
انڈے	3 عدد
پودینہ	1 گڈی
میدہ	1 کپ
ہری مرچیں	5 عدد
بریڈ کرمز	1 کپ
زیرہ (کٹا ہوا)	1 کھانے کا چمچ
بیسن	1 کھانے کا چمچ
سرخ مرچ	1 کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	ڈیپ فرائنگ کے لیے
نمک	حسب ذائقہ
لہسن ادرک کا پیسٹ	2 کھانے کے چمچ

ترکیب:

چکن میں پودینہ، ہری مرچیں، لہسن ادرک کا پیسٹ ڈال کر گرائنڈر میں بلینڈ کریں پھر ایک برتن میں نکال کر اس میں کٹا ہوا زیرہ، نمک، بیسن، سرخ مرچ 1 عدد انڈا ڈال کر اچھی طرح مکس کریں پھر ڈونٹس یعنی کباب بنا کر درمیان میں انگلی کو میدہ لگا کر سوراخ بنالیں۔ پہلے میدہ میں ڈپ کریں پھر انڈے میں اور پھر بریڈ کرمز میں ڈپ کر کے ڈیپ فرائی کریں۔ گولڈن ہو جائیں تو نکال لیں اور ٹماٹو کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

رس ملائی

اشیاء:

ملک پاؤڈر	ایک کپ
انڈا	ایک عدد
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
گھی	ایک کھانے کا چمچ
سبز الائچی پسی ہوئی	آدھا چائے کا چمچہ
دودھ	ایک لیٹر
شکر	3/4 کپ
ثابت سبز الائچی	4 عدد
کیوڑہ	ایک چائے کا چمچ
بادام اور پستے	ہوائیاں کاٹ لیں

ترکیب:

ملک پاؤڈر میں انڈا، بیکنگ پاؤڈر، گھی اور نصف ٹی اسپون اور سبز الائچی پاؤڈر ملا کر اچھی طرح گوندھ لیں۔ بیضوی رس ملائی بنا کر ایک طرف رکھ دیں۔ دودھ ابال کر اس میں شکر ملا لیں۔ اتنا پکائیں کہ شکر گھل جائے پھر اس میں ثابت سبز الائچیاں بھی ڈال دیں۔ جب دودھ کی مقدار پکنے کے بعد نصف رہ جائے تو تیار شدہ رس ملائیاں دودھ میں ملا کر مزید 8 منٹ تک پکالیں۔ خیال رہے آنچ دھیمی ہونی چاہیے۔ اس دوران پتیلی کو ایک دو بار کپڑے کی مدد سے ہلائیں تاکہ

دودھ پتیلے میں لگنے نہ پائے۔ جب رس ملائیوں کا سائز تقریباً ''دو گنا'' ہو جائے تب پتیلی چولہے پر سے ہٹا کر اس میں کیوڑہ' بادام اور پستے کی ہوائیاں اور بقیہ نصف چمچ الائچی پاؤڈر ڈال دیں۔ ٹھنڈا کر کے کھانے کے لیے پیش کریں۔

قوامی سویاں

اشیاء :

سویاں	1/2 پیکٹ
چینی	2 کپ
کھویا	1/2 کپ
بادام	6 عدد
گھی	2 کپ
الائچی	چند دانے

ترکیب :

ایک پتیلی میں گھی گرم کر کے اس میں الائچی کے دانے کڑکڑائیں۔ پھر سویاں ڈال کر بھون لیں جب سنہری ہو جائے تو اتار لیں۔ اب ایک الگ برتن میں چینی اور ایک گلاس پانی ڈال کر پکائیں۔ جب شیرہ دو تار کا ہو جائے تو اسے سویوں میں ڈال دیں۔ اور کھویا شامل کر کے تھوڑی دیر کے لیے پکائیں۔ شیرہ خشک ہو جائے تو چولہے سے اتار لیں۔ بادام باریک کاٹ کر اوپر چھڑک دیں۔ مزیدار قوامی سویاں تیار ہیں۔

لمکا ڈرنک

اشیاء :

لیموں کا شربت (تیار شدہ)	2-3 کھانے کے چمچے
پودینے کا رس	1/4 چائے کا چمچہ
کالا نمک	حسب پسند
زیرہ پاؤڈر (بھنا پسا ہوا)	1/4 چائے کا چمچہ
سیون اپ یا اسپرائیٹ	2 بوتل

ترکیب :

ایک کاک ٹیل مگ میں لیموں کا شربت' پودینے کا رس' زیرہ پاؤڈر اور 2 چمچے پانی ڈال کر مکس کریں۔ سرونگ گلاس میں لیموں کا قتلہ پودینے کے پتے اور مکس کیا ہوا شربت ڈالیں۔ اس کے بعد اس میں سیون اپ یا اسپرائیٹ سے گلاس کو آدھے سے زیادہ بھریں اور برف ڈالیں۔ سرو کرتے ہوئے کالا نمک چھڑک کر فوراً'' سرو کریں۔

چائنیز آملیٹ

ضروری اجزا :

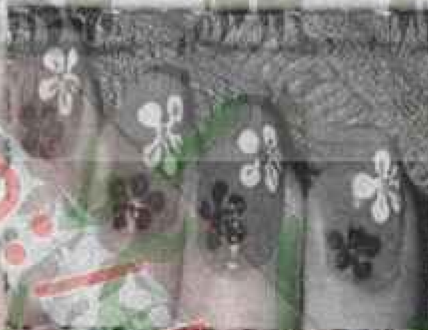
انڈے	تین عدد
پیاز (چوپ کی ہوئی)	کھانے کا ایک چمچہ
ہری پیاز (چوپ کی ہوئی)	آدھی پیالی
سیاہ مرچ	کھانے کا ایک چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ٹماٹر (چوپ کیے ہوئے)	ایک عدد درمیانہ
شملہ مرچ (چوپ کی ہوئی)	کھانے کے دو چمچے
سلائس	4 سے 6 عدد
پنیر (کدوکش کیا ہوا)	کھانے کا ایک چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

ایک پیالے میں انڈے پھینٹ کر اس میں پیاز' ہری پیاز' نمک' ٹماٹر' شملہ مرچ' سیاہ مرچ' پنیر ڈال کر اچھی طرح ملائیں۔ فرائنگ پین میں درمیانی آنچ پر تیل گرم کر کے اس میں انڈے کا آمیزہ ڈال کر پھیلا لیں اور سنہرا ہونے تک ہلکی آنچ پر پکائیں۔ پھر پلٹ کر دوسری جانب سے بھی فرائی کر لیں۔ مزیدار چائنیز آملیٹ تیار ہے۔ سرونگ پلیٹ میں نکال کر سلائس کے ساتھ سرو کریں۔

ادارہ

خوبصورتی



عید میک اپ پلان

کہتے ہیں کہ حسن کا راز خوب صورت جلد میں پنہاں ہے۔ بازو اور چمک دار جلد کے ساتھ اگر آپ میک اپ کرنے کا فن جانتی ہیں تو پھر یقین کر لیجیے کہ آپ ایک ''خوب صورت خاتون'' کہلانے کی حق دار ہیں۔ عید پر خوب صورت لباس کے ساتھ ساتھ سلیقے سے کیا گیا میک اپ آپ کی جاذبیت میں اضافہ کر دے گا۔

میک اپ سے قبل اپنا چہرہ اچھی طرح صاف کریں۔ اس کے بعد چہرے اور گردن پر اچھا سا موئسچرائزر لگا کر تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیں۔ تاکہ وہ اچھی طرح جذب ہو جائے' یہ آپ کی جلد کی نمی کو برقرار رکھتا ہے۔ اگر آپ کی جلد زیادہ چکنی ہے تو اس پر پاؤڈر لگا کر صاف کر لیجیے۔ پاؤڈر جلد کی اضافی چکنائی جذب کر لے گا۔ ملی جلی جلد رکھنے والی خواتین اپنی جلد کے چکنے حصوں پر پاؤڈر لگائیں۔ اب میک اپ کا آغاز کیجیے۔

سب سے پہلے فاؤنڈیشن کی تہہ لگائیے۔ خیال رہے کہ فاؤنڈیشن مناسب مقدار میں ہو۔ بہت زیادہ یا کم فاؤنڈیشن جلد پر اچھا تاثر نہیں دیتا۔ فاؤنڈیشن خریدتے وقت اس بات کا خیال رکھیے کہ اس میں پانی کی مقدار خاصی ہو۔ ایسا فاؤنڈیشن آپ کی جلد کو ہموار سکن دیتا ہے۔ زیادہ خشک جلد والی خواتین مائع فاؤنڈیشن کا انتخاب کریں۔ فاؤنڈیشن اپنے چہرے کی رنگت کی مناسبت سے لگائیں۔ درمیانی رنگت والی خواتین ہلکے رنگ کے فاؤنڈیشن کا انتخاب کریں۔ زیادہ گورے رنگ کی خواتین گہرے رنگ کا فاؤنڈیشن استعمال کر سکتی ہیں۔

فاؤنڈیشن کے بعد فیس پاؤڈر لگائیں۔ پاؤڈر کے رنگ کا انتخاب فاؤنڈیشن کے رنگ کی مناسبت سے کریں۔ اس کے بعد بلش آن لگائیں۔ بلش آن میک اپ میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اگر بلش آن غلط طریقے سے لگایا گیا ہو تو میک اپ کا سارا تاثر ختم ہو جاتا ہے' لہٰذا بلش آن لگاتے وقت خاصی احتیاط سے کام لیں۔ خشک جلد والی خواتین کریم بلش آن کا انتخاب کریں اور اسے پاؤڈر لگانے سے قبل لگائیں' جب کہ چکنی جلد والی پاؤڈر بلش آن لگائیں۔ اسے فیس پاؤڈر کے اوپر لگایا جاتا ہے۔ اگر آپ کا چہرہ بیضوی ہے تو بلش آن اپنے گالوں کی ہڈیوں پر لگائیں۔ گول چہرے والی خواتین بلش آن کو ہونٹوں سے کانوں کی





طرف لگائیں۔ اس سے چہرہ لمبائی کا تاثر دے گا۔ دیگر ساخت کے چہروں پر بلش آن ناک سے گالوں کی طرف لگایا جاتا ہے۔ درمیانی رنگت کی خواتین ہلکے گلابی اور براؤن بلش آن کا انتخاب کریں۔ گہرے رنگ کی خواتین کے لیے گلابی اور قدرے سرخی مائل گلابی رنگ کا بلش آن بہتر رہے گا۔ زرد رنگت کی حامل خواتین سرخی مائل براؤن رنگ کا بلش آن لگائیں، جب کہ گہری رنگت والی خواتین گہرے رنگوں پر مشتمل بلش آن کا انتخاب کریں۔

اب آنکھوں کا میک اپ کیجیے۔ آنکھوں کے میک اپ کے لیے آئی لائنر، آئی شیڈز اور مسکارا کی ضرورت ہوتی ہے۔ بھنوؤں کے نیچے ہلکے رنگ کا آئی شیڈ لگائیں، تاکہ یہ جگہ نمایاں ہو جائے۔ اس سے آنکھیں بڑی لگتی ہیں۔ پپوٹوں کے درمیانی حصوں پر گہرے رنگ کا آئی شیڈ لگائیں۔ انگلی سے ہلکا سا مل لیں، تاکہ دونوں آئی شیڈ کے کنارے واضح نہ ہوں اور وہ الگ الگ نہ محسوس ہوں۔ اس کے بعد پلکوں کے اوپر کی طرف آئی لائنر لگائیں۔ اب پلکوں پر مسکارا لگائیں۔ کالے رنگ کا مسکارا ہر طرح کی آنکھوں کے لیے سب سے بہتر رہتا ہے۔ اگر آپ نیلا، براؤن یا کسی اور رنگ کا مسکارا لگانا چاہتی ہیں تو پھر آئی لائنر بھی اسی رنگ کا لگائیے۔ اگر آپ کی پلکیں چھوٹی ہیں تو مسکارا لمبائی کے رخ پر سیدھا لگائیں۔ اگر پلکیں [illegible] ہیں تو مسکارا لگانے سے پہلے پلکوں پر [illegible] پاؤڈر لگائیں، پھر مسکارا لگائیں۔ [illegible] پلکیں گھنی لگیں گی۔

مسکارا کا انتخاب اپنی آنکھوں کی رنگت کی مناسبت سے کیجیے۔ سبز اور بھورے رنگ کی آنکھوں کے لیے سیاہ، خاکستری یا سبز رنگ کے تمام شیڈز لگائے جا سکتے ہیں۔ گلابی اور گہرے براؤن رنگ کا مسکارا لگانے سے گریز کیجیے۔ براؤن اور سیاہ رنگ کی آنکھوں کے لیے سیاہ، براؤن، ہلکا بھورا یا خاکستری، جامنی اور سرمئی رنگ کے تمام شیڈز لگائے جا سکتے ہیں۔ سرمئی اور نیلے رنگ کی آنکھوں پر سیاہ، نیلا، سرمئی اور خاکستری رنگ کا مسکارا استعمال کیا جا سکتا ہے۔

آخر میں ہونٹوں کا میک اپ کیجیے، ہونٹوں کا میک اپ سب سے زیادہ اہم ہے، کیوں کہ یہ میک اپ کا مجموعی تاثر ابھارتا ہے۔ لپ پنسل سے ہونٹوں کی ساخت نمایاں کیجیے۔ ہونٹ زیادہ پتلے ہیں تو پنسل کی مدد سے ہونٹوں سے باہر کی طرف خط کھینچیے۔ ہونٹ اگر موٹے ہیں تو اندر کی طرف لگائیں۔ پھر لپ برش کی مدد سے لپ اسٹک لگائیے۔ ایک نرم ٹشو پیپر لے کر اسے دونوں ہونٹوں کے درمیان رکھ کر زور سے دبائیے۔ اس کے بعد دوبارہ لپ اسٹک لگائیے۔ اس سے لپ اسٹک زیادہ دیر تک ہونٹوں پر جمی رہے گی۔ اس کے بعد لپ گلوس لگا لیجیے۔

چہرے کے میک اپ کے بعد اب ہاتھوں کی سجاوٹ پر توجہ دیں۔ آج کل ناخنوں [illegible] کی نیل پالش سے خوب صورت نقش و نگار بنائے جا رہے ہیں۔

اپنے لباس کی ہم رنگ [illegible] لگائیں، پھر کنٹراسٹ میں [illegible] نیل پالش منتخب کر کے کسی باریک [illegible] کی مدد سے حسب پسند کوئی [illegible] ڈیزائن بنانے کے لیے لی جانے والی پالش میں گلیٹر بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ یا [illegible] کے درمیان گلیو کی مدد سے چھوٹے چھوٹے نگینے بھی لگائے جا سکتے ہیں۔

اب آپ کا میک اپ مکمل ہے۔ اچھا سا ہیئر اسٹائل بنائیے اور دیکھیے اس عید پر آپ کی سج دھج کس قدر نرالی ہے۔

☼